عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم
طلوع اسلام
یادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مطبوعاتِ دائرہ طلوعِ اسلام

الحمد للہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ وارد ہا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے۔ گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے قیمت ۴ر محصول ڈاک ۱ر

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

از جناب رازی اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱ر

سوراجی اسلام

از جناب رازی، سیاسیاتِ ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جسنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے۔ الہلال کے دورِ اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۰ر

زبان کا مسئلہ

از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اُردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنارہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اُردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کررہے ہیں قیمت ۱ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یاایہا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا — استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ نہ ہو — بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار — لا اسلام الا بالجماعۃ

(فرمان رسولؐ) — (قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دَورِ جدید

مرتّب
محمد ظہیر الدین صدیقی بی۔ ایس سی

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ آٹھ آنہ

جلد (۲) شمار ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ مطابق جولائی ۱۹۳۹ء

فہرستِ مضامین

سادگی و پرکاری

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی
دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

نگہ دارد برہمن کارِ خود را
نمیگوید بہ کس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر
بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

اقبالؒ

لمعات

لکھنؤ کے حادثۂ الم انگیز و جگر سوز کے متعلق ہم نے ایک سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ فریقین کی ضد سے۔ جسے وہ اپنی زبان میں "سودائے جنت طلبی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ معاملہ اس حد تک جا پہنچا ہے کہ وہ اب پند و نصائح سے سُلجھایا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک صاحب اقتدار مرکز ہوتا جو قرآنِ کریم کے متعین فرمودہ مسلک کے مطابق اس تنازعہ کا فیصلہ کرتا۔ لیکن ہندوستان میں ہنوز مسلمانوں کے سامنے جماعتی زندگی کا تخیل ہی پیدا نہیں ہوا۔ مرکز اور مرکز کی قوّت کہاں سے آئے۔

دہن کا نام کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

البتہ اس اسلامی زندگی کا ایک دھندلا سا نقشہ ہمیں اس تنظیم میں دکھائی دیتا ہے جسے تحریک خاکساران کہتے ہیں۔ ہماری نگاہیں چاروں طرف سے نااُمید ہو کر ان ہی کی طرف اٹھی تھیں۔ بارے الحمدللہ کہ اُنہوں نے ہمیں مایوس نہیں ہونے دیا، اور علاّمہ مشرقی نے اعلان کر دیا کہ اگر ۳۰ جون تک فریقین اپنی ضد سے باز نہ آئے تو وہ آٹھ سو جاں باز اور دو ہزار خاکساروں کی جمعیت کے ذریعے جھگڑا چکانے کا بندوبست کریں گے۔ علاّمہ مشرقی کے لائحۂ عمل کی تفصیلات باہر نہیں آئیں لیکن وہ جو کچھ بھی ہوں اُمید ہے کہ ان کا یہ اقدام اس مسلک کے مطابق ہوگا جس کا حکم قرآنِ کریم نے دیا ہے سورۂ حجرات میں ہے۔ وَاِنْ طَائِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم دگر برسرِ پیکار ہوں تو اُن میں صلح کرا دو۔ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۔ لیکن اگر (باوجود صلح کے) ایک جماعت دوسری کے خلاف سرکشی پر اُتر آئے تو پھر جو جماعت سرکشی کرے تم اس کے خلاف صف آرائی کرو۔ حتّٰی کہ وہ جھک کر خدا کے حکم کے سامنے گردنِ تسلیم خم کر دے۔ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

وَاَقْسِطُوْا۔ سو جب وہ یوں جھک کر آمادۂ صلح ہو جائے تو ان میں عدل و انصاف سے صلح کرا دو۔
ہم علامہ مشرقی کی خدمت میں اُن کے اس مستحسن اقدام پر ملّتِ اسلامیہ کی طرف سے دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ کی نصرت و رحمت ان کے ساتھ ہو کہ انہوں نے اس دور میں جب کہ مسلمانوں کی نگاہوں سے مذہب کا یہ تخیل ہی گم ہو چکا تھا پھر سے اس بھولی ہوئی داستان کی یاد تازہ کرا دی کہ جس سے قوموں کے عروقِ مردہ میں خون زندگی دوڑ جائے اور ان کی نبضِ حیات میں تموّج پیدا ہو جائے۔ اسلام تو دنیا میں سکھانے ہی یہ آیا تھا

مومناں را تیغ با قرآں بس است

اس لیے کہ جب تک "شمشیر" اور قرآن ہم دوش نہ چلیں مسلمانوں کے اعمالِ صالحہ وہ صحیح نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے جسے قرآن کریم استخلاف فی الارض کہتا ہے۔ قوانین الٰہیہ کی محافظ شمشیر اور شمشیر کو حدودِ الٰہیہ کے اندر محصور رکھنے والا قرآن۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائنات زندگی را محور اند

آپ اشاعت زیرِ نظر میں عنوان "حقائق و عبر" کے ماتحت ایک مختصر سا شذرہ تحریک خاکساران کے متعلق ملاحظہ فرمائیں گے جس میں حادثۂ اکوڑہ کا ضمناً ذکر آ گیا ہے وہ حصہ پریس میں جا چکا تھا کہ ۲۲ رجون کے الاصلاح میں اس سانحۂ ہوش ربا کی تفصیلات نظر سے گذریں اللہ اکبر! ذرا تصور میں لائیے اس زہرہ گداز نقشے کو کہ بستی سے باہر کھلے میدان میں مسلمانوں کی ایک جماعت مصروفِ نماز ہو اور پیچھے سے مسلمانوں ہی کی ایک دوسری جماعت ان پر لاٹھیوں، تبروں اور کلہاڑیوں سے حملہ کر دے اور یوں سربسجود پیشانیاں خون سے رنگ دی جائیں اور خدا کے حضور میں جھکی ہوئی گردنوں کی ہڈیاں توڑی جائیں۔ چوں کہ یہ معاملہ اس وقت زیرِ تفتیش ہے اس لیے ہم سر دست اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ لیکن اتنا تو ظاہر ہے کہ عوام کو اس قسم کے وحشت انگیز مظالم پر آمادہ کرنے کے موجب وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ہم پہلے بھی لکھ چکے

ہیں کہ ان کا ذریعۂ معاش ہی یہ ہے کہ وہ لیڈری کے بہروپ میں دشمنانِ ملت کے آلۂ کار بن کر ہر اس مقام پر فتنہ انگیزی شروع کر دیں جہاں وہ دیکھیں کہ مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو کر منظم ہو رہا ہے۔ جب تک اس قسم کے بے کار "جنت فروشوں" کا خاطر خواہ بندوبست نہیں ہوتا، ملت کو فلاح و سکون نصیب نہیں ہو سکتا اور ان کے بندوبست کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جماعتی تشکیل کے بعد مرکزِ ملت کو اتنا مضبوط کر دیجئے کہ وہاں کی سند کے بغیر کوئی شخص "رہبرِ ملت" نہ بن سکے۔ ورنہ جب تک یہ حالت ہے کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اس وقت تک شیوۂ اہلِ وفا کی آبرو کا حال معلوم۔

"حقائق و عبر" میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے اس خطبہ پر ہمارا تبصرہ بھی آپ کی نظر سے گزرے گا جو انہوں نے جمعیت علماء (صوبہ بنگال) کے اجلاس میں بہ حیثیت صدر ارشاد فرمایا ہے۔ اس تبصرہ سے آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی کہ مولانا صاحب کے ارشادات سے کس طرح وہ "وحشت" اُبھر اُبھر کر نمایاں ہو رہی ہے جو بقول اُن کے وطن کی جُدائی کے احساس سے ان کے قلب و دماغ پر مسلط ہو چکی تھی اس خطبہ کے متعلق قومیت پرست اخبارات میں سے اس وقت تک صرف معاصر مدینہ کا تبصرہ ہماری نظر سے گذرا ہے جو بجائے خویش، پریشانیٔ فکر و نظر کا مرقع اور جنبہ داری کا آئینہ دار ہے۔ مولانا صاحب نے تحریک قومیت پرستی کے متعلق فرمایا ہے کہ کانگریس کو چاہیئے کہ اسے یورپ کی نیشنلزم کے انداز پر ترقی دے۔ چونکہ یہ مشورہ اس متحدہ قومیت کی تائید میں ہے جس کے علمبردار ہمارے قومیت پرست حضرات ہیں اس لیے اس حصہ کے متعلق معاصر مدینہ کا ارشاد ہے کہ یہ مولانا صاحب کی "وسعتِ نظر، وسعتِ معلومات، وسعت مطالعہ، وسعت تجربہ، بیباکی اور راست بازی، بے خوفی و جرأت" کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مولانا صاحب نے رومن رسم الخط

کی ترویج۔ ہیٹ اور نکٹائی کا استعمال اور بوٹ سمیت نماز پڑھنے کی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ ان کے متعلق ہمارے معاصر کا ارشاد ہے کہ "ہمیں توقع ہے کہ جب مولانا کو ذرا سکون میسر آئے گا تو وہ خود ان چیزوں کو غیر ضروری سمجھیں گے۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ خطبہ کا جو حصہ اپنے نظریہ کے مطابق ہے وہ عقل و ہوش کے معراجِ کمال کا مظہر لیکن جس حصہ سے اختلاف ہو وہ وحشت اور سراسیمگی کا نتیجہ! ظاہر ہے کہ مولانا صاحب نے جو کچھ اپنے خطبہ میں فرمایا ہے ایک ہی وقت میں ارشاد فرمایا ہو اس لیے اگر وہ عقل و خرد۔ فراست و بصیرت کا مظہر ہے تو سب کا سب ہے اور اگر اس پر وحشت و پریشانیٔ خیالات کا اثر ہے تو سب پر ہے اس تقسیم کے کیا معنی کہ ایک حصہ بصیرت و حکمت سے مملو ہے اور دوسرا حصہ عدم سکون کا نتیجہ۔

ہم اپنے مؤقر معاصر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اگر وہ متحدہ قومیت کے تصور سے خالی الذہن ہو کر اس خطبے کا مطالعہ فرمائیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مولانا صاحب کے خطبے کا پہلا حصہ بھی ویسا ہی عدم سکون کا نتیجہ ہے جیسا کہ دوسرا حصہ۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی قلب اور ایک ہی دماغ ہے فرق صرف آپکی نگاہ کا ہے۔

قارئین طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک عرصہ سے پیہم یہ اصرار چلا آتا تھا کہ سوشلزم کے متعلق ضرور کچھ لکھا جائے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا سیلاب بلا انگیز ہے جس میں ہماری قوم کے نوجوان کشاں کشاں بہے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ زیر نظر اشاعت میں "سوشلزم اور اسلام" کے عنوان پر ایک بسوط مضمون شائع ہو رہا ہے۔ چونکہ یہ نہایت ضروری تھا کہ سوشلزم کے مالۂ و ماعلیہ کے متعلق واضح طور پر لکھا جائے اور اس کے بعد یہ بتایا جائے کہ اسلام کی کسوٹی پر اس کی حقیقت کیا کھلتی ہے اس لیے اس مضمون کا طویل ہو جانا ناگزیر تھا۔ ہمیں تجربہ نے بتایا ہے کہ ایک ماہواری رسالے میں کسی مضمون کو بالاقساط شائع کرنا اس کی اہمیت کو کھو دینا اور اس کی افادی حیثیت کو ضائع کر دینا ہے اس لیے ہم ایسے اہم مضامین کو ایک ہی قسط میں شائع کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر چند اس سے

رسالہ کے تنوع میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن تنوع مقصود بالذات نہیں۔ اصلی مقصد تو کسی چیز کو بالوضاحت سامنے لانا ہے مضمون مذکورہ صدر کے مطالعہ کے بعد آپ یقیناً ہم سے متفق ہونگے کہ یہ اپنے مقصد میں نہایت کام یاب ہے۔ اسکی عام اشاعت کے پیش نظر ہم اسے ایک پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر رہے ہیں

پمفلٹونکی عام تقسیم کے لیے قارئین طلوع اسلام میں سے بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ صاحبِ استطاعت حضرات کچھ کاپیوں کی لاگت ادا کر دیا کریں جو ادارہ سے مستحق حلقہ میں مفت تقسیم کر دی جایا کریں۔ چنانچہ اس اسکیم پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور اس مہینے میں جو عطیات اس مد میں موصول ہوئے ہیں انہیں متعین کردہ پمفلٹوں کی لاگت پر صرف کیا جا رہا ہے اگر آپ بھی اس تجویز سے متفق ہوں تو اس میں تعاون فرمایئے غالباً آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ ادارہ طلوع اسلام کے شائع کردہ پمفلٹوں نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مسلمان نوجوانوں کے فکر و نظر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے

سابقہ اشاعت میں ہم نے دو پمفلٹوں کے اشتہار میں جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے اسم گرامی کے ساتھ " ہر دل عزیز متکلم اسلام مولانا " کے برمحل القابات کا اضافہ کر دیا تھا۔ جناب پرویز صاحب اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ " میں نہ ہر دلعزیز ہوں۔ نہ متکلم اسلام اور نہ مولانا۔ اس لیے براہِ کرم مجھے ان نوازش ہائے بے جا سے معاف ہی رکھیے کہ یہ چیزیں اکثر فریبِ نفس کا باعث ہو کر انسان کی ہلاکت کا موجب بن جاتی ہیں " ہم نے یہ القاب محض اس لیے لکھ دیئے تھے کہ ہم پرویز صاحب کو ان کا اہل سمجھتے تھے (اور سمجھتے ہیں) لیکن الامر فوق الادب۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

بڑی مشکل ہے! جن احباب کو تجدید خریداری کا کارڈ بطور یاد دہانی بھیجا جاتا ہے وہ اسکے جواب میں تساہل برتتے ہیں اور جب عدمِ جواب کی صورت میں مجبوراً رسالہ بند کر دیا جاتا ہے تو شکایت کی بھرمار شروع کر دیتے ہیں، ہم اپنے ان تغافل شعار کرم فرماؤں کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ یاد دہانی کے کارڈ پر ایک سطر لکھ دینا شکایت نامہ کے دو تین صفحات سے یقیناً زیادہ آسان بھی ہے اور زیادہ مفید بھی۔ ذرا ایک مرتبہ تجربہ کر کے تو دیکھیے۔

حقائق و عِبَر

مولانائے سندھی جب سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مُراجعت فرمائے ہند ہوئے ہیں ہم ان کی تقریروں اور تحریروں کا بامعانِ نظر مطالعہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ جس زمانہ میں اُن کی آمد آمد کی تیاری تھی اُن کی اصابتِ رائے۔ بلندیٔ فکر و نظر۔ تدبّر فی الامور۔ سیاست دانی اور قرآن فہمی کے متعلق عام چرچے ہو رہے تھے۔ لیکن ہندوستان میں تشریف لانے کے بعد مولانا صاحب نے وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے انھوں نے ہمارے دل پر کم از کم اُن کی بالغ نظری اور سیاست دانی کے متعلق کچھ اچھے نقوش نہیں چھوڑے۔ بایں ہمہ ہم انتظار میں تھے کہ مولانا صاحب یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد کہیں جامع انداز سے اپنے خیالات پیش کریں تو اُن سے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچا جائے۔ بارے الحمد کہ اس باب میں مولانا صاحب نے ہمیں زیادہ زحمتِ انتظار سے بچا لیا اور اجلاس جمعیتِ علمائے ہند (صوبۂ بنگال) کے خطبۂ صدارت نے آپ کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔ یہ خطبہ جب پریشانیٔ فکر و نظر کا آئینہ دار ہے اس سے قرآن کریم کی یہ حقیقتِ بالغہ واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ۔ (جو زیادہ عمر رسیدہ ہو جاتا ہے اُس کی طبعی حالت بالکل الٹی ہو جاتی ہے)۔

اس خطبہ کی تمہید میں مولانا صاحب فرماتے ہیں:-

"اب کہ مجھے وطن آنے کی اجازت ملی ہے آہستہ آہستہ میرے دماغ سے وحشت دور ہو رہی ہے۔" (مدینہ ۱۷ جون ۱۹۳۹ء)

عام حالات میں وطن کی محبت اور اُس کی یاد مستحسن جذبہ سہی۔ لیکن ایک مومن مجاہد جب اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے وطن چھوڑتا ہے تو وطن کی یاد میں اس قسم کے جذبات کبھی مستحقِ تبریک قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ ہجرت فی سبیل اللہ اور حرمِ پاک کی زندگی! اس پر تو ہندوستان جیسی غلام سرزمین کی لاکھوں آسائشیں قربان ہونی چاہئیں۔ پھر وحشت کیسی؟ مومن کا تو ایمان یہ ہے کہ

ہر ملک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خدائے ماست۔

مولانا صاحب کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی یہ ہجرت اور قیام حرم مقدس "عصمتِ بی بی از بیچارگی" تھی۔ بطیبِ خاطر نہ تھی۔

اسکے بعد مولانا صاحب نے جو سیاسی نصب العین ملک کے سامنے پیش کیا ہے اسے دیکھکر تو ہمیں مولانا صاحب کی فراستِ قرآنی کے فقدان اور سیاسیات ملی سے عدم واقفیت پر بے حد تعجب ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اگر ہمارا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اسوقت دنیا پر چھا گیا ہے اور روز بروز چھاتا چلا جا رہا ہے تو اُسے یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے۔ ہماری ہندوستانی تہذیب کا عہدِ قدیم جو ہندو تہذیب کہلاتا ہے اور عہدِ جدید جسے اسلامی تہذیب سمجھا جاتا ہے دونوں نئے پیچیدہ سوال یعنی آجکل کا یورپین اسکول مذہب سے قطعی نابلد ہے۔ اس کا مدار فقط سائنس اور فلسفہ پر ہے اس لئے ہمارے وطن میں اگر اس انقلاب کو سمجھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوئی تو سراسر نقصانات اور نقصان ہمارے حصے میں آئیگا۔"

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک صحیح اسلامی سیاست یہ ہے کہ ملک میں یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے یا تو مولانا صاحب کو اس کا علم نہیں کہ یورپین نیشنلزم کے اصول و مبانی کیا ہیں اور یا پھر معاف فرمائیے۔ وہ قرآنی نظریہ اجتماعیت سے قطعی نابلد ہیں۔ اس لئے کہ یہ دونوں اصول ایکدوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ یورپین نیشنلزم کی بنیاد مولانا حسین احمد صاحب کے الفاظ میں اس اصول پر ہے کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ یورپ میں افراد کے ایک قوم بننے کے لئے وجہ جامعیت جغرافیائی حدود یا نسلی امتیازات ہیں۔ برعکس اس کے اسلامی جماعت کے لئے وجہ جامعیت صرف **ایمان و تقویٰ** ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں قومیت پرستی ایک ایسی "کانِ نمک" ہے کہ اس میں جو کوئی بھی پہنچ جائے "نمک" بن جاتا ہے۔ افسوس کہ مولانا صاحب کی فراستِ قرآنی کے متعلق ہمارے اندازے کس قدر غلط ثابت ہوئے۔

پھر فرماتے ہیں:۔

"اس لئے میں سفارش کرتا ہوں کہ نیشنل کانگریس کے کرتے دھرتے یورپین نیشنلزم کو رواج دینا اپنا نصب العین بنائیں اور فقط اقتصادی ترقی کو آزادی کی بنیاد قرار دیں۔"

یعنی یورپین نیشنلزم اور اُس کی سوشلزم۔ یہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی نصب العین۔ اِنّا للّٰہ وَ اِنّا الیہ راجعون ! ۔ نہ کہیں خدا کا نام۔ نہ رسولؐ کا نہ تو انینِ الٰہیہ کا ذکر نہ خدا کی حکومت کا۔ نہ اپنی مرکزیت کا احساس نہ اجتماعیت کا۔ جغرافیائی حدود کی بنا پر قومیت اور روٹی کے سوال کا حل۔ یہ ہے مولانا صاحب کے نزدیک تحریک آزادی کا عُروۃ الوثقیٰ۔

سیاست کے متعلق تو آپ نے مولانا صاحب کی جنبد نگہیں ملاحظہ فرمالی۔ اب فلسفۂ اسلام کے متعلق بھی آپ کے ارشادات سن لیجئے۔ آپ کی تجویز یہ ہے کہ جمعیت علمائے ہند کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اُن میں سے ایک شعبہ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

" جمعیت العلماء کے دوسرے سکشن کو اسلامی فلاسفی کا محافظ ہونا چاہئے۔ یہ اسلامی فلاسفی دراصل وہی ہندو فلاسفی ہے جسے مُسلم صوفیائے کرام نے ہندوستان میں تکمیل کے درجہ تک پہنچایا ہے "

مولنٰا صاحب جامعہ ملّیہ میں اسی قسم کے اسلامی فلسفہ کا ایک مدرسہ کھولنا چاہتے ہیں جہاں کے فارغ التحصیل مُسلم نیشنلسٹ ہوں۔

" ہندو فلاسفروں سے متحد الخیال ہوکر یورپین انقلابِ معاشی میں ہندوستان کو بہت آگے لیجائینگے "

یعنی اسلام کا نہ کوئی اپنا فلسفۂ زندگی ہے نہ معاشی نظام فلسفہ میں ہندوؤں سے متحد الخیال ہونا چاہئے اور نظامِ معاشی کے لئے یورپ کی تقلید کرنی چاہئے۔ اِس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے آپ فرماتے ہیں

" جمعیت العلماء کا وہ سکشن جو حکمت و فلسفہ کے لئے خاص ہوگا میں اُس کے ہر ایک ممبر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر ہوجائے۔ (اور)

(ii) انڈین نیشنل کانگریس کو تمام سیاسیاتِ ہند کا مرکز بنا دیا جائے (لیکن یہ یاد رہے کہ)

(iii) مذہبی مراسم کو نیشنل تحریک کا جزو بنانا۔ خواہ کیسی نیک نیتی سے ہو مُلک کو تباہی کی نجات نہیں دے گا۔ "

اس کے بعد آپنے اس پروگرام کی وضاحت کی ہے جسے وہ تحریکِ انقلاب کی تمہید کے طور پر نمونۃً

سنا ھ میں شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ مثلاً

(۱) سندھی زبان (جو آجکل عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے) کو رومن رسم الخط میں لکھا جائے

(۲) مُسلمان گھٹنوں سے نیچے تک کی نیکر اور ہیٹ پہنیں اور ننگے سر نماز پڑھ لیا کریں ۔

(۳) نماز بوٹ سمیت پڑھ لی جایا کرے ۔

یہ ہے نمونہ اُن افکار عالیہ کا جنھیں اپنے دماغ میں لئے ہوئے مولانا صاحب ہندوستان میں ایک اِسلامی انقلاب پیدا کرنے ، اور کانگریس میں شاہ ولیؒ اللہ علیہ الرحمہ کے فلسفہ کو رائج کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں ۔ ہمیں مولانا صاحب کے اخلاص اور جوشِ عمل میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی ۔ اور اسی وجہ سے ہمارے دل میں اُن کی عزت بھی ہے لیکن جوشِ عمل سے ایک شخص ایک اچھا سپاہی بن سکتا ہے (بشرطیکہ اُس میں جذبۂ اطاعت بھی موجود ہو) سیاسی قیادت کے لئے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات کی ضرورت ہے ۔ ہمارے ہاں بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم ہر شخص کو اُس کے صحیح مقام پر نہیں رکھتے جس کی وجہ سے ہمیں بار بار ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ مولانا صاحب کو اپنی سیاسی بصیرت اور صحیح مقام کی شناخت میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اس میں اُن کے عقیدتمندوں کا وہ حلقہ زیادہ ذمہ دار ہے جس نے یہ سمجھکر کہ مولانا صاحب نے ہندوستان پہنچکر جس مقام کو اپنا مستقر بنا لیا وہ تمام سیاسیاتِ اسلامیہ کا قبلۂ مقصود بن جائیگا ، ان کی ذاتِ گرامی کو بیجا اہمیت دیدی ۔ اور اس بات کا اندازہ نہیں لگایا کہ اس سے آخر کار کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑیگا ۔ قوم کی انہی غلط بخشیوں کا نتیجہ ہے کہ ہندو جب ہمارے اتنے اتنے عظیم المرتبت اکابرِ ملت کی اس قسم کی پریشان خیالی دیکھتے ہیں تو اُن کے دل میں اپنے متعلق ایک قومی جذبۂ تفوق اور اسکے برعکس مُسلمانوں کو اپنے متعلق احساسِ مرعوبیت (Inferiority Complex,) پیدا ہو جاتا ہے ۔

مولانا صاحب نے بنارس میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمایندہ کو ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ

"ملک میں ایک جدید تعمیری پروگرام کا ہونا ضروری ہے جو گاندھی جی کے زیرِ قیادت گورنمنٹ کے ساتھ تعاون پر مبنی ہو ۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۸ ۳۹)

ایکطرف مولانا صاحب کے دعاویِ انقلاب کو مدِنظر رکھئے اور دوسری طرف اس تعمیری پروگرام کو اور اس کے بعد مولانا صاحب کی سیاسی بصیرت کے متعلق خود ہی فیصلہ فرما لیجئے۔

الحمدللہ علیٰ ذالک کہ ہمیں قرآن کریم کی تعلیم نے پہلے ہی شخصیت پرستی سے دور رکھا ہے۔ ورنہ ایسے وقت میں انسان جس مشکل میں پھنس جاتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ہماری رائے میں تو مولانا صاحب (اور خود ملتِ اسلامیہ) کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ کسی دینیاتی درسگاہ میں فقہ و حدیث کے درس میں مشغول رہیں

ہر کسے را بہر کارے ساختند

۲۔ خاکساران

ہم نے آجتک تحریک خاکساران کے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ جو تحریک خود اپنے عمل کی اپنی دلیل آپ بن رہی ہو اس کے متعلق کچھ لکھنے کی کیا حاجت! لیکن اب بعض ایسے واقعات ہمارے سامنے آ رہے ہیں جن کے پیش نظر ہم سمجھتے ہیں کہ

اگر خاموش بنشینم گناہ است

۲۶ مئی کے اخبار الاصلاح میں حسب ذیل واقعہ درج ہے:-

"ڈاکٹر خان صاحب وزیرِ اعظم سرحد کی آمد پر سرخپوشوں کا ایک دستہ بھی (ہری پور ہزارہ میں) آیا ہوا ہے۔ پرسوں رات سرخپوش روٹی کھانے کے لئے عزیز محمد ہوٹل والے کی دکان پر آئے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں معلوم ہوا کہ مالک ہوٹل خاکسار ہے۔ تو ایک کانگریسی ممبر اسمبلی تمام سرخپوشوں کو باہر نکال کر لے گیا اور دوسرے ہوٹل میں جا بیٹھے۔ ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب ایک دوسرے خاکسار نے اس دکاندار کو فوجی سلام کیا۔ وہاں سے اٹھ کر جب وہ بازار آئے تو ایک ہندو سے پانی مانگا۔ جب وہ پانی دینے لگا تو عزیز محمد نے جس کی دکان پر پہلے اٹھ کر چلے گئے تھے کہا کہ یہ بھی خاکسار ہے۔ تو جھجک کر پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرے ساتھی نے کہا نہیں یہ تو ہندو ہے اور ہمارا بھائی ہے۔ گلاس لے کر پانی پی لیا۔"

سن لیا آپ نے! ہندو ان کا اپنا بھائی ہے اور خاکسار مسلمان اچھوت ہے۔ پھر ۱۳ جون کے

نیشنل کال میں ہے کہ موضع اکوڑہ (پشاور) کے ایک مولوی صاحب نے خاکساروں پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔
اور انھیں فریضۂ نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد میں آنے سے روک دیا جس کی وجہ سے وہاں باہمی فساد ہو گیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ خاکسار کون ہیں جن کے ہاتھ کا کھانا حرام سمجھا جاتا ہے (اور اُن کے مقابلہ میں
ایک ہندو کے ہاتھ سے لے کر پانی پی لیا جاتا ہے) اور جنھیں نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آنے کی اجازت نہیں
دی جاتی! یہ وہ ہیں جو اللہ پر۔ اُس کے رسولوں پر۔ اُس کی کتابوں پر۔ ملائکہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں
نبی اکرم کو خاتم النبیین اور کتاب اللہ کو خدا کا آخری اور مکمل پیغام سمجھتے ہیں۔ خدمتِ خلق جن کا شیوہ اور سپاہیانہ زندگی
جن کا مسلک ہے۔ جرم اُن کا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض قرار
دیتے ہیں کہ قرآن کریم انھیں ایسا سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ عسکری نظام کو مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے لئے لاینفک خیال
کرتے ہیں کہ نبی اکرم کا اُسوۂ حسنہ انھیں ایسا خیال کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اجتماعیت اور اطاعتِ امیر کے
جذبۂ صادقہ کو روحِ اسلامی سمجھتے ہیں کہ اُن کے نزدیک آثارِ صحابہ ایسا سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں "خدا پر توکّل۔ ہر
ایک سے عمدہ سلوک۔ آپس میں محبّت۔ سادگیِ لباس۔ ماں باپ کی فرمانبرداری۔ عورتوں سے شفقت۔ کامل دیانتداری
فتح پر مکمل یقین۔ زمین پر قبضہ کی خواہش۔ خدا کی نعمتوں کا انتظار۔ اللہ پر پورا ایمان۔ روزِ قیامت پر پورا یقین"
اپنا مسلک قرار دیتے ہیں (مضمون علامہ مشرقی۔ الاصلاح ۹ جون ۱۹۳۹ء)۔ فرقہ پرستی۔ گروہ سازی۔
جماعت بندی۔ تشتّت۔ افتراق۔ لامرکزیت اُن کے نزدیک گناہِ عظیم اور اتحاد و یگانگت اور وحدت فی الخیال
والعمل صحیح اسلامی تعلیم ہے۔ عزّت و وقار۔ سرفرازی اور سربلندی آزادی اور حکومت کی زندگی اُن کے خیال میں
صحیح اسلامی زندگی اور ذلّت و رسوائی۔ مفلسی اور غریبی بے کسی اور بے بسی۔ بھوک اور خوف کی زندگی غیر اسلامی
زندگی ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ مولوی صاحبان کے نزدیک یہ لوگ گردن زدنی اور سوختنی کیوں ہیں۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اس تحریک میں ہنوز بعض خامیاں بھی ہیں اور اصلاح کی گنجائش بھی۔ لیکن اِس تحریک کا
بانی نہ (معاذ اللہ) رسول ہے نہ مدعیِ معصومیت۔ وہ ایک انسان ہے جس سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں اور سہو اور
فروگزاشتیں بھی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو نصب العین اِس تحریک کے سامنے ہے اور اس کے حصول کے لئے جو ذریعہ
اختیار کیا گیا ہے کیا وہ واقعی ایسا ہے کہ اس تحریک میں شامل ہونے والوں پر کفر کے فتوے لگا کر بزعمِ خویش

انھیں جہنم رسید کردیا جائے۔ فیھا آیاتٌ لقومٍ یعقلون۔

ہم علامہ مشرقی اور اُن کے جانباز سپاہیوں کی خدمت میں گذارش کرینگے کہ ان مخالفتوں کے ہجوم میں اُن کا مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ

حدی را تیز تری خواں چو محمل را گراں بینی

البتہ اتنا ضرور ہے کہ انھیں سرگرمیٔ عمل کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح نفوس کی طرف سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے ہم علامہ مشرقی کی خدمت میں باادب درخواست کرینگے کہ وہ خاکساروں کو پابندیٔ صوم وصلوٰۃ و دیگر احکام خداوندی کی زیادہ تاکید کریں اور اپنی تنظیم جیوش میں انھی راستوں سے پختگی پیدا کریں۔ اس کے بعد وہ دیکھینگے کہ اس آئینی جدوجہد کے بعد جس میں آج درد ملت رکھنے والے مسلمان ساعی ہیں اور جس کی اس وقت ضرورت بھی تم ہے ہندوستان کا مستقبل انشاء اللہ انھی کے ہاتھ میں ہوگا۔ باقی رہے مولوی صاحبان۔ سو وہ قابلِ عفو ہیں کہ

قوم کیا چیز ہے۔ قوموں کی امامت کیا ہے   اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

خاکساروں کے ضمن میں ہمیں ایک اور بات بھی یاد آگئی۔ جس کا تذکرہ ہمارے لئے ازحد جگر خراش ہے۔ ہمارے دل میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا بیحد احترام ہے لیکن ہمیں یہ دیکھکر رنج ہوا کہ انھوں نے مسٹر جناح کو لکھا ہے کہ

"مسلم لیگ خاکساروں کی مخالفت کا اعلان کردے۔ کیونکہ یہ فرقہ مذہبی حیثیت سے اسلام سے خارج ہے۔ اگر آپ نے ایسا اقدام نہ کیا تو میں مجبور ہونگا کہ مسلم لیگ کی مخالفت شروع کردوں۔"   (مدینہ ۲۹/۶/۱۷)

اگر یہ خبر صحیح ہے تو نہایت قابلِ تاسف ہے۔ مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ "خاکسار" مذہبی حیثیت سے اسلام سے خارج ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ اگر خاکسار "مذہبی حیثیت سے" اسلام سے خارج ہیں تو وہ کون سی حیثیت ہے جس کی رو سے وہ اسلام کے دائرے کے اندر ہیں! پھر یہ امر موجب حیرت ہے کہ اگر خاکساروں کی کوئی روش مولانا صاحب کے نزدیک غلط ہے تو لیگ پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ سب سے زیادہ تعجب مولانا کے اس ارشاد پر

ہے کہ اگر لیگ نے خاکساروں کی مخالفت نہ کی تو وہ لیگ کی مخالفت شروع کر دینگے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ کسی جماعت کی مخالفت یا موافقت کسی اُصول کے ماتحت ہونی چاہئے۔ نہ یہ کہ جب تک کوئی جماعت آپکے حسب منشاء کام کرے آپ اُس کی موافقت کریں اور جونہی کوئی بات آپ کی رائے کے خلاف ہو آپ اسکی مخالفت شروع کر دیں۔ اِس طرح تو دنیا میں کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر لیگ خاکساروں کی مخالفت نہ کریگی تو وہ اس کی مخالفت شروع کر دینگے۔ کل کو کوئی دوسرے صاحب کہدینگے کہ اگر لیگ خاکساروں کی مخالفت کریگی تو میں لیگ کی مخالفت شروع کر دونگا۔ کہئے! لیگ کس کی تائید کرے اور کس کی تردید۔ جماعتی زندگی کی صحیح روش تو یہ ہے کہ اہل الرائے حضرات کی مجلسِ شوریٰ ہو۔ اور ہر شخص کو حق حاصل ہو کہ اِس مجلس منتخبہ کے سامنے اپنے خیالات اور آراء پیش کر دے۔ پھر جو فیصلہ وہاں سے صادر ہو ہر شخص پر اُس کی اطاعت واجب ہو جائے۔ قرنِ اولیٰ کی تاریخ میں آپ کو اس امر کی سینکڑوں مثالیں ملینگی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب فتنۂ ارتداد کے استیصال کا اِرادہ فرمایا ہے تو صحابہ کبارؓ میں سے اکثر کی رائے اِس مُہم کے خلاف تھی۔ لیکن جب فیصلہ ہو گیا کہ یہ مُہم سر کی جائے گی تو وہ تمام حضراتؓ جن کی رائے اس کے خلاف تھی اِس لشکر میں شامل تھے۔ اگر وہ بھی یہی کہدیتے کہ اگر ہماری رائے کے خلاف فیصلہ ہوا تو ہم جماعت کی مخالفت شروع کر دینگے تو نتیجہ ظاہر ہے! ہم نے یہ مثال صحیح جماعتی زندگی کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے بیان کی ہے۔ خدا کرے کہ یہ خبر غلط ہو۔ اور مولانا صاحب نے ایسا نہ فرمایا ہو۔ کہ یہ طرزِ عمل تو کچھ اُن کے شایانِ شان نظر نہیں آتا۔

۳۔ شکستِ پندار کانگریس کے اجلاس تری پوری میں ہزارہا بت پرستوں نے سینکڑوں خدا پرستوں کی موجودگی میں ایک انسان کے متعلق منزہ عن الخطاء ہونے کا ریزولیشن پاس کر کے بزعم خویش اُسے خدائی صفات سے متصف کر دیا۔ لیکن فطرت کی دار و گیر ملاحظہ فرمائیے کہ آئے دن اِس مصنوعی خدا سے اُسکی لغزشوں اور خطاؤں کا اعتراف کراتی رہتی ہے تاکہ غلط بین عقیدتمندوں پر واضح کر دے کہ کوئی شخص تمھارے بنانے سے منزہ عن الخطاء نہیں بن سکتا۔ ۱۰ رجون کے ہریجن میں گاندھی جی فرماتے ہیں:۔

"جب کبھی مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میں نے فلاں معاملہ میں سخت غلطی (Blunder)

کی ہے۔ تو میں نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لئے۔"

اور سُنئے ۔ گاندھی جی نے ایک جگہ یہ کہدیا کہ "یہودی چاہتے ہیں کہ امریکہ اور انگلستان ان کی خاطر جرمنی سے جنگ چھیڑ دے" اس پر ایک شخص نے چیلنج دیدیا کہ وہ یہودیوں کے خلاف اس الزام کی تائید میں سند پیش کریں۔ غالباً گاندھی جی کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ کسی نے یوں کھلے بندوں انھیں چیلنج دیدیا ہو کہ وہ بلا سند جو جی میں آتا ہے کہدیتے ہیں۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ کہیں سے کوئی سند ہاتھ آجائے۔ لیکن سند ہو تو ہاتھ آئے مسٹر مہادیو ڈیسائی اور مسٹر پیارے لال کو اس کارِ خاص پر متعین کیا گیا کہ یہی کہیں کہ سند ڈھونڈھ نکالیں لیکن لاحاصل۔ سند کے لئے تقاضے بڑھتے گئے۔ یہودی اخباروں نے بھی مطالبہ شروع کردیا۔ گاندھی جی بہت سٹ پٹائے۔ لیکن وہ بھی پیچھا چھوڑنے والی اسامیاں نہ تھیں۔ بالآخر ہی منزہ عن الخطاء کو کہنا پڑا کہ

"چونکہ مجھے اپنے بیان کی تائید میں کوئی سند نہیں ملی اس لئے میں اسے بلا مشروط واپس لیتا ہوں" (ہریجن ——— دسمبر ۳۸ء)

عذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اگر اتنے پائے کا کوئی مسلمان لیڈر ایسی غیر ذمہ دار حرکت کر دیتا تو نہ معلوم ہمارے نیشنلسٹ حضرات کیا کچھ کہتے اور کرتے لیکن گاندھی جی ہیں کہ اب بھی ویسے ہی منزہ عن الخطاء ہیں۔ سچ ہے جب کسی کی پرستش شروع ہو جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

۴۔ **شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا** راجکوٹ کے معاملہ میں بالخصوص اور سیاستِ ہند میں بالعموم گاندھی جی کی "اندرونی روشنی" کیا کچھ کر رہی ہے اس کے متعلق کسی مخالف سے نہیں بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے سُنئے :-

" جو کچھ اس ضمن میں ہوا ہے۔ میں اس کا فلسفہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اور یہ صرف ایک راجکوٹ کے متعلق ہی نہیں۔ بلکہ اس کا اطلاق تمام سیاستِ ہند پر یکساں ہوتا ہے۔ سوال

ہمارے سامنے یہ ہے کہ کیا ہم (گاندھی جی کے) اس قسم کے فیصلوں کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرتے چلے جائیں جو بعض اوقات خود ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں - اور اُن کا کوئی معقول ربط و ضبط بھی سامنے نہیں ہوتا ایسی باتوں کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرتے چلے جانا جنھیں ایک شخص نہ کماحقہ سمجھ سکے اور نہ ہی انھیں بطیبِ خاطر منظور کر سکے آہستہ آہستہ انسانی عقل و دانش کو مفلوج کر دیتا ہے۔ ایسی اندھی تقلید کی بنا پر تو کوئی بڑی تحریک کبھی نہیں چل سکتی چہ جائیکہ جمہوری تحریک - " (سول اینڈ ملٹری گزٹ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۰ء)

یہی بات اگر مسٹر جناح کہہ دیتے تو آپ دیکھتے کس قدر ہنگامہ برپا کر دیا جاتا — بہرحال دنیا میں متعصب دانِ باطل" کی خدائی زیادہ دن چلی ہے نہ چل سکتی ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ پنڈت نہرو کو تو اتنی جرأت ہو گئی کہ جو کچھ دل میں تھا زبان پہ لے آئیں لیکن نہ ہوئی تو ہمارے ان علمائے عظام کو جو ہمیشہ اعلائے کلمۃ الحق کے بلند آہنگ دعاوی سے اپنی بیباکانہ حریت نوازی کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں — اور نہ صرف یہ کہ انھیں اس کی جرأت نہ ہوئی بلکہ وہ ابھی تک کہتے چلے جاتے ہیں کہ کانگریس ایک جمہوری ادارہ ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس میں غیر مشروط طور پہ جوق در جوق داخل ہو جائیں۔ اور گاندھی جی کی قیادت میں انگریز کے تعاون سے انگریز کو ملک سے نکال دیں !

گاندھی جی کی قیادت "اور" جمہوریت ! — انگریز سے تعاون "اور" انگریز کا استیصال !!

چند دھوکے ہیں ان کے لئے جن کی حالت قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہو گئی ہو کہ

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۲۲/۴۶

(اُن کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے کے اندر ہیں۔

۵- سادگی و پُرکاری کون نہیں جانتا کہ گاندھی جی کی آج کانگریس میں کیا پوزیشن ہے۔ وہ ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر ہیں۔ جن کے اشاروں پہ کانگریس کی کٹھ پتلیاں ناچ رہی ہیں۔ چنانچہ مسٹر کرپلانی

ے ملاحظہ ہو حقائق و عبر صفحہ ۱۲ میاں مولانا سندھی بحوالہ سول اینڈ ملٹری گزٹ

جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس ایک بیان کے دوران میں فرماتے ہیں :-

" اگر مسٹر بوس گاندھی جی کو اپنا طرفدار بنالیتے تو کوئی شخص ان کے خلاف نہ جاتا۔ اور اگر آج بھی مسٹر بوس گاندھی جی کو اپنا طرفدار بنالیں تو بابو راجندر پرشاد فوراً صدارت سے استعفٰی دیدینگے۔ اور مسٹر بوس صدر بن جائینگے۔" (الواحد - ۶/۳۹ ۲)

یہ تو ہے کانگریس میں گاندھی جی کی پوزیشن۔ لیکن اُن کی دور رُخی کی حالت یہ ہے کہ پچھلے دنوں بمبئی کے پارسیوں نے اُن سے کہا کہ وہ حکومتِ بمبئی پر اپنا اثر ڈالیں کہ وہ امتناعِ شراب کے مسئلہ میں ایسی سخت روش اختیار نہ کرے۔ چاہئے یہ تھا کہ گاندھی جی کہدیتے کہ نہیں! وہ تو سب کچھ ان کی مرضی کے ماتحت ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ انھیں اس اقدام سے روکنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ ایسی صاف گوئی سے کیوں کام لیں۔ وہ تو "مہاتما" ٹھہرے۔ اس لئے انھوں نے فرمایا کہ

اِن لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ کانگریسی حکومت کے اربابِ حل وعقد میں سے اکثر میرے رفقائے کار ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اُن کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ اور اگر میرا اُن پر کوئی اثر ہے تو اس کا راز بھی یہی ہے۔" (ہریجن ۳/۳۹ ۳)

اللہ اکبر! کس قدر درست فرمایا آپ نے کہ میں نے کبھی کانگریسیوں کے معاملات میں دخل نہیں دیا!

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

۲۔ افسوسناک غلطی امتناعِ شراب کا ذکر آتے ہی ہمیں خود بخود سر رضا علی صاحب یاد آ گئے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہندوؤں کے مذہب میں شراب حرام نہیں۔ بلکہ پوجا پاٹ اور قربانی کی بعض رسوم میں تو اس کے استعمال کے متعلق بھی سُنا جاتا ہے۔ بایں ہمہ ہندوؤں نے اِس اُم الخبائث کی اخلاقی خرابیوں کے پیشِ نظر اس کے متعلق امتناعی احکامات نافذ کر دیئے۔ اور از روئے قانون اس کے استعمال کو جُرم قرار دیدیا۔ لیکن اس کے برعکس سر رضا علی صاحب ہیں کہ کانگریسی حکومتوں کی اس حماقت پر نکتہ چین

ہورہے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اس اقدام سے ان حکومتوں کی آمدنی میں اتنا خسارہ پڑ جائے گا جس کا پورا کرنا مشکل ہوگا۔ ممکن ہے اقتصادی نقطۂ نظر سے سر رضا علی صاحب کا یہ اندیشہ درست ہو۔ لیکن ایک ایسے مذہب کے نام لیوا کی حیثیت سے جس میں شراب کا استعمال عملِ الشیطان سے ہو۔ اس کی خرید و فروخت ناجائز ہو۔ اس کا کاروبار ممنوع ہو۔ اس کی آمدنی طیب نہ قرار پائے۔ انھیں سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ سر رضا علی صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور اس کے بعد انھیں اتنی توفیق عطا ہو جائے کہ وہ اس کا اعتراف بھی کر لیں کہ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن اس کا اعتراف عزم الامور سے ہے۔

واردھا اسکیم خان عبدالغفار خان صاحب فرماتے ہیں :۔

"واردھا اسکیم میں اسلامی نقطۂ خیال سے کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں۔" (انقلاب ۹ مئی ۳۹ء)

کیا فرماتے ہیں حضرات اربابِ جمعیت علمائے ہند جنھوں نے اپنے سالانہ اجلاس میں واضح الفاظ میں بتایا تھا کہ اس اسکیم میں یہ یہ باتیں اسلامی نقطۂ خیال سے قابلِ اعتراض ہیں۔ لیکن یہ حضرات لب کشائی کیوں کرنے لگے۔ اس لئے کہ خان صاحب موصوف تو ان کی اپنی پارٹی کے آدمی ٹھہرے اور مخالفت و موافقت اب ایّامِ جاہلیت کی طرح پارٹی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اصول کے اعتبار سے تھوڑی ہوتی ہے!

ہاں! اور آپ کو یاد ہے کہ جمعیت کے سالانہ اجلاس (دہلی) میں ان حضرات نے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس نے اس اسکیم میں ان کی پیش کردہ تجاویز کے مطابق ترمیم نہ کر دی تو وہ سول نافرمانی شروع کر دیں گے۔ اسکیم جوں کی توں نافذ العمل ہوتی جا رہی ہے۔ کانگریسی حکومتوں کے زیرِ انتظام اس کے لئے ٹریننگ سکول کھل گئے ہیں۔ اس کی عام ترویج بھی شروع ہو گئی ہے۔ خود دہلی میں جامعہ ملیہ میں اس کے لئے استادوں کا مدرسہ قائم ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان منتظر ہیں کہ دیکھیں اربابِ جمعیت کب سول نافرمانی شروع کرتے ہیں۔ امتحاں ہے ترے ایثار کا، خود داری کا

رواداری یا بے حسی؟ جمعیت علماء کے اجلاس مراد آباد کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر مولوی عبدالسلام صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:-

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مساجد کے سامنے ہندوؤں کا باجہ بجانا مسلمانوں کے مذہبی حقوق میں کس طرح دخل اندازی کا موجب ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ اگر مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کی خاطر گائے کی قربانی بند کر دیں تو ان کا یہ طرزِ عمل اسلام کو کیا نقصان پہنچائے گا۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۸ ۵/۳۹)

جہاں تک باجہ کا تعلق ہے ہم مولانا صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ ذرا گاندھی جی سے اتنا تو دریافت فرما دیں کہ پچھلے دنوں جب راجکوٹ میں کچھ لوگوں نے اُن کی پرارتھنا کے وقت شور مچایا تھا تو گاندھی جی اس قدر نعل بر آتش کیوں ہوئے تھے؟ انھوں نے اس واقعہ کے متعلق لکھا تھا کہ ان لوگوں کا شور ان کے کلیجہ میں تیر کی طرح لگتا تھا۔ اس واقعہ پر انھوں نے کہرام مچا رکھا تھا اور تمام قومیت پرست حلقوں کی طرف سے ہنگامہ برپا کرنے والوں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا تھا۔ اُن کی آواز گاندھی جی کی پرارتھنا میں دخل اندازی کا موجب بن سکتی ہے لیکن ہمارے ان وسیع الظرف مولانا صاحب کے نزدیک باجہ کا شور مسلمانوں کی نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا! نماز یا دیگر اوقات میں تلاوتِ قرآن کریم کے موقع پر شور مچانا تو وہ فعل ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ [۴۱/۲۶]

اور کفار کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ (تو خود) سنو (اور نہ دوسروں کو سننے دو۔ اس کی تلاوت کے وقت) شور مچایا کرو۔ تاکہ تم غالب ہو جاؤ۔

باقی رہا یہ سوال کہ ہندوؤں کے جذبات کی خاطر ذبیحۂ گاؤ کو کیوں نہ ترک کر دیا جائے۔ سو اس کے متعلق ہمیں وہ واقعہ یاد آگیا جب کفارِ مکہ کا وفد ابوطالب کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ تمھارا بھتیجہ

ہمارے بتوں کی توہین کرتا ہے۔ ہمارے آباء واجداد کو گمراہ کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے تو ابو طالب نے آپ سے کہا کہ جانِ پدر! حالت نازک ہو چکی ہے۔ قریش آپ زیادہ تحمل نہیں کرینگے۔ ان کے جذبات کو ٹھیس نہ لگاؤ۔ تو اس کے جواب میں حضورؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دیدیں۔ تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہیں آؤنگا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہر جذبہ قابلِ احترام نہیں ہوتا۔ اور اس حقیقت سے انکار بھی کون کرسکتا ہے؟

کہہ دیا جا سکتا ہے کہ ذبیحۂ گاؤ کوئی فرض تھوڑا ہے محض ایک اجازت ہے۔ جسے ہم ہر وقت چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ درست ہے۔ لیکن ہندو جس طریق سے مسلمانوں کی اس اجازت کو سلب کرنا چاہتے ہیں اس کے پیشِ نظر اس کا ترک کر دینا ان کے جذبات کا احترام نہیں۔ اپنی حیاتِ ملّی کی خودکشی ہے۔ ہندوؤں سے کہیئے کہ وہ مسلمانوں سے درخواست کریں کہ وہ ان کے جذبات کی خاطر احساناً اس سے احتراز کریں۔ ویسے اُن کو ہر وقت اس کا حق حاصل ہوگا۔ تو پھر دیکھئے کہ مسلمان اپنی روایتی کشادہ ظرفی کا کس طرح ثبوت دیتا ہے۔ لیکن ہندوؤں کی قوت سے دبنے کا نام ان کے جذبات کا احترام قرار دیدینا فریبِ نفس سے کم نہیں۔ رواداری اور بے حمیتی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

پھر حیرت ہے کہ ان حضرات کو ہندوؤں کے جذبات کا تو اتنا احترام ہے لیکن خود مسلمانوں کے جذبات کا کوئی خیال نہیں۔ ورنہ یہ حضرات اپنے رفقائے کار ہندوؤں سے کیوں نہ کہیں کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مساجد کے سامنے باجہ بجانے سے احتراز کریں۔ یہ عجیب مشورہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے جذبات کی خاطر اپنے ایک جائز حق سے بھی دست بردار ہو جائیں اور اسکے بعد ہندو مساجد کے سامنے باجہ بجائیں تو اس پر بھی مسلمان برا نہ منائیں۔ مرعوبیت کی کوئی حد ہونی چاہیئے ــــ باقی رہا جذبات کے احترام کا اصولی مسئلہ۔ سو مولانا صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام تو اس انقلاب کا نام ہے جو ایک ایک قدم پر دنیا کے ہر غیر خدائی اصول اور نظام سے ٹکرائیگا۔ پھر آپ لوگوں کے کس کس جذبہ کے احترام کی تلقین فرماتے رہیئنگے! حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام نام ہے چند فقہی مسائل کا۔ اور بس!! سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست۔

سامانِ عشق

(اسد ملتانی)

میں نے کہا کہ دیکھ مسلمان فاقہ مست! — رزمِ حیات میں کہیں کھائے نہ تو شکست

میدانِ کارزار میں خالی ہیں تیرے ہاتھ — لیکن ترے حریف ہیں تیغ و سناں بدست

ساماں نہیں تو قوّتِ بازو بھی ہیچ ہے — ایماں بھی ضعیف ہے اور حوصلہ بھی پست

ڈر ہے کہیں یہ بے سر و سامانیاں تری — باطل کو کر دکھائیں نہ حق پر بھی چیرہ دست

سُن کر دیا جواب کہ یہ سب بجا سہی — لیکن کچھ اور ہے سر و سامانِ حق پرست

دل میں اگر ہو جذبۂ بے اختیارِ شوق — ہوتا ہے خود بخود سر و ساماں کا بند و بست

کیا خُوب ہے اسد ترے ہمنام کا یہ شعر — کرتا ہے تازہ ولولۂ وعدۂ الست

"بے دستگہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل
شوریست در سرم کہ بہ ساماں برابر است"

رباعی

تفسیرِ قرآں میں سنا دی اپنی
اور یاد بھی اس طرح دلا دی اپنی
میں نے کہا آنکھیں بھی ترستی ہیں مری
تصویر[1] محمدؐ میں دکھا دی اپنی

اخگرؔ مرادآبادی

[1] بایں اعتبار کہ خلقِ محمدی - تا بحدِ امکانِ انسانی - صفاتِ خداوندی کا آئینہ دار تھا - اور حضور کا اسوۂ حسنہ احکامِ قرآنی کی عملی تفسیر
(طلوعِ اسلام)

سوشلزم اور اسلام

قرآن کریم نے ایمان و اعمال صالحہ کا گراں بہا حصل اور درخشندہ نتیجہ یہ قرار دیا ہے کہ انعامات اُخروی کے علاوہ مسلمانوں کو اس دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہوتی ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا ... (الانفال)

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔

وہ جیتے ہیں تو خدا کی منتخبہ جماعت کی طرح سرفرازی و سربلندی کی تابناک زندگی لئے ہوئے اور مرتے ہیں تو حکومت الہیہ کے جانباز سرفروشوں کی طرح ممتاز حیثیت سے۔ یہی ان کی امتیازی زندگی۔ یہی فرقانی شان ہے جسے قرآن کریم نے ایک شمعِ نورانی۔ ایک سرچ لائٹ سے تعبیر کیا ہے جس کی جگمگاتی روشنی میں وہ ظلمت کدۂ عالم کے تاریک ترین گوشوں میں بلاخوف وحزن چلتے پھرتے ہیں اور ہر راستہ کو مطلعِ انوار بنا دیتے ہیں۔ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ ۔ لیکن ان کی یہی امتیازی زندگی۔ یہی ممتاز حیثیت ہے جو ہر غیر مسلم کی نگاہ میں خارِ چشم بن کر کھٹکتی ہے وہ اسے دیکھتے ہیں تو بغض وعناد۔ حسد و تنگ نظری کے جانگسل ابخرات اُن کے بھپچے ہوئے جہنم زار سینہ سے اُٹھتے ہیں اور ان کے قلب و دماغ پر دھوئیں کے سیاہ بادل بن کر چھا جاتے ہیں۔ وہ اس غم و غصہ کی آگ میں جھلتے ہیں اور مثلِ مارِ سیاہ۔ برخود پیچیدہ۔ جوشِ غضب میں اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ۔ اور چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اللہ کی نورانی شمع کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔

اسلام دنیا میں ہر طاغوتی قوت کے خلاف اعلان جنگ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر طاغوتی قوت ہمیشہ اس فکر میں رہتی ہے کہ مسلمانوں کی اس امتیازی زندگی کو مٹا کر انہیں اپنا جیسا کرلے

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً ۔ ۴/۸۹

وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح سے خود کفر کرتے ہیں اسی طرح تم بھی کفر کرنے لگ جاؤ تاکہ دونوں برابر ہو جاؤ۔

یہ طاغوتی قوتیں کہیں تو تلوار کی جھنکار اور تیروں کی بوچھاڑ میں چڑھتے ہوئے جھکڑوں۔ اٹھتی ہوئی آندھیوں، کڑکتی ہوئی بجلیوں۔ گرجتے ہوئے بادلوں۔ بڑھتے ہوئے سیلابوں۔ کف بردھاں طوفانوں کی طرح بپھرتی۔ اُمنڈتی میدان کارزار میں اعلان جنگ کرتی سامنے آتی ہیں۔ لیکن کہیں گربہ مسکین کی طرح نرم و نازک پنجوں میں فولادی نشتر چھپائے۔ اپنے خبث باطن پر ہمدردی نوع انسانی کی منافقت کا رنگین نقاب ڈالے۔ آنسوؤں سے تر آستینوں میں دشنۂ تیز لئے۔ بساط سیاست پر اس معصومانہ انداز سے فردکش ہوتی ہیں کہ بڑی بڑی تیز بین نگاہیں بھی دھوکہ کھا جائیں اور انہیں پیغامبران صبر و وفا سمجھ کر نہایت کشادہ ظرفی اور خندہ پیشانی سے گلے لگا لیں۔ اور جب تک چھپے ہوئے فولادی پنجے شیر افضل خاں کی طرح سینے سے پار ہی نہ ہو جائیں۔ ان کے اخلاص و محبت میں شُبہ نہ ہونے پائے۔ پہلی قسم کے ہجوم مخالفت سے مسلمان آسانی سے عہدہ برا ہوتا رہا لیکن اس دوسری قسم کی شاطرانہ چالوں میں یہ عام طور پر مات کھا گیا۔ بدبختی سے آج ہندوستان کے مسلمانوں کو گئو سالہ پرست سامریوں کی اسی قسم کی ہلاکت آفرینیوں سے سابقہ پڑا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے مدعیان عقل و دانش مسمریزم کے "معمول" کی طرح "عامل" کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی کے کانوں سے سُنتے ہیں۔ اسی کے دل سے سمجھتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ چاہتا ہے۔ وہی کچھ زبان سے نکالتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نہ وہ امتیازی زندگی باقی ہے۔ نہ وہ فرقانی شان۔ لیکن غیر مسلموں کی ضد اور کد اور بغض و عناد کے لیئے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کی جُدا گانہ ہستی خدا کے اس نور مبین کی یاد تازہ کرتی ہے۔

مسلمانوں کی اس امتیازی زندگی کا راز ان کی الگ جُداگانہ جماعتی زندگی میں ہے۔ اُنکی علیحدہ ملّی ہستی میں ہے۔ ان کے غیر مخلوط قومی تشخص میں ہے۔ یہ مٹا تو ان کی امتیازی زندگی بھی مٹی اور وہ مٹی تو پھر یہ دنیا میں بالکل دوسروں کی طرح ہو گئے۔ اور یہی غیر مسلموں کی دلی آرزو ہے۔

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی جُداگانہ ملّی ہستی کو مٹانے کے لیے آج برادران وطن چاروں طرف سے یورش کر کے اُمنڈ آئے ہیں۔ جس طرح میدان جنگ میں فوج کے مختلف دستے ہوتے ہیں اور تقسیم عمل کے لحاظ سے ان کے فرائض میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن مقصد زیر نظر سب کا ایک ہوتا ہے۔ اسی طرح آج کے میدان سیاست میں ہندوؤں کی جماعتیں مختلف ہیں۔ ان کے طریق کار جُداگانہ ہیں۔ لیکن نصب العین سب کا ایک ہے۔ اور وہ نصب العین ہے مسلمانوں کی جُداگانہ ہستی کا استہلاک۔

اس فوج کا میمنہ Right wing وہ ہے جسے گاندھی جی کا گروپ کہا جاتا ہے۔ اور میسرہ Left wing وہ جسے نوجوانوں کی جماعت قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے طریق کار مختلف ہیں۔ لیکن محاذ مشترک ہے۔ میمنہ کے پاس اپنے حربے ہیں اور میسرہ کے پاس اپنے ہتھیار۔ میمنہ کی طرف سے کبھی واردھا اسکیم کی کمند پھینکی جاتی ہے جس میں مقصد پیش نظر یہ رکھا گیا ہے کہ بچوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ دنیا کے تمام مذاہب یکساں طور پر برسرِ حق ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ کوئی برتری نہیں۔ لہٰذا وہ تفریق جو بنا بر مذاہب قائم کی جاتی ہے انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ غیر فطری ہے۔ باہمی اختلافات کا موجب ہے۔ مذاہب سب برابر ہیں۔ البتہ فلسفۂ زندگی میں اہمسا کو ہمسا پر افضلیت حاصل ہے۔ کبھی "ہندی۔ ہندوستانی" کا نظر فریب جال بچھایا جاتا ہے۔ اور ویوناگری کو ہندی قومیت کا مشترکہ رسم الخط قرار دیا جاتا ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے ماضی سے یکسر کٹ جائے۔ اپنی ملّی روایات کو بھول جائے۔ اپنے ادب۔ تمدّن اور کلچر۔ اپنے اسلاف کے انداز زندگی اور فلسفۂ حیات سے بیگانہ ہو جائے۔ یہ

اور اس قسم کے بہت سے حربے ہیں جو اس سمت سے مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ان کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات پر متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کا میسرہ۔ میمنہ سے بھی زیادہ پُرکار واقع ہوا ہے۔ اور ان کا حربہ بھی زیادہ مؤثر ہے۔ ملک میں افلاس، غربت، ناداری، بے کاری کے بادل چھا رہے ہیں۔ ہر سال صرف ایک پنجاب یونیورسٹی سے کم و بیش بیس ہزار طالب علم میٹرک کا امتحان پاس کر کے بیکاروں کی فوج میں اضافہ کئے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں کی تعلیم میں مذہب کا عنصر پہلے سے غائب ہے۔ اس پر بھوک کی مار۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میسرہ والوں کے سامنے نوجوانوں کی یہی جماعت ہے اور وہ ان کی اس دکھتی رگ سے واقف ہیں۔ اس لئے وہ ان کے سامنے یہ سوال پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کی تقسیم۔ کافر و مسلم کے بجائے صرف دو گروہوں میں ہو سکتی ہے۔ امیر اور غریب۔ سرمایہ دار اور مزدور۔ لہٰذا روٹی کا سوال سب سے مقدم ہے۔ مذہب۔ تمدن۔ کلچر۔ زبان۔ سب سیر چشمی کی باتیں ہیں۔ سرمایہ داری کے ڈھکوسلے ہیں۔ اس زہر سے بجھے ہوئے نشتر کا نام ہے سوشلزم۔ چنانچہ اس جماعت کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں نظامِ حکومت سوشلزم ہوگا۔ اس وقت بھوک۔ ناداری۔ افلاس۔ بیکاری کی سب لعنتیں دور ہو جائیں گی۔ روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس نظامِ حکومت کے قیام میں مذہبی تفریق۔ ہندو مسلم کا امتیاز۔ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا اٹھو اور سب سے پہلے اس روڑے کو راستے سے ہٹاؤ تاکہ اس جہنمی زندگی کے بجائے تمہیں جنتِ ارضی کی زندگی میسر آ جائے۔ بھوکا نوجوان جب اس مژدۂ جانفزا کو سنتا ہے تو بے تحاشہ اس پر لبیک کہتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ اس سے کہا جاتا ہے۔ کہتا ہے اور کرتا ہے۔ اس دستۂ فوج کے سپہ سالار پنڈت جواہر لال نہرو ہیں (جو لاکھوں روپے کی ذاتی جائداد کے باوجود سب سے بڑے سوشلسٹ ہونے کے مدعی ہیں)۔ وہ فرماتے ہیں۔

> "دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۵)

اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے ۔

"ہر پھر کر ہم اس چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے میں۔ پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم، ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طرح سے ہونا چاہیئے؟ یہ ایک جُداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوعِ انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے رد نہیں کی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیئے۔" (صفحہ ۲۰-۴۱۹)

اس سے غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل سے اس "خیال خام" کو نکال دیا جائے کہ وہ ایک الگ ملت ہیں جُداگانہ جماعتی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا وہ ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے"

(خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن)

پنڈت جی کو باقی ملتوں اور قوموں کے متعلق کچھ زیادہ تردد نہیں۔ اضطراب ہے تو صرف ملتِ اسلامیہ کے متعلق۔ فرماتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم ہے۔ جو یک جا نہیں ہے منتشر ہے۔ مبہم ہے۔ غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے۔ اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔

(میری کہانی صفحہ ۳۳۱)

اور چوں کہ مسلمانوں کا یہ دعوے کہ وہ ایک جداگانہ ملت ہیں۔ مذہب کی بنا پر ہے۔ بلکہ ان کی ملی زندگی کا نظام ہی مذہب ہے۔ اس لیے اس قسم کے مذہب کے متعلق پنڈت جی کا ارشاد ہے

"منظم مذہب بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہوجاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ (صفحہ ۶۸-۱۶۷)

اس لئے پنڈت جی دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ اس مذہب کو دیکھ کر میرا جی کڑھتا رہتا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کردوں۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم۔

چوں کہ انہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے بھوک اور افلاس کا عذاب ان پر مسلط ہے۔ قوم میں تشتت و افتراق کی وجہ سے اجتماعی زندگی کی بجائے لامرکزیت کی انفرادی زندگی آچکی ہے۔ ان کے سامنے زندگی کا کوئی خاص نصب العین نہیں رہا۔ مقصدِ حیات صرف روٹی رہ گیا ہے۔ خواہ اس کا طریق حصول کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ دو لفظوں میں یہ کہ ان کے اندر کوئی قومی کیریکٹر نہیں رہا اس لیے پنڈت جی علانیہ کہتے ہیں کہ۔

"میرے خیال میں عام مسلمان۔ عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے۔ اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہوجائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائیں گے" (صفحہ ۵۰۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں آزادی کی روح موجود ہے۔ لیکن اسلامی آزادی میں اور اس آزادی میں جو پنڈت جی کے ذہن میں ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ جس چیز کو آزادی قرار دیتے ہیں اسلام اُسے الحاد و بے دینی سمجھتا ہے۔ اسلام کے نزدیک آزادی وہ ہے جو آئینِ خداوندی کی سخت ترین اطاعت سے حاصل ہو۔

پھر سوشلزم کا نظام زندگی پنڈت جی کا ذاتی مسلک نہیں بلکہ اعلان کیا جاتا ہے اور نہایت

ذمہ دارانہ حلقوں سے یہ آواز اُٹھتی ہے کہ ہندوستان کا آئندہ نظام حکومت سوشلزم ہوگا
مسٹر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت کے دوران میں کہا کہ

"ہم ہندوستان کو ایک سوشلسٹ اسٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ملک کو ابھی سے تیار کرنے کی ضرورت ہے"

اس کی وضاحت میں پنڈت جی فرماتے ہیں کہ موجودہ قومیت پرستی تو محض ابتدائی مراحل ہیں آخری منزل تو یہی تمدنی انقلاب ہوگا جسے سوشلزم کہتے ہیں۔

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل سب سے بڑا محرک عمل رہیگا ...... یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب **Social Revolution** کا جذبہ پیدا ہو جائے" (صفحہ ۱۴۵)

پنڈت جی اور ان کے رفقائے کار نے سوشلزم کے متعلق یہ کچھ اجمالاً کہا ہے اور اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی انہیں ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لیے کہ ان کاموں کے لئے انہیں ہر جگہ ہر وقت اور ہر قیمت پر "مسلمان" تیار ملتے ہیں۔ دنیا میں بھوک کیا کچھ نہیں کرا سکتی؟ چنانچہ پنڈت جی وغیرہم نے اس سے زیادہ جو کچھ کہنا تھا خود مسلمانوں کی زبانی کہلوایا۔ کانگریس کے "شعبۂ اسلامیات" کے ایک سابق کارکن مسٹر منظر رضوی فرماتے ہیں۔

"غریبوں مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدّن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدّن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدّن نہیں ..... اس پیٹ کے لیے اسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑے گی" (مدینہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"آنے والی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔" (مدینہ نومبر ۳۶ء)

یہ وہ وقت ہوگا جب ہندو اور مسلم کی وہ تفریق جو مذہب کی بنا پر قائم ہے۔ یکسر مٹ جائیگی اور اس کی جگہ طبقات کی تفریق لے لیگی۔ یعنی ہندو اور مسلم غریب مل کر ایک قوم بن جائینگے۔ جن میں وجہ جامعیت، رشتہ وحدت روٹی ہوگا۔ پنجاب پراونشل مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکرٹیری منشی احمد دین صاحب لکھتے ہیں:

"ہم تو دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگ آزادی لڑی جائے گی وہ محنت اور سرمایہ۔ غریب اور امیر بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہونگے گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہوں گے ... لہذا فرقہ وارانہ جنگ طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہو جائے گی" (مدینہ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء)

عدم گنجائش کی بنا پر ہم انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ ہم بتاتے کہ پنڈت جی نے جو یہ فرمایا تھا کہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ کتنے جلدی سوشلزم کے دام میں گرفتار ہو جائے گا وہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ آج آپ مختلف جرائد و رسائل میں مسلمان نوجوانوں کے مضامین پڑھیئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس بیباکی اور بزعم خویش "آزادی" سے خدا۔ رسول۔ مذہب۔ اسلامی شعائر۔ ملی تمدن کا (نعوذ باللہ) تمسخر اڑاتے ہیں۔ ان پر پھبتیاں کستے ہیں۔ حتیٰ کہ گالیوں پر اتر آتے ہیں اور اس پر شرماتے نہیں بلکہ بڑا فخر اور ناز کرتے ہیں۔ چوں کہ ان کے معلم اول (پنڈت جی) خود ملحد ہیں۔ خدا کو نہیں مانتے اور سوشلزم کی بنیاد ہی دہریت پر ہے۔ اس لئے ان نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ (معاذ اللہ) خدا کی ہستی پر اعتقاد ہے۔ آپ نے کبھی غور بھی فرمایا کہ یہ کتنی گہری سازش اور کیسی خطرناک چال ہے جو اس بظاہر معاشی مسئلہ کے رنگ میں چلی جا رہی ہے۔ یہی نوجوانوں کا

بقہ کل کو ملتِ اسلامیہ بننے والا ہے۔ اس طبقہ کے دل میں خدا اور مذہب کے متعلق اس قسم کی
زبات پیدا کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کل کی "ملتِ اسلامیہ" اپنے کو مسلمان کہلانے میں شرم
سوس کرے گی۔ اور یوں وہ امتیاز جو انہیں بنا بر مذہب حاصل تھا مٹ جائے گا اور اس کے
ٹنے سے ان کی جداگانہ ملی ہستی۔ الگ جماعتی تشخص خود بخود فنا ہو جائے گا۔ اور اس طرح مخالفین
سلام کے وہ تمام منصوبے جنہیں بروئے کار لانے کے لئے وہ اس درجہ مضطرب و پریشان ہیں
یک ایک کرکے پورے ہو جائیں گے۔

جب سوشلزم کا نظام ہندوستان کے مستقبل پر اس درجہ اثر انداز ہونے والا ہے
ور بالخصوص جہاں تک مسلمانوں کی حیات اجتماعیہ کا تعلق ہے اس کے علمبردار اس قدر طوفان خیز
انقلاب کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم معلوم کریں کہ بالآخر سوشلزم ہے کیا اور
اسلام سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس چیز کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس
نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو یہ فریب دے کر کہ یہ تو محض ایک اقتصادی مسئلہ ہے
اسے کسی کے مذہب اور معتقدات سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات
کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب اپنے ایک تازہ مضمون میں۔ جس کا عنوان ہے "سوشلزم کیا نہیں ہے"
فرماتے ہیں۔

"اکثر لوگ سوشلسٹوں کے بارے میں منجملہ اور غلط فہمیوں کے حسب ذیل خیالات
کا اظہار انتہائی متانت اور ذمہ داری سے کیا کرتے ہیں:
دنیا میں محنت کشوں اور مزدوروں کا ایک معاشی نظام کرنے کے
نصب العین پر سوشلسٹ دنیا کے تمام معتقدات و خیالات کو قربان
کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر اس قسم کا نظامِ حکمرانی قائم کرنے میں انہیں مذہب
کی بھینٹ دینی پڑے تو وہ مطلق تامل نہیں کریں گے۔ علیٰ ہذا القیاس

اگر ضرورت کا تقاضا ہو تو وہ معاشرت و تہذیب کے موجودہ ڈھانچہ کو بھی
نہایت بیباکی کے ساتھ اس کے راستے میں قربان کر دینگے غرض
محنت کشوں اور مزدوروں کے مضبوط و مستحکم معاشی نظام حکمران کے
علاوہ سوشلسٹوں کے نزدیک ہر چیز ہیچ ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے معترض اپنے بیان کی تائید میں کسی سوشلسٹ کا قول نقل کرنے یا کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے ...... میں ذمہ دارانہ طریقہ پر اور ہلکی سی بصیرت رکھتے ہوئے اس کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی رائے زنی سوشلزم کے بارے میں قطعی لاعلمی پر مبنی ہے۔ (ہندوستان۔ مورخہ ۱۴ رمئی ۱۹۳۹ء)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے کس قدر ذمہ دارانہ طریقہ پر اس امر کا اعلان فرمایا ہے کہ سوشلزم کے خلاف اس قسم کی تنقید "قطعی لاعلمی پر مبنی" ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی شکایت ہے کہ ایسی تنقید کرنے والے معترض کسی سوشلسٹ مفکر کا قول نقل نہیں کرتے اور کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ نہیں دیتے۔ لیکن آپ سنیئے اور حیران رہ جائیے کہ خود جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے پورے مضمون میں کہیں ایک جگہ بھی نہ کسی سوشلسٹ مفکر کا کوئی قول نقل کیا ہے نہ کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یا تو سوشلزم کے متعلق خود ڈاکٹر صاحب کی معلومات بھی ایسی ہی سطحی ہیں جیسی اسلام کے متعلق۔ یا انہیں اپنے مفروضات کی تائید میں کوئی حوالہ ہی نہیں ملسکا۔ بہرحال ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان جیسے دوسرے سوشلسٹ حضرات کی واقفیت کے لیئے سوشلسٹ مفکرین کے اقوال و کتب کے حوالوں سے بتائیں کہ سوشلزم کیا ہے اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے جو یہ معلوم کرنے کی تمنا رکھتے ہوں کہ اسلام کے نزدیک اس نظام زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے یہ عرض کریں کہ کتاب و سنت کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے
وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون کی تمہید میں فرماتے ہیں کہ

"مگر پڑھنے والے اور بالخصوص مذہبی لوگ ایک بات کو پہلے صاف کرلیں "دین داروں" کی نگاہ فی نفسہ کسی سوال کے خارجی مطالعہ پر بہت کم جاتی ہے۔ ان کے ذہن دائمی مظاہر سے مانوس ہیں۔ ان کے اکثر سوالات دین و مذہب کو مرکز مان کر پیدا ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مفکروں نے برابر بدلنے والی سماج کی تقسیم بھی مسلم و کافر میں کر دی ہے۔ وہ جب سوشلزم، سوراج، ڈاشسزم یا کسی جدید سماجی سوال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاً انہیں پہلے ذہن میں یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ یہ اسلام کا حامی ہے یا مخالف اور اس کے بعد دیگر جزئیات پر متوجہ ہوتے ہیں۔ اسکی منطقی ترتیب کی آسانیاں بہت ہیں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دنیا کے بہتیروں صحیح تھوڑی سی توجہ اور غور و فکر سے روشن ہو جاتے ہیں، اور کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جہاں پیر امولا نہ چلتا ہو" (ایضاً)۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ ایک سوشلسٹ کے نزدیک یہ اندازِ فکر و نظر کس قدر لغو ہے کہ ہر نظریۂ زندگی اور ہر نظامِ حیات کو مذہب کے آئینہ میں دیکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب ایسا کہنے اور سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ، جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہوگا۔ سوشلزم کی ابتدا ہی مذہب کی مخالفت سے ہوتی ہے۔ لیکن اس مسلمان کی "مجبوری" کو کیا کیا جائے جس کے خدا کا یہ ارشاد ہو کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ ۵/۴۴

جو ان معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے ماتحت نہیں کرتا وہ دائرۂ اسلام سے خارج اور کفار کے زمرہ میں شامل ہے۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب سے نہ کوئی شکایت نہ افسوس۔ لیکن دلی رنج ہے ان قومیت پرست علماء کے گروہ پر جن کی آج حالت یہ ہے کہ جو لوگ ان سے سیاسی مسلک میں اختلاف رکھتے ہیں

انکے کالر ٹائی، ہیٹ، بوٹ، سگریٹ غرضیکہ ہر شے سے انہیں بُو شے کفر آتی ہے لیکن جو لوگ کانگریسی مسلک میں ان کے ہم نوا ہیں۔ وہ جو کچھ جی میں آئے مذہب کے خلاف علانیہ کہتے پھریں۔ ان حضرات کی مقدس پیشانیوں پر شکن تک نہیں پڑتی۔ بلکہ ان سے اُن کے ایسے گہرے تعلقات ہوتے ہیں کہ خود ڈاکٹر اشرف صاحب جمعیت علماء ہند کے سالانہ اجلاس (دہلی) کی تقریب پر جمعیت کے پنڈال میں انکے پلیٹ فارم پر تقریر کرتے نظر آتے ہیں۔ مسیلمہ کذاب نے جب دعوائے نبوت کیا تو اس کے متبعین سے پوچھا گیا کہ تم اس کی اتباع کیوں کرتے ہو تو اُنہوں نے کہا کہ کیا کریں ہمیں اپنے قبیلہ (ربیعہ) کا جھوٹا نبی مضر کے سچے نبی سے اچھا لگتا ہے یہ تھی عصبیتِ جاہلیت کہ اپنے قبیلہ کا جھوٹا بھی دوسرے قبیلہ کے سچے سے اچھا نظر آئے۔ آج وہی عصبیت پارٹی بازی کے رنگ میں جلوہ گر ہے فرق صرف لباس میں ہے روح وہی کار فرما ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات ومنات

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ

(۱) سوشلزم مذہب کی مخالف ہے۔ سوشلسٹ خدا کی توحید یا عبادت سے روکتے ہیں۔ اور معابد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۲) روس کے کمیونسٹ ازدواجی تعلقات میں حرام وحلال کی تمیز نہیں کرتے۔

(۳) سوشلزم قدیم تمدن یا کلچر کی مخالف ہے، اور

(۴) سوشلسٹ تشدد پرست ہیں اور اپنے نظریہ کو بہ جبر منوانا چاہتے ہیں۔

آئیے ہم دیکھیں کہ سوشلزم کے عناصر ترکیبی کیا ہیں اور جن الزامات کو ڈاکٹر صاحب جیسا سوشلسٹ "بہتان عظیم" قرار دے رہا ہے وہ مبنی برحقیقت ہیں یا نہیں۔ پہلے سوشلزم کو لیجئے۔ اس کے بعد اسلام سے اس کا تقابل۔ واللہ المستعان۔

سرمایہ دار اور مزدور کے باہمی تعلقات کا سوال اتنا ہی پرانا ہے جتنی مدنی الطبع انسان کی عمرانی زندگی کی تاریخ۔ نوعِ بشری کے دیگر مہمات اصول کی طرح یہ مسئلہ بھی مختلف مفکرین عالم کے زیر نظر رہا ہے اور اس کے تسلی بخش جواب اور حل کے لیے بہت کچھ دماغ سوزیاں اور خامہ فرسائیاں ہو چکی ہیں، چنانچہ فیلسوفوں کے ابوالآبا، افلاطون یونانی کی جمہوریت کا محرک بھی یہی خیال تھا، اور اس وقت سے آج تک انسانی جماعتوں کی تنظیم و انضباط کے متعدد نظریوں کا مبحث بھی یہی سوال رہا ہے۔

نوعِ انسانی کے دورِ استبداد میں برسرِ اقتدار افراد نے حکومت و سرمایہ کے نشے میں غریب اور مفلس انسانوں پر جو ظلم و ستم کی قیامتیں برپا کر رکھی تھیں، ان سے متاثر ہو کر کچھ ماہرین نظامِ عالم اس نتیجہ پر پہونچے کہ جب تک سرمایہ اور حکومت کے ان اجارہ داروں سے وہ قوت نہیں چھین لی جائے گی جس کے بل بوتہ پر یہ مفلوک الحال انسانوں پر دست تظلم دراز کرتے ہیں، نظامِ دنیوی میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان داعیوں نے اپنی جدّ و جہد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مطلق العنان حکومت کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ یہ جذبہ بڑا مستحسن اور یہ اقدام نہایت مبارک تھا، چنانچہ یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد شخصی حکومت جمہوریت سے بدلتی گئی۔ ہر چند یہ جمہوریت بھی اسلامی جمہوریت کے مقابلہ میں "استبداد" ہی کا دوسرا نام تھا، لیکن بہرحال اس شخصی حکومت سے کسی حد تک بہتر تھی جو اس سے پیشتر وجۂ ننگِ انسانیت تھی۔ یورپ کی سرمایہ داری یقیناً ایک انقلاب کی مستحق تھی لیکن بدقسمتی سے اس انقلاب کے علمبردار وہ انتہا پسند (Extremists) تھے جو نقطۂ اعتدال سے ناواقف تھے اور ان کے سامنے سرمایہ داری کی تخریب کے بعد مساواتِ انسانی کی تعمیر کا کوئی صحیح پروگرام نہ تھا، چنانچہ ان انقلاب پسند لوگوں نے ایک نظامِ زندگی وضع کیا جس کی رُو کر وہ چاہتے تھے کہ ذاتی املاک و مقبوضات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تمام پیداوار مزدوروں اور کسانوں میں

مساویانہ تقسیم کردی جائے۔ اور یوں دنیا سے بڑے اور چھوٹے کا امتیاز مٹا دیا جائے اس نظام کا نام سوشلزم ہے، اور اس کی انتہائی شکل کمیونزم کہلاتی ہے لیکن یہ نظام محض اقتصادیات تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اس لئے اس کے جملہ عناصر ترکیبی کو سامنے رکھے بغیر اسکے متعلق انسان کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔

اشتراکی خیالات کا مبتدع اگرچہ مزدک ہے جو ایران میں ۵۰۰ء کے قریب پیدا ہوا لیکن دورِ حاضر کی تحریک کا رہنمائے اعظم المانیہ (جرمنی) کا ماہر اقتصادیات کارل مارکس (Karl Marx—1818-1883) ہے یہ شروع ہی سے انتہا پسند تھا، اور ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے اس نے کئی ایک اشتراکی اخبارات میں کام کیا، یہ خیالات ہنوز اس کے سینہ کی پہنائیوں میں پرورش پا رہے تھے کہ وہ برسلز میں جرمن مزدوروں کی ایک خفیہ جماعت سے ملا جو اپنے آپ کو اخوان العدل (League of Just) کہتی تھی تھوڑے عرصہ کے بعد اس جماعت نے اپنا نام بدل کر اشتراکین (Communes) رکھ لیا جس کے معنی ایسی جماعت تھے جو باتحاد یک دیگر مزدوروں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا) اس زمانہ میں مارکس کو انجلیز (Engels) نامی ایک اور ماہر اقتصادیات ملا جو اس کا ہمخیال تھا اور جو مارکس کے بعد اس تحریک کا قائد اعظم سمجھا جاتا ہے۔ مزدوروں کی مذکورہ صدر جماعت نے ۱۸۴۷ء میں ایک جلسہ کیا جس میں انہوں نے مارکس اور انجلیز سے درخواست کی کہ وہ اس جماعت کی وجہ تخلیق اور اس کے اغراض و مقاصد کا ایک دستور اساسی مرتب کر دیں۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء کو یہ دستور اساسی منشور اشتراکیت (Communist Manifesto) کے نام سے شائع ہوا یہی دستور موجودہ اشتراکیت کا نصب العین ہے اور وحی منزل کی طرح واجب التسلیم مانا جاتا ہے انہیں دنوں (۱۸۴۹ء میں) شاہ جرمنی نے قومی مجلس کو برخواست کر دیا جس سے متاثر ہو کر مارکس اور اسکے رفقائے کار نے عوام میں یہ تحریک شروع کر دی کہ وہ ٹیکس ادا نہ کریں اور حکومت کی مخالفت کیلئے مسلح جماعتوں کی تنظیم شروع کر دیں۔ حکومت نے اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا اور اسے ملک بدر کر دیا۔ یہ

پہلے فرانس پہونچا اور وہاں سے انگلستان آگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جرمنوں کی کمیونسٹ جماعت نے ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل کرلی۔ چنانچہ اس جماعت کی برسلز کی شاخ نے اپنا نام بین الاقوامی مزدوروں کی جماعت (International working men Association) رکھا، اور مارکس کو اس کا صدر بنایا۔ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں ایک کانفرنس منعقد کی جسے اشتراکیت کی پہلی بین الاقوامی (کانفرنس) کہتے ہیں۔ بیکن اشتراکین اور انارکسٹ (بے نظمی اور بے آئینی کے علمبردار وں) کے باہمی اختلافات کی بنا پر یہ کانفرنس ٹوٹ گئی۔ زاں بعد ۱۸۹۸ء میں اس کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس ہوئی لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی بنا پر اس کی مختلف شاخوں میں پھر اختلافات رونما ہو گئے حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں اس کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جو درحقیقت اس عالمگیر تحریک کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس آخری کانفرنس نے دوسری کانفرنس کے معتدلین کے طریق کار کو مذمت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنا رشتہ واتحاد پہلی بین الاقوامی سے منسلک و منوط کرکے ہر قسم کے جارہانہ تشدد وغارتگری کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ جو اُن کے نزدیک مارکس کے نظریہ کی اصل ہے۔

یہ تحریک یوں تو آتش خاموش کی طرح سلگتی سلگاتی مختلف اقوامِ عالم میں اثرانداز ہوتی رہی، لیکن جہاں یہ رعد آسا دھماکے کیساتھ اُبھری وہ روس کا میدان تھا ویسے تو ۱۹۰۵ء کی انقلابی تحریک ہی سے رُوس میں اُس کے آثار نمودار ہو چکے تھے، لیکن ۱۹۱۷ء میں زارِ روس اور اُس کی حکومت کے خلاف ایک طوفان انگیز شورش برپا کی گئی۔ جس کا سرغنہ لینن (Lenin— 1870 1924) تھا، اس انقلاب نے حکومت روس کا تختہ الٹ دیا۔ اور اشتراکین کی جماعت جس کا مقامی نام بالشویک تھا۔ برسرِ اقتدار آگئی۔ اُن کی پہلی مجلس انتظامیہ چونکہ مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل تھی انہیں سوویٹ (Soveit) کہتے تھے۔ اس لئے اس نظامِ حکومت کا نام بھی سوویٹ رُوس کی جمہوریت رکھا گیا۔ لینن اس جماعت کا صدر تھا جس نے، جنوری ۱۹۱۸ء کی شب کو آئینی نظام حکومت کی اسمبلی کو برطرف کرکے اپنی آمریت (Dictatorship) کا اعلان کردیا۔ لینن ۱۹۲۴ء میں مرگیا اور اس کی جگہ سٹیلن (Stalin-1879) ڈکٹیٹر

مقرر ہوا۔ روس میں اگرچہ کمیونسٹ جماعت ہی برسرِاقتدار ہے لیکن ہنوز وہاں نظامِ حکومت و معاشرت کمیونزم کے مکمل دستور کے مطابق عمل میں نہیں آیا۔ یوں سمجھئے کہ بعض صورتوں میں سوشلزم اور بعض میں اس سے زیادہ متشدد طریقِ حکومت کارفرما ہے۔ البتہ کمیونسٹ جماعت تدریجاً اس نظام کو بدل کر اشتراکیت کے آخری نقطہ کی طرف لئے چلی جا رہی ہے۔ بہرکیف تحریک اشتراکیت کا آتش دان آج روس میں ہے اور وہیں سے اس کی چنگاریاں اڑ اڑ کر نظامِ عالم کے خرمن امن و طمانیت کو جلانے کے سامان فراہم کر رہی ہیں۔

موجودہ اشتراکیت کے اصول و طریقِ کار کی تفصیلات جو مارکس، انجیلز، لینن، سٹیلن، اور ان کی روسی جماعت کے اربابِ حل و عقد کی تحریر و تقریر سے ماخوذ ہیں حسب ذیل ہیں۔

---

(۱) معاشی اور معاشرتی نظام

مارکس اپنے منشورِ اشتراکیت (Communist Manifesto) کے شروع میں لکھتا ہے۔

"سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسرِاقتدار آکر، عالمگیر یکسانیت و مساوات پیدا کر دیا ہے"

پھر لکھتا ہے کہ۔

"اس تحریک کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ دُنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی و انفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدُوروں کی جماعت کو تسلّط حاصل ہو جائے تو تدریجاً سرمایہ داروں کے تمام املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے، اور یُوں ملکی پیداوار کے تمام وسائل و ذرائع مزدوروں کی جماعت کی حکومت کے ہاتھ میں مرکوز کر دیئے جائیں"

یک اور جگہ رقمطراز ہے۔

"اشتراکی اپنے خیالات اور مقاصد کو پوشیدہ رکھنے سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ان کے مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجودہ نظام معاشرت کو مسلح قوت کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔ برسر اقتدار جماعتوں اور طبقوں کو اشتراکی انقلاب سے خوف کھانا اور ڈرنا چاہئے مزدور اس انقلاب میں کچھ نہیں کھوئیں گے انہیں تو ایک دنیا کو فتح کرنا ہے۔"

اسی اصل الاصول کی تائید کمیونزم کے مختلف لٹریچر کے ذریعہ سے ہوتی رہتی ہے چنانچہ ہندوستان میں نظام عمل کا مسودہ ("Draft platform of action in India") مطبوعہ ڈیلی ورکر لندن) کی تیسری شق یہ ہے۔

"ہر قسم کی ذاتی ملکیت مثلاً زمین، جنگلات، سرمایہ، جاگیرداران، والیان ریاست، اور مذہبی عبادت گاہوں کی تمام جائدادیں بلا کسی معاوضہ کے ضبط کر لی جائیں۔"

"اشتراکی نظام شمسی" (Communistic Solar System) مطبوعہ لیبر پارٹی لندن کے شروع میں ہے۔

"اشتراکی بین الاقوامی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک منظم و مسلح لڑائی کے ذریعے سے بین الاقوامی سرمایہ داری کا انہدام کرے اور اس کی جگہ بین الاقوامی سوویٹ جمہوریت کو قائم کرے، جو سرمایہ داری کے مکمل استیصال تک ایک درمیانی ارتقائی منزل کا کام دے۔"

(V-Adorntsky) جو کہ "مارکس، انجیلز، لینن، انسٹیٹوٹ، ماسکو" کا ڈائرکٹر ہے۔ اپنی کتاب (Dialectical Materialism) کے صفحہ پر لکھتا ہے۔

"جماعتی جنگ کے ذریعہ سے اور ڈکٹیٹر شپ کی مدد سے، اشتراکیت جماعتی امتیازات

۴۴۸

وتفوق کو مٹا کر ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل کرے گی، جس میں طبقاتی امتیازات کا وجود نہ ہوگا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مدیر مارکس ولینن کی اسناد سے اشتراکیت کے مآل الحصول کے متعلق لکھتا ہے۔

"مشترکہ ملکیت، وسائل پیداوار کا اجتماعی نظم ونسق اور انفرادی وشخصی حقوق واملاک کا مکمل انقطاع، سوشلسٹوں کا نصب العین حیات ہے۔"

(۳) مذہبی نظام کہا جاتا ہے کہ اشتراکیت ایک خالصۃً اقتصادی اور سیاسی تحریک ہے، جسے مذہب سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن مدعیان تحریک کے نزدیک سب سے پہلے مذہبی انقلاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دنیا میں غریب انسانوں پر جس قدر ظلم واستبداد کی قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں سب مذہب کے وجود سے ہیں۔ اور ان مصائب وآلام کا استیصال اُس وقت تک ناممکن ہے جبتک لوگوں کے دلوں سے خدا کے وجود کا ایمان قاطبۃً مٹا نہ دیا جائے۔ اس لئے کہ۔

"دنیا میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا استبداد کا حامی خود خدا ہے۔"

(Bolshevism by Edmand Candler)

اور خود لینن خدا کے تصور کی ابتدائی وجہ یوں بیان کرتا ہے۔ کہ

"سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہن انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کردی ہے۔ جس سے ایک حاکم اعلیٰ کے تخیل کی بنیاد پڑی، اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کردیا۔ سو جبتک خدا کا تخیل ذہن انسانی سے فنا نہ کردیا جائے، یہ لعنت کسی طرح دُور نہیں ہوسکتی۔"

(Hammer and Sickle by Mark Patrick)

لینن، مارکس کے حوالہ سے اپنے ایک مقالہ مطبوعہ پریز منتھلی بابت دسمبر ۱۹۲۶ئہ میں لکھتا ہے۔

"مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے، اس لئے نظریہ مارکس کی رُو سے دنیا کے تمام مذاہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں۔ جن کی توسط سے مزدور جماعت کے حقوق کو پامال

کیا جاتا ہے اور انہیں فریب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا نفس مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے۔ تا آنکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے۔"

مبادیات اشتراکیت (A B C of Communism) مصنفہ (Buhareu Preobrazbensky) کے باب ۱۹ میں لکھا ہے۔

"اشتراکیت کے نام لیواؤں کا اولین فرض ہے کہ مارکس کے اس قول کو کہ مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے۔ عام جماعتوں کے ذہن نشین کرادیں اور انہیں یقین دلادیں کہ ازمنہ گذشتہ میں کیا اور دور حاضرہ میں کیا متمرد اور سرکش انسانوں کے ہاتھ میں مذہب ہی ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ دنیا میں عدم مساوات، جماعتی تفریق اور غضب واستبداد کو روا رکھا جاتا ہے۔ اور جس کے نام سے مزدوروں کی جماعت سے سرمایہ کے دیوتا کی پوجا کرائی جاتی ہے۔"

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتا ہے۔

"مذہب اور اشتراکیت عملی اور نظری ہر دو حیثیتوں سے بالکل متضاد ومتبائن ہیں۔"

ص۲۵۷ پر ہے کہ

"جو اشتراکی اپنے مذہبی عقیدے کو بھی ساتھ ساتھ رکھتا ہے، اسے اشتراکیت سے کچھ واسطہ نہیں۔"

(Lenin and Gandhi) کا مصنف (Rene Fulop Millor) لکھتا ہے۔

"لینن نے بار بار اپنی تقریر وتحریر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اشتراکین کے عوام وخواص کا نصب العین حیات ہی یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ممکن کوشش صرف کردیں کہ خدا سے اس کا غلبہ وتسلط سطوت وحکومت چھن جائے، کیونکہ اشتراکی نظام کا بدترین

دشمن خدا کا وجود ہے۔"

مقدمہ سازش (میرٹھ) کے ملزم مسٹر نمبکار نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

"ہم اس امر کو صیغۂ اخفا میں رکھنا نہیں چاہتے کہ ہم (اشتراکیین) دنیا کے تمام مذاہب کے خلاف ہیں اور ہم کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ دنیا میں مذہب کی تبلیغ ہو یا کوئی اشتراکی، مذہبی عبادات و مناسک کو ادا کرے۔"

اس کی تصدیق دوسرے ملزم مسٹر ادھیکاری نے ان الفاظ میں کی تھی۔

"ہم بہ حیثیت اشتراکیین، اور مادہ پرست مذہب اور خدا کے دشمن ہیں۔ لینن نے اسی بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ مذہب کے خلاف بھی جنگ اسی زور و شدت سے جاری رکھی جائے جس طرح جماعتی تفریق کے خلاف جنگ ہو۔ چنانچہ اشتراکیین کی پانچویں کانفرنس میں مذہب کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا وہ بالکل عیاں ہے کہ سرمایہ داری کے تعصبات اور توہم پرستی کے مقابلہ کے لئے سب سے پہلے مذہب سے جنگ کرنا ہوگا، اور اس کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ بالخصوص مزدوروں کی اس جماعت میں جہاں اُن کی روزانہ زندگی میں مذہب عمیق اثر پیدا کر چکا ہے۔"

چنانچہ پانچویں کانفرنس کے محولۂ بالا شق کے الفاظ یہ ہیں۔

"مذہب، حکومت اور کلیسا کے خلاف جنگ کرنا۔"

اس اصول اور اصول کی فروعی تصریحات کے ماتحت ۱۱ فروری ۱۹۲۲ء کو حکومت سوویٹ نے فیصلہ کر دیا کہ قحط سالی کے دفعیہ کی آڑ میں تمام عبادت گاہوں کی املاک ضبط کر لی جائیں

(Russia Reported by Walter Duranty—1921-1933)

یہی نہیں بلکہ ماسکو یونیورسٹی کے پروفیسر (Julius F Hecker) نے اپنی کتاب موسومہ (Religion under the soviet) جو درحقیقت روس کی تائید میں ہے لکھا ہے۔

"بالشویک کٹر مادہ پرست اور دہریہ ہیں مذہب ان کے نزدیک دور جہالت کی قلبی گمراہی کا نام ہے یا ایک فریب ہے یا افیون ہے اور کلیسا ان کے نزدیک اقتدار پسند جماعتوں کا ایک ڈھونگ ہے جو زیردست انسانوں کے تذلل اور تعبّد کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک اشتراکیت کی تہذیب جدید میں مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔"

پھر لکھتا ہے۔

"اشتراکیین محض اپنی جماعت کے اراکین سے ہی اس دہریت کا اقرار نہیں لیتے۔ بلکہ غیر اشتراکیین میں بھی ان عقائد کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے افراد کے نصاب تعلیم کی اس انداز سے تشکیل کرتے ہیں کہ وہ خود بخود ایسے لامذہبی معتقدات کو ذہن میں لئے ہوئے آگے بڑھیں۔"

آگے چل کر تحریر ہے۔

"ان کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی ہے اس کے بعد پھر وہ کسی اخروی زندگی کے قائل نہیں۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے ان کی سوسائٹیاں قائم ہیں جنہیں جمعیت منکرین خدا (Union of the Godless) کہا جاتا ہے۔ ان جماعتوں کو اشتراکی پارٹی کی پوری امداد حاصل ہے۔"

سنہ ۱۹۳۴ء میں اسی انجمن (منکرین خدا) کے صدر (Yaroslavsky) کی تقریر کے اقتباسات اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ جن میں اس نے اپنی انجمن کے اراکین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

"چونکہ خدا کے خلاف پروپیگنڈا کچھ سست پڑ گیا ہے اس لئے خطرہ ہے کہ مذہب کا شگوفہ پھر نہ پھوٹ نکلے۔ لہذا ضرورت ہے کہ پروپیگنڈا نہایت شد و مد سے کیا جائے۔"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۲-۴-۳۴ و لیڈر مورخہ ۱۶-۴-۳۴)۔

ہندوستانی سوشلسٹوں کے سپہ سالار پنڈت نہرو مذہب کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ سنئے!!

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے۔ اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین، اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق رکھنے والوں کی بقا کا حمایتی ہے۔"

(میری کہانی ص۱۴۲)۔

(۳) اخلاق اشتراکیت کا یہ جہاد، صرف خدا اور اس کے متعین کردہ قوانین کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ اس تجدد پسندی کے نشہ میں وہ ہر اس اخلاقی قانون اور ضابطہ کو کالعدم کر دینے پر تلے بیٹھے ہیں جو معلم اخلاق یا سوسائٹی کے اراکین نے نظام امنیت عالم کے لئے وضع کیا ہو چنانچہ لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اسی قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت و سطوت کا استحکام و استبقا کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے، نہیں! بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔"

(Lenin and Gandhi)

اسی حقیقت کا اعادہ "مبادیات اشتراکیت" میں ان جامع الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"جو کچھ جماعتی جدوجہد کی تائید میں ہو عین حلال ودرست۔ اور جو اس کے راستہ میں مزاحمت کرتا ہو حرام وناجائز"

یہ نظریہ اشتراکیت میں کچھ بعد کی پیداوار نہیں۔ یہ تمام عمارت ان بنیادوں پر استوار کی گئی ہے جس کی داغ بیل خود مارکس نے اپنے منشور میں ان الفاظ میں ڈالی تھی۔

"اشتراکیت کے انقلاب میں ان تمام کہنہ خیالات کی تبدیلی مضمر ہے جو مختلف ادوار عالم میں مختلف شکلوں میں رونما ہوئے ہیں"

(۴) نظامِ عائلی مذہب واخلاق کی حدود وقیود کو توڑ کر سب سے پہلے مرد وعورت کے جنسی تعلقات کو تمام اغلال وسلاسل سے آزاد کیا گیا ہے۔ خدا سے انکار اور مکافاتِ عمل کے اعتقاد سے بیگانگی کا اولین نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ فطرتِ انسان پر جذباتِ بہیمیہ سب آ جائیں اور خواہشات سفلیہ قوائے ملکوتی کے حسن ازلی پر خباثت ورذالت کے گھناؤنے پردے ڈال دیے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ آواز ۱۹۰۷ء میں (Artisybashev) نے ایک ناول (Samine) نامی میں بلند کی۔ وہ لکھتا ہے۔

"خواہشاتِ نفسانی کو بلاقیود وپابندی فرد کرنا ہی عین فطرت ہے۔ اس کے لئے نہ ضمیر کی آواز کی پرواہ کرنی چاہئے اور نہ ہی خدا اور انسانوں کے وضع کردہ اصولوں سے خائف ہونا چاہئے۔ بادہ نوشی اور حرامکاری میں کوئی ایسی معیوب بات نہیں جس سے انسان خواہ مخواہ شرماتا پھرے۔ تندوتیز مے نوشی اور مہیج جذبات فحش کاری فطرتی جذبات ہیں۔ اور جو چیز فطری ہو وہ ناجائز کیسے ہوسکتی ہے"[1]

چنانچہ (Samine) کی اس صلائے عام پر بہت سے نوجوان مرد وعورتوں نے لبیک کہا اور بلاقیود ہوس رانیوں کی عام سوسائٹیاں وجود میں آگئیں۔ اسی طرح وہاں شراب کی بھی بیشمار قسمیں رائج ہوگئیں۔ چنانچہ مسٹر (Alexander Wicklead) نے اپنی کتاب

---

(۱) (Religion under the Soveit)

(Ten years in Soveit Russia) میں بادہ نوشی کی کئی قسمیں گنائی ہیں۔

لیکن اس کا بہت گہرا اور خطرناک اثر سلسلۂ ازدواج و مناکحت پر پڑا جس پر مدنی الطبع انسان کی عائلی زندگی کا کلیتہً دارومدار ہے چنانچہ زمین، سرمایہ اور جائداد کی طرح اشتراکیت کی رُو سے عورت بھی تمام افراد جماعت کی مشترک ملکیت ہے جس کی تقسیم ماحصل محنت کی تقسیم کی طرح حکومت کرتی ہے۔ کوئی شخص کسی عورت کو اپنی بیوی نہیں کہہ سکتا۔ عورت حکومت کی ملکیت اور سب کی بیوی ہے۔ اس اشتراک کا تخیل بھی اشتراکین کے موسس اعلیٰ مزدک ایرانی کی "رفعت اخلاق" کا رہین منت ہے۔ چنانچہ اس کے نظام اشتراکیت میں بھی مناکحت کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی، عورت مشترکہ بیوی، اور بچے حکومت کی اولاد سمجھے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو (Enc of Religions and Ethics)

روس میں ابھی اشتمالیت کے طرز کی حکومت ہے۔ جو اشتراکیت سے کہیں معتدل اور نرم رو ہے۔ لیکن وہاں عورت و مرد کے جنسی تعلقات کے لئے کسی نکاح و عقد کی بندش ضروری نہیں۔ جبتک کسی جوڑے کا جی چاہے میاں بیوی کی حیثیت سے رہے۔ البتہ اعداد وشمار کی سہولیت اور قانون کی دیگر تعلقوں میں آسانی کی خاطر اتنا ضروری ہے کہ وہ کسی مجسٹریٹ کے سامنے جاکر اپنے ان تعلقات کی اطلاع کردیں یہ محض رسمی سی بات ہے۔ ورنہ رجسٹری شدہ اور غیر رجسٹری شدہ میاں بیوی کی اولاد میں قانوناً و عرفاً وہاں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ہاں جو شادیاں مذہبی قواعد کے مطابق سرانجام پاتی ہیں حکومت انہیں قانوناً تسلیم نہیں کرتی (ملاحظہ ہو (Soveit union year book for 1928)

شادی کی غرض و غایت وہاں تولید و افزائش نسل انسانی یا نظام عائلی کی طرز پر زندگی بسر کرنا نہیں بلکہ محض تعیش و ہوس رانی ہے مانع حمل تدابیر اگرچہ آج تمام مہذب دنیا میں رائج ہو چکی ہیں لیکن روس میں اس کے لئے حکومت کی طرف سے باقاعدہ ریسرچ انسٹیٹوٹ کھلے ہوئے ہیں۔ یورپ اور دیگر مہذب ممالک میں ابھی حرام کاری کے نتائج کو بالعموم چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ اس سے صنف نازک کی عفت پر دھبہ لگتا ہے اور مانع حمل تدابیر زیادہ تر از محارہ اس لئے اختیار کی جاتی ہیں کہ اولاد پیدا نہ ہو۔ روس میں اسقاط حمل قانوناً جائز ہے اور حکومت کی طرف سے مخصوص ہسپتال صرف اس غرض

کے لئے کھلے ہوئے ہیں کہ ان میں اسقاط حمل منظم طریقہ سے عمل میں لایا جائے۔ دیکھئے

(Modern Russia by Cecil Hamilton)

مناکحت کے بعد طلاق کا سوال آتا ہے۔ طلاق حاصل کرنے کے لئے متعاقدین میں سے کسی ایک کا عدالت میں جا کر صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ اسے فریق ثانی کے ساتھ رہنا منظور نہیں۔ (Soveit year book 1929) اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ فریق ثانی کو بھی اس کی اطلاع دی جائے۔ چنانچہ (Modern Russia) کی مصنف کے بیان کے مطابق روس میں نصف چھٹانک مکھن حاصل کرنے کے مقابلہ میں طلاق حاصل کرنا آسان ہے۔ خاتون موصوفہ رقمطراز ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صبح کو مرد ہنستا بستا گھر چھوڑ کر گیا ہے، لیکن شام کو واپس آیا تو گھر میں نہ بیوی موجود ہے نہ بچے۔ صرف ایک اطلاعی کارڈ رکھا ہوا ہے کہ بیگم صاحبہ آج کسی اور کی زینت آغوش ہوں گی۔

طلاق کے بعد بچے کی کفالت کا ذمہ دار مرد کو قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر باپ عدالت میں یہ ثابت کر دے کہ ماں کا تعلق بیک وقت کئی مردوں کے ساتھ تھا۔ تو بچے کی کفالت کے اخراجات سب میں برابر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ (Modern Russia)

حکومت نے لاوارث بچوں کے لئے پرورش گاہیں بنا رکھی ہیں لیکن مسٹر (Domillett) بلجیم قونسل کے قول کے مطابق وہاں قریب پچاس لاکھ بچے لاوارث مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں نہ کھانے کو ملتا ہے نہ رات کو سونے کے لئے چھت میسر ہے۔

ایک ممتاز روسی سائنس دان (Anton Nemilofe) جو اشتراکیت کا پُر جوش حامی ہے۔ اپنی کتاب (Biological Tragedy of Women) میں اعتراف کرتا ہے کہ مردوں میں صنفی انارکی (حدود شکنی و قیود فراموشی) عام ہو گئی ہے چنانچہ وہ تنبیہ کرتا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو اشتراکی نظام تباہ ہو کر رہے گا۔

مشہور اشتراکی اخبار (Prauda) میں اب سے چند سال قبل ایک مضمون نکلا تھا،

جس میں درج تھا۔

"محبت کے معاملہ میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں اور ان سب اصولوں کی تہہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جس قدر زیادہ تم حد کو پہونچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یا بالفاظِ دیگر جس قدر زیادہ تم حیوانیت کے قریب ہوگئے اسی قدر زیادہ تم اشتراکی ہوگئے۔ لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالب علم، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس بات کو اصول متعارفہ میں سے شمار کرتا ہے کہ محبت کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو اس کو اپنے اُوپر کوئی قید عائد نہیں کرنی چاہئے۔ اس طرح کے اصولِ متعارفہ میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جو لیبر فیکلٹی میں داخل ہے اس پر یہ لازم ہے کہ جب اس کے نوجوان ساتھیوں میں سے کسی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلا پس و پیش اپنے آپ کو اس کے سپرد کردے۔" (بحوالہ ترجمان القرآن - ۱۲/۱) -

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ جب اشتراکیت کی معتدل شکل اشتمالیت میں نظام عائلی کا یہ حال ہے تو اصل اشتراکیت میں تو خانگی زندگی کا وجود ہی مٹ جائے گا۔ مذکورہ صدر واقعات سے قطع نظر جب اشتراکیہ کا اصول ہی یہ ہے کہ عورت املاک انسانی کی طرح جماعت کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اور جنسی تعلقات کے لئے نکاح و پابندی کی ضرورت نہیں تو اشتراکیت میں عائلی زندگی کا جو حشر ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ نہ خون کے رشتے رہیں گے نہ ترکہ و وراثت کا سوال ہوگا نہ کوئی عورت محرمات میں سے ہوگی۔ نہ کوئی باپ کہلائے گا نہ بیٹا کسی سے منسوب ہوسکے گا۔ نہ کسی کی کوئی بیوی ہوگی۔ نہ بیوی کا خاوند ہوگا نہ ہمشیرہ کی ہوگی نہ ماں کی پہچان غرضیکہ انسانوں کی بستیاں حیوانوں کا وسیع جنگل ہوگا جہاں جذبات شہوانیہ کے پورا کرنے کے لئے متضاد جنسوں کے افراد اکھٹے رہتے ہوں گے۔

(۵) طریق کار

مارکس کے منشور کے بعد تحریک اشتراکیت میں لینن کی کتاب (State and Revolution) گویا "عہد جدید" کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں لینن لکھتا ہے۔

"سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکین کی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدّد آمیز انقلاب کے بغیر ممکن نہیں"

پھر دوسری جگہ لکھتا ہے۔

"مزدوروں کی جماعت کی آزادی تشدّد آمیز انقلاب اور موجودہ نظامِ حکومت کی مشینری کی مکمل تخریب کے بغیر ممکن نہیں"

اسی کتاب کے صفحہ ۴۷ پر انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار وارادہ قوت واستیلاء، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھار اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی مسلط کر دیتا ہے"

اور یہ کہ۔

"ہم حکومت کی مشینری کی مکمل تخریب اس انداز سے چاہتے ہیں کہ مسلح مزدوروں کی جماعتیں زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں"

۱۹۰۵ء کے انقلاب روس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے خیالات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے۔

"ہم اس حقیقت کو بالکل چھپانا نہیں چاہتے کہ اس کے بعد جو انقلاب ہو گا وہ جارحانہ خون آشام اور ہلاکت آفریں جنگ ہو گی"

A B C. of Communism جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ انہیں خیالات سے لبریز ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ان حالات کے ماتحت مزدوروں کی جماعت کے لئے خانہ جنگی Civil War بالکل لائیفک ہو جاتی ہے۔ اسی کتاب کے آخری باب میں ان تمام تفصیلات کو اجمالاً ان الفاظ میں قلمبند کیا گیا ہے۔

"اشتراکیت کا انقلاب صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ وہ عالمگیر شکل

اختیار کرلے۔"

(Stalin) اپنی مشہور کتاب (Leninism) میں بھی انہی تدابیر کو

بروئے کار لانے پر زور دیتا ہے۔ روس کی کمیونسٹ جماعت نے ۱۹۱۹ء میں ایک لاسلکی پیغام دنیا کی

کمیونسٹ جماعت کے نام بھیجا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کے یہ بھی تھا کہ۔

"اس جدوجہد و جنگ وجدل کا طریق عمل یہ ہوگا کہ جمہور مزدور کی جماعت میدان عمل

میں آجائے اور سرمایہ داری نظام کے خلاف ہر اس ہتھیار سے کام لے جو ان کے

ہاتھ آجائے۔"

اس کے بعد کمیونسٹ روس کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی جس میں مذکورہ صدر تدابیر سے اتفاق کرتے ہوئے

مقاصد ذیل کے ماتحت قرار پایا کہ۔

"بین الاقوامی اشتراکیت اپنا نصب العین یہ مقرر کرتی ہے کہ بین الاقوامی سرمایہ داری کے

نظام حکومت کے خلاف مسلح جنگ شروع کردے"

اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں پانچویں کانگریس میں ان امور کے جزئیات و فروعات کی تفصیل طے پائی۔ چنانچہ اس کی

روداد میں ہے

"وقت آگیا ہے کہ تمام اشتراکیین پر یہ فرض کردیا جائے کہ تمام ممالک عالم میں خواہ وہ

جماعتی جنگ کے اعتبار سے آزاد، قانون پسند اور امن جو ہی کیوں نہ ہوں منظم طریق

پر جماعت کے ایسے کاموں میں شریک ہو جائیں خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز"

یہی چیز ٹراٹسکی نے اپنی کتاب (Defence of Terrorism) میں پیش کی ہے

جہاں وہ لکھتا ہے کہ۔

"انقلاب کا تقاضہ ہے کہ وہ انقلاب پسند جماعتوں سے مطالبہ کرے کہ جو قوت ان کے حیطۂ اختیار

میں ہو اُسے بروئے کار لے آئیں۔ اگر ضرورت ہو تو ایک مسلح شورش کے ذریعہ اور اگر مناسب سمجھیں تو دہشت

انگیز طریقوں سے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں۔

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے۔ اس لئے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے .... یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے، یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر یعنی جبر و تشدد سے کام لئے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھا لے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔ (میری کہانی ص ۵۶-۵۷)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا فیصلہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں، اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا کیونکہ جبتک بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی"۔ (میری کہانی ص ۲۶۹)۔

چونکہ جماعتی مفاد کے حصول کے لئے اشتراکیت میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رکھی گئی، اس لئے ان کے نزدیک حلیف و حریف برابر ہیں۔ عہد و پیمان اور میثاق و معاہدہ کوئی شے نہیں۔ بظاہر دوست ہوں گے لیکن اس دوستی کے پردہ میں تخریب و استہلاک کی ہر ممکن کوشش بروئے کار لائے آئیں گے لہٰذا ان پر نہ امن و صلح کے زمانہ میں کوئی بھروسہ نہ جنگ و قتال کے وقت کسی ایفائے عہد کی توقع۔

اشتراکیت کے آہنی اصول۔ اور ان اصولوں کے پروپیگنڈا کا اثر ہے کہ ۱۹۰۵ء کے بعد آج تک اقصائے عالم کا کوئی گوشہ امن و امان کی زندگی بسر نہیں کر سکا ہر ملک اور ہر طبقہ میں عدم اطمینان و فقدان سکون کی ایک

روہیں گئی ہے جو مختلف قسموں کے انقلابات کی شکل میں آئے دِن امن عامہ پر برق خاطف بن کر گرتے رہتے
ہیں چنانچہ ۱۹۰۵ء میں انقلاب روس کے بعد ۱۹۰۶ء میں ایران میں ۱۹۰۸ء میں ترکی میں اور ۱۹۱۱ء
میں چین میں انقلابات کا سیلاب اُمڈا۔ یورپین ممالک میں یہ انقلابات اسٹرائک کی شکل میں پیدا ہوئے ۱۹۱۱ء
میں ریلوے کی جنرل اسٹرائک ہوئی اسی طرح ۱۹۱۰ء میں جرمنی میں عام نیابت کے لئے مزدوروں نے
مطالبہ کئے اور روس میں ۱۹۱۴ء میں باکو وغیرہ کے کارخانوں میں اسٹرائک ہوئی۔ پھر جنگِ عظیم کے بعد
تو ان انقلابات کو پوچھئے ہی نہیں۔ تاریخ عالم میں جو تغیرات صدیوں میں ہوا کرتے تھے وہ اب دنوں میں ہو
جاتے ہیں اور اگر دس بیس سال اُدھر کی تاریخ کے اوراق آج سے سو سال پیشتر کے کسی مدبر و سیاست دان
کے سامنے رکھ دئے جائیں تو وہ انہیں کبھی حقیقت پر محمول نہ کرے گا بلکہ محض افسانہ طرازی سمجھ کر خاموش
ہو رہے گا پھر روس میں ان انقلابات کی وجہ سے نوعِ بشری جن لرزہ فگن اور جگر پاش مصائب و آلام کا شکار
ہوئی ہے اُس کی نظیر نوشت یدی کہیں ملے۔ دنیا بھر کی تاریخ کے رنگین اوراق کے مقابلہ میں اکیلے روس کی
خونی داستان کا پلڑا شاید جھکتا ہی نظر آئے گا۔ اور سے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نظامِ حکومت

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ ایسی تمثیلی سوسائٹی (Ideal Society)
کی تشکیل کے بعد جس کے خواب مدعیان اشتراکیت دیکھ رہے ہیں اشتراکیت کا نظام
حکومت کیا ہوگا؟ اس کے متعلق (Stalin) اپنی کتاب (Leninism) میں لکھتا ہے۔

"لینن ازم (عہد حاضرہ کی اشتراکیت) سے مُراد مزدوروں کی جماعت کے ڈکٹیٹر مقرر کرنے کا نظریہ
اور اس نظریہ کی عملی ہیئت کذائی ہے۔"

اس کے بعد ڈکٹیٹرشپ (Dictatorship) کی تفصیل خود لینن کے الفاظ میں یوں
لکھتا ہے۔

"ڈکٹیٹر ایسی مختار عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق
العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سُن لیں
اور خوب غور سے سُن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں "قوت" غیر محدود اور قاہرہ قوت۔ جو

جبر واکراہ پر مبنی ہو۔ اور جسے آئین و دستور شریعت و قانون سے کچھ سروکار نہ ہو"

اس اجمال کی مزید تفصیل وہ (Foundations of Leninism) میں دیتا ہے

اور لکھتا ہے۔

"مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ ایسی انقلاب پسند اور صاحب اقتدار ہستی کا وجود ہے جس کی مطلق العنانی سرمایہ داری کی مکمل شکست و ریخت کے بعد لوگوں سے بجبر منوائی جائے گی"

دوسری جگہ خود لینن کے الفاظ نقل کر کے وہ لکھتا ہے۔

"مزدوروں کا ڈکٹیٹر جمہوریت کے انداز کی صاحب اقتدار ہستی نہ ہوگی جس کا انتخاب رائے عامہ سے عمل میں آتا ہے"

چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے شروع شروع میں مزدوروں اور کسانوں کے مندوبین پر مشتمل ایک آئینی مجلس قائم ہوئی تھی لیکن ۶ر جنوری ۱۹۱۸ئ کو لینن نے اس مجلس کو کالعدم کر کے اپنے ڈکٹیٹر ہونے کا اعلان کر دیا۔

عملی حیثیت سے اگرچہ روس کی حکومت اپنے آپ کو اشتمالی جمہوریت (Socialist) (Republic) کہتی ہے لیکن درحقیقت وہاں اشتراکین کی جماعت اور اس جماعت کا ڈکٹیٹر ہی اصل حاکم ہے۔ اس جمہوریت میں جس انداز سے نمائندے منتخب ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک کسان نے کانگریس کے بھرے مجمع میں کہہ دیا تھا کہ رائے عامہ تو محض ایک کھلونہ ہے اشتراکین اگر ہمیں مجبور کریں تو ہمیں ٹٹو کو نمائندہ بنا کر بھیجنا پڑ جاتا ہے۔

(Communism Exposed)

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ اشتراکیت کا موجودہ نظام حکومت شخصی اور بالکل ایسا ہی مطلق العنان ہے۔ جیسا شہنشاہیت کا نظام حکومت تھا (Religion—under the Soveit) کا مصنف لکھتا ہے کہ۔

"بالشوزم اپنی ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ بلا شائبہ تشکیک شخصی حکومت ہے بلکہ قدیم نظام شخصیت

سے بھی زیادہ خودمختیار۔"
کی ہے۔ اس کی تائید اشتراکیوں کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس نے ان الفاظ میں
اس کی تائید اشتراکیوں کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس نے ان الفاظ میں
(انسائیکلو پیڈیا
"سیاسی نظام حکومت میں جمہوریت کے طرز حکومت کو مسترد کر دیا جائے۔"

برٹانیکا)۔
اور بفرض محال اگر کسی ملک کے سوشلسٹ جمہوری حکومت بھی قائم کرنا چاہیں تو اس کی نوعیت کیا ہو گی؟
اس کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو کی زبانی سنئے جو فرماتے ہیں کہ۔
"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں
رکھتی ہے۔" (میری کہانی ص۴۵۵)۔
اور اس حقیقت کا عملی ثبوت آپ کو آج کل کے کانگریسی صوبوں کے اندازِ حکومت سے بخوبی مل سکے گا۔ پھر جو حیثیت گاندھی جی کو دی جا رہی ہے۔ نگہ حقیقت بیں اس سے بھی اندازہ کر سکتی ہے کہ ہوا کا رخ کس طرف کو ہے۔

ان اصول و مبادیات سے لازمی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اشتراکیت کا نصب العین اور دستور اساسی حسب ذیل شقوں میں منقسم ہے۔

نظام معاشی:۔ ہر قسم کی شخصی اور انفرادی ملکیت خواہ وہ جائیداد کی شکل میں ہو یا سرمایہ کی، یکسر مٹا دی جائے۔ انفرادی کوششوں اور ذاتی محنتوں کے حاصل کو عوام کی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا جائے۔ تاکہ جماعتی تفریق مٹ جائے اور مالی مساوات پیدا ہو جائے۔

نظامِ عائلی:۔ ازدواجی تعلقات پر سے تمام قیود اور پابندیاں اٹھا دی جائیں۔ عورت کو ہر مرد سے اختلاط جنسی کی مکمل آزادی ہو نیز بچے عوام کی ملکیت قرار دیئے جائیں۔ اور اس طرح "نظام عائلی" کو کالعدم کر دیا جائے۔

نظامِ حکومت:۔ ہر قسم کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو، اس وقت تک حکومت کے تمام اختیارات ایک قوت قاہرہ یعنی منزہ عن الخطاء اور مطلق العنان

ڈکٹیٹر کو دے دئے جائیں۔

نظامِ مذہب: خدا کی ہستی کا اعتقاد ذہن انسانی سے محو کر کے تمام مذاہب کا نام و نشان صفحۂ ارض سے مٹا دیا جائے۔ اور جب یہ ہو گیا تو عاقبت پر ایمان خود بخود ناپید ہو جائے گا۔

طریق کار: ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جائز و ناجائز ہر حربہ استعمال کیا جائے۔ اور خون و آتش کی ہلاکت انگیزیوں سے لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس نظام زندگی کو اختیار کریں۔
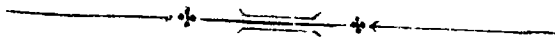
یہ ہے مختصراً وہ سوشلزم جس کے متعلق ڈاکٹر اشرف صاحب کا ارشاد ہے کہ اس کے خلاف یہ "پروپیگنڈا قطعاً لاعلمی پر مبنی ہے کہ" وہ خدا اور مذہب کے خلاف ہے۔ قدیم تمدن اور کلچر کے خلاف ہے۔ ضابطۂ اخلاق کے خلاف ہے۔ ازدواجی تعلقات کی حدود و قیود کے خلاف ہے۔ اس کے نظام حکومت میں جمہوریت نہیں۔ سوشلسٹ تشدد پسند ہوتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ ہم حیران ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو "قطعاً لاعلمی" پر مبنی سمجھیں یا دانستہ کتمان حقیقت پر۔ بہر حال سوشلزم کے بنیادی اصول آپ کے سامنے ہیں۔ اور ان کی ایک ایک شق سوشلسٹ مفکرین کے اقوال و کتب کی اسناد پر مبنی ہے۔ ان حقوں کو سامنے رکھکر اب ہم دیکھیں گے کہ سوشلزم کہاں تک اسلام کے موافق یا مخالف ہے۔
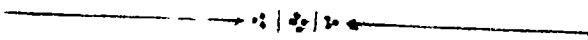
جس طرح اشتراکیت کے تعارف میں صرف ان ہی اصولوں کو معتبر سمجھا گیا ہے جو مدعیانِ تحریک کے نزدیک مستند ہیں اور اُن کے مادہ افزدعات یا ذاتی قیاسات کو اہمیت نہیں دی گئی۔ اسی طرح اسلامی تعلیم کو پیش کرتے وقت صرف قرآن کریم کی نصوص صریحہ اور سنت نبوی کی حکمت بالغہ کو ہی سامنے رکھا جائے گا۔

نظامِ معاشی | اشتراکیت ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن اسلام ہر شخص کی کمائی

اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے زمانہ ظہور اسلام میں جائداد و املاک عموماً مویشیوں کی شکل میں تھیں۔ ان کے متعلق فرمایا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ۔۷۱-۳۶

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے اپنے دست قدرت سے مویشی پیدا کئے ہیں جن کے یہ لوگ مالک ہیں۔

جب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں انسان کی ملکیت ہو سکتی ہیں تو انسان کی اپنی کمائی اور مصنوعات تو یقیناً اس کی ملکیت ہوں گی ارشاد ہے۔

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ ۳۲-۴

جو مرد کمائے ہیں اس میں مردوں کا حصہ ہے اور جو عورتیں کماتی ہیں اس میں عورتوں کا حصہ ہے۔

اشتراکیت کے اصول نفی املاک سے اسلام کا معاشی تمدنی اور عمرانی ہر قسم کا نظام منہدم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۚ ۱۷-۲۶

قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا۔ اور محتاج اور مسافر کو بھی۔ اور مال کو بے موقع فضول خرچی میں نہ اڑانا۔

ظاہر ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کوئی چیز کسی کی ملکیت ہو۔ اگر ہر چیز غیر کی ملکیت ہو اور کمانے والے کو صرف اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے تو وہ دوسروں کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے یہی حال ترکہ و وراثت کے احکام کا ہے جن پر ذاتی ملکیت کی عدم موجودگی میں عمل ہو ہی نہیں سکتا حکم ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ ۳۳/۴

اور ہر ایسے مال کے لئے جسے والدین اور رشتہ دار لوگ چھوڑ دیں ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں اور جن لوگوں

سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں ان کو ان کا حصہ دیدو۔

دوسری جگہ ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۔ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۔ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۔ ط - ۷ - ۴

مردوں کے لئے حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں وہ چیز تھوڑی ہو یا بہت حصہ قطعی ہے:

کہا جا سکتا ہے کہ وصیت، وراثت، ترکہ کے احکام اسی صورت میں نافذ العمل ہیں جب کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر مرے۔ اگر کوئی شخص ترکہ نہ چھوڑے تو ان احکام کا اطلاق نہیں ہوگا۔ پس اشتراکیت میں جب ترکہ ہی نہیں تو یہ احکام خود بخود ساقط ہو جائیں گے۔

بظاہر یہ اعتراض قوی نظر آتا ہے لیکن ادنے تدبر سے اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ وراثت و ترکہ کے احکام اسی وقت نافذ ہوں گے جب کوئی ترکہ چھوڑ کر مرے لیکن "ترکہ نہ چھوڑنے" اور "ترکہ نہ چھوڑ سکنے" میں بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت میں جواز ہے اور دوسری میں جبر۔ قرآن حکیم کے اوامر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بجائے خویش مستحسن ہیں اور جس چیز کو قرآن نے حلال کیا ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے حرام نہیں بنا سکتی حتےٰ کہ یہ اختیار خود نبی ؐ کو بھی نہیں دیا گیا حضور ؐ نے ایک قسم کے شہد نہ کھانے کی پابندی اپنے اوپر عائد کر لی۔ تو فوراً حکم آ گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۚ ۶۶

اے نبی ؐ جس چیز کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اسے اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو۔

یا مثلاً قرض لینے اور دینے کا معاملہ ہے ہو سکتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں ایسا وقت آجائے کہ کسی کو قرض لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ یا کسی کے پاس قرض دینے ہی کو کچھ نہ ہو تو ان صورتوں میں اگرچہ قرضہ کے احکام ساقط العمل ہو جائیں گے لیکن دنیا کی کوئی طاقت ایسا قانون نہیں بنا سکتی جس کی رو سے قرآن کے تجویز فرمودہ قواعد لین دین کو اس طرح بدل دیا جائے کہ ایک مسلمان باوجود جائز ضرورت و احتیاج کے کسی سے کچھ قرض نہ لے سکے۔ یا

دوسرا مسلمان استطاعت و اقتدار رکھتے ہوئے اپنے مسلمان بھائی کو قرضہ نہ دے سکے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے،
وجعلنا موالی ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں۔ اور مسلمان اشتراکیت کہتے ہیں کہ جنہیں اللہ وارث مقرر کرتا ہے
انہیں ہم ورثہ سے محروم کرتے ہیں۔ کیا کوئی مسلمان ایسے قانون کو برداشت کر سکتا ہے جو خدائی قانون کا
ناسخ ہو۔

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور نصب العین حیات ہی یہ ہے کہ وہ اللہ
کے راستے میں ہر وقت ایثار کے لئے تیار رہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے پہلے ورق میں انسانوں کی ان امتیازی
خصوصیات کا ذکر ہے جس سے وہ صحیح اسلامی سوسائٹی کے افراد بن سکتے ہیں۔ یہ خصوصیتیں تین ہیں۔

(۱) الذین یؤمنون بالغیب	ایمان بالغیب
(۲) ویقیمون الصلوٰۃ	عبادت بدنی (نماز)
(۳) ومما رزقنٰهم ینفقون	انفاق فی سبیل اللہ

اور اصل نیکی کے متعلق فرمایا۔

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ط ۳-۹۲

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہاں تک کہ اپنی محبوب شے کو خرچ نہ کر دو۔

یہ ظاہر ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ذاتی ملکیت تسلیم کی جائے۔ ورنہ جو چیز اپنی ملکیت
ہی نہیں اس میں سے انفاق کیسا۔ قرآن کریم نے فرمایا۔ ومما رزقنٰهم ینفقون جو کچھ ہم نے ان کو دیا
ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ گویا جو اللہ نے دیا ہے وہ انفرادی ملکیت ہے۔

وآتوهم من مال اللہ الذی آتاکم۔ ۲۴-۳۳-

اس مال میں سے ان کو (غلاموں کو) بھی دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

انفقوا من طیبٰت ما کسبتم ۲-۲۶۷

اپنی کمائی میں سے عمدہ چیز کو خرچ کیا کرو۔

ما کسبتم سے مطلب ہی یہ ہے کہ جو کچھ تم کماتے ہو۔ وہ تمہاری ملکیت سے

وَاَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط (۷ - ۵۷) جس مال کا تم کو (پہلوں سے منتقل کرکے) وارث بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

اشتراکیت کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی کا سرمایہ۔ جائداد۔ کمائی۔ ورثہ سب کچھ حکومت لیلے تو یہ انفاق کی وہ حد ہے جس سے بڑھ کر قربانی اور ایثار کی مثال نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسلامی انفاق (جو تقوے پر مبنی ہے) اور اس قسم کے جبر میں بڑا فرق ہے۔ اسلام نے بھی ایک ٹیکس (زکوٰۃ) مقرر کیا ہے۔ جو بہر حال وصول کیا جاتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۹-۱۰۳

ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے۔ کہ اس سے بظاہر و باطن میں پاک ہو جائیں گے۔ اور پھر ان کے لئے دعا کیجئے۔

لیکن ساتھ ہی اس نے خیرات کا بھی حکم دیا ہے۔ جس میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ - قُلِ الْعَفْوَ - (۲۱۹ - ۲)۔

آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ کہہ دیجئے کہ جتنا آسان ہو۔

اس کے علاوہ جہاں دنیاوی قوانین سے محض قومی افادیت اور ملکی مفاد مفقود ہوتے ہیں۔ وہاں اسلامی انفاق میں ان مفاد کے ساتھ ساتھ تزکیہ قلوب و نفوس بھی پیش نظر ہے۔ ایک طرف قوم کے محتاج۔ مفلوک الحال افراد کی دستگیری مقصود ہے تو دوسری طرف معطی کے قلب کو حب مال کی خباثت سے پاک اور اس کی جگہ ایثار و قربانی کے جذبہ کی پرورش کرنا بھی مطلوب ہے۔ یہ دوسرا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان ارادہ و اختیار کے باوجود اپنی پاک کمائی اور جائز ملکیت میں سے بہ خوشی خرچ کرے۔ قرآن کریم نے اس فرق کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی کیفیت اس دانہ کی سی ہے جس میں سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال کے اندر سو دانے ہوں؛ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ آزار دیتے ہیں ان کے (اعمال کا) ثواب ملے گا۔"

"مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کرنا بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے بعد آزار دیا جائے۔ اے
ایمان والو احسان جتا کر اور ستا کر اپنی خیرات کو برباد نہ کرو۔ وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لئے
خرچ کرتا ہے اور وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی حالت اس چکنے پتھر کی سی ہے جس پر کچھ
مٹی ہو لیکن جب زور کی بارش ہو تو اسے خالی کر جائے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی کا پھل ہاتھ نہیں
لگتا۔ ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو خدا کی رضاجوئی کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اپنے
نفسوں کو اس میں ثابت قدم کا خوگر بنا کر اپنے اندر پختگی پیدا کرنا چاہتے ہیں اس باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلے پر
واقع ہو اگر بارش زور کی پڑے تو وہ دوگنا پھل لائے۔ اور اگر زور کا مینہ نہ برسے تو معمولی پھوار بھی اس کے
لئے کافی ہے۔" (البقرہ رکوع ۳۶)۔

چنانچہ یہاں ریا کو بھی کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں مقصد نہیں ابتغاء مرضات اللہ ــــــ تھا
جو حاجتمند کو دیتا ہے قرار دے دیا۔ اصل روادارانہ کے ساتھ انفاق کی غرض اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ نفس کو
اس عمل صالح کا خوگر بنا کر اس میں ایثار، ہمدردیٔ خلائق کی پختگی پیدا کر دی جائے۔ یہ چیز سرمایہ کے
جبر سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس بیان سے واضح ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد اسلام نے قائم کی ہے اشتراکیت اس کے
بالکل منافی ہے۔ اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ نظام معاشی ہماری اقتصادی مشکلات کا واحد حل ہے جب تک زکوٰۃ
باقاعدہ بیت المال میں جمع ہوتی رہی اور اس کی تقسیم کا طریقہ درست رہا اس وقت تک اہل حاجت کی
امداد اور قومی ضروریات میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ حالت ہوگئی کہ زکوٰۃ کا روپیہ
بیت المال میں موجود ہے مگر کوئی لینے والا نہیں۔ صدقہ وخیرات کی تحریص کا نتیجہ یہ تھا کہ اغنیاء محتاجوں
کے گھروں پر جا جا کر روپیہ تقسیم کرتے تھے۔ اور قانون وراثت کی رو سے جائداد کی دوامی ملکیت کا امکان
ہی جاتا رہا تھا جس کے ماتحت مسلم کی جائداد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، دور دور کے
انسان اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور دولت کسی ایک طبقہ کے لوگوں میں محدود ہونے نہیں پاتی۔

مساوات

ادنی و اعلیٰ۔ امیر و غریب۔ متمول و مفلس کے باہمی امتیازات کو مٹا کر مالی مساوات کے ذریعہ سے انسانوں کو ایک ہی سطح پر لے آنے کا اصول کچھ ایسا سحر کار واقع ہوا ہے کہ عوام تو ایک طرف بڑے بڑے مفکرین اس کی نظر بندی سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور یہی اشتراکیت کا وہ اصول ہے جسے بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ عین اسلام قرار دیا جاتا ہے آیئے دیکھیں کہ اسلامی مساوات اور اشتراکی مساوات میں کیا فرق ہے۔ اشتراکیت کا تقاضا ہے کہ تمام انسانوں کی دولت اور اُن کی محنتوں کا حاصل عوام کی ملکیت قرار دے دیا جائے اور وہاں سے ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق کفاف مل جائے تاکہ ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز اُٹھ جائے۔ اور سرمایہ دار اور مزدور میں جو حدِ فاصل ہے وہ خود بخود مٹ جائے۔ لیکن اسلام کی نظر میں مساواتِ انسانی کا تخیل صرف مالی مساوات سے بہت زیادہ وبلند و بالا ہے

اسلامی نظام سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن اور غریب انسانوں کا دلی ہمدرد ہے۔ اسلام کے نزدیک نہ تو مال و دولت معیارِ فضیلت بن سکتے ہیں اور نہ حسب نسب کے امتیازات۔ قرآن کریم نے معیار بہتری یہ بتایا ہے

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۵ ۴۹/۱۳

اے ساکنانِ زمین ہم نے تم سب کو ایک (ہی نوع کے) مرد اور ایک ہی نوع کی عورت سے پیدا کیا ہے (ہمارے نزدیک تم سب برابر ہو) اور تمہارے مختلف گروہ اور قبیلے محض اسلئے بنائے ہیں کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ورنہ اللہ کے نزدیک تم سب میں قابلِ عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ حقیقی عزت اور اصلی مفاخر دولت کی فراوانی اور سرمایہ کی کثرت میں نہیں ہے بلکہ دلوں کے تقویٰ اور اعمال کی صلاحیت میں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دو انسان جب اس میدانِ مسابقت میں نمودار ہوئے۔ جن میں سے ایک ہابیل غریب لیکن خدا سے ڈرنے والا اور دوسرا قابیل امیر اور متکبر تھا تو اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی کو شرفِ قبولیت بخش کر یہ واضح کر دیا کہ خدا کے نزدیک معیارِ فضیلت تقویٰ ہے۔ (سورۂ مائدہ رکوع ۵)

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ مال و دولت کے ساتھ اگر تقویٰ و خدا ترسی نہ ہو۔ اور وہ تکبر نخوت تمرد اور

سرکشی کا موجب بنتا ہے۔ تو ایسا مال انسان کو بہت جلد ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو قارون کا ذکر (۲۸: ۷۹-۸۱) اور ان دو شخصوں کا قصہ جن میں سے ایک کے دو باغ تھے اور دوسرا غریب تھا۔ (الکہف ۵۴-۳۲، ۴۵)۔

لیکن جہاں قرآن کریم نے فضیلت و فوقیت کا معیار مال و دولت کی بجائے اعمال صالحہ اور حسن نیت کو قرار دیا ہے۔ اور دولت و حشمت سے جو تمرد اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مختلف عنوانوں سے مذمت کی ہے۔ وہاں اس نے دولت و ثروت کے اعتبار سے بنی نوع انسان میں مدارج کے اختلاف کو مقتضیات فطرت میں سے قرار دیا ہے اور کارو بار عالم کے چلانے کے لئے اس تفریق مدارج کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ فرمایا

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا۔ ۴۳/۳۲

ان کی دنیاوی زندگی کی روزی ہم تقسیم کرتے ہیں اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت اور فوقیت دے رکھی ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔

چونکہ اختلافِ مدارج فطری امر تھا۔ اور اس کا قائم رکھنا ضروری تھا۔ اس لئے فرمادیا کہ اس تفریق کو دیکھ کر حسد نہ کیا کرو۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط ۴/۳۲

اور تم ایسے کسی امر کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اس تفریق مدارج کو پیدائشی یا پہلے جنم کے کرموں کا پھل نہیں بتایا۔ بلکہ کسب دولت کی قابلیت و استعداد کے اختلاف پر مبنی قرار دیا ہے اور فرمایا۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۵۳ انسان کو وہی کچھ ملیگا جسکی اس نے کوشش کی ہو۔

دولت کی مساویانہ تقسیم کو اس نے خلافِ فطرت قرار دیا ہے۔ اور اسے کفرانِ نعمت بتایا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَآدِّي

رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ ۱۶/۷۱

اللہ نے تم کو ایک دوسرے پر رزق میں فضیلت دی ہے۔ سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے۔ وہ اپنے مال کا حصہ اپنے غلاموں (اور نوکروں) کو اس طرح کبھی نہ دیں کہ مالک و مملوک سب آپس میں برابر ہو جائیں۔ کیا اس طرح اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔

کیونکہ اختلافِ مدارج اعمال و مساعی کے مطابق ہوتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۴۶/۱۹ | اور ہر ایک کے مدارج اسکے اعمال کے مطابق ہیں۔

اختلافِ مدارج دنیاوی کاروبار کے لئے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ انسان کی عمرانی زندگی کا تقاضا ہے کہ تقسیمِ عمل ہو۔ اور چونکہ اعمال بہرحال ادنیٰ اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اس لئے تقسیمِ عمل کے اعتبار سے مدارج مختلفہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر خاص خاص قویٰ ودیعت کئے گئے ہیں۔ جن کو بروئے کار لانے کے لئے خاص خاص جذبات کو حرکت میں لانا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً قوتِ مدافعت کا مظاہرہ اُسی وقت ہوگا۔ جب غیرت و حمیّت یا دفعِ مضرت کا جذبہ حرکت میں آئیگا۔ یا مثلاً قوتِ استدلال کے جوہر صرف اُسی وقت کھلیں گے۔ جب جذبۂ خودداری پر ٹھیس لگے گی۔ اسی طرح کسب و ہنر کے ملکات اپنی انتہائی وسعتوں کے ساتھ صرف اس صورت میں رُونما ہونگے جب اُن کے لئے کوئی جذبہ یا کشش موجود ہوگی۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ اپنی محنت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو "میری" کہنا چاہتا ہے۔ "میں" اور "میرا" ہی وہ "سم سم" ہے جس سے تمام مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اور ہر مشکل کا طلسمی باب خود بخود کھل جاتا ہے۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۱۱:۳) | ہر بڑائی والے کو اس کی بڑائی دیجائیگی۔

کارگہ حیات میں جتنی جدوجہد۔ جسقدر تگ و دو ہے سب اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہے نبضِ حیات میں تموّج ہے تو اسی کے دم سے۔ اور نظامِ عالم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔ ذہنِ انسانی سے یہ جذبہ نکل جائے تو ہنگاموں اور شورشوں کی شان و شوکت دنیا راہبوں کی جھونپڑی

اور سنیاسیوں کی کٹیا بن جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مال و دولت کی فراوانی تکبر و غرور پیدا کردیتی ہے جو انسانی استبداد و مظالم کی اصل الاصول ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک درد سر کا علاج سر کاٹنا نہیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری بلکہ یہ ہے کہ صحت اعتدال پیدا کرکے درد کو دور کرتا ہے۔ انسانی اعمال میں بڑی افراط اور تفریط ہے ان دونوں کے اعمال میں اعتدال پیدا کرنا اسلام کا کام ہے۔ مال و دولت کو معیار فضیلت دار دینے سے سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اور مال و دولت پر لات مار کر جنگلوں کا رخ کرنے سے نظام کائنات درہم و برہم ہوجاتا ہے۔ اسلئے اسلام نے ایک طرف اس رہبانیت سے منع کیا۔ اور جد و جہد حیات میں مساعی و اعمال میں مسابقت و مقابلہ کو اصل زندگی قرار دیا۔ اور دوسری طرف سرمایہ داری کے عواقب خبیثہ اور نتائج قبیحہ کے خلاف جہاد کیا۔ کہ مال و دولت کو عزت و فضیلت کا معیار سمجھکر غریبوں کو کچلنا شروع نہ کردیا جائے۔ فرمایا:

انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ۲۱

دیکھئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے لیکن آخرت بلحاظ مدارج اور باعتبار فضیلت بہت بڑی ہے۔

اور اختلاف مدارج کو وجہ ابتلا بتایا۔

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۔ ۶/۱۶۶

اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر رفعت دی ہے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس میں تمہاری آزمائش ہوسکے۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (المائدہ ع ۷) ۵/۴۸

اگر مشیت خداوندی ہوتی تو تمام انسانوں کو ایک ہی جماعت بنا دیا جاتا۔ یہ اس لئے نہیں کیا کہ جو کچھ تم کو دیا گیا ہے اس میں آزمائے جاسکو۔ پس نیکی کرنے کے لئے مسابقت کرو۔

ایک شخص اپنی محنت و مساعی سے جو کچھ کماتا ہے۔ اسے اس کی واحد ملکیت قرار دیدیجئے۔ اور پھر

اسے ترغیب دیجئے کہ وہ برضا ورغبت اپنے اختیار وارادہ سے اپنی کمائی سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے دیکھئے اس سے انسانیت کتنے قدم آگے بڑھتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دولت مند اور صاحب ثروت شخص جو اپنے آپ کو واجب التکریم سمجھتا ہے کسی غریب اور مفلس انسان کی جو صاحب تقویٰ ہے خود بخود اس وجہ سے عزت کرتا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ تو غور فرمایئے کہ انسانیت کس درجہ فروغ پاتی ہے۔ لیکن اگر ارادہ اور اختیار کو انسان سے چھین لیا جائے تو انسانیت اور شرافت تباہ ہو جاتی ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ ۶۷

اللہ نے موت وحیات (انسانی) کو پیدا کیا تاکہ تم آزمائے جاؤ کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

یہی وہ ابتلا ہے جس سے انسانیت تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اشتراکیت کی جبری مساوات انسانی شرف اختیار کی ترقی معکوس اور رجعت قہقری ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ (والتین)

ہم نے انسان کو بہترین ہیئت کذائی میں بنایا پھر اس کو ادنیٰ درجہ کی طرف لوٹا دیا۔

اسلامی مساوات کی درخشندہ مثالیں اس کے صدر اولیٰ میں ہر مقام پر نظر آتی ہیں۔ جن کے پیش کرنے سے اشتراکیت باوصف اپنے مزعومہ دعاوی مساوات یکسر قاصر ہے۔ ایک حبشی غلام جسے خود حضرت ابوبکر صدیق ؓ زر فدیہ دیکر آزاد کراتے ہیں کے شرف اعتبار کا یہ عالم ہے کہ جب وہ دور سے آتا دکھائی دیتا ہے تو عمرؓ اور ابوبکرؓ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ سیدنا بلال ہمارے آقا آرہے ہیں۔ اور بنی ہاشم کے ممتاز ترین قبیلہ کے ممتاز ترین رکن۔ مولائے علیؓ فرماتے بلال میرے اہل بیت میں سے ہے۔ روم کا ادنیٰ مزدور مدینہ میں آکر آزادی حاصل کرتا ہے اور حضرت عمرؓ اپنی آخری خواہش یہ فرماتے ہیں کہ میرے جنازہ کی نماز صہیب رومی پڑھائیں۔ خود رسول اللہؐ اپنے غلام زید بن ثابتؓ کے ساتھ بنی ہاشم کے خاندان کی خاتون محترمہ اپنی پھوپھی زاد بہن کا عقد فرما دیتے ہیں۔ اسی غلام کے بیٹے (اسامہ بن زیدؓ) کا اس

لشکرِ جرار کا سپہ سالار مقرر کر دیا جاتا ہے جس میں ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے قصرِ اسلامی کے ارکین اعلیٰ بحیثیت سپاہی کے کام کرتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں ہمیں یہ تصویریں بھی ملتی ہیں کہ خلیفۃ المسلمین جناب عمرؓ اس اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے پیدل چل رہے ہیں جس پر آپ کا غلام سوار ہے۔ یا ایک نومسلم نصرانی شاہزادے کی چادر پر طوافِ کعبہ کے دوران میں جب ایک غریب بدو کا پاؤں پڑ جاتا ہے تو شاہزادہ دنیاوی وجاہت کے گھمنڈ میں اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے۔ اور بدو اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔ شاہزادہ دربارِ خلافت میں آکر شکایت کرتا ہے کہ ادنیٰ بدو نے ایک عالی وقار امیر کے طمانچے کا جواب طمانچے سے دیدیا۔ وہاں سے فیصلہ ہوتا ہے کہ شاہزادے نے چونکہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اس لئے اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ شہزادہ مساوات کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور کہتا ہے کہ شاہزادہ اور مزدور آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔ جب کہا جاتا ہے کہ اسلام کی ترازو میں دونوں برابر ہیں۔ تو وہ اسلام چھوڑ کر عیسائی ہو جاتا ہے۔ خلیفۃ المسلمین نے اس کا عیسائی ہونا برداشت کر لیا لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ مساوات اسلامی کے بنیادی اصول پر کسی قسم کا حرف آئے۔ یہی وہ مساوات کی تعلیم تھی جو سردارانِ قریش کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی اور جس کی وجہ سے وہ اسلام کے دشمن بن گئے کیونکہ اس تعلیم کی رُو سے اُن کے تمام مدارج و مراتب ملیامیٹ ہوئے جاتے تھے۔ ابوجہل کائنات سے اپیل کرتا ہے کہ وہ محمدؐ سے بدلہ لے۔ کیونکہ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب　　از قریش و منکر از فضلِ عرب!

در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ　　با کلفتانِ حبش در ساختہ

احمراں با اسوداں آمیختند　　آبروئے دود مانے ریختند

(اقبالؒ)

اس دورِ سعید کے بعد جو انسانیت کے معراجِ کبریٰ کا عکس تھا۔ اسلام کے دورِ شاہنشاہیت میں بھی مساوات کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے مفکرین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ شاہزادہ

مراد کے لئے کسی معمار نے مسجد بنائی۔ شاہزادہ کو پسند نہ آئی۔ اور اس نے جوشِ غضب میں معمار کے ہاتھ کٹوا دئے۔ معمار نے قاضی کے ہاں انصاف چاہا۔ مراد مجرموں کے کٹہرے میں لایا گیا۔ اس نے اقرارِ جرم کیا۔ قاضی نے فیصلہ دیا کہ جس طرح معمار کے ہاتھ کاٹے گئے ہیں اسی طرح شاہزادہ کے ہاتھ بھی کاٹ دئے جائیں کہ

عبدِ مومن کمتر از احرار نیست ۔۔۔ خون شہ رنگیں تر از معمار نیست
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے ست ۔۔۔ بوریا و مسند دیبا یکے ست (اقبالؒ)

شاہزادہ نے ہاتھ بڑھا دئے۔ مدعی کو تاب خاموشی نہ رہی اور پکار اٹھا کہ میں نے شہزادہ کا قصور معاف کیا۔ آج کل کے گئے گذرے زمانے میں بھی اسلامی مساوات کا نظارہ دیکھنا ہو تو کسی مسجد میں جماعت کے وقت چلے جائیے۔ جہاں انسانوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

بندہ و صاحب محتاج و غنی ایک ہوئے ۔۔۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہ مثال بھی آپ کو صرف اسلام کی تاریخ ہی میں ملے گی کہ ہندوستان میں "غلاموں کا خاندان" اور مصر میں "مملوک" (غلام) صدیوں تک حکومت کرتے رہے۔ غلام ہو کر آقا اور مملوک ہو کر مالک بن جانا محض اسلام کے طفیل تھا۔

مالی تفوق کے اعتبار سے خود دورِ صحابہؓ میں مختلف طبقات موجود تھے۔ حضرت زبیر بن عوامؓ کے کاروبار میں ایک ہزار مزدور روزانہ کام کیا کرتے تھے۔ حضرت طلحہؓ کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک ہزار دینار تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اُن کا قافلہ مدینہ میں آیا تو اس میں سات سو اونٹوں پر صرف اشیائے خوردنی لدی ہوئی تھیں۔ لیکن مسلمانوں میں ان ہستیوں کا نام اگر آجتک سلام و صلوٰۃ کے ساتھ لیا جاتا ہے تو اس کی وجہ اُن کی دولت و ثروت نہیں بلکہ ان کا وہ ایمان، تقویٰ، اعمال صالحہ، ایثار، قربانی ہیں۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے انہوں نے نمونہ کے طور پر یادگار چھوڑا ہے۔ انہی متمول صحابہ کبار کے ساتھ ساتھ اصحاب صفہ جیسے مفلوک الحال حضرات کا نام بھی آجتک مسلمانوں کے لئے باعثِ افزائش ایمان و عمل ہے۔

اسلام نے مال کو خزانوں و دفینوں کی شکل میں زمین دوز کرنے سے منع کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ..

(۹ - ۳۴ - ۵)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے آپ انہیں ایک بڑے دردناک عذاب کی خبر دیجیے۔ انہیں دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا۔ اور اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں کو داغا جائیگا۔ یہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا۔ اس لیے جمع کرنے کا مزہ چکھو

اور مال و دولت کے انتقال کی صورت اس نے باہمی رضامندی قرار دی ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ
تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ - ۴/۲۵

اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ۔ لیکن اگر تجارت ہو یا باہمی رضامندی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں

لیکن بیع و اشتراء لین دین ہر معاملہ میں محتاجوں کے ساتھ احسان و مروت کی تاکید کی ہے۔ چنانچہ ربوا کو حرام قرار دیکر قرضہ کے متعلق فرمایا۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ - وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o (۲ : ۲۸۰)

اگر مقروض تنگدست ہو تو آسودگی تک اسے مہلت دیدو اور معاف کردو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل اعتنا ہے۔ اشتراکیت کے حامی سرمایہ داری کے خلاف یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ اس میں مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ لیکن کیا خود اشتراکیت اس الزام سے بری ہے؟ نظام اشتراکیت کے ماتحت یہ فیصلہ کہ مزدور کس قدر کام کرے حکومت کرتی ہے (اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملے گی) مزدور کی محنت کا حاصل حکومت کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور مز

کی ضروریات کا تعین بھی حکومت ہی کرتی ہے جس کے مطابق اسے زرکفاف ملتا ہے کیا یہ ہر ہر قدم پر مزدور کی آزادی کو سلب کرنا نہیں ہے؟ فرض کرو ایک مزدور سے حکومت اس قدر کام لیتی ہے جس کا معاوضہ قاعدے کے مطابق چار روپے روزانہ ہونا چاہیے لیکن اگر اس کی ضروریات کے لئے صرف ایک روپیہ روزانہ کافی سمجھا جاتا ہے تو باقی تین روپے روزانہ حکومت کے پاس چلے جاتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام میں جہاں تک مزدور کے معاوضہ کا تعلق ہے کچھ فرق نہیں رہتا کہا جاسکتا ہے کہ اشتراکی نظام کے ماتحت حکومت مزدوروں ہی کی اصلاح و بہبود پر بقایا تین روپے صرف کر دیتی ہے اور سرمایہ دار اسے اپنے ذاتی مصرف میں لاتا ہے لیکن یہ خرچ کی نوعیت کا فرق ہے جہاں تک مزدور کا تعلق ہے دونوں اس کی کمائی کے غاصب ہیں۔ اگر مزدور اپنی مرضی سے اپنی کمائی کا کچھ حصہ کسی کے نام منتقل کردے تو یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کی محنت کا ماحاصل اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرلے۔ قرآن کریم اس قسم کے معاملہ کو غصب و ظلم قرار دیتا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ۔ ۸۳ - ۱

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے کہ جب لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا پورا لیں۔ اور جب ان کو ماپ کر دیں تو کم دیں۔

اس ناپ تول کے اصول میں معاوضہ بالمثل کی تمام فروعات شامل ہیں۔ اور خسران مبین ان لوگوں کے لئے ہے جو دوسرے سے محنت تو پوری پوری لیں لیکن معاوضہ کم دیں۔ قرآن کے نزدیک محنت کرنیوالا اپنے پورے معاوضہ کا حقدار ہوتا ہے جو اسے فوراً مل جانا چاہیے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "مزدور کو اس کی پوری پوری مزدوری دیدو قبل اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو"۔

ضروریات کے تعین کے لئے اسلام نے حدود و شرائط مقرر کر دی ہیں جن سے اسراف و تبذیر کا امکان نہیں رہتا اس نے ہر انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی کمائی کے اندر اپنی ضروریات خود متعین کرے چنانچہ غلامی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہے کہ آزاد اپنی ضروریات کا تعین خود کرتا ہے۔ اور غلام

کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ

يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ ۔ ١٦/٧٥

اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ ایک غلام ہے پرایا جس میں وہ کسی پر اختیار نہیں رکھتا اور دوسرا شخص ہے جسے ہم نے خوب روزی دی ہے اور وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ

جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ دونوں شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں

مسلم اپنی مِلک کا مالک ہے وہ اس کے حق ملکیت کو خدا کے سوا کوئی خرید نہیں سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ ٩-١١١

بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ

ان کو جنت دی جائے گی

یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اسلام میں مسلم کے جان و مال کو خدا نے خرید رکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ حق و صداقت کی حمایت و حفاظت میں اگر ضرورت آپڑے تو عبد مومن بلا تامل اپنی جان و مال کو قربانی کے لئے پیش کر دے گا۔ تو اگر اشتراکی حکومت مزدور کا مال لیکر مفاد عامہ میں صرف کرے تو عین اسلام کے مطابق ہوگا۔ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے اشتراکیت میں مزدور کی محنت کا حاصل حکومت زبردستی لے لیتی ہے اور مزدور کی مرضی کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا لیکن خدا اور بندے کا معاملہ کلیتہً بندہ کی خوشی پر مبنی ہے اگر بندہ خدا کی راہ میں کچھ دیتا ہے تو اپنی خوشی سے اور بدلے کی امید میں دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے انفاق فی سبیل اللہ کے لئے لفظ قرضہ استعمال کیا ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ ۔ ٦٤/١٧

اگر تم لوگ اللہ کو اچھی طرح (خلوص سے) قرضہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لئے بڑھاتا جائے گا۔

مسلم کا ایمان غیر متزلزل ایمان ہے کہ دنیوی زندگی کے بعد اُخروی زندگی ہے جو حقیقی دار المکافات ہے اگرچہ بعض ایسے ہیں جن کا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے مثلاً اعمال صالحہ کے نتیجہ میں عزت و وقار کی حیات

طیبہ۔ اور اعمال بد کے بدلہ میں ذلت و رسوائیوں کی لعنتی زندگی مگر حیاتِ آخروی کے مقابلے میں یہ معاوضے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَّ الدَّارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرًا ۔ (۱۶-۳۰)

جن لوگوں نے نیک اعمال کیے ہیں ان کے لئے اس دنیا میں بھی بہتری ہے اور آخرت تو کہیں بہتر ہے

اشتراکیت میں غریب مزدور کو محنت کا ثمرہ نہیں ملتا۔ اور چونکہ وہ بعد کی کسی زندگی کا قائل نہیں ہے اس لئے اس سودے میں اسے صرف دنیا ہی دینا ہے۔ معاوضہ کچھ نہیں ملتا۔ اگر رضا و رغبت کو مقدم رکھا اور شخص اپنی محنت کی پیداوار کا خود مالک ہو اور ساتھ ہی آخرت پر بھی ایمان۔ تو انفاق اسلامی انفاق ہوتا ہے۔ ورنہ اشتراکیت میں تو خسرۃ الدنیا والآخرۃ اور خالص غلامی کے سوا کچھ نہیں۔

معاشی نظام کی طرح اشتراکیت کے معاشرتی نظام کو بھی جس کی رو سے صرف مالی مساوات قائم ہوتی ہے اسلام کے قانون مساوات سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ وہ قرآن کی نصوص صریحہ اور واضح اور بین تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ لہٰذا جو شخص اس نظام کی ظاہری مساوات سے متاثر ہو کر اسے "عین اسلام" کہتا ہے یا خوش ہوتا ہے کہ روس اسلام کے قریب آرہا ہے وہ حقیقت سے دور ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان چونکہ بالعموم اپنی تعلیم سے بیگانہ ہیں۔ اور اُن کے اعمال کو قرآن سے کوئی نسبت نہیں اس لئے جونہی انہوں نے اشتراکیت میں مساوات کا ذکر سنا (اور دُنیا عدم مساوات سے گھبرا چکی ہے) تو انہوں نے سمجھا کہ یہ مساوات ہی جملہ آلام کا علاج ہے اور اسے عین اسلامی تعلیم قرار دیدیا حالانکہ حقیقی مساوات جس کی دنیا کو تلاش ہے اسلامی مساوات ہی ہے۔ اور اشتراکیت کی مساوات قرآنی تعلیم کے بالکل برعکس ہے۔ حضرت ابو ذرؓ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اغنیا کی دولت کو غربا کا حق سمجھتے تھے۔ گویا اُن کے خیال میں اشتراکیت کی ایک جھلک پائی جاتی تھی۔ حضرت عثمانؓ (خلیفۂ ثالث) کو جب یہ معلوم ہوا۔ تو انہوں نے اُن کو فوراً ربذہ میں بھیج دیا جو ایک بیابان مقام تھا تاکہ تنہائی کی زندگی بسر کریں۔ حضرت ابو ذرؓ نے وہیں وفات پائی۔

معاشرتی اور معاشی نظام کے ماتحت عائلی نظام کا ذکر ضمناً آچکا

نظامِ عائلی (ازدواجی زندگی) ہے اس باب میں عائلی نظام کے ایک اہم پہلو یعنی ازدواجی نظام کے متعلق مزید تصریح مقصود ہے۔ اشتراکیت میں مرد و عورت کے جنسی اختلاط کے متعلق کوئی حدود مقرر نہیں۔ نہ وہاں نکاح ہے نہ طلاق۔ نہ حرام و حلال اور نہ جائز و ناجائز میں تمیز۔ اسلامی تمدن اور شرعی نظام میں ازدواجی تعلقات کے ضبط و انضباط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دنیا نے عورت کے معاملہ میں بھی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ نے عورت کو محض جذباتِ شہوانیہ کا آلۂ کار سمجھا چنانچہ یونان کی ابیقوریت میں عورت کا تخیل کچھ ایسا ہی تھا۔ ایران میں مزدک کے فلسفۂ اشتراکیت کی رو سے عورت سوسائٹی کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ ظہور اسلام سے پیشتر عرب میں بھی عام سوسائٹی کا قریب قریب وہی نقشہ تھا جو آج روس کی اشتراکیت میں پایا جاتا ہے چنانچہ جب کئی مرد ایک عورت سے اختلاط کرتے اور بچہ پیدا ہوتا تو اس کی صورت جس مرد سے ملتی اسی کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا اسے نکاح ۔ بغایا ، کہتے تھے اسی طرح جب دس سے کم مرد ایک عورت سے بیک وقت جنسی تعلقات پیدا کرتے اور بچہ پیدا ہوتا تو عورت جس مرد کی طرف چاہتی بچہ کی نسبت کر دیتی تھی اسے نکاح "جمع" کہتے تھے (اشتراکیت ایسی صورت میں تمام مردوں پر بچے کی کفالت مساویانہ عاید کرتی ہے) نکاح کی ایک شکل "متاع" بھی تھی جس کی رُو سے مرد و عورت باہمی اختلاط کا معاہدہ کر لیتے تھے اور اجور معینہ کے سوائے مرد پر کوئی اور ذمہ داری عاید نہیں ہوتی تھی۔

ان معاہدوں کے علاوہ فحش کاری کی داستانیں اتنی عام تھیں کہ شعرا انہیں فخریہ اپنے اشعار میں بیان کرتے تھے۔

اسلام نے ان فواحش کو دیگر خباثت کے ساتھ ظھر الفساد فی البر والبحر (خشکی اور تری میں فساد ہی فساد برپا تھا) سے تعبیر کیا مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق نہایت واضح اور تاکیدی احکام صا فرمائے اس نے مرد و عورت کے اختلاط جنسی کا صرف ایک طریقہ جائز قرار دیا جسے نکاح کہتے ہیں۔ او اس کے علاوہ اور تمام طریقے حرام اور ناجائز قرار دئے۔ فرمایا۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ - (۳-۴)

عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہو۔ اس سے نکاح کر لو (بجز محرمات کے)

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ - (۵-۵)

(صرف) اس طریق پر کہ انہیں بیوی بنا کر رکھو۔ نہ کہ اعلانیہ بدکاری کرو یا خفیہ آشنائی رکھو۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ - (۲۴-۳۲)

اور جو تم میں بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ط ۱۷-

اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بری راہ۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ ۔ نیز ۳۳/۷

کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو۔ ان میں جو علانیہ ہیں وہ بھی اور جو پوشیدہ ہیں

وہ بھی اور ہر گناہ کی بات۔

نکاح کی غرض و غایت جذباتِ شہوانیہ کا فرو کرنا قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس سے مقصود بقائے نسل انسانی

اور خانگی زندگی کا سکون و راحت بتایا ہے۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ط ۴۲/۱۱

اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے (جن کے ذریعہ سے تمہاری نسل کو پھیلاتا رہے)۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً

وَّرَحْمَةً ط (۳۰-۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ ان کے ذریعہ سے

آرام و سکون ملے اور تم میں باہمی محبت اور جذبہ رافت پیدا کیا۔

نکاح کو قرآن کریم نے معاہدہ قرار دیا ہے اسے عمر قید نہیں بتایا جس کے بندھن مقدرات انسانی کی طرح اٹل

اور جنم لیکھے کی طرح انمٹ ہوں۔ فرمایا۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۲۱-۴)

اور تم ان عورتوں کا مہر کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم ان سے بے تابانہ مل چکے ہو۔ اور تم ان کے ساتھ بہت پختہ

معاہدہ کر چکے ہو۔

زویمر نے اپنی کتاب (Across the world of Islam,) کے صفحہ ۱۰۱ پر لکھا ہے کہ اسلامی نکاح ایک معاہدہ ہے (Sacrament) نہیں ہے اس معاہدے کی شرائط مقرر کی گئی ہیں جن کی رُو سے مرد کے ذمہ مہر واجب ہوتا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ط ۴-۴ | اپنی بیویوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔

اور وہ عورت کی ضروریات کا کفیل اور بوجہ صنفِ نازک ہونے کے اس کا محافظ ہوتا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا

مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط ۳۴-۴

مرد عورتوں کے محافظ ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک (جنس) کو دوسری پر (مختلف چیزوں میں) فضیلت دی ہے۔

اور اس سبب سے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

عورت کی طرف سے علاوہ اس سکون و راحت کی زندگی مہیا کرنے کے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے مرد کی عزت و آبرو کا تحفظ ضروری ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط (۳۴-۴)

نیک بخت عورتیں اطاعت شعار ہیں اور مرد کی عدم موجودگی میں اس چیز کی حفاظت کرنی ہیں جس کی حفاظت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

نکاح کے معاہدے میں جبر و اکراہ نہیں۔ عورت کی رضامندی کے بغیر نکاح جائز نہیں ہوتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (۱۹-۴)

اے ایمان والو تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔

اس معاہدہ کے دوران میں بیوی سے حُسنِ سلوک اور معاشرتِ حسنہ کی تاکید ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ | اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کرو۔

اس معاہدے میں عورت کو وہی حقوق دیئے ہیں جو مرد کے ہیں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲۲۸-۲)۔

اور عورتوں کے حقوق (مردوں کے ذمے) ایسے ہی ہیں جیسے (مردوں کے حقوق) عورتوں کے ذمے ہیں۔

اگر میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو جائے۔ اور اختلاف مزاج یا دیگر حالات کی وجہ سے وہ سکون و راحت مفقود ہو جائے جو اس معاہدہ کی اصل غرض تھی۔ اور گھر اضطراب و عدم اعتماد کا جہنم بن جائے۔ تو اس صورت حالات کے لئے بھی اسلام نے احکام نافذ فرما دیئے ہیں۔ پہلے مختلف تدابیر سے معاملات سلجھانے کی تاکید کی ہے لیکن اگر تمام تدابیر و مساعی کارگر نہ ہوں اور اختلافات ایسی بھیانک اور لاینحل شکل اختیار کر لیں کہ اصلاح ناممکن ہو جائے تو ایسی صورت میں نکاح کے معاہدے کو فسخ کر دینے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ایسی قیود و شرائط کے ساتھ کہ پہلے مکمل انقطاع سے پہلے بھی تو سے فیصدی اتصال وایتلاف کا امکان باقی رہے۔ لیکن جب مکمل انقطاع بھی ناگزیر ہو جائے تو ایک دوسرے کے حقوق کی انتہائی نگہداشت کی گئی ہے۔ یہ احکام سورۂ بقر۔ سورۂ نسا اور سورۂ طلاق میں تفصیل سے درج ہیں۔ معاہدہ کے فسخ کرنے کے لئے جیسے مرد کے لئے ادائیگی مہر کا فدیہ مقرر کیا ہے ویسے ہی عورت کو بھی فدیہ ادا کر کے طلاق حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (۲۲۹-۲)۔

اس مال کے لینے دینے میں عورت مرد کسی پر گناہ نہ ہوگا جسے ادا کر کے عورت آزادی حاصل کرنا چاہے۔

طلاق کے بعد دوسری جگہ نکاح کرنے کی مرد و عورت دونوں کو اجازت ہے۔ مگر عورت کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑتا ہے جسے عدت کہتے ہیں تاکہ ممکن ہے کہ اس تجرد کی زندگی سے اصلاح کا مادہ پیدا ہو جائے۔ نیز یہ کہ اگر وہ حاملہ ہے تو دوسرے نکاح سے قبل نتیجہ حمل ظاہر ہو جائے (سورۂ بقر رکوع ۲۸)

اشتراکیت میں نہ نکاح ہے۔ نہ محرمات[1] کی کوئی قید۔ نہ طلاق کے لئے کوئی حدود و شرائط۔

---

[1] قرآن کی رو سے وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے اُن کی تفصیل سورہ النساء اخیر پارہ ۴ ملاحظہ فرمایئے۔ ۱۲ منہ

نہ عدت کا وجود، نہ زنا سے پرہیز۔ نہ فواحش سے احتراز پس اسلام سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوسکتا ممکن ہے کہ تجدد پسند طبقہ یہ کہے کہ جب بالغ مرد وعورت باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط پیدا کریں تو اسے بہر حال معاہدہ ہی سمجھنا چاہئے لیکن مذہب کو چھوڑ کر خود دنیاوی قوانین اور سماجی قواعد کی نظر میں بھی مرد وعورت کی یہ باہمی رضامندی جب تک قانونی قول وقرار کی شکل اختیار نہ کرلے معاہدہ تسلیم نہیں کی جاتی۔ خود روس کی موجودہ اشتراکی حکومت میں اگرچہ رجسٹری اور غیر رجسٹری شدہ شادیوں کے بچوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا لیکن باہمی اختلاط کو مستند قرار دینے کے لئے اقرار د معاہدہ کی رجسٹری ضروری ہے بالغ مرد وعورت کا جنسی اختلاط جو نکاح کے بغیر ہو۔ قرآن کی نگاہ میں زنا ہے۔ فرمایا

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ (۲۴ - ۲) ۔

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد۔ ان میں سے ہر ایک کے سو سو درے لگاؤ۔

گویا زنا ایک شرعی جرم ہے جس سے حد شرعی لازم آجاتی ہے۔ چونکہ اس میں زانیہ کو بھی سزا دینے کا حکم ہے اس لئے یہ حکم زنا بالجبر سے متعلق نہیں بلکہ باہمی رضامندی کے اختلاط سے متعلق ہے۔ قرآن کریم میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے کہ جب عورتیں اسلام لانے کے لئے آئیں تو ان سے منجملہ دیگر امور کے یہ بھی اقرار لیا کرو کہ وَلَا يَزْنِينَ ۶۰ - ۱۲ - (وہ بدکاری نہیں کریں گی) یہ اس لئے کہ ایام جاہلیت میں بدکاری عام تھی اور اسے روکنا ضروری تھا۔ ان ہر دو احکام میں بالغ مرد وعورت کی باہمی رضامندی سے بلا نکاح مباشرت کا نام زنا رکھا گیا ہے۔

ازدواجی زندگی کے اثرات یعنی عائلی نظام میں اشتراکیت کی رُو سے۔ (۱) اسقاط حمل یعنی قتل اولاد قانوناً جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہے (۲) اولاد ماں باپ کی نہیں ہوتی، بلکہ حکومت (عوام) کی ملکیت ہوتی ہے (۳) حسب ونسب کا کوئی رشتہ اور خون کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ان ہرسہ امور میں قرآن کریم کا فیصلہ حسب ذیل ہے۔

(۱) قتل اولاد کے متعلق فرمایا ۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (الانعام) | اپنی اولاد کو افلاس کے سبب سے قتل نہ کرو۔

من املاق (افلاس کے ڈر سے) کے یہ معنی نہیں ہیں کہ افلاس کے علاوہ اور اسباب کے ماتحت قتل اولاد جائز ہے قتل اولاد بہرحال حرام وممنوع ہے لیکن مِنْ اِمْلَاقٍ کا ذکر اس وجہ سے کردیا ہے کہ نزول حکم کے وقت سوسائٹی میں یہ شکل بالعموم رائج تھی۔ اس کی مثال قرآن کریم ہی میں ہے

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (البقرہ)

پس فحش باتیں کرنا، گناہ کرنا، آپس میں جھگڑنا حج میں منع ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فحش باتیں کرنا، آپس میں جھگڑنا، اور فسق وفجور میں مُبتلا ہونا صرف حج کے ایام میں ممنوع، حج کے علاوہ دیگر ایام میں حلال وجائز ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ افعال شنیعہ ناجائز تو بہرحال ہیں لیکن ایام حج میں بالخصوص ان سے محترز رہنا چاہئے اور اس وضاحت کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ زمانۂ جاہلیت میں حج میں ایسی حیا سوز حرکات عمل میں آتی تھیں، جو اس فریضۂ مقدس کی حرمت وتکریم کے سراسر منافی تھیں۔

یہی صورت قتل اولاد کے متعلق ہے حضور صلعم جب عورتوں سے اسلام کی بیعت لیتے تھے تو اس میں یہ اقرار بھی شامل تھا۔

لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (۶۰-۱۲)۔ | کہ وہ اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گی۔

دوسری جگہ قرآن میں ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (انعام ۶-۱۴۱)۔

بڑے نقصان میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو محض بلا کسی سند ودلیل کے حماقت سے قتل کردیا

اسلامی قانون کی رُو سے اسقاطِ حمل قتل اولاد میں داخل ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت میں یہ جرم ہے

(۲) قرآن کی رُو سے اولاد ماں باپ کی وارث ہوتی ہے اور والدین کے ذمہ اولاد کے بہت سے حقوق وفرائض عائد کئے گئے ہیں۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ (النساء) - | اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے

اور اس کے بعد اُن تفصیلات کا ذکر ہے جن کی رو سے جائیداد کی تقسیم وغیرہ عمل میں آتی ہے علاوہ بریں اولاد کی تربیت و پرورش کے متعلق کتاب و سنت میں مبسوط اور مفصل احکام موجود ہیں۔ جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں اگر اولاد کو عوام کی ملکیت تسلیم کر لیا جائے تو ان احکام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۳) نسبی رشتہ داروں کا ذکر معاشی اور معاشرتی نظام کے سلسلہ میں احکامِ وراثت کے ماتحت آچکا ہے۔ والدین کے ساتھ احسان و مروت کی تاکید قرآن کریم میں بار بار آئی ہے وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا اور وَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ (ان دونوں کو جھڑکی بھی نہ دو) قرآن کریم نے نسبی قرابت کو عائلی نظام کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ط (۲۵-۵۴)۔

اللہ وہ ہے جس نے پانی (نطفہ) سے آدمی کو پیدا کیا۔ اور (اس تعلق کے ذریعہ) اس کو خاندان والا اور نسب و قرابت والا بنایا۔

مذکورہ بالا نصوص صریحہ سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کریم نے عورت کی حیثیت کو کس قدر بلند کر دیا ہے وہی عورت جس میں ادیانِ سابقہ اور عام سوسائٹی کے فیصلہ کے مطابق رُوح بھی نہیں تھی۔ اسے اسلام نے مردوں کے ہمدوش کھڑا کر دیا۔ اور سوائے ان اختلافات کے جو مرد و عورت میں تخلیق کی وجہ سے ہیں۔ کوئی فضیلت اور فوقیت ایک کو دوسرے پر نہیں رہی۔ عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ بیٹی۔ بیوی۔ ماں اور مبدءِ سوسائٹی اور ان چاروں حیثیتوں میں اسلام نے عورت کے حقوق کی زبردست نگہداشت کی ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے ترکہ میں اس کو حصہ دیا ہے۔ بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید ہے وراثت میں اس کا حصہ ہے اور ازدواجی معاہدے میں اسے مردوں کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ جن کی نگہداشت فریقین کے ذمے نکاح کے ذریعہ فرض کی جاتی ہے۔ بحیثیت ماں اس سے حسن سلوک اور احسان و مروت کا حکم ہے بحیثیت مبدءِ سوسائٹی مردوں

کو اس کے ناموس کا ذمہ دار بنایا۔ اور اس کی عفت وعصمت کو اس قدر گراں بہا بتایا کہ کسی کو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ فرمایا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴-۳۰)

مسلمان مردوں سے کہدیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔

اور عورتوں سے بھی کہدیا کہ دوسروں سے آنکھیں دو چار کر کے انہیں اذنِ تماشا نہ دیں کیونکہ ان کا جوہر بے بہا ہے جس کی غارت گری کی جرائتیں اکثر انہیں راستوں سے پیدا ہوتی ہیں ۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ

اور مسلمان عورتوں سے بھی کہدیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں ۔

اللہ اکبر! کہاں یہ احکام اور کہاں اشتراکیت کی شتر بے مہاری جس میں عورت عام سوسائٹی کی ملکیت سمجھی جاتی ہے ۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

نظامِ حکومت ہم دیکھ چکے ہیں کہ اشتراکیت کا مقصد دنیا سے ہر قسم کے نظامِ حکومت کو فنا کر دینا ہے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا وہ حکومت ایسے مطلق العنان ڈکٹیٹر کے ذریعہ سر انجام دینا چاہتی ہے۔ جس کے اختیارات غیر محدود۔ اور جس کا حکم قانون ہو جو خود کسی قانون کا پابند نہ ہو اور جس کے انتخاب کے لئے رائے عامہ کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ نظامِ حکومت کس طرح وجود میں آیا شکار اور گلہ بانی کی منفردہ زندگی کے بعد جب انسان نے قبائلی اور مدنی زندگی اختیار کی تو ضروری ہوا کہ فرد کی آزادی اور اختیار و ارادہ کو محدود کیا جائے۔ کیونکہ باہمی تعاون کی زندگی میں فرد کے اعمال و افعال کا اثر خود اس کی ذات تک محدود رہنے کی بجائے دوسروں تک متعدی ہوتا ہے ۔ اور ان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے قواعد و ضوابط اور حدود و قیود کی ضرورت لازمی ہو جاتی ہے ساتھ ہی ایک ایسی قوت

کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اِن قواعد متعینہ کو نافذ کر سکے۔ اس نظامِ حکومت کی ابتدا تو سیدھی سادھی تھی۔ لیکن نگران کارِ جماعت کے افراد نے محسوس کیا کہ درندں کے شکار اور چوپایوں کی سیاقت میں وہ ذہنی تپش نہیں جو خود انسان کے شکار اور جماعت کی قیادت میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے رفتہ رفتہ ایسے قوانین کی طرح ڈالی جن سے برسرِ اقتدار جماعت کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ مصر کے فراعنہ بطور دیوتاؤں کے پوجے جاتے تھے۔ بابل کے نمرود کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ ہندوستان کے راجہ ایشور پرماتما کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ رومۃ الکبریٰ کا اسقف خدا کے بیٹے کا قائم مقام تھا فارس کے کسریٰ اپنے آپ کو ظل اللہ سمجھتے تھے۔ غرض ہر جگہ اسی جذبہ حکمرانی کے کرشمے مختلف اشکال و صور میں ظاہر ہوتے تھے

یک چراغیست کزو انجمنے ساختہ اند

گذشتہ صدی تک یہ شخصی استبداد شاہنشاہیت کی صورت میں مختلف اقوام عالم میں بالعموم کارفرما تھا تغیر پسندی کے جذبے نے اس بساط کو اُلٹا اور انقلاب فرانس نے یورپ میں جمہوری یا قومی طرزِ حکومت کی بنا ڈالی۔ جس میں نظامِ حکومت قومی نمائندوں کی مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور مجلس کے فیصلے کثرت آرا ہوتے ہیں یہ مجلس جو قوانین وضع کرتی ہے ان کا مرافعہ نہیں ہو سکتا اس نئے نظامِ حکومت کو جو ذہن انسانی کی اس وقت تک بہترین پیداوار ہے۔ رفتہ رفتہ تمام قوموں نے قبول کر لیا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ شخصی مطلق العنانی کے مقابلہ میں یہ طرزِ حکومت بہت بڑی اصلاح ہے۔ لیکن

بنی نوعِ انسان کے دنیاوی مفکرین کے مقابلہ میں عرب کے اُمیؐ نے جو نظام بخشا وہ انسانوں کی آزادی کو برقرار رکھنے اور اُن کی تمدنی و عمرانی زندگی کے تحفظ کے لیے بہترین دستور ہے۔ اساس و اصول کے لحاظ سے خدا کی کتاب مسلمانوں کے لئے قانون ہے یہ اس خدا کا فرمان ہے جو رب العٰلمین ہے جس کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں جو نہ کسی کی رورعایت کرتا ہے۔ اور نہ کسی کے ساتھ ذرہ برابر ظلم کرتا ہے وہ بحیثیت خالق ہونے کے بہترین طور پر جانتا ہے کہ نظم و نسق عالم کے لئے کس قسم کے قوانین کی ضرورت ہے۔ خدا کی کتاب کہتی ہے کہ۔

اِنِ الحکم اِلَّا لِلّٰہ (یوسف) | حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔

یہ وہ ضابطہ ہے جو شریعتِ الٰہی کی شکل میں دنیا کو ملا جس کے اساسی احکام اٹل اور جس کے اصول ناقابل تغیر ہیں۔ اسلام کا طرزِ حکومت اور تمدّن و معاشرت تمام تر اسی ضابطہ پر مبنی ہے اس ضابطہ کے نافذ کرنے کے لئے ایک رئیس ملت کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے جس کی حیثیت اشتراکیت کے ڈکٹیٹر کی طرح واضع قوانین کی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوانین کا محض نگراں و پاسباں ہوتا ہے۔ اور جہاں تک قوانین کے اطلاق کا تعلق ہے اس میں اور ایک عام مسلمان میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا وہ مقامی اور وقتی معاملات کا حل کتاب اللہ کی روشنی میں مشاورت سے کرتا ہے اور فرعی و جزوی احکامات کی تدوین کے لئے وہ ایک جماعت مقرر کرتا ہے جو قرآن کو سامنے رکھکر احکامات منضبط کرتی ہے اور جسے فقہا کی جماعت کہا جاتا ہے ایک عام مسلمان ہو یا فقہا کی جماعت کا رکن مجلس مشاورت کا ممبر ہو یا خود رئیس قوم (امیر المومنین) سب پر یہ قوانین یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ اسلام کے قانون کے مہمات اصول خود اس احکم الحاکمین کے وضع فرمودہ ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے وہی قانون قابل تسلیم ہوگا جو شریعت الٰہی کے مخالف نہو۔

اسلامی طرز حکومت کا یہ خاکہ صرف نظریہ ہی نہیں بلکہ دنیا اس کو عملی شکل میں خلافت راشدہ کے زمانے میں دیکھ چکی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر نظامِ حکومت نہ کبھی وجود میں آیا، اور نہ آسکتا ہے خلفاء قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے تھے وہ مہاجر و انصار سے خصوصًا اور عام مسلمانوں سے عمومًا مشورہ کرتے تھے۔ کیونکہ قرآن کا حکم تھا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳-۵۳) | اور حکومت میں مسلمانوں سے مشورہ لیا کرو۔

اور۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲-۳۶) | ان کی حکومت باہمی مشورے سے ہے۔

ان کے زمانے میں قانون کی نگاہ میں ادنیٰ و اعلیٰ غریب و امیر سرمایہ دار و مزدور میں کوئی فرق نہ تھا حضورؐ نے فرمایا۔

لَیْسَ لِاَحَدٍ عَلٰی اَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِدِیْنٍ اَوْ تَقْوٰی (مشکوٰۃ)۔

ایک کو دوسرے پر سوائے دین اور تقوے کے اور کوئی حق فضیلت و ترجیح نہیں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ اور اُبَیّ بن کعبؓ کا کوئی مختلف فیہ معاملہ جب حضرت زید بن ثابتؓ کی عدالت میں پیش ہوا اور حضرت زیدؓ نے خلیفۃ المسلمین کو دیکھ کر تعظیم کے لئے جگہ خالی کر دینی چاہی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لے زید یہ پہلی ناانصافی ہے جو اس مقدمہ میں تم کر رہے ہو۔ (کتاب الخراج)۔

اسی طرح حضرت امیرؓ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کی حیثیت سے گئے تو مدعی کے برابر کھڑے رہے۔ (العقد الفرید)۔

خود خلیفۃ المسلمین کے منصب کا اندازہ اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمائی۔

لوگو! میں تمہارا امیر مقرر ہوا ہوں۔ حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ بھائیو! میں تو صرف (شریعت الٰہی کی) اتباع کرنے والا ہوں کوئی نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں اگر میں درست کام کروں تو میری معاونت کرو۔ اور اگر میں کج ہو جاؤں۔ تو مجھے سیدھا کرو۔ (ابن سعد جلد ۳)۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ایک مجلس میں جہاں باہمی اختلاف رائے تھا فرمایا میں بھی تم میں سے ایک کے برابر ہوں (کَاَحَدِکُمْ) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جو میں چاہوں تم اس کی اتباع کرو۔ (کتاب الخراج)۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

لَا خِلَافَۃَ اِلَّا عَنْ مَشْوَرَۃٍ۔ (کنز العمال)۔

خلافت صرف عام مشورہ سے ہے۔

جس سے ظاہر ہے کہ خلافت و امارت نہ تو وراثت میں مل سکتی ہے نہ طاقت سے بجبر منوائی جا سکتی ہے۔ خلافتِ اسلامیہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ ایک امانت ہے جو رائے عامہ سے

صاحب الامر کو تفویض کی جاتی ہے۔ چنانچہ بنی امیہ کی ملوکیت میں جب سلیمان نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ چونکہ میں رائے عامہ سے خلیفہ منتخب نہیں ہوا ہوں اس لئے میں خلیفہ برحق نہیں ہو سکتا۔

تصریحات مذکورہ سے واضح ہے کہ۔

(۱) اسلام میں حکومت کا قائم رہنا ضروری ہے اور یہ حکومت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ لیکن اشتراکیت حکومت کے وجود کو ہی فنا کر دینے کے درپے ہے۔

(۲) اسلام میں حکومت شریعت الٰہی کے ماتحت ہوگی۔ لیکن اشتراکین خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔

(۳) اسلام میں قوانین واحکام کی حفاظت ونگہبانی کے لئے امیر ملت رائے عامہ سے منتخب ہوتا ہے .... لیکن اشتراکیت کا ڈکٹیٹر رائے عامہ کا محتاج نہیں ہوتا۔

(۴) اسلام میں مقامی اور وقتی ضروریات کے حل اور فرعی وجزوی مسائل کے استنباط کے لئے مجالس مشاورت ہوتی ہیں۔ گویا انتخاب ومشاورت میں جمہوری طرز اختیار کیا گیا ہے۔ نہ کہ شخصی .... لیکن اشتراکیت کی ڈکٹیٹر شپ میں جمہوریت کا وجود ہی نہیں۔

(۵) اسلامی قانون کی نگاہ میں عام مسلمان اور صاحبان امر میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اور ان میں سے ہر ایک مسئول اور قانون کا پابند ہوتا ہے .... لیکن اشتراکی ڈکٹیٹر پر کسی قانون کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔

(۶) مسلمانوں کے مقدمات شریعت محمدی کے ماتحت فیصل ہوتے ہیں..... لیکن اشتراکین کے نزدیک شریعت مہمل شے ہے۔

اس تقابل سے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام حکومت کی کوئی شق بھی اسلامی نہیں کہلائی جا سکتی۔

—————×✻×—————

مذہبی نظام

اشتراکیت کا اوّلیں اصول مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہے اس کے نزدیک خدا اور آخرت کی زندگی پر ایمان بنی نوع انسان کی تمام مصیبتوں کا باعث ہے۔ گویا جب تک یہ اعتقادات ذہن انسانی سے حرف غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے جائیں گے دُنیا کو اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔ پس جس تحریک کا نصب العین ہی تمام ادیان کو جس میں اسلام بھی شامل ہے دنیا سے نیست و نابود کرنا ہو۔ اسے عین اسلام کہنا اگر پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے مسلمان کا وجود دنیا میں مذہب کے نام سے ہے اگر مذہب نہیں تو مسلمان نہیں۔ مسلمان کی عبادتیں اور قربانیاں اس کا مرنا اور جینا صرف اس ذات کے لئے ہیں جسے خدا کہتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶-۱۶۳)

کہہ دیجئے کہ میری عبادتیں اور میری قربانیاں میرا مرنا میرا جینا صرف رب العالمین کے لئے ہے مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور (اس اعتقاد کی بدولت) میں سب سے پہلے مسلمان ہوں۔

بقول علامہ اقبال۔ ع — ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

خدا اور آخرت کے متعلق مسلمان کا یہ ذہنی اور قلبی احساس ہی اس کی ساری پونجی ہے۔ مگر اشتراکیت مسلمان کی اس اساس کو تباہ و برباد کر دینے کے درپے ہے قرآن کہتا ہے کہ خدا روف بالعباد (اپنے بندوں پر رحمدل) ہے اشتراکیت کہتی ہے کہ وہ (خاکم بدہن) بدترین ظالم ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میری دعوت یکسر دلیل و برہان پر مبنی ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲-۱۰۸)۔

کہہ دیجئے کہ میں اور میرے متبعین خدا کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں۔

اشتراکیت کہتی ہے کہ مذہب افیون کی گولی ہے جو قوائے ذہنی کو سلب کر لیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حُدُوْدُ اللّٰہ کی پابندی میں ہی دین و دنیا کی فلاح و کامیابی ہے۔

بالتحقیق فلاح و بہبودی صرف ان مومنین کے لئے ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے

والے ہیں جو لغویات سے برکنار رہنے والے ہیں۔ جو اعمال وافعال میں اپنا تزکیہ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو حرام شہوت رانی سے بچائے رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲۳-۵-۱)
اشتراکیت کہتی ہے تمام حدود وقیود کا توڑنا ہی اصل انسانیت اور فلاح وبہبودی کا راز ہے۔ قرآن جہاں اس دنیا میں عزت وکامیابی حاصل کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے وہاں وہ اس حقیقت کبریٰ کو بھی فراموش نہیں ہونے دیتا کہ دنیاوی زندگی حقیقی انسانی زندگی کی ایک مخفی شکل ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ (۲۹-۶۴) ۔

اور یہ دنیاوی زندگی (بابں ہمہ اہمیت) محض کھیل کود کی زندگی ہے اصلی زندگی تو دارالآخرۃ کی ہے۔

لیکن اشتراکیت کہتی ہے کہ اصل زندگی دنیوی زندگی ہے اس کے بعد کی زندگی کا خیال لغو ومہمل ہے۔ مذہب اور امور دنیا (مثل سیاست واقتصادیات معاشرت ومعیشت) کسی اور مذہب میں جدا جدا ہوں تو ہوں لیکن اسلام دین ودنیا کو الگ نہیں کرتا۔ اس نے جہاں روحانی اور اخلاقی زندگی کا ایک دستور العمل پیش کیا ہے وہاں تمدنی اور معاشرتی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا مکمل ضابطہ بھی مسلمانوں کو دیا ہے۔ اور یہی چیز تکمیل دین اور اتمام نعمت ہے (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ) مسلمان کے لئے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً "اے اللہ مجھے دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور عاقبت میں بھی۔ کی دعا تجویز کی گئی ہے۔ غرض اصل اور فرع دونوں میں اشتراکیت قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ اور جب کوئی اس تحریک کی تائید کرے گا قرآن کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اشتراکین کا مذہب کے خلاف جنون ردعمل کا نتیجہ ہے اور انہیں امید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اعتدال پر آجائیں گے۔ لیکن واقعات اس خوش فہمی کی تکذیب کرتے ہیں۔ ۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کو بالشویکوں نے مذہب اور آزادی ضمیر کے متعلق جو منشور جاری کیا تھا اس میں مذہب وملت کو حکومت سے علیحدہ کیا گیا تھا اور یہ اجازت دی تھی کہ۔

(۸) کوئی شہری جونسا مذہب بھی چاہے اختیار کرسکتا ہے۔

اور اگرچہ مدارس و مکاتب میں مذہبی تعلیم کے مظاہرے ممنوع قرار دیئے گئے تھے لیکن اس کی اجازت تھی کہ

(۹) ہر شہری نج کے طور پر اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلاسکتا ہے۔

(Religion under the Soveit)

اس میں مذہبی عبادتگاہوں سے تعرض نہیں کیا گیا تھا لیکن ۱۹۲۲ء (فروری) میں حکومت نے یہ فیصلہ کردیا کہ مذہبی عبادت کدوں کی جائداد و املاک ضبط کرلی جائیں۔

(Russia Reported—1921-1923)

۱۹۲۸ء میں یہ تشدد اور بھی بڑھ گیا۔ اور عبادتگاہیں مسمار کردی گئیں۔ مذہبی مکاتب جبراً بند کردیئے گئے مذہبی تعلیم ممنوع قرار دیدی گئی مناسک وعبادات کی ادائیگی روک دی گئی اور خدا کے پرستاروں کے لئے خدا کا نام لینا جرم عظیم قرار دیدیا گیا۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جوں جوں یہ تحریک زیادہ مستحکم ہوئی۔ مذہب کے خلاف اس کا جذبۂ انتقام وعناد زیادہ مشتعل ہوتا گیا۔ لہٰذا یہ امید کہ قوت کے استحکام کے بعد اشتراکین میں میانہ روی آجائے گی۔ اپنے آپ کو دھوکہ دینا اور حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ لیکن بفرض محال اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وحشت و سبعیت کے بعد اشتراکین میں اعتدال آجائے گا تو جب وہ کچھ مسلمانوں کو مرتد اور باقی کو جوروستم کا شکار بنا کر شہید کرچکے ہوں گے تو اس وقت جبکہ (کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی) اگر اُن کا مزاج اعتدال پر آیا بھی تو اس سے اسلام کو کیا فائدہ

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکین کی دہریت اُن کے نزدیک خود ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے منکرین خدا کی انجمنیں قائم ہیں انہیں حکومت کی طرف سے امداد ملتی ہے اور لامذہبیت کی اشاعت کے لئے پوری آزادی حاصل ہے

(Religion under the Soveit)

طریق کار اشتراکیت کی نشر و اشاعت کے لئے جو لائحۂ عمل یا طریق کار اختیار کیا گیا ہے اُس میں ہر قسم کا فتنہ و فساد، آگ اور خون، مسلح انقلاب، جور و استبداد، جبر و استکراہ سب کچھ شامل ہے۔ اشتراکیین کے نزدیک جائز وہ ہے جس سے مطلب براری ہو۔ اور ناجائز وہ ہے جو اُن کے مقاصد کے منافی ہو

اسلام اِس طریقِ کار کا حامی نہیں۔

کسی نظام میں تغیر پیدا کرنے کے لئے دو قسم کے طریقۂ عمل اختیار کئے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خرابیوں کے اسباب و علل پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ حالات کا جائزہ لیا جائے۔ مخالفین کے خلاف دل میں انتقامی جذبہ پیدا نہ ہو۔ نقائص و اسقام کے دور کرنے کے لئے نرم روی سے علاج سوچے جائیں۔ دعویٰ کے اثبات میں دلائل و براہین پیش کرنے سے فریقِ مخالف کا سکوت نہیں بلکہ سکون مقصود ہو۔ جب تک اپنی حفاظت اور مظلوموں کی حمایت کے لئے مدافعت کی ضرورت نہ پڑے طاقت و قوّت کا استعمال نہ کیا جائے۔ اگر سوسائیٹی کی صحت و بقا خطرہ میں پڑ جائے تو (اُس کے جسم کا) صرف اتنا حصّہ کاٹا جائے جو زہر آلود ہو کر لاعلاج ہو چکا ہو۔ اس طریقِ عمل کا نام قرآن کریم نے اصلاح رکھا ہے۔

دوسرا طرزِ عمل وہ ہے جس کی ابتدا غیظ و غضب اور جوشِ انتقام سے ہوتی ہے۔ اس میں ہر قسم کی تخریبی قوت بروئے کار لائی جاتی ہے۔ فریقِ مخالف کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوتا۔ ہر نظریئے کو زبردستی منوایا جاتا ہے۔ بدعنوانیوں کا استیصال ویسی ہی بدعنوانیوں سے کیا جاتا ہے۔ اِس جوش و خروش، اِس شورش و اضطراب کا نام جسے آجکل انقلاب کہا جاتا ہے قرآن کی اصطلاح میں فساد ہے۔ اسلام اِس قوت آزمائی، اِس ہنگامہ آرائی، اِس جبر و اکراہ۔ اِس ظلم و استبداد کا یکسر مخالف ہے۔ قرآن کریم نے اس طریقہ کا ضمناً اِس انداز میں ذکر فرمایا ہے:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۔ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝ (۲: ۱۱-۱۲)	اور جب اُن سے کہا جاتا ہے فساد مت کرو زمین میں۔ تو کہتے ہیں کہ (نہیں) ہم تو محض اصلاح کرنیوالے ہیں۔ بیشک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اسے سمجھتے نہیں

اسلام کا طریقِ کار اصلاح ہے۔ فساد نہیں۔ چنانچہ حضرات انبیاءؑ نے تغیرِ حالات کے لئے اصلاح ہی کا طریقہ اختیار فرمایا۔ مثلاً حضرت شعیبؑ کے ذکر میں ہے:۔

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۱۱/۸۸

میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے خلاف وہ طریق عمل اختیار کروں جس سے میں خود منع کرتا ہوں میں تو جہاں تک میرے امکان میں ہے صرف اصلاح چاہتا ہوں۔

اپنی نشر و اشاعت کے لئے اسلام نرم روی اور رواداری سے کام لیتا ہے۔ اور جبر و اکراہ کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ فرمایا:۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (۲ : ۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی جائز نہیں (اسلئے کہ) ہدایت و گمراہی بالکل ایک دوسرے سے الگ ہو چکی ہے

جس کا جی چاہے ایمان اختیار کرے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے (فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ) اسلام نے جہاں جسمانی جبر و اکراہ کو معیوب قرار دیا ہے وہاں عقل و شعور کے مقابلہ میں ذہنی استکراہ کو بھی جائز نہیں رکھا۔ اس نے اپنی دعوت کے لئے اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصود سکونِ قلب ہے نہ اسکاتِ خصم۔ علمِ منطق کی رو سے استدلال کے بالعموم تین طریقے قرار دیئے گئے ہیں۔ ایک برہانیات جس میں یقینی شواہد کے ذریعہ دعوے کے اثبات میں دلائل لائے جاتے ہیں۔ دوسرے خطابیات جس میں مؤثر طریق خطابت سے مافی الضمیر کو دوسرے کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ اور تیسرے جدلیات یعنی ایسے اقوال سے دعوے کو ثابت کیا جاتا ہے جو فریقین میں مسلّم ہوں۔ قرآن کریم نے یہی تینوں طریقے اپنی دعوت کے لئے تجویز فرمائے ہیں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۱۶:۱۲۵)

لوگوں کو اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت و دانائی اور موعظۂ حسنہ کے ذریعے بلاؤ۔ اور ان سے مناظرہ نہایت عمدہ طریق سے کرو۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون جب فرعون کو دعوتِ حق دینے کے لئے مامور ہوئے تو ان سے ارشاد ہوا کہ

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۲۰:۴۳-۴۴)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے طوفان برپا کر رکھا ہے لیکن اس سے نرمی سے بات کرنا۔ شاید وہ نصیحت قبول

کرلے یا (اللہ سے) ڈرے۔

نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا کہ تبلیغِ حق کے لئے

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (النساء)

ان سے ایسی باتیں کہئے کہ سیدھی ان کے دِل میں اُتر جائیں

اِس میں شبہ نہیں کہ اسلام کو لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں۔ لیکن اُس کا مقصد کسی قوم کی آزادی کو سلب کرنا نہیں تھا[1] بلکہ ہر ایک مذہب کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا۔ فرمایا:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲/۴)

گر اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے گرجا۔ یہودیوں کے معبد۔ ترساؤں کے مندر اور مسلمانوں کی مساجد جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے منہدم ہو گئے ہوتے۔

مذکورہ بالا صورت کے علاوہ قتل و خونریزی کو قرآنِ کریم نے فعلِ شنیع قرار دیا ہے۔ سورہٗ مائدہ میں فرمایا:۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)

قتلِ بے گناہ یا فساد فی الارض کی نوعیت سے جس نے ایک جان کو بھی مار دیا۔ یوں سمجھئے کہ گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک انسان کو مرنے سے بچایا اُس نے گویا کُل بنی نوعِ انسان کو زندگی بخشی۔

امن پسند انسانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر ڈالنا۔ جذبۂ وحشت و غارت گری فرو کرنے کے لئے خون کی ندیاں بہا دینا۔ انتقام لینے کے لئے نہتے انسانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دینا۔ اسلام کے

---

[1] سرطامس آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب (Preaching of Islam) میں مختلف اقوام و ممالک میں تبلیغ اسلام کی تاریخ شرح و بسط سے لکھ کر ثابت کیا ہے کہ اسلام کہیں بھی بزورِ شمشیر نہیں پھیلایا گیا۔ منہ

نزدیک حرام ہے۔ اسلام کا مادہ سلم ہے جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ اسلام کو فساد و غارتگری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ کسی شکل میں بھی حق و صداقت، اور عدل و انصاف کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک جو چیز ناجائز و حرام ہے وہ دوست دشمن سب کے لئے ناجائز و حرام ہے فرمایا:-

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۸ : ۵)

(یکھنا) کسی قوم کی دشمنی کہیں تمہارے لئے اس بات کا باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ (ہمیشہ) عدل کرو کہ وہ تقوٰی سے زیادہ قریب ہے۔

تاریخ و عبر میں اس امر کے شواہد بکثرت ملتے ہیں کہ مسلمان اور غیر مسلم کے تنازعہ میں مسلمان قاضی کی عدالت سے ڈگری غیر مسلم کو ملی۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف جھگڑوں میں اپنے ججوں کو چھوڑ کر نبی اکرمؐ کو ثالث مقرر کیا۔

میدانِ جنگ میں دُنیا بھر کے مقننین قوت کے ہر قسم کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن نبی اکرمؐ جب کسی دستۂ فوج کو روانہ فرماتے تو التزاماً انھیں تاکید فرماتے تھے کہ

"خبردار اگر کسی نے غیر مذہب والے پر ظلم کیا یا اس کے مذہب کی تنقیص کی یا کوئی چیز بجبر اس سے چھین لی تو یاد رکھو قیامت کے دن خُدا کے حضور اُس کی طرف سے ایسا کرنے والے مسلمان کے خلاف میں جھگڑونگا۔" (ابوداؤد۔ جلد دوم)

اِن حقائق کی روشنی میں کون کہہ سکتا ہے کہ اشتراکیت کا طریقِ عمل اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ ظلم و استبداد۔ جور و تعدّی۔ خون آشامی۔ آتش ریزی۔ فتنہ و فساد اور قتل و غارت کی استھلاک انگیز و امن شکن تحریک اسلام کے نزدیک کیسے مستحسن ہو سکتی ہے جس کا مقصد وحیدہی دنیا سے اس قسم کے وحشیانہ جرائم کا نیست و نابود کرنا ہے!

نتائج:- اگرچہ یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو یہ دیکھنے کے لئے کہ

اشتراکیت نے دنیا کی مسرتوں اور راحتوں میں کس قدر اضافہ کیا ہے اور نظامِ امنیتِ عالم میں کیا کیا ترقیاں کی ہیں۔ روس کی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ روس ہی فی الحقیقت اشتراکیت کا گہوارہ ہے۔

اشتراکیت کے علمبرداروں کے نزدیک دنیا کی تمام تباہیاں اور بربادیاں۔ تمام ہلاکتیں اور مصیبتیں اقتصادی نظام ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ہیں اور اُن کا واحد علاج تحریکِ اشتراکیت ہے سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں زارِ روس کے نظامِ حکومت کا تختہ الٹ کر اس تحریک نے زور پکڑا۔ ابھی ایک برس بھی نہ گذرا تھا کہ سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں روس میں ایک قیامت خیز قحط پڑا۔ جس کے رفع کرنے کے لئے جملہ جائز و ناجائز طریقے استعمال کئے گئے۔ جائدادیں غصب کی گئیں۔ سرمائے چھین لئے گئے۔ فقیر کی جھونپڑی سے لیکر امیر کے محلات تک میں جو کچھ ملا سب کچھ ضبط کر لیا گیا۔ حتّٰی کہ تختہ ہائے مسجد جو قابلِ سوختن نہ قابلِ فروختن سمجھے جاتے تھے انھیں بھی حکومت نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ لیکن حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ماہرینِ زراعت کے نزدیک قحط کی اصلی وجہ اشتراکیت کی پہلی اسکیم ملکیت (Requisition Scheme) تھی۔ یہ دیکھکر کہ پیداوار اوروں کی ملکیت ہو جاتی ہے کسانوں نے زمین میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور خود لینن کو کہنا پڑا کہ یا تو ذاتی تجارت کی پھر اجازت دینی پڑیگی یا کسانوں کے خلاف جدال و قتال کرنا ہوگا۔ چنانچہ ملکیت کی اسکیم کو چھوڑ کر اجتماعی طریقِ زراعت (Collective Scheme) جاری کیا گیا۔ مگر یہ بھی ناکام رہا۔ اس اسکیم میں فوج کے سپاہی کسانوں کی فصل اٹھا کر حکومت کے مرکزوں میں جمع کرتے تھے۔ اور جو کوئی اُن کی مزاحمت کرتا تھا اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ اس تشدد کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کسان زمین چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور زمینیں سبزۂ بیگانہ سے اَٹ گئیں (ملاحظہ ہو (Bombay Sentinal)

چنانچہ ایک امریکن سیاح مسٹر (Sherwood Eddy) جو عام طور پر روسی طرزِ حکومت کا مداح ہے پچیس سالہ سیاحت کے خیالات قلمبند کرتے ہوئے اپنی کتاب (Russia to-day) میں لکھتا ہے کہ کسانوں کو حکومت کی طرف سے نادر شاہی احکام ملتے ہیں کہ اس قدر غلّہ فی کھیت پیدا کرنا ہوگا۔ اگر آفاتِ ارضی و سماوی کی وجہ سے کسان غلّہ کی اتنی مقدار بہم نہ پہنچا سکے تو اُسے سائبیریا کے یخ بستہ

میدانوں کی طرف جلاوطن کر دیا جاتا ہے (ملاحظہ ہو Daily Gazette Karachi)

اس میں شبہ نہیں کہ ان ایام میں ساری دنیا اقتصادی کساد بازاری کے بے پناہ عذاب میں ماخوذ تھی۔ خود ہندوستان میں اجناس کا نرخ اتنا گر گیا تھا کہ اس کی نظیر گذشتہ صدی میں ملنی مشکل ہے۔ لیکن باایں ہمہ اگر غلہ کا قحط کہیں دنیا کے کسی حصہ میں پڑا تو وہ صرف روس کا ملک ہے جو دنیا بھر میں گندم کی پیداوار کا بہترین خطہ سمجھا جاتا ہے ۱۹۳۳ء میں وہاں دوبارہ قحط پڑا جس میں دیہات والوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بلی۔ کتے حتیٰ کہ انسانوں تک کو کھا گئے۔ مگر تعزیری پولیس فصل جمع کرنے کے کام میں بدستور مشغول تھی۔ آذربائیجان کے علاقہ میں قحط اپنی انتہائی شدت پر تھا۔ فروری سے اکتوبر ۱۹۳۲ء تک قریب ۳۴۳۰۰۰ نفوس اس علاقہ سے خراسان کی طرف ہجرت کر گئے۔ مسٹر (Williams) نے اپنی سیاحت کی بنا پر جن حالات کا انکشاف کیا ہے وہ عبرت و بصیرت کی داستان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ہزارہا کھیت ایسے دیکھے گئے جن میں فصل پڑی سڑ رہی تھی۔ کیونکہ بہت سے کسان بھوک کی شدت سے زمین چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ جو باقی تھے وہ خود بھوکے مر رہے تھے۔ کیونکہ تمام غلہ پہلے حکومت کے مرکزوں میں جمع ہوتا تھا اور پھر وہاں سے کسانوں کا حصہ ملتا تھا (ملاحظہ ہو Bombay Sentınal) مجریہ ۱۳ مارچ ۱۹۳۴ء) ایک کسان نے کانگریس کے بھرے اجلاس میں کہہ دیا تھا کہ "زمینیں ہماری ہیں لیکن فصل تمہاری۔ چراگاہیں ہماری ہیں لیکن گھاس تمہاری جنگل ہمارے ہیں لیکن درخت تمہارے" تشدد پسند انقلاب کی بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر خرابی کا علاج تشدد سے کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کا مضمون ہو جاتا ہے۔ اس کے حامی مرض کے اسباب و علل پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کرتے۔ انھیں ہر بات پر غصہ آ جاتا ہے اور ان کا ہر علاج انتقامی جذبہ میں شور بور ہوتا ہے اشتراکیت کا انقلاب تشدد کا انقلاب ہے۔ چنانچہ نسل کشی اسپان کے ۳۸ ڈکٹیٹروں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے اسپان کی نگہداشت میں تساہل برتا ہے۔ اس تساہل کے لئے ۱۱ کو سزائے موت۔ ۹ کو دس دس سال کی قید اور باقیوں کو اور سزائیں دی گئیں۔ (اسٹیٹسمین مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۴ء)

روس کے ایک اخبار کی رپورٹ کے مطابق مارچ ۱۹۳۴ء میں ایک شخص کو غلہ چھپانے کے جرم میں

سزائے موت کا فتویٰ سنا دیا گیا۔ چنانچہ خود لینن نے اس بدنظمی سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ اس میں شک نہیں کہ ہم بے آئینی کے ایک بحر ذخار میں بہے چلے جا رہے ہیں اور مقامی اثرات سخت درجہ مانع ہیں کہ ملک میں نظام امنیت قائم ہو سکے (Communism Exposed)

حکومت کے اقتدار۔ اشتراکیت کے تسلط اور استیلائے ہمہی کے استحکام کے لئے جس قدر ظلم و تشدد اور قتل و غارت روا رکھا گیا ہے نظام و آئین کے تحفظ کے لئے جس قدر بے آئینی و بے نظمی برتی گئی ہے قانون کے ضبط و انضباط کے لئے عدل و انصاف کے اندھے دیوتا کے مندر پر جس قدر قربانیاں چڑھائی گئی ہیں اور اپنے اعتقادات کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر خون کی سیلاب انگیزیاں برپا کی گئی ہیں اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکیگا جو مسٹر جون واٹن ہرڈ (gohn wynne H) نے اپنے تیس سالہ قیام روس کے زمانہ میں فراہم کئے تھے اور جو ڈیلی گزٹ کراچی کی اشاعت مورخہ ۵ و ۶ جون ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے تھے۔

تعدادِ مقتولین

اساقیف	۳۱
پوادر	۱۵۶۰
جج وکلاء۔ اور مجسٹریٹ	۳۴۵۸۵
اساتذہ اور طلباء	۱۲۳۶۷
سول حکام	۷۹۹۰۰
امراء و روساء	۶۵۸۹۰
فوجی افسر	۵۶۳۴۰
مزدور مرد و عورت	۱۹۶۰۰۰
سپاہی اور جہازراں	۲۶۸۰۰۰
کسان اور کاشتکار	۸۹۰۰۰۰

بخت نصر کی تباہ کاریاں - یونانیوں کی ستم ریزیاں - ایرانیوں کی لشکر انگیزیاں - رومیوں کی ہلاکت آفرینیاں - حتیٰ کہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی قتل و غارتگری کی خونچکاں اور خونفشاں قیامت خیزیاں سب اس فہرست کے سامنے شرمندہ ہیں - یہ نتائج اس اشتراکیت کے ہیں جس کے متعلق خود لینن کا دعویٰ تھا کہ یہ تحریک حکومت اور جنگ کی دہشتوں سے نجات دلانے کی صراط مستقیم ہے -

(Dialectical Materialism

by V Adoratsky)

اور جس کے متعلق محولہ بالا کتاب کے مؤلف کا بیان ہے (جو آجکل ماسکو میں مارکس - انجلز - لینن انسٹیٹیوٹ کا ڈائرکٹر ہے) کہ :-

"نسلِ انسانی صرف قوتِ بازو سے جو اشتراکیت کی شکل میں موجود ہے - نیم بربریت کی زندگی اور افلاس - استبداد اور جہالت کے پنجہ سے رہائی پا سکتی ہے نہ کہ خدا کی مدد کے بھروسہ پر جس کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے" (ایضاً ص ۱۰۳)

یہ ہے وہ روس جس کے متعلق ہمارے ہندوستانی سوشلسٹ جناب منتظر صاحب کا بیان ہے کہ

" اسی ردِ عمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے جو زمین پر ایک جنت ہے -

وہاں بے روزگاری - بھوک جہالت اور تنگدستی کا نام نہیں" (مدینہ ۱۲ جون ۱۹۴۱)

اس کے مقابلہ میں خدا کی مدد پر بھروسہ رکھنے والے اسلام نے جو نتائج پیدا کئے ان کے متعلق مسٹر (A. Von Kremer) جو ایک ممتاز مستشرق ہیں، لکھتے ہیں کہ :-

" اصلاح کا یہ عظیم الشان کام برابر سر انجام پاتا رہا - حتیٰ کہ جب محمد (صلعم) کی وفات ہوئی تو عرب کے بیشتر حصہ پر خدا کی امنیت و سکینت کے ایسے بادل چھا رہے تھے جو قتل و غارتگری کے خوگر - عربوں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے تھے - امن و سلامتی کا یہ دَور دَورہ محض اسلام کے طفیل سے تھا -"

(Preaching of Islam)

فتنہ و فساد کے استیصال اور امن و سلامتی کے تسلط کے لئے اسلام کو بھی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ نبی اکرم کی دس سالہ مدنی زندگی میں کم و بیش ۸۰ لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں مسلمانوں کے ۲۵۹ اور مخالفین کے ۷۵۹ آدمی قتل ہوئے۔ یعنی کل ۱۰۱۸ گویا مقتولین کی اوسط فی لڑائی ۱۳ ہوئی۔ ان ۸۰ جنگوں میں قیدیوں کی اوسط فی لڑائی سات ہے۔ قیدیوں کے ساتھ سلوک کے متعلق جنگِ بدر کے ایک قیدی عزیز کا بیان ہے کہ میں حضرت مصعب ابن عمیرؓ کے سپرد کیا گیا۔ حضرت مصعبؓ دن بھر محنت مشقت کرتے اور شام کو گیہوں کی روٹیاں مجھے کھلاتے اور خود کھجوروں پر گذارہ کرتے۔ میری گردن ندامت سے جھک جاتی اور جب میں کہتا کہ آپ روٹی کیوں نہیں کھاتے تو فرماتے کہ بھائی تم ہمارے مہمان ہو اور مہمان کی مدارات ہم پر فرض ہے

بصائر و عِبَر :- دنیا نے آج جس قدر مادیات میں ترقی کی ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں شاید ہی کہیں ملے۔ میدانوں۔ پہاڑوں۔ خشکی۔ تری۔ غرض تحت الثریٰ سے اوج ثریا تک ہر جگہ انسان کو اقتدار حاصل ہے لیکن بایں ہمہ غلبہ و استیلاء جس اضطراب و بیتابی کے دور سے دنیا آج گذر رہی ہے اس کی نظیر بھی تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملے گی۔ حریر و اطلس کے نرم و نازک لباس میں لپٹے ہوئے جسم کے اندر قلبِ انسانی کو دیکھئے تو عدمِ اطمینان اور فقدانِ سکون کی ایک آگ شعلہ فگن رہتی ہے۔ بڑے بڑے مدبرین جلیل القدر مفکرین سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں کہ ہلاکت و تباہی کی ان مہیب غاروں سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے۔ مختلف فارمولے اور متعدد ازم تجویز کئے جاتے ہیں لیکن جس کی تلاش ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔ ایک اسکیم پر عمل کرتے ہیں۔ اس کی روشنی میں تھوڑی دور چلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب راہِ نجات مل گئی۔ لیکن جلدی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس میں بھٹکنے لگ جاتے ہیں۔ تنہا عقلِ انسانی کی اس بےبسی کی مثال قرآنی الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ بجلی کی سی چمک ہے۔ جب چمکتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض سے لے کر عالمِ افلاک تک سب کچھ منور ہو گیا کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ (بقرہ) جب اُن کا

گرد و پیش روشن ہو جاتا ہے۔ تو چلنے لگتے ہیں۔ اور جب چمک ختم ہو جاتی ہے تو حیران و ششدر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا۔ اقوامِ عالم کی یہ حالت تو اس لئے ہے کہ ان کے پاس کوئی مستقل شمعِ ہدایت نہیں لیکن حیرت ہے مسلمانوں پر کہ جن کے پاس وہ نورِ مبین اور شمعِ ہدایت موجود ہے جو لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے والی ہے (لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ) لیکن افسوس انھوں نے اس شمعِ ہدایت کو چراغ تہِ دامن کی طرح غلافوں میں لپیٹ کر زینتِ دہ طاقِ نسیان بنا رکھا ہے اور دوسروں کے جگنو کی روشنی کو خضرِ راہ سمجھ کر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کہیں اشتمالیت کہیں فسطائیت کہیں نازی ازم۔ کہیں کمیونزم۔ غرضیکہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اِک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں،

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کے دائیں بائیں دو تہذیبیں موجود تھیں۔ ایک طرف رومیوں کی تہذیب اَوجِ کمال پر تھی۔ دوسری طرف ایرانیوں کے تمدن کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ اگر اسلام اپنے ساتھ کوئی مستقل تہذیب نہ لایا ہوتا اور فلاح و بہبود دوسروں ہی کی تقلید میں ہوتی تو انھیں حکم دیدیا جاتا کہ رومیوں یا ایرانیوں کی تہذیب اختیار کر لو لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ کہا گیا کہ :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ (النساء)

اَے مسلمانوں۔ تم ایمان رکھو اللہ پر اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی۔

یعنی کتابِ مبین کی روشنی میں جو اللہ کا نور ہے رسول اللہ کے نقوشِ قدم پہ چلے جاؤ۔ تہذیبِ اسلامی کے ان عناصرِ ترکیبی پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم قیصر و کسریٰ کی تہذیبوں کی مالک بن گئی۔ یہ احسامیات

ان کے انسانے نہیں بلکہ تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں ہیں۔ ایک انگریز مورّخ کے بیان کے مطابق
دِ فاروقی تک یعنی بارہ سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کر لئے تھے۔
ی کی اوسط ۹ قلعے روزانہ پڑتی ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سلام کا انقلاب اشتراکیت کا انقلاب نہ تھا۔ جس میں خونِ ناحق کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام
فتح اس انداز کی تھی کہ جیسا حمص کا شہر فتح ہوا تو اُس کی حفاظت کے لئے شہر والوں سے
ال بھر کا زرِ جزیہ لیا گیا۔ لیکن چونکہ چھ ہی مہینے کے بعد مسلمان فوجوں کو کسی اور جگہ منتقل
نا پڑا۔ خلیفۃ المسلمین نے حکم بھیج دیا کہ نصف زرِ جزیہ اہلِ شہر کو واپس دے دیا جائے۔ کیونکہ جب
ان کی حفاظت ہی نہ کرینگے تو زرِ معاوضہ کیسا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور جب مسلمان رخصت ہونے
، تو اہلِ شہر کا جو عیسائی تھے یہ حال تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ مسلمانوں سے
ہ جاتے تھے کہ خدا کے لئے جلد واپس آنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں پھر رومیوں کے ماتحت رہنا پڑے۔
انکہ رومی اُن کے ہم مذہب تھے۔

ہ نتائج مارکس اور لینن کی اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کی اتباع سے حاصل ہوتے
ں۔ یہ راستہ آپ کو منشورِ اشتراکیت سے نہیں بلکہ اس احکم الحاکمین کے ضابطۂ ازلی کی مدد
ملیگا جسے قرآن کہتے ہیں۔ اگر آپ قرآن کے تابعِ فرمان ہو جائینگے تو صدرِ اسلام کی تمام نعمتیں
ل ہو جائینگی۔ کیونکہ خدا کی طرح جو حیٌّ لا یموت ہے اس کی کتاب بھی زندۂ جاوید۔ لیکن
آپ کفر و اسلام۔ حق و باطل۔ اہرمن و یزدان۔ خدا و شیطان۔ قرآن و اشتراکیت کو بیک وقت
میں جگہ دینگے۔ اگر خدا کو خدا مانتے ہوئے دوسروں کے آستان پر جبہ سائی کرینگے۔ اگر اُس کے
بین کی موجودگی میں دوسروں کی نظر فریب ضیا پاشیوں کو مشعلِ ہدایت بنائینگے تو یاد رکھئے
ان کا یہ اٹل فیصلہ آپ کے لئے موجود ہے۔ کہ

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۔ ۲۲/۳۱

جس نے خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنایا، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا یا کوئی پرندہ اسے اچک کر لے گیا۔ یا ہوا کا تھپیڑا اسے اڑا کر کسی دور دراز مقام میں لے گرا (یعنی اس کا کوئی مرکز نہ رہا)

لیکن اگر آپ گلشنِ کائنات میں سرفرازی و برومندی چاہتے ہیں تو اس کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ مذہب و شریعت کی ارضِ مقدس میں آپ اپنی جڑوں کو مضبوطی سے پیوست کریں کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ

اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہوں۔

وگر بشاخِ گُل آویز و آب و نم درکش

پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ میجوئی (اقبال)

لیکن اگر کسی تحریکِ ارضی کی جاذبیت آپ کو اپنی طرف اس لئے کھینچ رہی ہے کہ اس میں عیش و نشاط کی فراوانیاں مضمر ہیں تو یاد رکھئے خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۲۸/۵۸

ہم بہت سی بستیاں ایسی ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامان عیش و طرب پر نازاں تھیں۔ سو دیکھ لو یہ اُن کے گھر بار ہیں کہ پھر اُن کے بعد یہ آباد نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے اور آخر کار ان سب سامانوں کے ہم ہی وارث ٹھہرے۔

برادران! یہ ہے سوشلزم اور اس کے مقابلہ میں یہ ہے اسلام! آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ سوشلزم کو اسلام سے کتنا تعلق ہے لیکن غور طلب معاملہ یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کانگریس کا نصب العین یہ ہے کہ ملک کو سوشلزم کے لئے تیار کیا جائے۔ اور جب اختیارات اپنے ہاتھ میں

آجائیں تو یہاں سوشلزم کے انداز کی حکومت قائم کردی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے علمائے کرام کا یہ فتویٰ ہے اور بار بار فتویٰ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ بلا شرط جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جائیں یعنی عملاً نظامِ سوشلزم کے قیام میں معاونت کریں۔ آپ ان سے کبھی دریافت تو کیجئے کہ وہ نظام سوشلزم جو اسلام کی ضد ہے اس کا عملی قیام کس طرح اسلامی فریضہ قرار پاسکتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات ایک طرف سوشلزم کو اسلام کی نقیض بھی قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اُن کی حالت یہ ہے کہ خود جمعیت العلماء کے سالانہ اجلاس (دہلی) کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ صاحب انصاری اپنے خطبۂ صدارت میں سوشلزم کو تمام مصائب کا واحد علاج قرار دیتے ہیں اور ہمارے علماء حضرات میں سے کسی ایک کی طرف سے ایک لفظ بھی مخالفت کا نہیں کہا جاتا۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد ترجمان القرآن (جلد دوم) میں سوشلزم اور قرآنی تعلیم میں اصولی فرق بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کانگریس کے سرگرم کارکن بھی ہیں جس کا نصب العین سوشلزم نظامِ حکومت کا قیام ہے۔ اپنے مسلک کے جواز میں ان حضرات کے پاس لے دے کے دلیل صرف ایک ہے کہ انگریز کو ملک سے نکال دو۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ کون سا مردِ مسلمان ہے جس کے ہاتھ میں قرآن ہو اور وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی انگریز کی غلامی پر قانع رہ سکے لیکن سوال صرف انگریز کو نکال دینا ہی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بعد ہندوستان کا نظامِ حکومت کیا ہو۔ اور چونکہ جدید نظامِ حکومت کی بساط بھی ساتھ ہی ساتھ بچھتی چلی جارہی ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس امر کا فیصلہ بھی اسی وقت کیا جائے کانگریسی مسلک کی مساعی کا مقصد یہ ہے کہ جب اختیارات مل جائیں تو نظامِ حکومت سوشلزم ہو لیکن ایک صحیح مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ جب آزادی مل جائے تو ملک کا نظامِ حکومت اسلامی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ متحدہ قومیت کے نظر فریب سراب کو چھوڑ کر تمام مسلمان اپنی الگ جماعتی تشکیل کریں اور اپنا نصب العین قرار دیں ملک میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام۔ وذٰلک دین القیمۃ

ایک مسلمان

طلوعِ اسلام
یادگارِ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکز ملت ←	لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ	→ مرکز ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایہا الذین اٰمنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا — اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم — مانو اللہ و رسولؐ کی جب وہ تمہیں اس بات کیطرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا
علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار
(فرمان رسولؐ)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !
لا اسلام الا بالجماعۃ
(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب
محمد ظہیر الدین صدیقی . بی ایس سی
جلد (۲) شمارہ (۴)

بدل اشتراک پانچ روپیہ سالانہ
ششماہی تین روپے
جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ مطابق اگست ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

حقائق و عبر

بہ بندِ صوفی و ملّا اسیری
حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جزایں نیست
کہ از "یٰسین" او آساں بمیری

بر ہمن گفت - برخیز از درِ غیر
زیارانِ وطن ناید بہ جز خیر
بیک مسجد دو ملّا می نہ گنجد
ز افسونِ بتاں گنجد بیک دیر

اقبال

لمعات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۔ $\frac{48}{49}$

اس ننھے سے بیج کی طرح جو پہلے ایک نرم و نازک سی کی طرح زمین سے نکلے پھر اس میں قوت پیدا ہو لی جائے تو ایک لہلہاتے پودے کی شکل میں سرفراز ہو۔ اور پھر اور طاقت حاصل کرے تو ایک بلند و بالا تناور درخت کی صورت میں جاہ طراز ہو جس کی نزہت و شگفتگی اور برگ و بار کو دیکھکر اس حسنِ ارضی کا باغبان فرطِ مسرت سے جھومنے لگے اور مخالفین اپنے غصہ کی آگ میں جلے رہیں۔

طلوعِ اسلام ایک پیغام لیکر آیا ہے۔ دو لفظوں میں وہ پیغام ہے "حکومتِ الٰہی کا قیام"۔ پہلے اپنے گھر میں۔ اور پھر پھیلتے پھیلتے تمام روئے زمین پر۔ اس پیغام کے مخاطبِ عمومی تمام مسلمان ہیں۔ لیکن چونکہ قوموں کا مستقبل ہمیشہ ابھرنے والی نسل کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسلئے ہم نے شروع ہی سے نوجوانانِ ملت کو اپنے اس پیغام کا خصوصی مخاطب سمجھا ہے اور علیٰ قدر وسعت ہر ممکن طریقہ اختیار کیا ہے کہ یہ پیغامِ خداوندی ان کی نگاہوں کے سامنے روشن اور انکے دلوں میں جاگزین ہو جائے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ہم نے رسالہ اور اسکے شائع کردہ پمفلٹوں کو قوم کی درسگاہوں میں اس کثرت سے پھیلایا ہے کہ ہمارے بعض کرم فرما اسے "جنونِ مصلحت فراموش" سے تعبیر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ الحاد و افرنگیت یا دوسری طرف نیشنلزم اور سوشلزم کا وہ سیلاب بلاانگیز جو ہمارے ان نوجوانوں کی تربیت گاہوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے میں بڑی حد تک حائل ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی رحمت سے مایوسی ہمارے مسلک میں جرمِ عظیم ہے اسلئے اس سے نہ تو ہمارے حوصلوں میں پستی آئی نہ عزائم میں لغزش اور ہم اللہ کے فضل و کرم کے بھروسہ پر اسکے اس

درخشندہ پیغام کی نورانی شمع کو ہاتھ میں لیکر آگے ہی بڑھتے گئے۔ تاآنکہ ہم نے محسوس کرلیا کہ ہماری سعی لاحاصل اور ہماری تگ و تاز بے نتیجہ نہیں۔ اس دوران میں ہماری انگلیاں نبضِ ملت پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر رہیں۔ اور ہم نے علیٰ وجہ البصیرت دیکھا کہ ہماری قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں ایک آنے والے انقلاب کی خوابیدہ آرزوئیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ کچھ روز ادھر سے تو اس طبقہ کے جو خیالات متعدد مراسلات کی صورت میں ہم تک پہنچ رہے ہیں وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

خلوت کی گھڑی گزری۔ جلوت کی گھڑی آئی

چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر!

چنانچہ انہی حیات آفریں خیالات کا ایک مختصر سا مرقع آپکو اس گرمجوش اسکیم میں ملے گا جو پچھلے دنوں "پنجاب مسلم سٹوڈنٹس" کی طرف سے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوئی ہے جسکا نصب العین یہ ہے کہ:۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث ! مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے !

اسلیئے اس اسکیم کے اجزائے ترکیبی یوں سمجھیئے۔

(۱) مومن کی زندگی کا مقصد استخلاف فی الارض ہے

(۲) ہندوستان میں اس کی ابتدا کے لیئے شمالی ہندوستان کا پورا خطہ ایک اسلامی ریاست میں تبدیل کیا جائے۔ جس کی حدیں افغانستان اور آسام تک پھیلی ہوئی ہوں۔

(۳) اس خطہ میں حکومتِ الٰہی کو قایم کیا جائے جسکا ضابطۂ قوانین کتاب اللہ ہو۔

(۴) احکامِ خداوندی کی تنفیذ کا ذمہ دار ایک امیرِ ملت ہو جس کی پشت پر مجاہدین کی ایسی جماعت ہو جسکے نزدیک احکامِ الٰہی میں اطاعت امیر۔ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف ہو۔

(۵) جماعت کا ہر رکن امیرِ ملت کے ہاتھ پر اس امر کی بیعت کرے کہ جب تک اسے جماعت کا اعتماد حاصل رہے گا۔ اور وہ کتاب اللہ کے مطابق راہ نمائی کرتا رہے گا۔ بیعت کرنیوالے پر اُسکے ہر حکم کی تعمیل فرض ہوگی۔

(۶) حکومتِ الٰہی کے دائرہ کے اندر بسنے والے غیر مسلموں کی حیثیت ذمیوں کی ہوگی جو جزیہ بجائے فوجی

خدمت سے مستغنی رہینگے۔ اور انکے معابد۔ جان۔ مال۔ عزت کی حفاظت، حکومتِ خداوندی کے ذمہ ہوگی

آپ اس اسکیم پر جس انداز سے جی چاہے تنقید کیجئے۔ (اور ہمیں خود تسلیم ہے کہ اسے قابلِ عمل بنانے کے لئے اس میں ابتداءً کچھ تغیر و تبدل کرنا پڑیگا۔ اور اسکے حصول کے لئے بے پناہ قربانیوں کی ضرورت ہوگی) لیکن اس حقیقت سے آپکو کسی صورت میں بھی انکار نہیں ہوگا۔ کہ وہی نوجوان جو کل تک یورپ کی نیشنلزم اور اس سوشلزم کو اپنا مسلک اور مارکس اور لینین اور گاندھی اور نہرو کو اپنا راہنما تصور کرتے تھے۔ جنکے کمروں سے خدا اور مذہب کے خلاف تضحیک و تمسخر کے قہقہے فضائے آسمانی میں تحرک و تموج پیدا کر دیتے تھے۔ آج انہی نوجوانوں کی زبان سے حکومتِ الٰہی۔ احکامِ قرآنی ملتِ اسلامی۔ امیر المومنین۔ جماعتِ مجاہدین۔ مرکزیت۔ اطاعت کے الفاظ ایک حیرت انگیز اور مسرت آفریں انقلاب ہے۔ کیا اس سے اس حقیقت کیطرف رہنمائی نہیں ہوتی۔ کہ:۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　　نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

اور پھر یہ آواز کس دور میں اٹھ رہی ہے؟ اس دور میں جب وہ "مقدس طائفہ علمائے عظام جو دینِ خداوندی کا واحد علمبردار ہونے کا مدعی ہے" قشقہ بر جبین اور زنار بدوش کہیں متحدہ قومیت کے سیلاب میں بہا جا رہا ہے۔ اور کہیں "معاشی مسائل" کو ملتِ اسلامیہ کا مطمح نگاہ قرار دے رہا ہے اس دور میں "مذہب سے بیگانہ نوجوانوں کے طبقہ" سے اس آواز کا بلند ہونا اسکے سوا اور کیا ہے کہ

پاسباں مل گئے کعبہ کو "صنم خانہ" سے!

جہانتک ہمارا تعلق ہے ہم ان سعادتمند نوجوانوں کے اس جذبہ کو موجب ہزار تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں کہ یہی ہیں وہ علائم و آثار جنسے قوم کے مستقبل کا پتہ ملتا ہے۔ ہم ان سے درخواست کرینگے کہ وہ اپنے اس جوش و ولولہ اور تڑپ و اضطراب کو کسی ہنگامی طوفان کی نذر ہوجانے سے بچائیں اور اپنے لیے گزشتہ صدی کے ائمہ مجاہدین حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت شاہ اسمعیل شہید دہلوی علیہ الرحمہ۔ کی زندگی کو نمونہ بنائیں۔ یعنی فکر و نظر کو قرآن کریم کے قالب میں اور اعمال و عزائم کو اسوۂ حسنہ نبی اکرمؐ کے سانچہ میں ڈھالیں کہ دنیا اپنی فلاح و کامرانی کے لیے جو راستے جی چاہے اختیار کرے

ایک مردِ مومن اور جماعت مومنین کے لیے اِس راستے کے علاوہ اور کوئی صراطِ مستقیم نہیں۔ اِس راستہ کے نشانات آج حکیم الامت حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے ارشادِ گرامی سے ملینگے۔ جب آپ اتباعِ قرآن کریم سے اپنے قلب و دماغ میں پختگی پیدا کرلیں۔ تو پھر دنیا کی بڑی سی بڑی طاقت سے ٹکرا جائیے خدا کی نصرت آپ کے ساتھ ہوگی۔

بانشۂ درویشی درساز و دما دم زن | چو پختہ شدی خود را بر سلطنتِ جم زن

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان جواں بخت۔ جواں ہمت۔ جواں سال۔ نونہالانِ ملت کے ارادوں میں استقامت۔ مساعی میں برکات۔ حوصلوں میں بلندی۔ دل میں جوشِ ایمانی۔ دماغ میں فراستِ قرآنی۔ بازوؤں میں قوت اور قوت میں صحیح نتائج پیدا کرے ؎

جوانوں کو میری آہِ سحر دے | پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پَر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے! | مرا نورِ بصیرت عام کردے

(اقبالؔ)

گزشتہ ماہ جہاں ایک طرف نوجوان قوم کیطرف سے اس قسم کے تابناک آثار نزہت بخش قلب و نظر ہوئے۔ دوسری طرف بعض "بزرگانِ ملت" کیطرف سے ایسی افسوسناک ذہنیت کا مظاہرہ ہوا ہے۔ جو قوم کی بدبختی کا آئینہ دار ہے۔ لارڈ لنلتھگو کی زندگی کی تمام آرزوئیں سمٹ سمٹا کر اس نقطہ پر مرکوز ہو رہی ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح انکے عہد گوسالہ پرستی" میں فیڈریشن کا نفاذ ہو جائے۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ ہندوے اپنے روایتی بنیاپن کی بنا پر انگریز سے سودا کر لیا ہے۔ ریاستیں بھی کسی بتِ طنّاز کے جبینِ ابرو کی تاب نہ لاکر سجدہ ریز نہیں تو کم از کم خمیدہ کمر ضرور ہو چکی ہیں۔ اب خداوندانِ لندن اور شملہ کو خدشہ صرف مسلمانوں کیطرف سے ہے۔ چونکہ فیڈریشن جس شکل میں انگریز اور ہندو ملکر اسے نافذ کرنا چاہتے ہیں مسلمانوں کے لیے "ملّی خودکشی" کا حکم رکھتی ہے۔ اسلیئے وہ اربابِ حل و عقد جنہیں اللہ تعالےٰ نے دولت اور سیاسی بصیرت کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ بار بار اس کی مخالفت کا اعلان کر رہے ہیں۔ مخالفت کی یہ آواز انگریز کو کس طرح بھا سکتی ہے؟ کاسہ لیسانِ ازلی کا گروہ ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ جہاں انکے خداوندانِ نعمت کو کسی

طرف سے خلش و کاوش پیدا ہو۔ وہ اپنی خدماتِ جلیلہ پیش کردیں تاکہ انکے صلہ میں انکے جذبات جاہ پرستی کی تسکین کا سامان فراہم ہو جائے ارباب حکومت کے پاس ان بندگانِ حرص و آز کے لیے بڑی بڑی کشش کے سامان موجود ہیں۔

فرنگ آئینِ رزاقی بداند ٭ ٭ بایں بخشد از و وامی ستاند

بہ شیطاں آنچناں روزی رساند کہ یزداں اندر آں حیراں بماند

پھر فیڈریشن کے معاملہ میں وہ اس حربہ کو کیوں نہ استعمال کرے۔ چنانچہ سمائے لندن و شملہ سے احکامات نازل ہوئے اور یہ کٹھ پتلیاں انکے اشاروں پر رقص کرنے لگیں۔ کسی نے فیڈریشن کی مخالفت کو جنون بتایا۔ کسی نے اس کی متبادل اسکیم کو خیال خام سے تعبیر کیا۔ کہیں لیگ میں تشتت و انتشار پیدا ہو جانے کی دھمکی دی۔ کہیں اپنے آقایانِ نعمت کو یقین (موہوم) دلایا کہ قوم (جسکے یہ "ترجمان" ہیں) فیڈریشن کے لیے بالکل آمادہ ہے۔ غرضیکہ ہر ایک نے ملتِ اسلامیہ سے غداری اور اپنے "خداؤں" سے وفاشعاری کا ثبوت دیا۔ اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہیئے کہ ؂

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است جبینِ خود منہ جز در برِ او ٭

سرِیں را ہم بہ جوشش دہ کہ آخر ٭ حقے دارد بہ غیر پالاں گیرِ او ٭

یہ ہے انکا مسلک! دل میں خودی موجود ہو تو وہ بتائے کہ ؂

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

تقسیم ہندوستان کے متعلق دو ادر اسکیمیں سامنے آگئی ہیں۔ ایک نواب آف ممدوٹ کی طرف سے اور دوسری سر سکندر حیات خاں کی جانب سے۔ سر سکندر کی اسکیم کی تفصیلات ہنوز صیغۂ راز میں ہیں۔ لیکن جو کچھ انکے بیان کردہ اشارات سے مترشح ہوتا ہے۔ اسکے پیش نظر تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ یہ اسکیم ملتِ اسلامیہ کے لیے مفید نہیں ہو سکتی، پنجاب کے ساتھ راجپوتانہ کی ہندو ریاستوں کو ملانا یہاں کی رہی سہی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دینے کے مرادف ہوگا۔ باقی رہی نواب

آف ممدوٹ کی اسکیم۔ سواس میں اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی اسکیم میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اسوقت جتنی اسکیمیں سامنے آئی ہیں۔ ان میں تو فی الجملہ ڈاکٹر صاحب کی اسکیم بہترین نظر آتی ہے۔ اسلئے کہ یہ "پاکستان" کے اس نظریہ کے زیادہ قریب ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کا واحد نصب العین ہونا چاہیئے۔ خدا کرے کہ ارباب لیگ ان اسکیموں کے متعلق بہت جلد کسی نتیجہ پر پہونچکر کسی متفقہ فیصلہ کو اپنا نصب العین قرار دیدیں۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ معاملات جلد بازی سے طے نہیں ہوا کرتے لیکن وقت کا تقاضا کچھ ایسا ہی ہے کہ۔۔

پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے۔

خدا کرے کہ لاہور کے اجلاس لیگ تک اِس باب میں کوئی حتمی فیصلہ بروئے کار آجائے۔
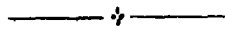
کبھی سلطنتیں خون کی قیمت سے ملا کرتی تھیں لیکن اِس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں سلطنت نہیں تو کم ازکم سلطنت کا اقتدار و اختیار۔ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر محض خلوص نیت اور مالی قربانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس بیع و شرا کے بازار میں مسلمان سب سے پیچھے تھے۔ کہ اسکے جمہور نادار اور اُمرا بالعموم بخیل واقع ہوئے ہیں۔ متوسط طبقہ عام طور پر صاحب درد بھی ہے اور ایثار پیشہ بھی۔ لیکن جتنا ایثار انکے مقدور میں ہے۔ اس سے حکومت جیسی جنس گرانمایہ کی قیمت ادا نہیں ہوسکتی۔ ہمیں حیرت ہے کہ ہمارا اُمرا کا طبقہ بالاخر کس سوچ میں بیٹھا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو چھوڑیئے۔ پنجاب میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے مکانوں کے نیچے سونے اور چاندی کی کانیں دبائے بیٹھے ہیں وہ اِس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ وہ روپیہ جو ایسے نازک وقت میں ملت کے کام نہیں آتا دورِ انقلاب میں وبالِ جان بن جایا کرتا ہے اور اس افراتفری کے زمانہ میں سب سے زیادہ تباہی انہی کو آیا کرتی ہے۔ جو ایسے ایسے دفائن وخزائن کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا آج اگر کسی اور خیال سے نہیں تو اپنے مستقبل کی حفاظت کی خاطر انہیں چاہیئے کہ اس روپے کو قوم کے قدموں میں ڈھیر کردیں۔ اور پھر دیکھیں کہ تجارتی

نقطۂ خیال سے بھی یہ سودا کس قدر منافع پیدا کرتا ہے۔ ہم نے یہ بات بر وقت اُنکے گوش گزار کر دی ہے۔ اگر یہ حضرات سمجھ جائیں تو خود بھی بچ جائینگے۔ اور قوم بھی بچ جائیگی۔ ورنہ قوم کے ڈوبنے سے پہلے اِن کی تباہی لازمی ہے۔ خدا کرے کہ جن کانوں تک ہم یہ آواز پہونچانا چاہتے ہیں۔ ان میں گرانباریٔ دولت نے ثقل سماعت نہ پیدا کر دیا ہو

تعصب اور تنگ نظری کے معنے یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو آسمان کی بلندیوں پر سمجھے اور فریقِ مقابل کو "تحت الثریٰ" کے نیچے۔ اپنے عیوب بھی محاسن نظر آئیں۔ اور دوسرے کی خوبیاں بھی بُرائیاں بن جائیں۔ کبھی علما کا طبقہ سب سے زیادہ کشادہ ظرف اور حقائق کا معترف سمجھا جاتا تھا لیکن جب "علم" کا مفہوم بدل جائے تو اسکے نتائج کا بدل جانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آج بدبختی سے ہمارا یہی طبقہ بالعموم سب سے زیادہ تنگ نظر واقعہ ہوا ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ جنہیں ان سے کسی مسلک میں کچھ اختلاف ہوتا ہے انہیں بدترینِ مخلوق قرار دیتا ہے۔ جمعیۃ العلماء (مراد آباد) کے خطبہ صدارت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"اب دو طبقے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں ایک اپنا نصب العین یہ بناتا ہے کہ (۱) حکومتِ برطانیہ سے وفاداری استوار کرو۔ اور ان کی حکومت اپنے لیئے دورِ رحمت سمجھو۔ (۲) ان کی قوم کا کلچر اپنا کلچر بناؤ۔ ... (۳) دیگر اقوامِ ہند سے علیحدہ ہو کر اپنا سرپرست صرف انگریز کو سمجھو وغیرہ وغیرہ دوسرا بالکل اس کی ضد میں اعلان کرتا ہے اور نوامیس الہیہ کے شواہد پیش کرتا ہے (۱) لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلاً۔ ہرگز مسلمان کسی غیر کی حکومت کو قبول کرنے کو تیار نہیں (۲) اپنی تہذیب تمدن۔ اپنا کلچر محفوظ رکھو۔ کیونکہ انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین تمہاری ہی تہذیب بلند اور رارفع ہے۔ اور تم نے یہ نہ کیا تو ہمیشہ کے لیئے اپنی غلامی پر مہر لگا دو گے۔ انکے مقرر کردہ نصابِ تعلیم۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخیں تم کو ہمیشہ سے لیئے

غلامی میں مبتلا کر دیگی۔ جس سے نکلنا مشکل ہوگا (۳) تمہیں حق نہیں کہ ہندوؤں سے لڑو کہ وہ تم سے نہیں لڑ رہے۔ اُن سے مل کر متحدہ محاذ انگریز کے خلاف اپنی ملکی آزادی کے لیے قائم کرو۔" (انصاری ۹/۴۳ ۱۱)

مولانا صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اگر انہیں اس کی ذمہ داری کا ذرا بھی احساس ہے تو ہم ان سے بادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ فرمائیں کہ وہ کون سی جماعت ہے جسکا نصب العین یہ ہے کہ انگریز کی حکومت کو رحمت سمجھو۔ اسکا کلچر اپنا کلچر بناؤ اور اسے اپنا سرپرست تصور کرو؟ اسکے مقابل مولانا صاحب اپنی جماعت (قومیت پرست) کا یہ مسلک بیان فرماتے ہیں کہ:-

(۱) کسی غیر کی حکومت قبول نہ کرو۔

(۲) اپنی تہذیب کو محفوظ رکھو۔

(۳) غیروں کے نصاب تعلیم کو اختیار نہ کرو۔

(۴) انگریز کو دشمن سمجھو اور ہندو کو دوست۔

کس قدر شاندار اور نظر فریب الفاظ ہیں لیکن کیا مولانا صاحب ارشاد فرمائینگے۔ کہ:-

(۱) انگریز کو ہندوستان سے نکال دینے کے بعد (اگر ہندو نے اسے گوارا کیا تو) جو حکومت "متحدہ قومیت" کی رُو سے قائم ہوگی وہ خالصتہً اسلامی حکومت ہوگی یا ہندو اکثریت کی حکومت۔ اگر ہندو اکثریت کی حکومت ہوگی تو کیا اس حکومت پر اس آیہ مقدسہ کا اطلاق نہیں ہوسکے گا کہ لَنْ یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلاً۔ (اللہ کفار کو مسلمانوں پر غلبۂ حکومت نہیں دیگا) اُسوقت ہندو۔ کفار میں شامل ہونگے یا مومنین کہلائینگے؟

(۲) کیا بڑے سے بڑے اکابر قومیت پرست یہ اعلان نہیں کر چکے کہ جب تک ہندوں اور مسلمانوں کی جداگانہ تہذیبیں مٹ کر ایک جدید تہذیب میں مدغم نہ ہو جائیں گی۔ متحدہ قومیت کی تشکیل نہیں ہوسکیگی؟ اور کیا اس امر کا بھی مضحکہ نہیں اُڑ چکا کہ مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب کون سی ہے؟

(۳) کیا خود جمعیتہ علماء ہند نے اس امر کا اعتراف نہیں کیا کہ وار دھا کی تعلیمی اسکیم اور اسکا نصاب مرتب کرتے وقت ان حضرات سے مشورہ تک نہیں لیا گیا - یہ اسکیم اب مُلک میں نافذ ہو تی جا رہی ہے - کیا یہ غیروں کا تجویز کردہ نصابِ تعلیم نہیں ہے ؟

(۴) کیا انگریز اور ہندو دونوں غیر مسلم نہیں - اور کیا تمام غیر مسلموں کی دوستی سے قرآن کریم نے منع نہیں فرمایا ؟ بلا لحاظ اس امر کے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ مقاتلہ کیا ہو یا نہ ؟

مولانا صاحب کے خطبہ سے صاف ظاہر ہے کہ جب وہ "غیر" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان حضرات کی مراد صرف انگریز ہوتا ہے - ہندو "غیر" نہیں ہے یہ ہے قومیت پرستی!

پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ مولانا صاحب کے نزدیک ہندو مسلمانوں سے لڑے نہیں نہ لڑتے ہیں - اسلئے ان کی دوستی بالکل جائز اور دُرست ہے - کفار سے دوستی کے متعلق اشاعتِ زیرِ نظر میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہو رہا ہے - اسلئے اس مسئلہ کے متعلق کچھ نہیں لکھنا چاہتے - البتہ یہ سادہ لوحی ملاحظہ فرمایئے کہ ان حضرات کے نزدیک لڑائی صرف تیغ و سناں اور توپ - بندوق کی لڑائی ہے - ان ہتھیاروں کو استعمال کیئے بغیر اگر کوئی قوم دوسری قوم کا تمام خون چوس جائے - پھر بھی وہ دوست ہی رہتی ہے - باقی رہا "انگریز کے خلاف محاذ" تو کیا یہ محاذ "متحدہ قومیت" کے بجائے - ہندو اور مسلمان اور جُداگانہ قوموں میں بین الاقوامی اتحاد کی رُو سے قائم نہیں ہو سکتا! یہی تو بنیادی فرق ہے ہندو اور اسکے ساتھ مسلمان قومیت پرست حضرات - مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تسلیم نہیں کرتے اور اسلام - مسلمانوں کو ساری دنیا سے الگ - غیر مخلوط قوم قرار دیتا ہے -

یہ ہے ہمارے ان "علمائے عظام" کی سیاسی بصیرت اور کشادہ ظرفی!

کفار سے دوستی!

قرآن کریم کی تحریف معنوی کا ایک حسرت آفرین منظر

(ایک مسلمان)

دنیا میں بعض لوگ فطرۃً غلام ہوتے ہیں۔ محکومی ان کی سرشت میں مضمر اور عبودیت ان کے خمیر میں داخل ہوتی ہے۔ انکا مسلکِ زندگی ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ اقتدار کے سامنے جھکنا۔ اسکی خوشنودی حاصل کرنا۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ صاحبِ قوت وسطوت کون ہے، وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ طاقت کہاں ہے؟۔ جہاں طاقت نظر آئے ان کی جبینِ نیاز وہیں سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ کہ:۔

طواف اندر سرشتِ برہمن است

ایسے غلام فطرت انسانوں کے بالعموم ۲ طبقے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو کھلے بندوں صاحب غلبۂ اختیار کی خوشامد کرتے ہیں۔ ان کی بارگاہِ عالیہ میں تمنائے قرب ان کی زیست کا سہارا اور اسکا حصول ان کے نزدیک حاصلِ زندگی ہوتا ہے۔ وہ اس کی خاطر۔ جائز و ناجائز ہر قسم کے وسائل اختیار کرتے ہیں۔ اور "حکومت پرست" کہلانے میں انتہائی عزت و مسرت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ کھلم کھلا طوقِ غلامی زیبِ گلو کرتے ہیں۔ اس لیے دوسرے انسان اُن کی نسبت دہوکا نہیں کھا سکتے اسکے برعکس انہی لوگوں کا ایک اور طبقہ ہے۔ جو اپنی اس خوئے غلامی کو تقدس کا پیرہن اڑھا کر اپنے خبثِ باطن کو مذہب کی آڑ میں چھپاتے ہیں۔ اور یوں خدا۔ اسکے رسولؐ۔ اور ملتِ اسلامیہ کو دہوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے۔ کہ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (۲) وہ خود اپنے آپ کو دہوکا دیتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ ہے وہ طبقہ جو ملت کے لیے ہمیشہ رہزن

ایمان وحریت ثابت ہوتا ہے! اور ان سے بچنا ہمیشہ متاعِ دین وتقویٰ کے تحفظ کا موجب
ان میں سے کچھ تو محض بنا بر جہالت ایسا مسلک اختیار کرتے ہیں۔ لیکن اکثر نفس پرستی کا شکار
ہوکر جلب منفعت کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ یہی طبقہ تھا کہ جب اُسنے مُلک میں انگریز کا غلبہ دیکھا
توکتاب وسنت کو اپنے جذباتِ رذیلہ کے ابلہ فریب غلافوں میں لپیٹ کر آگے بڑھا کہیں
”حاکمِ وقت“ کی اطاعت کو فریضہ خداوندی قرار دیا۔ کہیں اسے ”اولی الامر منکم“ ٹھیرا کر اسکی
فرماں پذیری کو (نعوذ باللہ) خدا ورسولؐ کی اتباع کے قائم مقام بنایا۔ کہیں اس کی خاطر ”جہاد
بالسیف“ کو حرام قرار دیا۔ اور کہیں ”لاتفسدوا فی الارض“ کی نصِ صریح سے اسکے خلاف صدائے
احتجاج بلند کرنے کا خیال تک ناکفرانِ مرادت بتایا۔ غرضیکہ یہ تھا وہ گروہِ ”حاملانِ دینِ متین اور
مفتیانِ شرعِ متین“ جسنے اپنی نفس پرستی کی خاطر غیر خدا کی غلامی کی بدترین لعنت کو نعمتِ الٰہی
اور موہبتِ ربانی بنا کر دکھایا۔ اور یوں مذہب کی آڑ میں اپنے جذباتِ رذیلہ اور خواہشاتِ دنیاوی
کی تسکین کا سامان بہم پہونچایا — وہ زمانہ گزر گیا۔ اب انگریز کا اقتدار رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا
ہے۔ اور حکومت آہستہ آہستہ ہندوؤں کے ہاتھ میں منتقل ہوتی جارہی ہے۔ اس تبدیلی کے ساتھ
ہی اس غلام فطرت نفس پرست طبقہ نے بھی اپنے سجدوں کی سمت میں تبدیلی پیدا کرنا
شروع کردی ہے۔ اب انھوں نے اظہار تعبد وتذلل میں اپنی ”نمازوں“ کا رُخ لندن سے آنند
بھون کی طرف پھیر لیا ہے۔ اربابِ اقتدار کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے کہیں ہندو مسلم امتیاز مٹا کر
ایک متحدہ قومیت کا نظریہ وضع کیا جارہا ہے۔ تاکہ اکثریت نہایت اطمینان وسکون سے پورے
مُلک پر حکومت کرسکے۔ کہیں تمام مذاہب میں ”عالمگیر سچائی“ کے وجود کو تسلیم کرایا جارہا ہے
تاکہ خداوندانِ حکومت یہ کہہ کر انہیں بابِ عالی سے دھتکار نہ دیں کہ تم ہمارے مذہب کو
اپنے مذہب سے کمتر درجہ دے رہے ہو۔ کہیں اہنسا کو ہمسا پر فضیلت دے کر حرمتِ جہاد کے اُسی
دیرینہ ملت کُش فتویٰ کو نئے قالب میں پیش کیا جارہا ہے۔ متحدہ قومیت کے راستہ میں
سب سے بڑا روڑا یہ تھا کہ قرآن کریم مسلمانوں کو کفار کی دوستی سے بڑی شدت سے منع کرتا ہے لیکن

قرآن کو تو یہ حضرات ہمیشہ اپنے خیالات کے تابع چلاتے ہیں۔ اس لیے اب یہ آواز بلند ہونی شروع ہوگئی ہے۔ کہ قرآن کریم صرف اُن کفار کی دوستی سے روکتا ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ و قتال کیا ہو۔ عام کفار کی دوستی سے منع نہیں کرتا۔ لہٰذا انگریز سے دوستی تو حرام ہے۔ لیکن ہندو سے دوستی عین قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ (استغفر اللہ) یہ تو اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ اسنے اپنی کتاب مبین کے ایک ایک لفظ پر (بڑے بڑے زبردست پہرے دار بٹھا رکھے ہیں۔ کہ کسی کی مجال نہیں کہ انہیں اپنی جگہ سے ہلا سکے۔ ورنہ جو لوگ قرآن کریم میں اس درجہ تحریفِ معنوی کی جرأت کر سکتے ہیں، ان سے یہ کب بعید تھا کہ وہ الفاظِ قرآنی میں بھی (نعوذ باللہ) اپنی مرضی کے مطابق ردّ و بدل کر ڈالتے۔ کتبِ سابقہ میں جو ردّ و بدل ہوا وہ بھی ایسی ہی دسیسہ کاریوں کا شرمندۂ احسان تھا۔ آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم کفار سے دوستی کے متعلق کیا حکم دیتا ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام نوع انسانی کے ساتھ عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے۔ کہ وہ مساواتِ انسانی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ لیکن وہ انسانوں کے مختلف طبقات کے فرق کو بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ وہ کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کہ ظالم اور مظلوم میں نمایاں فرق ہے۔ اگر تمہیں مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہے، تو اس کی مدافعت اور امداد کی خاطر ظالم کی مخالفت کرنی ہوگی۔ تم بیک وقت ظالم اور مظلوم دونوں سے دوستی کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتے۔ مظلوم سے دوستی کا لازمی نتیجہ ظالم سے ترکِ موالات (دوستی چھوڑ دینا) ہوگا۔ اس لیے کہ ظالم کا دوست بھی ظالم ہوتا ہے۔ ان کی مسخ شدہ فطرت کی ہم آہنگی۔ انکے راہ گم کردہ خیالات کی یک جہتی۔ انکے فسادانگیز اعمال کی ہمرنگی۔ ان میں رشتۂ موالات۔ دوستی کا علاقہ پیدا کر دیتی ہے +

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٥ (۶/۱۲۹)

اور اس طرح ہم ظالمین کو اُنکے اعمال (کی ہمرنگی کی) وجہ سے ایک دوسرے کا
دوست بنا دیتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

إِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ۔ ۴۵/۱۹

اور یقیناً ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور اللہ تو متقین کا دوست ہے

اسی اصولِ وحدت فی الخیال والعمل (فکر و نظر اور اعمال و افعال کی یکسانیت) کے مطابق قرآنِ کریم نے تمام نوعِ انسانی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو دُنیا میں قوانینِ الٰہیہ کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ اور اس طرح اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام اپنا منتہائے نگاہ قرار دیتا ہے۔ اس گروہ کو مومنین کی جماعت 'حزبُ اللہ' کہا گیا ہے۔ اسکے برعکس دوسرا گروہ کفار کا ہے جو اس نظامِ زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ غیر خدا (طاغوتی) قوتوں کے وضع کردہ دستور و آئین کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے۔ چونکہ ان ہر دو جماعتوں کی فطرت میں تضاد۔ سرشت میں تخالف۔ زاویۂ نگاہ میں تباین۔ ذہنیت میں اختلاف۔ لائحہ عمل میں افتراق اور منزلِ مقصود میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں میں باہمی دوستی کے تعلقات استوار ہوں۔ دوستی کے لیے فکر و نظر میں یگانگت۔ قلب و دماغ میں موانست خیال و عمل میں وحدت اور منزلِ مقصود کی یکسانیت ضروری ہے۔ جہاں ان باتوں میں اتحاد و ائتلاف نہ ہو۔ وہاں دوستی کیسی؟ دوستی تو قلبی تعلقات کا نام ہے۔ جب دل ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہوں تو دلی تعلقات کس طرح پیدا ہوں۔ کبھی ممکن ہے کہ حکومت کا باغی اور اسکا جانثار سپاہی ایک دوسرے کے دوست ہوں؟ نور اور ظلمت۔ خدا اور شیطان کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ باہمی دوستی کے تعلقات کے لیے قرآن کریم نے تولّٰی کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جسکے معنٰی ہیں بھروسہ کے تعلقات۔ ایک دوسرے پر کامل اعتماد۔ دلی دوستی۔ محبتِ قلبی۔ اور یہ ہیں وہ تعلقات جو ایک مومن کسی غیر مومن سے کسی حالت میں بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ انگریز ہو۔ خواہ ہندو کہ قرآن کریم کے نزدیک

اس باب میں یہ دونوں ایک ہی شق میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم نے فرمایا کہ مومن۔ مومن کا دوست ہوتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۹/۱

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست (ولی) ہوتے ہیں۔

اور کفار آپس میں ایک دوسرے کے دوست۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ - ۸/۷۳

اور کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں (اے مسلمانوں) اگر تم نے بھی (باہمی دوستی میں) ایسا ہی (مسلک اختیار) نہ کیا تو (یاد رکھو زمین میں عظیم الشان فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل غور ہے کہ کفار ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ ان کی دوستی میں قدر مشترک، وجۂ جامعیت۔ حق کی مخالفت ہوتی ہے۔ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمان باہمدگر اُخوت و محبت کے تعلقات نہ رکھیں گے تو دنیا میں فساد عظیم برپا ہو جائے گا (اس فساد کا نظارہ آج خود ہندوستان میں دیکھیے جہاں مسلمان مسلمان کی دوستی کے بجائے کفار کی دوستی اختیار کر رہا ہے اور جو اس کے خلاف کہتا ہے اُسے گردن زدنی قرار دے دیتا ہے۔)

یہاں تک تو ہم نے یہ دیکھا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مومن کا دوست مومن اور کافر کا دوست کافر ہو سکتا ہے۔ لیکن چوں کہ دنیا میں حق پرست جماعت (حزب اللہ) کے استحکام و استبقا کے لیے یہ اصول اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ جماعت غیر مسلموں کی جماعت سے ایسے تعلقات پیدا نہ کرلے اس لیے قرآن کریم نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں اس کی ممانعت فرما دی۔ اور متعدد مقامات پر اس کی تکرار سے اس کی اہمیت اچھی طرح ذہن نشین کرا دی۔ فرمایا،

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ

وَاِلَى اللّٰہِ الْمَصِیْرُ۔ ۳

جو لوگ ایمان والے ہیں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ مومنوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی کے تعلقات پیدا کریں۔ جس کسی نے ایسا کیا (تو وہ یاد رکھے کہ) اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رہا۔ بلکہ تمہیں چاہیئے کہ ان سے اپنے بچاؤ کا پورا پورا انتظام کرو۔ اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے (کسی اور سے مت ڈرو)۔ اور (انجام کار) اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

کفار سے دوستی نہ پیدا کرو اور ان کی طرف سے اپنی حفاظت کا پورا پورا بندوبست رکھو اس لیے کہ اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا۔ ۴/۱۰۱ ۔ یقیناً کفار تمہارے کھلے کھلے دشمن ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم العقل انسان اپنے کھلے دشمن کو دوست بنا کر اپنی آستین میں سانپ پالنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

اس مقام پر قرآن کریم نے کفار کو جماعت مومنین کا "کھلا ہوا دشمن" کہا ہے۔ اور متعدد مقامات پر شیطان کو بھی کھلا ہوا دشمن (عدوٌ مبین) قرار دیا ہے۔ کفار اور شیطان میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں قوانین الہیہ سے سرکشی کرنے والے ہیں۔ اس لیے جس طرح کفار ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ کفار اور شیاطین بھی باہمدگر دوست ہوتے ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ ۷/۲۷

یقیناً ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے

اور اگر اپنے آپ کو مومن کہلانے والے حکومت خداوندی سے بغاوت کرنے والے شیاطین کی دوستی اختیار کر لیں تو ان کے متعلق ارشاد ہے۔

فَرِیْقًا هَدٰى وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۚ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ ۷/۳۰

(تمہارے دو گروہ ہو گئے) ایک گروہ کو (سیدھی) راہ دکھائی۔ اور دوسرے پر گمراہی ثابت ہو گئی (اسی لیے کہ) ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ باین

یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ راست پر ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کونسا گروہ ہے۔ وہ گروہ جو بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ ہم بالکل راہ راست پر ہیں۔ گمراہ وہی ہیں جو کفار کی دوستی سے منع کرتے ہیں اور خالصتہً مسلمانوں کی الگ غیر مخلوط جماعت میں باہمدگر اخوت و مودت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ شیاطین جن سے دوستی رکھنے والوں کے متعلق فرمایا کہ ان پر گمراہی مسلط ہو چکی ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے غیر مسلم جماعتوں کے وہ بڑے سے بڑے سربرآوردہ لوگ ہیں جو اپنی طاغوتی قوتوں کے بل بوتے پر حکومت خداوندی کے قیام کی مخالفت کرتے ہیں اور دین الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً منافقین کے متعلق فرمایا:۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ ۔ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿۲/۱۴﴾

جب یہ لوگ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ لیکن جب اپنے شیاطین کے ساتھ خلوت میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے تو) تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ اُن سے تو ہم تمسخر کرتے ہیں۔

ذرا اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ آج کون مسلمانوں کی جماعت سے اس قسم کا عملی تمسخر کرتے ہیں اور کون کفار کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کر ان سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ہماری دوستی کے متعلق اس بات سے کبھی بدگمانی پیدا نہ کرو کہ ہم مسلمانوں سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۲/۱۶﴾

وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے۔ لیکن ان کی تجارت انہیں کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اور نہ ہی یہ راہِ ہدایت پر رہے۔

یعنے صراطِ مستقیم کو بھی کھو بیٹھے۔ اور جس دنیاوی تجارت کی خاطر کفار کی دوستی اختیار کی تھی وہ بھی کچھ سودمند ثابت نہ ہوئی (اور عاقبت کا خسارہ اس پر مستزاد ہے) اس لیے کہ یہ جتنا جی چاہے دوستی کا دم بھریں کفار تو انہیں اپنی مطلب براری کے لیے ساتھ رکھتے ہیں اور اسی چیز کی قیمت ادا کرتے ہیں جب مطلب نکل

جائے گا تو پھر انہیں کون پوچھے گا۔

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ "منافقین" نبی اکرمؐ کے عہدِ مسعود کی کسی خاص جماعت کا نام تھا۔ بلکہ یہ وہ طبقہ ہے جو ہر زمانے میں موجود رہتا ہے۔ جن کے متعلق فرمایا۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔ (۴/ ۱۳۸-۳۹)

(اے رسول) تم منافقین کو یہ خوش خبری سنادو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے یعنے وہ لوگ جو مسلمانوں کے سوا کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں کیا یہ لوگ کفار کے پاس عزت تلاش کرنے جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو یاد رکھیں کہ عزت جتنی بھی ہے سب کی سب اللہ ہی کے لیے ہے (یعنے اسی کے قبضہ اختیار میں ہے۔)

غور فرمائیے اس حقیقت کی طرف کہ یہ لوگ غیروں کے ہاں عزت حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مسلمان اپنی جماعت کی برومندی اور اسلام کے مستقبل سے (نعوذ باللہ) مایوس ہو جائے اور اپنے اندر اتنی جرأت بھی نہ رکھے کہ علانیہ کفر کا اقرار کرلے۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۤ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا۔ (۴/ ۱۴۳)

کفر و ایمان کے درمیان متردد (کھڑے) ہیں نہ تو ادھر ہیں نہ ادھر۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جس پر اللہ راہ گم کردے (یعنے اس کے قوانین کے مطابق راہ سعادت گم ہو جائے) تو تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔

اسی لیے اس کی ملحقہ آیات میں فرمایا:۔

"مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ مسلمانوں کے سوا کفار کو اپنا دوست بنالو کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو۔ بلا شبہ منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ڈالے جائیں گے۔ اور اس دن تم کسی کو بھی ان کا رفیق و مددگار نہ پاؤ گے (۴/ ۱۴۴-۴۵)

دیکھا آپ نے! کفّار کی دوستی اور منافقت کیسے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ پھر جس طرح کفار کے متعلق فرمایا
کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اسی طرح منافقین کے متعلق بھی فرمایا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۔ 9/67

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کو جہاں کفار کی دوستی سے منع فرمایا ہے وہاں منافقین کی دوستی سے بھی روک دیا۔ اس لیے کہ کفّار اور منافقین میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ آخر الذکر مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام مسلمانوں جیسا لکھاتے ہیں اور یہی چیز ہے جو دوسروں کے لیے فریب خوری کا موجب بن جاتی ہے چوں کہ قرآن کریم کے سامنے فطرت انسانی کا کوئی گوشہ چھپا نہیں اس لیے اس نے منافقین کے ذیل میں اس گروہ کا بھی ذکر کر دیا۔ جو اُن کے فریب میں آکر اُن سے موالات و محبّت کی سفارش کرتا ہے۔ فرمایا۔

"مسلمانوں تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق بن گئے ہو۔ حالاں کہ اللہ نے ان کی بدعملیوں کی وجہ سے انہیں الٹا دیا ہے (اور وہ راہِ حق سے پھر چکے ہیں) کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھا دو جن پر خدا (کے قوانین) نے راہ گم کر دی ہو۔ یاد رکھو جس پر اللہ راہ گم کر دے۔ تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ ان منافقین کی دلی تمنا یہ ہے کہ جس طرح اُنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے۔ تم بھی کر لو۔ اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔ پس دیکھو۔ جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ تمہیں چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ اور اگر یہ ایسا نہ کریں تو انہیں گرفتار کرو اور جہاں کہیں پاؤ قتل کرو۔ اور نہ تو کسی کو اپنا دوست بناؤ نہ مددگار۔" 4/89-88

ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سمجھ لیجیے کہ منافقین صرف نبی اکرمؐ کے زمانۂ مبارک کے کسی خاص گروہ کا نام نہیں بلکہ یہ لوگ ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں اور کفار کے ساتھ دوست داری کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ بقول مولانا ابوالکلام صاحب آزاد۔ "کفر کی طرح نفاق بھی محض عہدِ نزول ہی کی پیدا وار نہ تھا ہمیشہ ظہور میں آنے والی گمراہی تھی اور انسان کی گمراہیاں کسی خاص عہد و نسل کی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی گمراہیاں ہوتی ہیں۔"

(ترجمان القرآن ج ۲، ص ۱۳۸)

کفار اور منافقین کی دوستی سے منع کیوں کیا گیا۔ اس کی تفصیل سورۂ آل عمران کی ان آیات میں ملیگی

جہاں فرمایا۔

"اے ایمان والو۔ اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا ہمراز و معتمد نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنا رکھتے ہیں بغض (منصوبے) تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو تو۔ تم ان لوگوں سے محبت کرتے ہو لیکن وہ کبھی تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے۔ حالاں کہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصہ میں اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہدو کہ جاؤ۔ جوش غضب میں اپنے آپ کو ہلاک کر لو۔ اللہ دلوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اگر تمہارے لیے کوئی بھلائی کی بات ہو جائے تو ان کے لیے موجب غم ہو جاتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں اگر تم ثابت قدمی سے رہو اور ان سے اپنی حفاظت کرتے رہو تو ان لوگوں کی تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ ان کے اعمال کو محیط ہے۔" $\frac{3}{118-119}$

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں قرآن کریم کی رو سے دنیا میں دوست داری کے تعلقات کے لیے رشتہ صرف ایمان و تقویٰ کا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں۔ ہم وطن ہونا تو ایک طرف اگر کسی مسلمان کا حقیقی بھائی رشتہ، ایمان کی بنا پر اسلامی برادری میں شریک نہیں ہوا۔ تو اس سے بھی دوست داری کے تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔ $\frac{9}{23}$

اے مسلمانوں، اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں

تو انہیں اپنا دوست مت بناؤ اور جو کوئی ان سے دوستی کے تعلقات قائم کرے گا۔ تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں۔

سورۂ مجادلہ میں فرمایا۔

"تم کبھی ایسا نہ دیکھو گے کہ وہ لوگ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرنے لگیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔ خواہ وہ ان کے اپنے باپ۔ اپنے بھائی اور اپنے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ (اوّل الذکر) وہ لوگ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ایمان کو نقش کر دیا ہے۔ اور وہ اپنی رحمت (روح) سے ان کی مدد کرتا ہے۔ اور انہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان لوگوں سے راضی ہو گیا اور یہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ ہیں اللہ کی جماعت (حزب اللہ) اور یاد رکھو کہ کامیابی صرف اللہ کی جماعت کے لیے ہے۔" ۵۸/۲۲

قرآن کریم نے ملت اسلامیہ کے موسس اولےٰ حضرت ابراہیمؑ کے مسلک و مشرب کو مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ یہ حکم کس مقام پر ہے غور فرمایئے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ... ۶۰/۴

مسلمانوں تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے جب اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی تم، اللہ کو چھوڑ کر، پرستش کرتے ہو۔ بیزار ہیں ہم تمہارے ساتھ (ہر قسم کے تعلقات سے) انکاری ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغاوت اور بغض ظاہر ہے۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

آپ نے غور فرمایا کہ غیر مسلموں سے دوست داری کے تعلقات قائم کرنے کے لیے شرط کیا ہے؟ حتّٰی تؤمنوا باللہ یعنے جب تک ایک کافر و مشرک اسلام لا کر جماعتِ مومنین میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس سے دوستی کے تعلقات قائم

نہیں کئے جا سکتے ۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں مشرکین کے متعلق فرمایا۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ .. ۹/۱۱

اگر یہ لوگ (اپنے کفر و شرک سے) توبہ کرلیں۔ اور نماز قائم کریں۔ اور زکوٰۃ ادا کریں تو پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔

اس لیے کہ :-

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ۔ ۵/۵۵

اے مسلمانوں۔ تمہارے دوست تو صرف اللہ اس کا رسول۔ اور وہ جماعت مسلمین ہے جو نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور (ہر حال میں) اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔

بس یہ ہے ایک شکل غیر مسلموں سے مودت و مواخات ۔ تولی اور دوست داری کی ۔ یعنے وہ اسلام قبول کریں اس میں مشرک کافر۔ یہود۔ نصاریٰ سب داخل ہیں۔ جب تک یہ لوگ اسلام قبول نہ کریں ان سے دوستی کے تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے ۔ فرمایا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ ۵/۵۱

اے ایمان والو۔ یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ باہم کر ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی قائم کرے گا تو وہ بھی انہی میں کا ایک ہو جائیگا یقیناً اللہ ظالمین کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا۔

اس لیے کہ ان کا۔ اور جملہ کفار کا شیوہ، حق کی مخالفت اور قوانین الہیہ کی تضحیک و استہزاء ہے ۔ فرمایا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۵/۵۷

اے ایمان والو۔ اہل کتاب اور کفار جن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ تمہارے دین سے استہزاء کرتے

ہیں۔ انہیں کبھی اپنا دوست نہ بناؤ۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اگر تم مومن ہو تو۔

سورۂ فاتحہ میں دو جماعتوں کا ذکر ہے جو ایک دوسرے سے بالکل متمیز ہیں۔ ایک وہ جنہیں "منعم علیہ" کی جماعت کہا گیا ہے۔ یعنے وہ جن پر اللہ کے انعام و اکرام کی بارش ہے۔ دوسری وہ جن پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے دیگر مقامات میں ان دونوں جماعتوں کی تفصیل و تشریح موجود ہے۔ پہلی جماعت اللہ پر ایمان رکھنے والوں کی اور دوسری کفار کی ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرنے سے بالتصریح روک دیا گیا ہے۔ فرمایا

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۔ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَ يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ ۵۸/۱۴ (نیز دیکھو ۶۰/۱۳)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ایسے لوگوں سے دوستی پیدا کرتے ہیں جن پر اللہ نے اپنا غضب نازل کر رکھا ہے۔ ایسے لوگ نہ تم میں سے ہیں۔ نہ اُن میں سے۔ اور وہ دیدہ دانستہ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں (کہ وہ تم میں سے ہیں)۔

سورۂ انعام میں یہودیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ کفار کی دوستی اختیار کرتے ہیں اس لیے کہ ان پر خدا کا عذاب مسلط ہے۔ اگر یہ اسلام قبول کر لیتے تو کبھی کفار کو دوست نہ بناتے۔

"تم دیکھو گے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے دوست داری کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ کیا ہی بُری بات ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے تیار کر دی ہے کہ ان پر خدا کا غضب ہو اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ اللہ پر۔ اس کے رسولؐ اور جو کتاب اس پر نازل ہوئی ہے اس پر ایمان رکھتے تو (کفار کو) اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔" ۵/۸۰-۸۱

اور قرآن کریم ایک مردِ مومن کے صحیح ایمان و عمل کا تو معیار ہی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ ثابت کرے کہ اس کے دل میں خدا۔ رسول اور اپنی جماعت مسلمین کے علاوہ کسی اور کی محبت کا شائبہ تک نہیں۔ فرمایا:۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ

دُونِ اللّٰہِ وَلَا رَسُوْلِہٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَۃً وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ ۹

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی چھوڑ دئے جاؤ گے حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ تو آزمایا ہی نہیں کہ تم میں سے کون میدانِ جہاد میں پورا اترتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی اور کو اپنا دلی دوست نہیں بناتا۔ اور اللہ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے

قرآن کریم کی یہ نصوص صریحہ آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ غیر مسلموں کی دوستی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ اور وہ حکم کس تاکید اور شدت سے ہے۔ یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ یہ حکم عام کفار کے متعلق ہے کفار کی کسی خاص جماعت سے متعلق نہیں۔ وہ کفار جو مسلمانوں کے خلاف عملاً جنگ و قتال میں مصروف ہوں۔ اور وہ جو اس طرح مصروف نہ ہوں۔ سب کے سب ان احکام میں شامل ہیں۔ کفار، حکومت خداوندی کے باغی ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کا کوئی وفادار بندہ ایسے باغیوں سے دوستی کے تعلقات پیدا کرے ان کے ساتھ دوستی کی شرط صرف ایک ہے یعنے (حتّٰی تومنوا باللّٰہ) کہ وہ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ اگر یہ شرط پوری نہیں ہوتی تو خواہ وہ مسلمانوں کے باپ بھائی، اور عزیز رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیتے ہیں۔ (اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ) تو ان سے کبھی دوستانہ تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے ان کفار کا بھی ذکر کیا ہے جو مسلمانوں سے عملاً برسرپیکار ہوں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے تذکرہ سے مقصود یہ ہے کہ دوستی کے تعلقات کی ممانعت صرف انہی کفار سے ہے۔ عام کفار سے نہیں۔ ایسا سمجھنا قرآن کریم کے ان تمام مقامات سے آنکھیں بند کر لینا ہے جن میں اس حکم کی تعمیم ہے (اور جنہیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں) سورۂ ممتحنہ میں ہے۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۸

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے بارے میں اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ احسان و مروت (یعنی)

اور عدل و انصاف (قسط) کا سلوک کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا۔

اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ ۶۰/۹

اللہ تمہیں ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات پیدا کرنے سے روکتا ہے جو تمہارے ساتھ دین کے معاملہ میں لڑے ہوں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا ہو۔ یا جنہوں نے ان لوگوں کی مدد کی ہو جنہوں نے تمہیں جلا وطن کیا ہے۔ اس لیے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا وہ ظالمین سے ہوگا

اس آیت کو اگر باقی قرآن کریم سے الگ ہٹا کر دیکھا جائے تو یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دوستی کے تعلقات کی ممانعت صرف ان کفار سے ہے جو محارب ہوں (یعنے جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو) لیکن جو شخص اس آیت کو دیگر آیات متعلقہ سے ملا کر پڑھتا ہے۔ وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں تمام کفار سے (بلا تخصیص اس امر کے کہ انہوں نے عملاً قتال کیا ہو یا نہ) دوستی کے تعلقات سے منع کیا گیا ہے۔ ان احکام کی موجودگی میں صرف اس ایک آیت سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ دوستی کے تعلقات صرف ان کفار سے ممنوع ہیں جنہوں نے قتال کیا ہو۔ یومنون ببعض الکتاب ویکفرون ببعض (قرآن کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے سے کفر) کی عملی تفسیر ہے۔ اگر دوستی کی ممانعت کا حکم صرف ان کفار تک محدود ہوتا جو برسر پیکار ہوں تو جس وقت یہ لوگ جنگ سے باز آ جاتے اور صلح کر لیتے تو ان سے پھر دوستداری کے تعلقات پیدا کر لیے جا سکتے تھے لیکن قرآن کریم تو دوست داری کے تعلقات قائم کرنے کے لیے صرف ایک شرط ٹھہراتا ہے اور وہ یہ کہ یہ لوگ ایمان لا کر تمہاری جماعت میں شامل ہو جائیں (حتّٰی تؤمنوا باللّٰہ)۔ اپنے کفر و شرک سے باز آ کر مسلمان ہو جائیں (فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین۔ ۹/۱۱) اور یہ ظاہر ہے کہ تیغ و تفنگ توپ اور بندوق کی لڑائی تو ان جذبات بغض و عناد کا محسوس و مشہود مظاہرہ ہے جو عام کفار کے دلوں میں اسلام کے خلاف موج زن رہتے ہیں۔ ورنہ وہ کونسا غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کا دشمن نہیں ہے۔ جب قرآن کریم کا یہ کھلا ہوا ارشاد موجود ہو کہ ان الکفرین کانوا لکم عدوا مبینا ۴/۱۰۱ (یقیناً تمام کفار تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں) تو پھر

دوستی کے معاملہ میں محارب و غیر محارب کفار کی تخصیص اگر قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں تو اور کیا ہے۔ آیت مندرجہ بالا (۳۳) میں امتناع دوست داری کے حکم کی تاکید کی ہے۔ اور اس قسم کی مثالیں قرآن کریم میں اور مقامات پر بھی ملتی ہیں۔ مثلاً فرمایا۔

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ - ۲/۱۹۷

اور (ایام) حج میں تو عورتوں کی طرف رغبت کرنا جائز ہے۔ نہ کوئی گناہ کی بات اور نہ لڑائی جھگڑا۔

اب اگر کوئی شخص اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ فسق و فجور اور باہمی جنگ و جدل سے ممانعت صرف ایام حج میں ہے باقی سارا سال بے شک یہ کچھ کرتے رہو۔ تو سوائے اس کے کہ آپ ایسے شخص کی بصیرت کا ماتم کریں اور کیا کہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس آیت کو قرآن کریم کے دیگر احکام متعلقہ کے ساتھ ملا کر دیکھنا ہوگا۔ یا مثلاً سورۃ ممتحنہ کی ہی آیت (۶۰/۸) جس میں یہ ارشاد ہے کہ اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ جنگ و قتال نہ کیا ہو ان سے نیکی اور احسان اور عدل و انصاف کا سلوک کرو۔ تو اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنگ و قتال کرنے والوں سے عدل و انصاف نہیں کرنا چاہیئے۔ ان سے بے انصافی اور ظلم کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ آپ اس آیت کو باقی قرآن سے الگ ہٹا کر دیکھیں۔ اگر آپ اس آیت کو آیتِ ذیل سے ملا کر پڑھیں تو مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ فرمایا:۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ -

کسی قوم سے دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

اب ان آیات کو ملا کر پڑھنے سے واضح ہو گیا کہ:۔

(۱) عدل و انصاف کا حکم تمام انسانوں سے ہے۔ خواہ وہ ہمارے بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) احسان و مروّت کی اجازت ان غیر مسلموں سے ہے جو عملاً جنگ میں مصروف نہ ہوں۔

(۳) دوستی اور مودت کے تعلقات کسی غیر مسلم سے جائز نہیں۔ عام اس کے کہ وہ عملاً شمشیر بکف تمہارے مقابل ہوں یا نہ۔

اس کے بعد آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ آج یہ فتویٰ دینا کہ انگریز کی دوستی تو حرام ہے کہ اس نے تمہارے خلاف لڑائیاں کی ہیں۔ لیکن ہندو کی دوستی عین اسلام ہے کہ اس نے تمہاری خون ریزی نہیں کی ہے۔ اگر قرآن کریم سے کھلی ہوئی بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور تماشا یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک جنگ صرف وہی جنگ ہے جس میں تلوار کی دھار سے خون بہایا جائے۔ اگر ایک قوم شمشیر و سنان کی مدد کے بغیر اپنی سازشوں اور فریب کاریوں سے دوسری قوم کا تمام خون پی جائے تو اس قوم کو گلے لگائے رکھنا چاہیئے اور اپنا بہترین دوست سمجھنا چاہیئے! قرآنی حقائق سے آنکھیں بند کر لینے کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں اتنی عقل سلیم بھی باقی نہ رہے کہ وہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت کو پہچان سکے۔ سچ فرمایا ہے قرآن کریم نے کہ :-

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ‎۲۲/۴۶

ان لوگوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینہ کے اندر ہیں۔

یوں تو اس قسم کا فتویٰ دینے والے حضرات میں سے ہر ایک کی حالت قابل رحم ہے لیکن ہمیں سب سے زیادہ افسوس مولانا آزاد پر ہے کہ وہ یہ سب کچھ دیدہ و دانستہ کر رہے ہیں۔ اور یوں قوم کو "جہنم" میں لے جانے کے سب سے بڑے ذمہ دار ہیں۔ آپ سورۂ توبہ کے حواشی میں فرماتے ہیں :-

"اس سورت میں جا بجا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے رفاقت و اعانت کے رشتے نہ رکھو اگرچہ وہ تمہارے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں اور دوسری سورتوں میں بھی ایسے ہی احکام موجود ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اور اس طرح کے تمام احکام، احکام جنگ میں سے ہیں نہ کہ معیشت و علائق کے تمام احکام اور یہ بات خود قرآن نے جا بجا اس درجہ وضاحت اور قطعیت کے ساتھ واضح کر دی[1] ہے کہ شک اور تردد کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی۔

جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے۔ قرآن کہتا ہے اصل اس باب میں محبت و شفقت ہمدردی و سلوک اور تعاون[2] و سازگاری[3] ہے اس کے سوا

---

[1] مولانا صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں اس امر کی وضاحت اور قطعیت درج ہے
[2] ہر معاملہ میں تعاون نہیں بلکہ صرف بر و تقویٰ کے معاملہ میں تعاون (تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ منہ
[3] سازگاری سے اگر مراد دوستی ہے تو یہ غلط ہے۔ دوستی صرف مسلمانوں کے ساتھ جائز ہے۔ کفار کے ساتھ نہیں۔ منہ

کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتا ہے ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے[1] خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو۔ ہم نسل ہو یا نہ ہو۔ ہم عقیدہ[2] ہو یا نہ ہو اور امتیاز[3] و تفریق کی وہ تمام باتیں جو اس انسانی بھائی چارگی کا رشتہ قطع کرتی ہیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں خود انسانوں کی گھڑی ہوئی معصیت اور گمراہی ہے۔ پیغمبر اسلام کی دعاؤں میں سب سے زیادہ اعتراف اسی حقیقت کا ہوتا تھا کہ "اِنِّی اَشْھَدُ اَنَّ الْعِبَادَ[4] کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ" (مسلم) خدایا! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں!

لیکن جب تمام ملک و قوم نے اس دعوت کو بزور شمشیر نابود کر دینے کا فیصلہ کر دیا اور پیروان دعوت پر محض اختلاف عقائد کی بنا پر ظلم و ستم کرنے لگے تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہوگئی۔ اب دو فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ ایک فریق مسلمانوں کا تھا جو اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ دوسرا دشمنوں کا تھا جو حملہ آور تھا۔ پس ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ دوستوں اور دشمنوں میں صاف صاف امتیاز ہو جائے۔ جو دوست ہیں وہ دشمنوں کے کیمپ سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں جو دشمن ہیں وہ دوستوں سے کسی طرح کی سازش نہ کر سکیں۔ قرآن میں جس قدر احکام عدم موالات کے ہیں وہ سب اسی صورت حال سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سورت کی آیت (۲۳) بھی اسی سے متعلق ہے۔

اصل اس باب میں سورۂ ممتحنہ کی یہ آیات ہیں جو ایک ایسے ہی معاملہ کی نسبت نازل ہوئی تھیں:

"خدا تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ ان مشرکوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ خدا تو تمہیں صرف ان لوگوں کی رفاقت و سازگاری سے روکتا ہے

---

[1] کہاں کہتا ہے؟ شاید بنی آدم ہونے کی جہت سے مولانا صاحب نے ایسا کہہ دیا ہو۔ ورنہ قرآن میں تو ایسا کہیں نہیں کہا گیا۔

[2] یہ غلط ہے۔ اسی سورۂ توبہ کی گیارہویں آیت میں ہے کہ مشرک صرف اس صورت میں تمہارا دینی بھائی بن سکتا ہے جب وہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اسلام لے آئے۔ مولانا صاحب ہندوؤں سے سلسلۂ مواخات قائم کرنے کی تڑپ میں یہ کچھ بھی بھول گئے۔ منہ

[3] کفر و ایمان کا امتیاز اگر اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ نہیں تو اور کس کا ہے مولانا صاحب نے "معصیت اور گمراہی" قرار دے دیا۔ استغفر اللہ منہ

[4] یہاں عباد سے مراد، عباد الرحمٰن (اللہ کے بندے) ہی ہو سکتا ہے۔ عبد الطاغوت اور عبد الرحمٰن دونوں بھائی کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ قرآن کریم میں حصر کے ساتھ موجود ہے کہ انما المومنون اخوۃ۔ مومن باہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مومن اور کافر بھائی کیسے ہو سکتے ہیں۔

جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی ہے (یعنے محض اس لیے کہ تم نے ان کا دین چھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لیا ہے، تم پر حملہ کر دیا ہے) اور ظلم و ستم کر کے انہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ نیز تمہیں جلا وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے پس جو کوئی ایسے لوگوں میں رفاقت و سازگاری رکھے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے ہیں!" ۶۰: ۸-۹ (متن پہلے درج کیا جا چکا ہے)

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ قرآن میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مشرکینِ عرب یا یہود و نصاریٰ کی موالات سے روکا گیا ہے تو اس سے مقصود صرف وہی جماعتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں سے محض اختلاف دین کی بنا پر قتال کیا تھا اور جن کے ظلم و ستم نے مسلمانوں کو ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ تمام مشرکین عرب یا یہود و نصاریٰ سے ترکِ علائق کا حکم دے دیا گیا ہو اور ظاہر ہے کہ قرآن کا یہ حکم کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ اس کی دعوت سرتا سر انسانی اخوت[1] و مساوات کی دعوت اور عموم شفقت و احسان[2] کا عالم گیر پیام ہے۔" (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۴۵-۱۴۶)

آپ نے ملاحظہ فرمایا ان ٹکڑوں کو کہ

(۱) "قرآن کریم میں جس قدر احکامات عدم موالات کے ہیں وہ سب اسی صورت حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔"

(۲) "قرآن میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مشرکین عرب یا یہود و نصاریٰ کی موالات سے روکا گیا ہے تو اس سے مقصود صرف وہی جماعتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں سے محض اختلافِ دین کی بنا پر قتال کیا تھا۔"

یعنی مولانا صاحب نے قرآن کریم کے تمام احکامات متعلقہ امتناعِ موالاتِ کفّار کو صرف ان لوگوں سے مخصوص کر دیا ہے جنہوں نے مسلمانوں سے قتال کیا ہو۔ محض اس لیے کہ ہندو کے ساتھ دوستی کا جواز پیدا ہو جائے۔ ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہماری نگاہ ان پیشانیوں پر ہے جن پر مولانا صاحب کے خلاف اس الزام

---

[1] انسانی اخوت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب دو انسانوں میں ایمان وجہ جامعیت ہو۔ منہ

[2] شفقت اور نرمی اور دوست داری کے تعلقات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ منہ

کی وجہ سے کئی شکن پڑ رہے ہیں جو زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ یہ انتہائی بدگمانی ہے اور بہت زیادتی!
لیکن ذرا صبر کیجئے اور خود مولانا صاحب کی زبان سے سن لیجیے کہ عدم موالات کے احکام صرف ان کفار تک محدود ہیں جنہوں نے قتال کیا ہو۔ یا ان کے علاوہ دیگر کفار پر بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ ترجمان القرآن کی مندرجہ صدر عبارت مولانا صاحب کے دور قومیت پرستی کی بصیرت قرآنی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس دور سے پیشتر آپ ان آیات کے متعلق وہی کچھ سمجھتے تھے جو ہم نے لکھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ الہلال بابت ۹/۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء کے صفحہ ۲۲۲ پر آپ نے کفار کے ساتھ تعلقات کی بحث چھیڑی ہے۔ پہلے آیت (۶۰/۸) "لا ینھٰکم اللہ ... الآخر" سے قرآن کریم کے نرمی و رافت کے احکام سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جب دوسری قوم مسلمانوں کی تخریب کے درپے ہو تو "پھر اسی قرآن کا جس نے گذشتہ آیات میں احسان عام اور محبت عمومی کا حکم دیا تھا۔ یہ حکم ہے۔" اس کے بعد دوسری آیت (۶۰/۹) "انّما ینھٰکم ..... الآخر" نقل فرمائی ہے اور پھر کفار سے جنگ و قتال کا ذکر ہے۔ اس باب میں تحریر ہے۔

"اور غور کرو کیسی سخت وعید ان کے لیے فرمائی جو ان عیسائیوں سے رسم و راہ دوستی اختیار کریں جنہوں نے مسلمانوں سے مقاتلہ کیا ہے! فرمایا کہ ایسے لوگوں کا شمار بھی ان ہی عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔"

یہاں تک تو صرف ان کفار کا ذکر تھا جنہوں نے مسلمانوں سے قتال کیا ہو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

"اور متعدد مقامات میں عام طور پر دشمنانِ حق و اسلام کی نسبت فرمایا:۔
مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے برادران دینی کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریگا تو پھر اس سے اور خدا سے کوئی سروکار نہیں۔" ۳/۲۷ (الہلال میں آیات کا متن بھی دیا گیا ہے لیکن چونکہ ہم متن پہلے لکھ چکے ہیں اس لیے صرف ترجمہ لکھا گیا ہے)

پھر فرماتے ہیں:۔

"اتنا ہی نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے جو دین الٰہی کی کسی نہج پر بھی مخالفت کرتے ہوں۔ یا شعائر الہیہ کی تضحیک و تمسخر جن کا شیوہ ہو اور احکام اسلامی کی ہنسی اڑاتے ہوں

(جیسا کہ آجکل ملاحدۂ مسلمین اور متفرنجین مارقین ومفسدین کا شیوہ ہے) یہ حکم صاف سورۂ مائدہ میں نازل فرمایا۔

مسلمانو۔ ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کے ساتھ ہنسی اور تمسخر کرتے ہیں اور گویا اسے ایک کھیل سا بنا لیا ہے۔ جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ نماز کا تمسخر اُڑانا شروع کر دیتے ہیں (۵۴۔ الہلال میں متن بھی موجود ہے)۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس بارے میں اصولی طور پر اسلام کی تعلیم کیا ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے۔ ۱۹۱۳ء میں لکھا جاتا ہے کہ محارب کفار کے علاوہ "عام طور پر تمام دشمنانِ حق واسلام سے دوستی کے تعلقات منع ہیں۔ ان سے بھی "جنہوں نے تمہارے خلاف تلوار اُٹھائی ہے" اور ان سے بھی جو دین الٰہی کی کسی نہج پر بھی مخالفت کرتے ہوں"

اور ۱۹۳۶ء کی اس تفسیر میں جو "موتی نگر کانگریس کیمپ۔ لکھنؤ" (ترجمان القرآن جلد دوم) سے شائع ہوئی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں 'جس قدر احکامات عدم موالات کے ہیں وہ سب ان کفار سے متعلق ہیں جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو"

کیا تحریف قرآنی کی اس سے بڑھ کر روشن مثال اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس کے بعد یہ کہنا بدگمانی اور زیادتی ہے کہ مولانا صاحب آج دیدہ دانستہ محض ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے۔ قرآن کریم کو اس قدر مسخ شدہ صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اور آیاتِ قرآنی کی ایسی "تاویل" کر رہے ہیں جو قرآن کریم کی واضح اور بیّن تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس تعلیم کے خلاف جس کے (۱۹۱۳ء میں) یہ خود سب سے بڑے داعی تھے۔ حیرت ہے کہ مولانا صاحب کا سیاسی مسلک کیا بدلا اُنہوں نے سارا قرآن ہی بدل ڈالا

زمن بر صوفی و ملاّ سلامے　　　کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت　　　خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

اقبالؔ

مولانا صاحب نے ۱۹۱۴ء میں "اولیاء اللہ واولیاء الشیطان" کے عنوان سے ایک مبسوط

مقالہ تحریر فرمایا تھا۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے مضمون کا خاتمہ اُس مضمون کے مختصر سے اقتباسات سے کریں جن سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ "کفار دوستی" کے متعلق جو کچھ ہم نے سمجھا ہے اصولی طور پر یہی کچھ کبھی مولانا صاحب سمجھا اور سمجھایا کرتے تھے۔ ہم نے یہی لکھا ہے کہ قرآن کریم نوعِ انسانی کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک مسلمانوں کی جماعت اور دوسری غیر مسلموں کی جماعت۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں۔

" قرآن کریم کے تدبّر و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق و باطل۔ ایمان و کفر۔ نور و ظلمت۔ تعلق علوی و رشتہ سفلی۔ اور اعمالِ صالحہ اور کاروبار مفسدہ دنیّہ کے اختلاف کے اعتبار سے دو بالکل متضاد اور باہمد گر مخالف گروہ دنیا میں ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں اور جب کبھی حق و باطل کا معرکہ گرم ہوتا ہے تو انہی دو جماعتوں کی قطاریں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوتی ہیں۔ قرآن حکیم نے مختلف ناموں سے ان دونوں جماعتوں کا ذکر کیا ہے اور جا بجا ان کے آثار و علائم اور خواص و اعمال کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ۲۲ سے زیادہ مقامات میں ایک ایسی جماعت کا ذکر کیا گیا ہے جس نے اپنے دلوں کو حق کے قبول کے لیے مستعد کر لیا ہے اور جو اپنی تمام قوتوں اور جذبوں سے اللہ اور اس کی صداقت کو چاہنے والی اور پیار کرنے والی ہے اور اس لیے اللہ نے اسے اپنا دوست اور ساتھی بنا لیا ہے۔ اس جماعت کو اولیاء اللہ کے لقب سے پکارا گیا ہے یعنی وہ خدا کے دوست ہیں اور اس کے چاہنے والوں کے گروہ میں داخل ہیں .... لیکن اس جماعت کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت ہے جو اپنے خواص و اعمال میں بالکل اس کی ضد اور مخالف واقع ہوئی ہے۔ قرآنِ کریم اسے اولیاء الشیطان سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام قوتیں جو تعلق الٰہی اور رشتۂ حق و صداقت کی مخالف ہیں شیطانی قوتیں ہیں اور ان میں ہر قوت اور ہر عمل شیطان لعین کا ایک مظہر خبیث ہے۔ پس جو لوگ حق و صداقت کی راہِ روشن سے ہٹ کر اعمال باطلہ کی تاریکی میں گم ہو گئے ہیں اور اللہ کا رشتہ ان کے ہاتھوں میں نہیں ہے وہ خواہ کسی حال اور کسی شکل میں ہوں لیکن درحقیقت شیطان کے ولی۔ اس کے پرستار۔ اس کی نسل کے چاکر اُس کی بادشاہت کے غلام ہیں .... پس ایک طرف تو اولیاء اللہ ہیں، اور

دوسری طرف اولیاء الشیطان۔

اولیاء الشیطان کے بھی مثل اولیاء اللہ کے مختلف مدارج و مراتب ہیں۔ آخری مرتبہ درجۂ کفر ہے اور اس کا سب سے بڑا اضل واشقیٰ گروہ "الکافرین" کا ہوتا ہے یہ دونوں جماعتیں ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا رہتی ہیں اور باہم معرکۂ جنگ و قتال گرم رہتا ہے ....
اولیاء اللہ اور اصحاب الجنہ کا مقصد دعوت خدا کی بادشاہت اور اس کا کلمہ علیا ہوتا ہے۔ پس وہ خدا کے حکموں کو بیان کرتے اور اس کے پاک اور مقدس اوامر کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اولیاء الشیطان کی چیخ و پکار اور جدوجہد کا مقصد شیطانی حکومت ہوتا ہے .... پس مومن اور اللہ کا ولی وہی ہے جو شیطان کے ولیوں کو قتل کرے اور ان کے فساد و طغیان سے ارضِ الٰہی کو پاک کردے کیوں کہ اس کے ایک ہی آقا اور خداوند نے حکم دیا ہے۔

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطَانِ ۔ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا ۔ $\frac{4}{58}$

شیطان کے دوستوں اور پجاریوں کو قتل کرو شیطان کے مکر و فساد خواہ کتنے ہی قوی اور مہیب نظر آئیں لیکن اللہ کے ولیوں کے سامنے بالکل ہی ضعیف و بے طاقت ہیں۔

اور ایسا کرنا قتل و خوں ریزی نہیں بلکہ عین صلح و اصلاح اور امن و نظام ہے۔ کیونکہ فساد و ظلم کے روکنے کے لیے جو شخص خون بہاتا ہے وہ اپنا حقیقی مصلح اور محسن ہے کیوں کہ اس نے ایک جماعت کا خون بہاکر تمام عالم کو زندگی بخش دی اور جو شخص ظلم و فساد کو زندگی بخشتا ہے وہی دنیا کا دشمن اور انسانیت کا عدو ہے۔ کیونکہ چند انسانوں کی خاطر تمام انسانوں سے دشمنی کر رہا ہے ۔"

(الہلال ۱۵ و ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء نمبر ۶)

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ مولانا صاحب کے فہم قرآن کے مطابق :۔
(۱) دنیا میں ہمیشہ سے دو گروہ ایسے چلے آتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد

اور باہمدگر مخالف ہیں
(۲) ایک گروہ مسلمانوں کا ہے اور دوسرا گروہ کافرین کا۔
(۳) مومنین کا گروہ خدا کو دوست رکھتا ہے۔ اور کافرین کا گروہ خواہ وہ کسی حال اور کسی شکل میں ہو شیطان کا دوست ہوتا ہے۔
(۴) یہ دونوں گروہ ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے ہیں۔ (ہمیشہ کا لفظ قابل غور ہے۔ یعنے خواہ شمشیر و سنان کی خوں ریز جنگ ہو یا کفار کی طرف سے مکائد و حیل کی خاموش لڑائی ۔)
(۵) جماعت مومنین کا مقصد حکومت الٰہی کا قیام اور جماعت کفار کا نصب العین قوانین الٰہیہ کے مقابلہ میں غیر خدا قوتوں کے نظام حکومت کا تسلط ہے۔
(۶) چوں کہ ان ہر دو جماعتوں کا طریق فکر و نظر اور لائحہ عمل و منزل مقصود بالکل ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اس لیے حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے اس مخالف جماعت کی تخریب نہایت ضروری ہے خواہ اس کے لیے خوں ریزی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔
(۷) جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں کسی صورت میں بھی دوستی کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔

لیکن یہ مولانا صاحب تھے دور قومیت پرستی سے پہلے کے۔ مسلک قومیت پرستی کے بعد کے مولانا صاحب کے نزدیک

(۱) یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے اس انداز سے مل سکتے ہیں کہ ان میں باہمی لغایت و تفریق کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اور یوں ایک متحدہ قومیت کی تخلیق ہو جاتی ہے۔
(۲) دو انسانوں کے بھائی بھائی بننے کے لیے صرف ان کا ابن آدم ہونا کافی ہے۔ نور و ظلمت، حق و باطل۔ ایمان و کفر کا فرق اس بھائی چارگی کے راستے میں قطعی حائل نہیں ہوتا۔

(۳) نورِ حق اور صداقت کسی خاص مذہب یا جماعت کا حصّہ نہیں بلکہ "عالمگیر سچائیاں" تمام مذاہب میں یکساں طور پائی جاتی ہیں۔

لہذا (۴) عام کفار سے دوستی کے تعلقات کی قطعی ممانعت نہیں۔ صرف ان سے ممانعت ہے جو مسلمانوں سے جنگ و قتال کریں

اور

اس تمام "تدبر فی القرآن" کا منشاء۔ جو سرسوتی نگر کے "کانگریس کیمپ" میں بیٹھ کر کیا گیا ہے۔ فقط اتنا کہ کسی طرح ہندوؤں کی دوستی کا جواز قرآن سے ثابت کر دیا جائے۔

یہ ہے ایک عالم کی وہ لغزش جس سے نبی اکرمؐ نے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی تھی۔ اور یہ ہے ایک ایسے لیڈر کی رہنمائی جس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۔ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۔ ۱۴ / ۹-۲۸

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں دیکھی جنہیں اللہ نے (علم و فضل) کی نعمت عطا فرمائی تھی۔ مگر انہوں نے کفرانِ نعمت سے اُسے بدل ڈالا (بے جا استعمال کیا) اور یوں اپنی قوم کو ہلاکت کے جہنّم میں لے گرے۔ جس میں وہ جا داخل ہوئے۔ اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

فتاوی از مقام کبریائی
حضور دوں نہادان [illegible]

[illegible] دین حق شان را
[illegible]

تصویر کے متعلق اسلام کا شرعی حکم

ہمیں ایک عرصہ سے قارئین طلوع اسلام کی طرف سے استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ وہ پرچہ جو قوانین الٰہیہ کی نشر و اشاعت کا مدعی ہے۔ اپنے سرورق پر تصویر کیوں شایع کرتا ہے۔ (کیوں کہ مستفسرین حضرات کے نزدیک) تصویر کی اشاعت از روئے شریعت جائز نہیں۔ ہم ان استفسارات کے جواب میں اس فرعی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتے تھے کہ تصویر کی اشاعت جائز ہے یا ناجائز۔ لیکن اکثر حضرات نے یہ لکھا (اور ان میں مولوی صاحبان کا طبقہ زیادہ ہے) کہ ہمارے اس سکوت سے مقاصدِ پیشِ نظر کی اشاعت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ مخالف مسلک رکھنے والے حضرات پرچہ دیکھتے ہی اتنا کہہ کر منہ پھیر لیتے ہیں کہ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ تمرک!" اس ضرورت کے پیش نظر ہمیں بھی اس امر کا احساس ہوا کہ اس باب میں کچھ لکھنا ناگزیر ہو گیا ہے ورنہ جہاں تک ہمارا اپنا تعلق ہے ہم تو اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اپنے دل میں ایک کامل اطمینان پاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ایک اور مشکل درپیش تھی مستفسر حضرات کا تقاضا تھا کہ اس مسئلے کے متعلق فقہی بحث کی جائے اور ہمارا طریقِ استدلال اور اندازِ فکر و نظر اس نہج سے مختلف ہوتا ہے۔ بارے ہمیں اس باب میں ایک ایسی چیز مل گئی جو امید ہے مستفسرین کے اطمینانِ خاطر کے لیے کافی ہوگی۔ آج سے قریب بیس برس اُدھر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے مجسموں اور تصویروں کے متعلق احادیث اور فقہ کی روشنی میں ایک مبسوط تحقیقی مقالہ تحریر فرمایا تھا جو معارف بابتہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۹ء میں شایع ہوا تھا اس مقالہ میں سید صاحب نے اس موضوع پر بہت سا مواد یکجا جمع کر دیا تھا اور اس کے بعد بطور شرعی حکم ایک نتیجہ بھی اخذ فرمایا تھا۔ وہ مقالہ بہت طویل ہے۔ اس لیے عدم گنجائش اسے بتمام و کمال شایع کرنے سے مانع ہے۔ البتہ ہم ارباب معارف کے شکریہ کے ساتھ اس نتیجہ سے قارئین طلوع اسلام کو مطلع کیے دیتے ہیں جو سید صاحب نے مستنبط فرمایا تھا۔ جو حضرات تفصیل سے آگاہ ہونا چاہیں وہ معارف کے محولہ صدر پرچے ملاحظہ فرمالیں۔ سید صاحب اپنے مضمون کی تمہید میں فرماتے ہیں۔

"نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام عالم اسلامی میں یہ مسئلہ علمائے دین میں مدتوں زیر بحث رہا ہے

مصر کے علماء میں سے مفتی عبدہٗ مرحوم نے تو اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ بشرطیکہ وہ بت پرستی کی حد سے باہر ہو
علامہ سید رشید رضا مصری نے المنار کے متعدد فتاویٰ میں اس کو جائز بتایا ہے

اس کے بعد سید صاحب نے احادیث وفقہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق فرمائی ہے۔ جس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"اس تشریح سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہاف ٹون[1] (یعنے آدھے دھڑ کی) تصویر بالکل جائز ہے۔ اس بناء پر اگر اختلاف فقہا سے بچنے کے لیے اور زیادہ احتیاط و تقوےٰ برتنے کے لیے مسلمان صرف ہاف ٹون کی تصویر کو بوقت ضرورت اختیار کریں تو مناسب ہے۔ اور ہر قسم کے خطراتِ حرمت سے پاک ہے۔"

مضمون کے آخر میں رقمطراز ہیں :۔

"سب سے آخر مسئلہ یہ ہے کہ فوٹوگرافی کیا مصوری ہے۔ اور فوٹوگرافی پر کیا مصور کا اطلاق ہوگا۔ اور کیا فوٹو کھچوانا بھی داخل معصیت ہے؟ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں۔

ہمارے ایک مخدوم جناب بابو نظام الدین صاحب رئیس امرتسر ہیں۔ ان کے گھر میں ایک فوٹو رکھا تھا۔ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ آپ گھر میں فوٹو رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ یہ فوٹو نہیں ہے۔ فوٹو کے جواز کا فتویٰ ہے۔ انہوں نزدیک جا کر دیکھا تو اس میں حضرات ذیل مع عبا و قبا و عمامہ کے نظر آئے۔ علامہ سید رشید رضا مصری مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء۔ مولانا ابوالکلام۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فقیر سید سلیمان۔

موجودہ دنیائے اسلام کے تمام "روشن خیال" علماء کی (بشرطیکہ روشن خیالی منصب افتاء کے خلاف نہ ہو) رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ فوٹوگرافی مصوری نہیں ہے اور نہ فوٹو پر تصویر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ مصر و مراکش و ایران و قسطنطنیہ کے تمام اکابر ارباب عمائم ہم کو کاغذی پیراہنوں میں ہندوستان میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

فوٹوگرافی درحقیقت عکاسی ہے۔ جس طرح آئینہ، پانی اور دیگر شفاف چیزوں پر صورت کا عکس اتر آتا ہے

---

[1] سید صاحب سے انگریزی کے اس لفظ کے صحیح استعمال میں سہو ہو گیا ہے۔ "طلوع اسلام"

اور اس کو کوئی گناہ نہیں سمجھتا اسی طرح فوٹو کے شیشہ پر مقابل صورت کا عکس اترآتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائدار اور قائم نہیں رہتا۔ اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کر لیا جاتا ہے۔ ورنہ فوٹوگرافر مصور کی طرح اعضاء کی تخلیق و تکوین نہیں کرتا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فوٹو عبادت کے کام میں نہیں آتے۔ تاہم احتیاط و تقویٰ اس کا مقتضی ہے کہ بجائے پورے قد کے فوٹو کے مسلمان صرف آدھے دھڑ یعنی ہاف ٹون فوٹو کھینچیں اور کھینچوائیں۔ اور حقیقت میں انسان کی شناخت اور پہچان صرف اوپر ہی کے دھڑ سے ہوتی ہے اور فوٹو سے یہی مقصود ہے۔"

امید ہے ان حضرات کے لیے جو مسئلہ زیر نظر کے متعلق منقولی طریق سے کسی نتیجہ تک پہنچنے کے متمنی ہیں سید صاحب کا نتیجہ مستخرجہ، جو احادیث و فقہ کی مبسوط تحقیق و بحث کا حاصل ہے، وجہ اطمینان ہوگا۔ اور وہ معترضین کے سامنے جواب کے طور پر پیش کر سکیں گے۔ اس پر بھی جن حضرات کو اعتراض باقی رہ جائے وہ اصل مضمون کے مطالعہ کے بعد اپنے اعتراضات سید صاحب کی خدمت میں بھیج کر مزید اطمینان کر لیں۔ ہم بجز اس کے بحث میں الجھیں کہ مصوری اور فوٹوگرافی میں شرعی نقطہ خیال سے وہ تفریق واقعی ہے یا نہیں جو سید صاحب نے بیان فرمائی ہے صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں یہ بات ابھی تک نہیں آسکی کہ اگر فوٹو میں جسم کا نچلا حصہ بھی شامل ہو جائے (یعنی بجائے آدھے دھڑ کے پورے جسم کا فوٹو کھینچوالیا جائے) تو یہ چیز تقویٰ کے خلاف کیسے ہوگی۔ بہر کیف آدھے دھڑ کے فوٹو کے متعلق تو فتویٰ واضح ہے کہ یہ ہر قسم کے خطرات حرمت سے پاک ہے۔

سوشلزم اور اسلام

یہ جو پُر مغز مقالہ گذشتہ اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اُسے ایک بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ پمفلٹ کی شکل میں چھاپا گیا ہے۔ مضمون میں کچھ کتابت کی غلطیاں رہ گئی تھیں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ اس پمفلٹ کی عام اشاعت کی ضرورت ہے۔
قیمت فی نسخہ ۲ر۔ فی سیکڑہ دس روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔ (ناظم ادارہ طلوع اسلام)

پیامِ اقبال اور قرآنِ کریم

(مسلسل)

(چودھری غلام احمد صاحب پرویز)

{ ہم نے اس مضمون کا سلسلہ ایک عرصہ سے شروع کر رکھا ہے لیکن ندامت ہے کہ ہر پرچہ میں اس کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ تجربہ نے ہمیں بتایا ہے کہ طلوعِ اسلام کے اندازکے پرچہ میں طویل مضامین کا تسلسل بلاناغہ قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر ماہ ایسے اہم وقتی موضوعات سامنے آجاتے ہیں جنھیں دوسرے وقت پر ملتوی نہیں کیا جا سکتا سو لامحالہ مسلسل مضامین کی قسط حذف کر دینی پڑتی ہے۔ اس مجبوری کے ماتحت ہم اس اہم مضمون کے تسلسل کو اس قسط پر ختم کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی اشاعت کا ایک اور مفید ترین طریقہ اختیار کیا جائیگا۔ ہم ان قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں جن کا ہر ماہ تقاضا موصول ہوجاتا تھا کہ اس مضمون کی قسط کا ناغہ کیوں کر دیا۔ کیا کریں ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار ۔۔۔ گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

طلوعِ اسلام }

یہ تو تھا اس دنیا کے متعلق لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی تو حیاتِ انسانی کا اولیں گہوارہ ہے۔ عہدِ طفولیت ہے۔ اس نے تو ابھی جوان ہونا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی۔ بایں ہمہ رعنائی و زیبائی، اصل معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں "زندگی" تو اس کے بعد آنے والی ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۔ ۲۹/۶۴

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شے کا نام ہے۔ غیر منقطع جہاں کوئی شے مرک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔ ؎

زندگانی از خرامِ پیہم است ۔۔۔ برگ و سازِ ہستی موج از رم است

موجودہ دورِ حیات کے لہو و لعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔ ؎

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما ۔۔۔ فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است   جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

ذرا اس "خاک درمیخانہ" اور "گردش یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھئے اور پھر سامنے لایئے آیت مذکورہ کے اس حصّہ کو کہ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ۔ اور اس "دیباچۂ افسانۂ ما" کے ساتھ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ کو۔ یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے۔ اصل کتاب تو ابھی شروع ہونے والی ہے ؎

ہر چند مضمون طویل ہو رہا ہے لیکن جی نہیں چاہتا کہ ایک چیز سامنے آجائے اور اسے یونہی چھوڑ کر آگے گذر جائیں: حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است کے لئے مجھے نظریۂ ارتقا بیان کرنا چاہیئے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس کا ضمناً لکھنا دشوار ہے۔ یہاں صرف حضرت علّامہ کے اس مصرع کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں۔ قرآن کریم میں ارتقا کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تدبیر (Plan) کرتا ہے۔ پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہونچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کراتا ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک گونا گوں مقامات میں سے گذرنا ہے۔ ایک ایک مقام اور ایک ایک منزل کا نام یَوم ہے (بمعنی دن) لیکن یہ ایّام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایّام نہیں بلکہ ان کا طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۳۲/۵

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ امر (پختگی اختیار کرکے) اس کی طرف بلند ہوتا ہے ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہو سکتی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایّام پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے۔ اسی کرۂ ارض کو دیکھئے۔ اپنی اصل سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) کتنے عرصہ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی، کہ اس پر کوئی ذی رُوح آباد ہو سکے اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے کتنی منازل، طے کرنی ہونگی۔ اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا اب پھر دیکھئے کہ

کس قدر سچی حقیقت ہے۔ اور کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں　　　کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ہاں! تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شے نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است　　　زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جائیے۔ کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہونچا دیا، ایسے ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے۔ اس کتاب مبین کی ضیا پاشیوں کا جس کا دعوے ہے کہ آؤ تمام نوع انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل کوئی چیز پیش کر کے دکھاؤ۔ ایسے شجر طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ فرماتے ہیں ؎

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے　　　ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

پیامِ فرنگ کے دو شعر ہیں ؎

زندگی جوئے روان است و روان خواہد بود　　　این مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم　　　صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمایئے۔ شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے حقائق اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیولیٰ کی شکست اس لئے ہوگی کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہونچے جن کیلئے لاشرقیہ ولاغربیہ آیا ہے۔ جو مکانیت (Space) کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں۔

یعنی اِدھر سکراتِ موت کی ہچکی آنکھ بند کرے اور اُدھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں۔ کہ حضور آیئے۔ تشریف لایئے۔ دیدہ و دل فرشِ راہ۔ یہ نورانی وادیاں۔ یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہونچانے والی حسین جنّتیں آپ کے انتظار میں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ـ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ـ ۱۶/۳۲

یہ وُہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو۔ آیئے جنت میں داخل ہو جایئے۔ بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔

اس آیت کو سامنے رکھئے اور پھر اس شعر کو پڑھیئے کہ

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم   صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

پھر جنت کے متعلق جو اس آیت میں، اور دیگر متعدد آیات میں، آیا ہے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی جنت اعمال کی جزا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ   تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا بھی ایک شعر سنئے۔ اور دیکھئے کہ غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جاسکتے ہیں۔ فرماتے ہیں ـ

پریشاں ہوکے میری خاک آخر دل نہ بنجائے   جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

قیامت کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔ کہ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ، جب نفوس کو (پھر سے) اٹھایا جائے گا۔ یا ملایا جائے گا۔ خاک اپنی پریشانی کے بعد پھر سے "دل" بن جائے گی۔ اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط و صعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے تخلیق آدم کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اس کے بعد ہبوطِ آدم کا ذکر ہے۔ ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں، آدم

کے جنت سے نکلنے کے لئے قرآن کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہبوط (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس ہبوط کی رعایت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارہ کہنا کس قدر موزوں ہے۔ کہ تارہ جب ٹوٹتا ہے تو نیچے گرتا ہے۔ پھر حضرت آدم نے اپنے ہبوط کا جو اثر بیان کیا تھا وہ یہ تھا کہ اے بار الٰہ! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی۔ اگر ہمیں اپنی حالت میں نہ پہنچایا گیا تو لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ ٹوٹا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس ہبوط کے بعد ان تمام ارتقائی منازل کو طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارہ مہ کامل بن جائے! اس کی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا، اور جس کی وجہ سے یہ انجم یوں سہمے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (وَالتِّيْن)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا پھر اسے (اس کے اعمال کی بدولت) نچلے سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا، مگر سوائے ان کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ اعمال صالح کئے۔ پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے۔

انسان میں ایمان و عمل صالح پیدا ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اُڑتا ہے ایسی فضاؤں میں جو حدود ما آشنا ہیں (غیر ممنون) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد — ایں مشت غبارے را انجم بہ سجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہی فرق ہے یورپ کے نظریۂ عروج اور ایک مسلم کے نظریۂ عروج میں، یورپ کا مادہ پرست انسان کی پرواز اس دنیا۔ یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ تک سمجھتا ہے۔ اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ جو پھر مادی پرواز ہی ہے اور اسی زندگی سے متعلق ہے لیکن قرآن کریم انسان کو بہت اونچلے جاتا ہے كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کے اوپر ہوں اسلئے حضرت علامہ فرماتے ہیں۔ کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن — قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحاں" کہنا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سمٰوات کہا جاتا ہے، آبادی سے خالی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۔ ۴۲/۲۹

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ اس نے زمین و آسمان (پستیوں اور بلندیوں) کو پیدا کیا۔ اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دئے وہ بھی۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۔ اور ہم نے تمہارے اوپر سات (یا متعدد) رہگذر بنائے یہ رہگذر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں ہجوم کون کون سی ارتقائی منازل طے کرتے پھر رہے ہیں۔ عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں، قطع منازل کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کو کارواں کہنا ایسا حسین انداز ہے جس کی داد غالب ہی دے سکتا تھا۔

- شعر جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دلکشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز مصلحانہ، اور پیامی ہو جائے۔ تو

پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

یا اس انداز کا۔

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے بُرا وہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے

اور گر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تو اسکے بُرا مانتا ہے

اور ایک ذوقؔ ہی پر کیا موقوف ہے بڑے بڑے عمدہ شعر کہنے والے جب تبیانِ حقائق یا مصلحانہ انداز میں کچھ کہتے ہیں تو شعر بے جان ہو جاتا ہے لیکن یہ خصوصیت حضرت علامہ ہی کے حصّہ میں آئی ہے۔ کہ حقائق اور حقائق بھی اس درجہ دقیق۔ بیان کئے جاتے ہیں۔ اور شعر کے حسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔
ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔

ستاروں کی دنیا کے متعلق زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست کہ ہر ستارہ جہان است و یا جہاں بود است

ہاں! تو زندگی ایک مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا۔ بڑھتے جانا۔ اور بڑھتے جانا۔ بڑھتے ہی چلے جانا کہ ؎ ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں۔ یونہی ذرا ستانے دم لینے کے لئے۔ گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ کارواں کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت کہ جسے بالعموم منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے۔ راستہ کی خوشگوار وادی ہے کہ جنت میں پہونچ کر بھی اہلِ جنت کی یہ کیفیت ہوگی کہ۔

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ ۔ ۵۷/۱۲

ان کا نور ان کے آگے۔ اور ان کے دائیں کی طرف چلتا ہوگا۔

یہ نور پیشانی کی روشنی۔ یہ سرچ لائٹ۔ بالآخر اگلی منزل کا راستہ دکھانے کے لئے ہی تو ہوگی۔ وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے۔ کہ جنت میں پہونچ کر بھی وَهُدُوْا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ان کی ایک پسندیدہ راستہ

کی طرف رہنمائی کی جائے گی ۔ دنیا میں صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا تھی۔ ایک سیدھے راستہ پر چلنے کی، وہاں ایک پسندیدہ راستے پر چلائے جائیں گے ۔ اس لئے جنت مقام نہیں۔ راہ گذر ہے ۔ وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے ۔

اگر عنان تو جبریل و حور می گیرند　　　کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

کہ ملائکہ کا تو یہ ظیفہ اسجود۔ اُن کا مقام اس کا مقام کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ تنکا ہے جس کا اٹھانا بھی تضیع اوقات ہے ۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　　یزداں بہ کمند آور، اے ہمتِ مردانہ

لیکن بایں ہمہ۔ انسان "لامکان" نہیں۔ ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی لیکن مقام اس کا ضرور ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزل مقصود کونسی ہے؟! یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کونسی ہے؟ سو اس کی تفصیل شرح و بسط سے قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس منتہٰی کے متعلق تو سرِ دست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَاِلٰی رَبِّکَ مُنۡتَہٰہَا ، اس کا منتہٰی تیرے رب تک ہے ۔

شعلۂ درگیر زد برخس و خاشاکِ من،　　　مرشدِ رومی کہ گفت۔ منزلِ ماکبریاست

لیکن یہاں پہونچ کر حضرتِ علامہ دراصل باتحق کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے کہ قرآن کریم کے رُو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی۔ لیکن حضرت علامہ اس عقیدے کے اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اسے انسان کی خودی، محکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے خواہ وہ خدا ہی کی ذات کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں۔ بلکہ تو دریا گہر بن کر بیٹھ جانا ہے ۔ آپ فرماتے ہیں ۔

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی　　　ترا او بیند و او را تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش　　　مشو ناپید اندر بحرِ نورش

"مرا او ببند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے۔ وہ کونسا لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا لیکن "ادراتو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے موجودہ مقام میں تو ایک اُولوالعزم پیغمبرؑ نے جب یہ آرزو کی، کہ ربّ ارنی، تو جواب مل گیا کہ لن ترانی (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہو گی کہ

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ۔

بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے۔ اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ

عبدومولا در کمین یک دگر ہر دو بے تاب انداز ذوق نظر

زندگی ہر جا کہ باشد جستجو ست حل نشد این نکتہ من صیدم کہ اوست

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسّس کا یہ عالم ہے کہ اِلٰی رَبِّھِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ۔ اپنے رب کی طرف رواں دواں جائیں گے۔ تو دوسری طرف یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّھَا زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَجَآءَ رَبُّکَ وَالۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا۔ اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار زمین پر آئیں گے۔ کہ

ہر دو بے تاب انداز ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے؟ یہ "محکم خودی" حاصل کیسے ہو گی!! یہ اس دنیا میں اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ۔ ہونا یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے۔ کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہو گا!!! اس خاک کے تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہوں گے! یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج حریف سنگ" ہو جائے۔ اس کے لئے رموز و اسرار میں پورا لائحہ عمل مُرتب کر کے دے دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن اس سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے۔ اور یہی نکتہ دراصل کلامِ اقبال کا محور ہے۔ مرکز ہے۔ محیط ہے۔ سب کچھ ہے یہ نکتہ ہے۔ محمدؐ رسول اللہ۔ فرماتے ہیں۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو　　فروغِ دیدہ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں! افرشتہ و حور　　کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو

بس یہ ہے راز ایک مومن کی پختگی کا۔ اس کی خودی کے استحکام کا۔ کہ شاہین شہ لولاک ہے تُو۔ تو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جس کی شان میں آیا ہے کہ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (الفتح) تو تُو اس ذاتِ گرامی کا شاہین ہے جو دانائے سبل۔ ختم رسل، مولائے کل ہے جو معراجِ انسانیت کا مظہر کامل ہے جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے عرش آشیاں ہونے میں کیا کلام ہے۔ لہٰذا یہ تمام فضائیں اور فضاؤں کی پہنائیاں　یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں۔ یہ ارض و سمٰوات، یہ تمام کائنات اور اس کی قیود ماآشنا و سعتیں۔ اس شاہینِ شہ لولاک کے بازوں کے نیچے کیوں نہ ہوں۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسولؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہونچ چکی ہو۔ کہ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے میسّر ہوتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کو تشریف لائے تھے +

"قسم ہے تیرے پروردگار کی۔ ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ان تمام معاملات میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں اے رسول تجھے اپنا حکم تسلیم نہ کرلیں۔ پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں بھی کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں۔ بلکہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں + پ۵ع۶

اسی ایک نکتہ کے اندر امت کی مرکزیت۔ امیر کی اطاعت۔ وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج یعنی تمکن فی الارض۔ شان و شوکت۔ حکومت و سطوت۔ زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا قیام سرفرازیاں اور سربلندیاں۔ کامیابیاں اور کامرانیاں۔ اور اس کے بعد حیاتِ اُخروی میں۔ بعد کی منزل میں آگے بڑھنے کی قوتیں۔ مدارج عالیہ، یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھیڑ دینا پڑا۔ ورنہ یہ تو وہ عنوان ہے جس پر کلامِ اقبال سے ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اقبال کی تمام شاعری اور شاعری کا سوز و گداز رہینِ کرم ہے۔ محبتِ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کا۔ جذبۂ اطاعت کا۔ اسی ذاتِ گرامی کی شعلہ ریز محبت ہے۔ جس نے اقبال کو اقبال بنا دیا۔ ورنہ یہ بھی کہیں

«میر مشاعرہ» ہوا کرتے۔ جذبۂ اطاعت[علہ] رسولؐ نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبالؔ کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیئے۔ اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے۔ فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو یکسر علم و حکمت تھا محبتِ رسولؐ کی موہبتِ عظمیٰ سے وہ قلبِ منوّر مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی۔ جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے۔ جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخِ گل کے اندر جا کر مشاہدہ کرے کہ «درونِ او نہ گل باشد نہ خار است» اس نگہِ حقیقت شناس کا نام ہے اقبالؔ۔ یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ۔ ایماںؔ و حکمتؔ کا فشردہ۔ زیرکی و عشق کا عصارہ۔ ادریس و بوعلی کا مرکب مجسمہ۔ رُومی و رازی کا مشترکہ شاہکار۔ وہ مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے۔ جو قرآن کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مظاہر فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں کے بعد فرمایا

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ ۔

بے شک (ان مظاہر فطرت) کے اندر صاحبانِ عقل و خرد کے لئے آیات ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ کو

علہ نظامِ اسلامی کی رُو سے کس طرح امامِ متفقہ علیہ (یعنی مرکزِ ملت) کی اطاعت۔ اطاعتِ خدا و رسول کے مرادف ہو جاتی ہے قرآن کریم میں بہ صراحت اس کی تشریح موجود ہے اسی جذبۂ اطاعت کے اندر قوموں کی زندگی کا راز ہے اور اس کو بھلا دینے سے مسلمانوں کی آج یہ حالت ہو رہی ہے۔ اطاعت جب خوف و ترہیب سے بلند اور مزد و معاوضہ سے بے نیاز ہو جائے۔ تو عشق بن جاتی ہے ٭

کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔
یہ عقل و ہوش کے ساتھ خدا کو یاد کرنے والے وہ مومن ہیں جنہیں نوعِ انسانی کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے۔
اور پھر سحابِ فطرت کا کرم بالائے کرم کہ اس تنگِ حقیقت بیں کو اظہارِ مشاہدات کے لئے ذریعہ
بھی ایسا حسین و دلکش عطا کر دیا کہ جو دیکھے کھنچا چلا آئے ——— بشرطیکہ وہ کہیں۔ سے بوجہل و
بولہب کی ہی آنکھیں نہ مانگ لایا ہو اور پھر تماشا یہ کہ یہ ملکوتی کام لیا اس شاعری سے جس کے علمبردار
ابھی تک اس "تحقیق انیق" سے ہی فارغ نہیں ہوسکے کہ بُلبُل مذکر ہے یا مونث۔ سچ ہے جب خدا
چاہے تو ایک خشک لکڑی سے وہ کام لے لے کہ وہ کذب و باطل کے بڑے بڑے اژدھوں کو
نگل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ قوم اقبال کو بھی ایسی ہی ملی ہو جو قوم موسےٰؑ کی طرح کہہ دے کہ
فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ وَ اِنَّاهٰهُنَا قَاعِدُوْنَ جا۔ تو اور تیرا رب لڑو جا کر ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔
جب فتح ہو جائے تو آواز دے دینا۔ بایں ہمہ یقین مانئے جس طرح قرآن کریم نے عرب کی شاعری
کے دورِ جاہلیت کو ختم کرکے اسی قوم سے ایک ایسا خمیر تیار کر دیا تھا کہ وہ جس آٹے میں جا کر ملے۔
اس میں بھی خمیر کی کیفیت پیدا کردے۔ وہ قوم کہ جسے چشم فلک نے ایک بار دیکھا۔ اور دوبارہ
دیکھنے کے لئے وہ سرگرداں ہے۔ اقبال نے بھی مشکوٰۃ قرآن کی روشنی میں عجمی شاعری کے
"دورِ جاہلیت" کو ختم کرکے ان کے افیونی اعصاب میں ایسا خون دوڑا دیا ہے کہ وہ دن دور نہیں۔
جب یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا اور مسلمان پھر یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ

زمیں از گردشِ تقدیر ما گردوں شود روزے
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے[1]

---

[1] اس حصۂ مضمون کو ایمان کے عنوان کا ایک ٹکڑا سمجھنا چاہئے۔ میں نے اسے مقدم اس لئے رکھا ہے۔ کہ
ایمان ہی تمام اعمال کی اساس ہے۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے ‏ ‏ ‏ یہ وہ قوت ہے جو صورت گر تقدیرِ ملت ہے

اعمال کا عنوان اس کے بعد آتا ہے۔ اسے ہم کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

بابر

اسد ملتانی

اس نظم کے آخری تین شعر ۲ جون کو موزوں ہوئے۔ ۱۴ جون کی صبح کو خواب میں دیکھا کہ حضرت علامہ اقبال رح کسی جگہ ایک مجمع کے درمیان بیٹھے ہیں۔ میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ کچھ تازہ اشعار لکھے ہیں تو سناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ شہنشاہ بابر کے متعلق تین شعر کہے ہیں۔ لیکن نظم کی تکمیل کے لیے ابھی کچھ بھرتی کرنا باقی ہے۔ "بھرتی" کا لفظ سن کر میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ بھرتی مجھے بالکل ناپسند ہے۔ غیر ضروری شعر کبھی نہ کہا کرو۔ مگر وہ تین شعر کون سے ہیں؟ میں نے پہلا شعر سنایا ؎

این نکتہ وا نمود بہ دستِ جہاں کشا
حدِ وطن فضائے زمیں را کنارہ نیست

فرمانے لگے کہ یہ شعر خوب ہے مجھے بہت پسند آیا ہے۔ اس کے بعد جب میں نے دوسرے شعر کا پہلا مصرع پڑھا کہ "ما نازمی کنیم بہ ذاتش ولے چہ سود" تو ٹوک کر پوچھا۔ کیا کہا؟ ما نازمی کنیم بیادش ولے چہ سود؟ میں نے دہرایا تو خاموش ہوگئے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہاں کچھ اصحاب ایسے موجود ہیں جو فارسی نہیں سمجھتے اس لیے شعروں کا مطلب اردو میں بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے جاؤ۔ میں نے تعمیل کی۔ تین شعر ختم ہوئے تو آنکھ کھل گئی۔

جاگ اٹھنے پر خواب کی پوری پوری کیفیت ذہن میں تھی۔ جب میں نے "بہ ذاتش" کی جگہ "بیادش" کے اشارہ پر غور کیا تو یہ ایک عمدہ اصلاح نظر آئی۔ چنانچہ میں نے شعر میں اسی کے مطابق ترمیم کردی۔

اس خواب کے متعلق یہ امور قابلِ ذکر ہیں کہ ایک تو حضرت علامہ کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع

تھا کہ میں نے انہیں خواب میں دیکھا۔ دوسرے جس شعر میں اصلاح ہوئی ہے اسے میں اپنی طرف سے بالکل مکمل کر چکا تھا اور میرے ذہن میں اس کی اصلاح یا ترمیم کا کوئی خیال نہ تھا۔ (اسدؔ)

(طلوع اسلام حضرتِ اسدؔ کے اس طابع بیدار پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے)

باشد حیات بابر اعظم دلیلِ آں — مردے کہ خودشناس بود، ہیچکارہ نیست

می بیند اندر آئنۂ ممکناتِ خویش — آں جلوہ ہا کہ بر دگراں آشکارہ نیست

نقشِ جہانِ تازہ بہ بندد بدستِ خویش — پابندِ گردشِ مہ و مہر و ستارہ نیست

در فتح مندی و ظفر از خود نمی رود — وقتِ شکست ہمّتِ اُو پارہ پارہ نیست

نتواں حکومتے صفتِ بابر آفرید — گر عزم اُستوار تر از سنگِ خارہ نیست

فرغانہ داد و کابل و ہندوستاں گرفت — چو دید جز توکّلِ تر کانہ چارہ نیست

ایں نکتہ وانمود بہ دستِ جہاں کشا — حدِّ وطن فضائے زمیں را کنارہ نیست

مانازمی کنیم بیادش ولے چہ سود؟ — در خاکِ ما ز آتشِ او یک شرارہ نیست

درسِ عمل از و نہ گرفتیم غیر ازیں

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

ایک شعر کی تاویل

مولوی سلیم پانی پتی مرحوم کے مجموعۂ کلام "افکارِ سلیم" پر لاہور کے رسالہ ادبی دنیا بابت ماہ جولائی میں جناب "ص" کی طرف سے مفصل تبصرہ شایع ہوا ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں جناب مؤلف نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"سلیم جمالیات کا عاشق زار ہے لیکن اس کے لیے اس نے بالعموم مظاہر قدرت کا انتخاب کیا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

حسن جس چیز میں ہو دیکھ کے خوش کر دل کو
بند کر لے مگر آنکھیں اگر انسان میں ہو"

اس ٹکڑے کا حوالہ دے کر جناب "ص" نے حضرت اکبر مرحوم کے شعر پر ان الفاظ میں اظہارِ خیال فرمایا ہے:۔

"ظاہر ہے کہ اکبر کا شعر ہماری معاشرتی کمزوریوں پر ایک طنز ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انسان کے حسن سے آنکھیں سیراب نہ کی جائیں بلکہ وہ تو ہماری سوسائٹی کے آداب پر ہنستا ہے کہ ہم کوہ و دمن اور لالہ و گل کے حسن کی سیر تو پوری آزادی سے کر سکتے ہیں لیکن جہاں حسنِ انسانی کی دید کا سوال آیا۔ سوسائٹی ہمیں آنکھیں بند کر لینے کا حکم دیتی ہے۔ پس اکبر کے اس شعر سے سلیم کی مناظر قدرت سے دلبستگی اور حسن انسانی سے بے نیازی ثابت نہیں کی جا سکتی۔"

یقیناً یہ شعر نہ سلیم کے متعلق لکھا گیا تھا اور نہ اس سے سلیم کی مناظر قدرت سے دل بستگی اور حسن انسانی سے بے نیازی ثابت کرنا مقصود ہے لیکن اس شعر سے جو مطلب نکالا گیا ہے اُسے دیکھ کر جناب "ص" کی ادبی قابلیت اور شعر فہمی کی صلاحیت کے متعلق انتہائی تعجب ہوتا ہے۔

شعر اپنے مفہوم میں بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں نہ تو کوئی ایسا لفظی یا معنوی اشارہ موجود ہے جس سے کسی تاویل کی گنجائش نکل سکے اور نہ شعر میں طنز کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ کسی خیال کو پہلے سے اپنے دل میں قائم کر لیا جائے اور پھر کھینچ تان کر شعر کو اس پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے۔

یوں تو یہ شعر اپنی جگہ پر بالکل مکمل ہے لیکن اگر بالفرض اسکے مطلب کے متعلق کسی قسم کا شبہ پیدا بھی ہو تو اسی کے ساتھ کے دو شعر اس شبہ کو بالکل دور کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

پیاری صورت پہ تو انسان کو آتا ہی ہے پیار　　　دل کو روکیں کوئی صاحب اگر امکان میں ہو
حسن جس چیز میں ہو دیکھ کے خوش کر دل کو　　　بند کرلے مگر آنکھیں جو یہ انسان میں ہو
دل جہاں ہوگا وہاں عشق بھی ہوگا پیدا　　　خواہ افریقہ میں ہو خواہ پرستان میں ہو

کیا ان اشعار کو پڑھ لینے کے بعد شاعر کے مافی الضمیر کے متعلق کسی قسم کا شک باقی رہ سکتا ہے اور ایک لمحہ کیلئے بھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ زیر بحث شعر اظہار حقیقت کے بجائے ہماری معاشرتی کمزوریوں پر ایک طنز ہے؟ کس قدر حیرت کی بات ہو کہ تبصرہ نگار اس شعر کو ایک نصیحت نہیں سمجھتا بلکہ اسے سوسائٹی کا تمسخر قرار دیتا ہے۔ غالباً ایسے ہی نقطۂ نظر رکھنے والے نوجوانوں کی شان میں شاعر موصوف کو کہنا پڑا تھا ؎

تاکیدِ عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے　　　پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

زیر بحث شعر کی انوکھی تاویل سے زیادہ قابل توجہ وہ ذہنیت ہے جو اس تاویل کی محرک ہوئی ہے۔ لفظ "ص" سے اندازہ ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار مسلمان ہے۔ اگر یہ درست ہے تو کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک مسلمان ادیب کے قلم سے ایسی بات نکلے جو اسلامی تعلیمات کے بالکل منافی ہو۔ شاید صاحب موصوف کو معلوم نہیں کہ جس چیز کو وہ "ہماری سوسائٹی کے مصنوعی آداب" کہہ کر اس کی ہنسی اڑا رہے ہیں وہ نصِ قرآنی پر مبنی ہے۔ کلام پاک میں جہاں "افلا ینظرون" (کیوں نہیں دیکھتے) کے تاکیدی استفہام کے ذریعے مناظر قدرت کی طرف پُرزور توجہ دلائی گئی ہے وہاں حسن انسانی کے بارے میں "غض بصر" کا حکم بھی صاف صاف الفاظ میں موجود ہے کہ مرد اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ گویا کوہ و دمن اور لالہ و گل کے حسن کی سیر کی آزادی کے ساتھ حسن انسان کی دید پر جس حد تک پابندی عائد کی گئی ہے وہ کسی فرد یا سوسائٹی کی طرف سے نہیں بلکہ ارشاد خداوندی کے عین مطابق ہے اور اکبر مرحوم کا زیر نظر شعر بے کم و کاست اسی حکم کی ترجمانی کرتا ہے۔ جمالیات کے متعلق غیر مسلم حضرات جو نظریے بھی چاہیں بے تکلف قائم کر سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ اسلام کی صداقت کا یقین رکھتے یا کم از کم قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کا اقرار کرتے ہوں ان کو تو یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ کلام پاک کی مقرر کردہ حدود کو "سوسائٹی کے مصنوعی آداب" قرار دیکر ان کا تمسخر اڑائیں اور ان سے تجاوز کرنے کی کھلم کھلا تلقین کریں۔

"ل"

کیا سوشلزم ہندوستان میں قابلِ قبول ہے؟

از جناب محمد شبیر حسن صاحب ایم۔اے مراد آبادی

ہمارے سوشلسٹ حضرات کا ارشاد بلکہ اصرار ہے کہ آج ہندوستان کا مسئلہ محض اقتصادی
و معاشی ہے۔ لہٰذا "مسلمان کیا کریں؟" کا جواب صرف یہ ہے کہ وہ تمام چیزوں سے آنکھیں بند کر کے
غیر مسلم عوام سے ملکر جماعتی تنظیم کریں تاکہ جلد سے جلد "روٹی" کا مسئلہ حل ہو۔ ان حضرات کا خیال
ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے اپنے علیحدہ قومی وجود اور تہذیب و کلچر وغیرہ
کا کوئی سوال نہیں ہے چونکہ "ہندوستان میں مسلمان نہ ایک قوم ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں بلکہ
وہ مختلف مفاد کی وجہ سے متضاد اور متصادم جماعتوں سے مرکب ہیں" (مقالہ ڈاکٹر اشرف
"مدینہ" ۲۸ جنوری ۳۹ء) یعنی ہمارے ان حضرات کے نزدیک مسلمانانِ ہند کے مفاد محض
معاشی اور اقتصادی ہی ہیں اور یہی ہو سکتے ہیں جن کے اثر سے ان کے خیال میں مسلمان "مستقل
طور پر" متضاد اور متصادم جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ ایسے دیگر مفاد
مثلاً قومی۔ تہذیبی۔ معاشرتی وغیرہ جو مسلمانانِ ہند کو متحد و متفق کر سکتے ہوں یا تو ہیں ہی
نہیں یا اگر ہیں تو وہ لغو ہیں لچر ہیں۔ بیہودہ ہیں "گذری ہوئی دنیا کے ازراں مذہبی اور
فرقہ پسندی کے غیر تاریخی (؟) محرکات ہیں" لہٰذا درخورِ اعتنا نہیں ہیں اور ان کو روٹی پر
بھینٹ چڑھا دینے میں بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر اشرف فرماتے ہیں کہ
"مسلمان یا قوم کو عمل پر مائل کرنے یا آزادی کی جدوجہد کے لئے ابھارنے کی غرض سے
(محض!) مناسب سماجی اور اقتصادی محرکات کی ضرورت ہے"۔ یہی ان کے نزدیک "زندہ سیاست
ہے" اور یہی "عملی اور زندہ پروگرام ہے" باقی رہا تہذیبی و معاشرتی سوال۔ اسکے متعلق
انکا خیال یہ ہے کہ "جو لوگ اقلیت اور تحفظات یا زبان و کلچر کے سوالات پر زور دیتے ہیں اور

اسی راگ کو الاپتے رہتے ہیں شاید انہیں اسکا احساس نہیں کہ وہ اپنے اس طرز عمل سے استعمار اصلاح پسندی اور ہندوستانی اعلی طبقہ کے مفاد کے سب سے زبردست دوست بن جاتے ہیں"۔ لہذا انہیں چاہئے کہ وہ بے چون وچرا ان سوالوں سے ہمیشہ کے لئے چشم پوشی اختیار کرلیں چونکہ غالب یہ لکھہ ہی گئے ہیں کہ "رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے۔ نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" (مطلب اس شعر سے یہاں پر انکا یہ ہے کہ زبان کلچر وغیرہ کے معاملات میں ہندو اکثریت کی طرف سے جو کچھہ ہو رہا ہے اسے مسلمان ہو لینے دیں اور اس پر بالکل خاموش رہیں) دوسرے "پرائے شگون کے پیچھے اپنی ناک کٹوا لینا" عین "سیاسی وحکیمانہ مزاج" کا مالک ہونے کی دلیل ہے یعنی آپکا قومی وجود ختم ہو تو ہوا کرے۔ آپ کی کلچرل شدہی ہو تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ آپ تمدنی حیثیت سے اچھوت بن کر رہ جائیں تو بھی کوئی نقصان نہیں۔ لیکن اگر آپ نے ان سوالات کو اُٹھایا اور "زبان و کلچر وغیرہ پر زور دیا" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "آپ استعمار۔ اصلاح پسندی اور ہندوستانی اعلیٰ طبقہ کے مفاد کے سب سے زبردست دوست ہیں" لہذا آپ رجعت پسند ہیں۔ ٹوڈی ہیں۔ برطانیہ پرست ہیں۔ گورنمنٹ کے پٹھو ہیں۔ دشمنِ ترقی اور نہ معلوم کیا کیا ہیں۔

فی الحال اس سوال کو تو جانے دیجئے کہ کیا آزادی کے معنی محض روٹی ہی کے ہیں۔ اور اسکو بھی چھوڑئے کہ اگر مسلمان کلچر وغیرہ کے تمام سوالوں سے منہ موڑ کر کسی معجزہ کے ذریعہ اس قوم کے ساتھہ جو اس کی محض اس وجہ سے ہر بات میں کاٹ کرتی ہے کہ اسکا نام "خدا بخش" ہے جماعتی تنظیم وغیرہ کرکے "آزادی" حاصل کر بھی لے تو کیا ایسی نام نہاد جمہوریت میں ووٹوں کی حکومت کو مانکر یہ آزادی مسلمان اقلیت کو ملیگی یا اُس ہندو اکثریت کو جسکا مذہبی تعصب کی بنا پر خود اپنے ہم قوم اچھوتوں کے ساتھہ اقتصادی معاشی اور روٹی ہی کے مسئلہ میں صدیوں سے یہ عالم ہے کہ غریب اچھوتوں پر زندگی تنگ ہے۔ مسلمان تو بھلا پھر بھی "ملکش" ٹھہرا مگر خیر ان سوالوں کو چھوڑیئے۔ آیئے ذرا ٹھنڈے دل سے سوشلسٹوں کے اس "سیاسی وحکیمانہ نظریہ" ہی کا نفسیاتی تجزیہ کرکے دیکھئے۔ ہندوستان کی قوموں کے رجحانات اور امیال پر سرسری نظر ڈالئے۔ قوموں کو

ابھارنے اور آزادی کی تحریک کے لئے تیار کرنے کے محرکات اور عوامل پر غور کیجئے۔ پھر دیکھئے کہ ہمارے ان سوشلسٹ حضرات کا یہ نظریہ قابل قبول بھی ہے۔ یا نہیں اور آیا سوشلزم ہمارے درد کا علاج ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بحث ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ کیا واقعی ہندوستان کا مسئلہ محض اقتصادی و معاشی ہی ہے؟ اور کیا ہندو مسلم عوام بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں اور کیا ان سوالوں کو وہ ایسے محرکات ماننے کے لئے تیار ہیں یا آئندہ ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے علیحدہ قومی اور کلچر وغیرہ سے منہ موڑ کر بس انہیں کے ہو رہیں؟ ہمیں اس سوال کو واقعات۔ تجربات اور اصول نفسیات کی روشنی میں حل کرنا ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ ہندوستان میں محض معاشی سوال ہی درپیش ہے اور ہندو مسلم عوام جس چیز کے لئے آج بےچین ہیں وہ صرف "روٹی" ہے اور دونوں قوموں کے نوے۹۰ فیصدی افراد جو کسان۔ مزدور اور غریب ہیں ان کو "عمل پر مائل کرنے یا آزادی کی جدوجہد کے لئے ابھارنے کی غرض سے محض اقتصادی محرکات ہی کی ضرورت ہے" لیکن ہمیں ان سوشلسٹ حضرات سے ساتھ ساتھ یہ بھی تو دریافت کرنے کا حق ہے کہ یہ محرکات تو ہندوستان میں برس ہا برس سے موجود ہیں معاشی مشکلات کے وہ نوے۹۰ فیصدی ہندو و مسلمان غریب افراد کئی صدی سے شکار بنے ہوئے ہیں۔ اور بھوک ایسی چیز نہیں کہ اسکا احساس کرایا جائے تو ہی محسوس ہو۔ روٹی کی ضرورت ایسی نہیں کہ ہمارے یہ "سیاسی اور حکیمانہ مزاج" رکھنے والے لیڈر تحریر و تقریر سے ہندو مسلمان غریب افراد کو بتائیں جب ہی معلوم ہو چونکہ یہ کوئی سیاسی نکتہ نہیں ہے۔ اس بھوک۔ عریانی۔ روٹی اور غربت کے محرکات تو پیدائش سے لیکر موت کے وقت تک چوبیسوں گھنٹے دونوں کو برابر پریشان رکھتے ہیں۔ پھر آخر یہ سب ملکر بھوک کے مسئلہ پر ابھرتے کیوں نہیں؟ جب آپ تنہا بھوک اور غریب کے محرکات ہی کے قائل ہیں اور ان کو اس قدر مؤثر مانتے ہیں کہ ملک کی دو مختلف قومیں باوجود اختلافات مذہب و کلچر وغیرہ کے تنہا ان محرکات کے ذریعہ ایک ہو سکتی ہیں تو

آخر ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی آپسمیں یہ کھینچا تانیاں۔یہ کشمکش۔یہ علیحدگی اور یہ جھگڑے کیوں ہیں؟ یہ آپس میں مل کیوں نہیں جاتے تاکہ استعمار دشمن جدوجہد مضبوط ہو اور بلا تخصیص مذہب وملت اس اعلیٰ ومتوسط طبقہ کا زور ختم ہو جائے جو انکی روٹی ہضم کر رہا ہے آپس میں متحد ہو کر جماعتی وطبقاتی تنظیم کرنا تو درکنار ان کی حالت تو یہ ہے کہ آج یہ قصبات ودیہات میں عام طور پر (الہ آباد۔بنارس۔کانپور وغیرہ کو چھوڑئے کہ وہ شہر ہیں) یہ خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔اگر کلچر وغیرہ سے متوسط اور اعلیٰ طبقہ ہی کو دلچسپی ہے اور یہ انہیں کے بنائے ہوئے ڈھونگ ہیں تو پھر یہ عوام ان اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے قبضے میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں جو ایک طرف ان کی آنکھوں کے سامنے انکی روٹی کو ہضم کر رہے ہیں دوسری طرف روٹی کی بجائے محض "زبان وکلچر وغیرہ کا راگ الاپ رہے ہیں" جب کہ آپ کے نزدیک تہذیب وتمدن مذہب وکلچر کے محرکات عوام کی نظروں میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے اور بالفرض ان کی کوئی حیثیت ہے بھی تو بھی وہ اقتصادی محرکات کے مقابلہ میں بہت کمزور ہیں۔بہت بودے ہیں۔بہت معمولی ہیں۔

پھر یہ چیز بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ جب آپ کا یہ یقین وایمان ہے کہ "مسلمان کو عمل پر مائل کرنے یا آزادی کی جدوجہد کے لئے ابھارنے کی غرض سے مناسب اقتصادی محرکات کی ضرورت ہے۔" تو آج مسلمان ایسی حالت میں جب کہ یہ محرکات اس کے لئے عرصہ سے موجود ہیں کیوں سترہ برس سے (جس وقت سے کہ ہندو اکثریت نے اس کے مذہب وکلچر وغیرہ پر حملہ کرنا شروع کیا) کانگریس سے من حیث القوم علیحدہ ہے؟ آج کیوں مسلم لیگ میں شامل ہے؟ اور کیوں غیر مسلم عوام سے ملکر جماعتی اور طبقاتی تنظیم نہیں کرتا اور "اقلیت تحفظات زبان اور کلچر کے سوالات پر زور دینے اور اسی راگ کو الاپتے رہنے" کے بجائے آخر وہ کیوں ایسی جماعت میں شامل نہیں ہوتا جو تقریر سے۔تحریر سے ہر طرح ڈھنڈورا پیٹ کر چوبیس گھنٹے چلا چلا کر اس کا پروپگنڈا کرتی رہتی ہے اور اس کو یقین دلاتی رہتی ہے کہ "ہم تمہاری روٹی کا انتظام کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ہم ترقی کے خواہاں ہیں۔ہم استعمار دشمن ہیں ہم آزادی

پسند ہیں۔ تم آؤ۔ ہم میں شامل ہو کر نہ صرف برطانوی سامراج کو ہندوستان سے نکال باہر کرو بلکہ اس ہندوستانی اعلیٰ اور متوسط طبقہ کا زور ختم کر دو جو تمہاری روٹی چھین رہا ہے۔ تاکہ تم آزاد ہو تمہیں روٹی ملے اور تم ترقی کر سکو" ذرا سوچئے تو سہی۔ بھلا کسقدر خوشنما اور دلپذیر الفاظ ہیں؟ آزادی روٹی۔ ترقی!!! یعنی دنیا میں جنت بلکہ اس سے بڑھکر!! اگر مسلمان کہاں کھڑا ہے؟ مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے! آخر کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ حالات اسے بتا رہے ہیں کہ جس آزادی کا یہ ڈھونگ رچایا جا رہا ہے اس میں ممکن ہے کہ اسے روٹی تو کسی طرح —— باوجود ہندو قوم کے نزدیک "ملکش" ہونے کے —— مل بھی جائے لیکن اسکا علیحدہ قومی وجود اور اس کے ساتھ اسکا کلچر و تمدن سب ختم ہو جائیگا اور یہی چیز وہ گوارا نہیں کر سکتا چاہے آپ لاکھ بار یہ کہیں کہ تمہارا مسئلہ محض روٹی کا ہے۔ تمہیں تمدن سے کوئی واسطہ نہیں۔ کلچر سے کوئی غرض نہیں۔ معاشرت سے کوئی مطلب نہیں رکھنا چاہیئے۔

پھر آپ تو یہ فرماتے ہیں کہ مسلمانان ہندوستان میں نہ ایک قوم ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں بلکہ وہ متضاد اور متصادم جماعتوں سے مرکب ہیں" لیکن آج ذرا نگاہ اٹھا کر دیکھئے کہ مسلمانوں کی انہیں متضاد اور متصادم جماعتوں کی اکثریت کس جھنڈے نیچے کھڑی ہے اور عام طور پر مسلمانوں کے کلچر وغیرہ کے متعلق کیا خیالات اور کیا رجحانات ہیں۔

اس موقع پر ضرورت اس امر کی تھی کہ یہ سوشلسٹ حضرات اپنے مخصوص عقائد سے ذرا بالاتر ہو کر ٹھنڈے دل سے ان تمام چیزوں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھتے اور غور کرتے کہ قوموں کیلئے اقتصادی محرکات کے علاوہ دیگر عوامل و محرکات کیا کیا ہیں۔ اور ان میں کون سے زیادہ موثر ہیں لیکن افسوس ہے کہ یہ حضرات ان نظریوں سے جو کہ انہوں نے فرض کر لئے ہیں ایک انچ آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان قوم کے نزدیک بھی معاشی محرکات ہی سب سے زیادہ موثر ہیں اور اسی کے ذریعہ اسے ابھارا جا سکتا ہے۔ حالانکہ انہیں اس میں ہر ہر منٹ ناکامی ہو رہی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ جب ان حضرات کے سامنے روزانہ کے

ٹھوس واقعات اور مسلمانانِ ہند کے عملی رجحانات پیش کر کے سوال کیا جاتا ہے کہ "دیکھئے اقتصادی محرکات مسلمانوں کے سامنے زبردست سے زبردست (ہندو سے زیادہ) موجود ہیں لیکن وہ پھر بھی روٹی کے بجائے اپنے علیحدہ قومی وجود اور کلچر وغیرہ پر سب سے زیادہ بیچین ہیں اور اسی وجہ سے وہ آج ہندو سے جو آپ کے نزدیک اقتصادی مسئلہ میں انکے عزیز ترین بھائی ہیں دست وگریباں ہیں!" تو یہ حضرات بڑے سوکھے منہ سے جواب دیا کرتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ بیس سال سے مسلمانوں کا مذہب، کلچر، تمدن وغیرہ کے نام پر ابھارا گیا ہے۔ استغفراللہ۔ ابھارا جانا چہ معنی دارد بھلا آپ دنیا کے کسی ایک ہی انسان کو ابھار تو لیجئے کوئی غیر متعلق مسئلہ پیش کر کے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے ۳۵ کروڑ انسانوں میں سے کسی ایک شخص ہی کو یہ کہکر عمل پر مائل کر کے دکھا دیجئے کہ رومانیہ خطرہ میں ہے۔ ہٹلر اسے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ ابھرنا تو درکنار۔ ہر شخص آپ کا مذاق اُڑائیگا کہ ایک رومانیہ نہیں اگر ایک لاکھ رومانیہ بھی خطرہ میں ہوں تو ہمیں کیا واسطہ؟ حیرت یہ ہے کہ یہ سوشلسٹ حضرات کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا کرنا نہیں چاہتے کہ قومیں ابھرا کرتی ہیں تو اسی سوال پر جن سے انہیں بذاتِ خود کوئی واسطہ ہو اور ذاتی طور پر کوئی مطلب وغرض ہو اور جس چیز پر ان میں جوش وحرارت پیدا ہوتی ہے وہ لازمی طور پر ان کے نزدیک عزیز ترین چیز ہوتی ہے اور اس کی تباہی کو وہ مقابلۃً کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتے بعینہٖ یہی حال آج مسلمانوں کا ہے ان کے سامنے دونوں محرکات موجود ہیں۔ روٹی کا بھی اور کلچر کا بھی۔ لیکن وہ روٹی سے زیادہ کلچر اور اپنے علیحدہ قومی وجود کے محرکات سے متاثر ہیں۔ بلکہ "روٹی" کے محرکات کو کلچر وغیرہ کے محرکات کے مقابلہ میں انہوں نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ چونکہ وہ روٹی سے زیادہ اپنے قومی وجود اور کلچر کو عزیز رکھتے ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ اکٹھے "بیس سال" تک وہ عوام جن کو "روٹی" اور محض روٹی کا طلبگار سمجھا اور کہا جاتا ہے "کلچر کے نام پر ابھرتے رہتے" جب کہ اس دوران میں نہ صرف چوبیس گھنٹے ان کے پیٹ میں بھوک کی آگ برابر سلگتی رہی ہے۔ بلکہ ہمارے یہ "حکیمانہ مزاج رکھنے والے" لیڈر بھی ان کو بھوک اور عریانی کی برابر یاد دلاتے رہتے ہیں کہ غیر مسلم عوام سے ملکر جماعتی اور

طبقاتی تنظیم کر کے بھوک کی آگ کو ٹھنڈا کر دی لیکن ان محرکات و ترغیبات کا نتیجہ آج سب کے
سامنے ہے کہ جماعتی تنظیم کے بجائے یہی ہندو مسلم عوام کلچر وغیرہ کے محرکات کی بنا پر ہندوستان کی
زمین کو جا بجا اپنے خون سے لالہ زار بنا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟

کہنے کو ڈاکٹر اشرف نے کہدیا اور صاف طور پر اقرار کر لیا کہ "خود مسلمان کانگریسیوں نے
جمیعت العلمائے ہند اور مجلس احرار قائم کر لی ہیں یعنی ان بنیادوں کو خود مسلمان کانگریسی مضبوط
کر رہے ہیں جن پر آخری منزل میں جا کر مسلم لیگ یا اسکی ہموزن جماعت بن سکتی ہیں۔ یہ سنّتِ
دیرینہ ہے اور خلافت کی تحریک سے برابر چلی آ رہی ہے اور آج اس درجہ مستحکم ہے کہ اگر مسلم لیگ
سامنے سے ہٹ جائے تو میرا خیال ہے کہ اس کے نعروں اور مطالبوں کو کانگریسی مسلمانوں کی
دوسری جماعتیں فوراً اپنا لیں گی ـــــ۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ کانگریس سے قریب اگر بھی مسلمان
علی برادران اور حسرت یا ظفر علیخاں کی طرح پیدا ہو سکتے ہیں" (مقالہ "ہماری قومی تحریک اور مسلمان"
اخبار "ہندوستان" مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۹ء) لیکن ڈاکٹر صاحب نے کبھی غور بھی کیا کہ ایسا کیوں ہوتا رہا
ہے؟ یہ "سنتِ دیرینہ" کیوں جاری ہے اور "کیوں" اس درجہ مستحکم ہے"؟ اس "تجربہ" کی وجہ
اور بنیاد کیا ہے؟ کبھی سوچا بھی کہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات کے بعد یہ "سنت دیرینہ" کیوں جاری
ہوئی۔ اور مذکورہ بالا لیڈر اور عام مسلمان (جن کو آپ سامراج پرست بھی نہیں کہہ سکتے) کیوں من حیثیت
قوم کانگریس میں شامل ہوتے ہوئے باہر نکل آتے۔ شدھی کا مسئلہ جو ایک خالص مذہبی سوال تھا
آپ کے نزدیک تو عوام کے لئے محرکات کی فہرست میں بھی شامل نہیں ہے۔ پھر یہ عوام اس سے کیوں
متاثر ہو گئے دوسرے اتنے زیادہ کیوں متاثر ہوئے کہ اس سوال پر اس جماعت یعنی کانگریس
کو چھوڑ کر باہر آگئے جو ان کی "واحد ضرورت" روٹی کا انتظام کرنا چاہتی ہے؟ یہاں پر چاہئے تو یہ تھا
کہ سوشلسٹ حضرات مسلمانوں کی ۱۹۲۳ء اور اس کے بعد سے کانگریس سے علیحدگی کا نفسیاتی
تجزیہ کر کے دیکھتے۔ اس کی بنیادوں کو ٹٹولتے اور ان اسباب، عوامل اور محرکات پر غور کرتے جن سے
بالکل قدرتی اور فطری طور پر مجبور ہو کر مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہوئے تاکہ ان حضرات کو آج

ملک وقوم کی "رہنمائی ولیڈری" کرتے وقت ان نتائج سے کوئی فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے سیکھی ہے نظری سیاست اور وہ بھی ادھوری۔ یہ ہندوستان میں روسی اشتراکیت تو پھیلانا چاہتے ہیں لیکن روس ہی کی زمانۂ مابعد کی تاریخ سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ یہ نہ صرف ملک کی ضروریات، حقائق اور رجحانات سے بے خبر رہنا چاہتے ہیں بلکہ آئے دن کے برسوں کے واقعات سے ہندو مسلمانوں کی نفسیاتی کیفیت کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اب سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یا تو یہ حضرات مغالطہ میں مبتلا ہیں یا پھر اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے ان حالات پر غور کرنا ہی نہیں چاہتے کہ قوموں کے افکار۔ ان کے اعمال اور ان کی تاریخ تمام تر ان کے معتقدات ان کی قومی روایات انکی تہذیب وکلچر وغیرہ سے متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ نہ صرف ہندوستان کے حالات اس کے شاہد ہیں بلکہ میں یہاں پر تمام دنیا کی قوموں کی اس مسئلہ میں نفسیاتی کیفیت کے متعلق مشہور فرانسیسی فلاسفر اور ماہر نفسیات **موسیو لیبان** کی مشہور آفاق تصنیف "روح الاجتماع" سے جو اس نے قوموں کی نفسیات پر لکھی ہے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن میں اس نے پہلے مختصراً یہ بتایا ہے کہ قومی روایات وکلچر اور تمدن کے کیا معنی ہیں (جس کے پنڈت جواہرلال اور ڈاکٹر اشرف وغیرہ منکر ہیں اور اسکو "ٹونٹی دار لوٹے" اور لٹیا یا "ہندوستانی وایرانی مٹھائیوں" تک محدود سمجھتے ہیں) اور اس کے بعد اس نے تاریخی شہادتیں دیکر یہ ثابت کیا ہے کہ قومیں اپنے کلچر وتمدن اور قومی روایات کو (جن کو ڈاکٹر اشرف "غیر تاریخی" محرکات کہتے ہیں) اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں، چونکہ وہ زندہ ہی اسی طرح رہ سکتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

"قومی روایات کسی قوم کے ان افکار، خیالات اور ضروریات سے عبارت ہیں جو زمانہ گذشتہ سے سلسلہ وار نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتے چلے آتے ہیں اور جن سے قومی روح یا بالفاظ دیگر قوموں کے مزاج عقلی کی تشکیل ہوتی ہے اور چونکہ وراثت کے پے درپے اثر سے وہ ایک گونہ رسوخ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے قوموں کے افکار، معتقدات اور ان کے طریق کار کے متعین کرنے

میں ان روایات کو بڑا دخل ہوتا ہے اور قوموں کی ترقی وتنزل میں انکو بڑی اہمیت ہوتی ہے (صفحہ ۹۴ مطبوعہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ)

اس کی مزید تشریح کے بعد وہ لکھتا ہے کہ

"یہی وجہ ہے کہ قومی روایات اور قومی سرمایہ کی حفاظت کا قوموں اور جماعتوں کو سب سے زیادہ خیال رہتا ہے۔ یہاں تک کہ قومیں ان لوگوں سے لڑنے جھگڑنے پر تل جاتی ہیں جو ان کی قومی روایات میں کوئی تغیر یا ترمیم کرنا چاہتے ہیں اور پھر جماعتوں میں بھی وہ جماعتیں اس کا زیادہ خیال رکھتی ہیں جن کا دائرۂ اثر محدود ہوتا ہے (جیسا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان اقلیت کا) اور اصل یہ ہے کہ ان قوموں کی حفاظت بغیر اس کے ہو ہی نہیں سکتی۔ لہذا اگر یہ قومیں اپنی قدیم روایات کو محفوظ نہ رکھیں تو سب سے پہلے حوادثِ زمانہ کا شکار یہی ہوں" (صفحہ ۹۷)

اس اقتباس میں خط کشیدہ آخری جملہ کو پھر غور سے پڑھیے اور اس کی روشنی میں ان سوشلسٹ حضرات کے اس ارشاد کو جانچیے کہ مسلمانوں کو اور سب طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف روٹی کے مسئلہ کو سامنے رکھنا چاہیے ——— یہ الفاظ ایسے وقت میں کہے جا رہے ہیں جب کہ خود "قوم پرست" مسلمان کھلے الفاظ میں اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ "ہندو اکثریت من حیثیت المجموع مسلمانوں کے مخصوص کلچر کو مٹانے کے درپے ہے اور ان کی زبان و رسم خط اور ان کی تاریخی و روایتی آثار کو فنا کر کے ان کی جگہ مہابھارت اور رامائن کا جھنڈا گاڑنے" کی کوششوں میں مصروف ہے (مدینہ۔ مقالۂ افتتاحیہ۔ مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء)

یہ ہے ہمارے ان سوشلسٹ حضرات کا طریقۂ استدلال جس کو مسلمان تو مسلمان، ہندوستان کی تمام ۳۵ کروڑ آبادی میں سے ایک قلیل سے قلیل تعداد نے بھی آج تک عملاً قبول نہیں کیا ہے (یہ میں سطور ذیل میں بتاؤں گا کہ محض جماعتی تنظیم کو مذہب کے اختلافات سے بالاتر ہو کر ہندو و مسلم عوام کس حد تک قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اور سوشلزم کو ان ہندو حضرات نے جو اپنے آپ کو ظاہرا سوشلسٹ کہتے ہیں کس حد تک قبول کیا ہے اور در اصل عملاً وہ

کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ڈاکٹر اشرف وغیرہ ایک سراسر مغالطہ امیز طعنہ دیتے ہیں غیر سوشلسٹ مسلمانوں کو کہ "مجھے اس قسم کی تحریرات سے (مولانا ظفر الملک اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کی تحریرات) صرف ایک شکایت ہے کہ لکھنے والے مسلمان ملت کے موجودہ تقاضوں اور محرکات وسوالات سے قطعاً بے خبر ہیں یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا ارزاں اور فرسودہ وعظ کبھی ایک عملی اور زندہ پروگرام یعنی اجتماعی لائحۂ عمل کی صورت اختیار نہیں کرتا" (مدینہ۔ ۲۸ جنوری ۱۹۴۳ء) غالباً ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے کہ خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد ؎ یا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۔۔۔ مگر ہوا کا رخ معلوم کرنے اور آئندہ کے متعلق اندازہ لگانے کے لئے ذرا مختصراً یہ دیکھ بھی لیجئے کہ ان سوشلسٹ حضرات کا "وعظ" جو ماشاء اللہ اپنے آپ کو ملت کے موجودہ (!) تقاضوں اور محرکات وسوالات سے بالکل باخبر بتاتے ہیں کس حد تک "ایک عملی اور زندہ پروگرام یعنی اجتماعی لائحۂ عمل کی صورت اختیار کر سکا ہے۔

حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور یہ حقیقت ہے کہ جس حد تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے وہ آج سے نہیں بلکہ سترہ برس سے محض کلچر و مذہب کی وجہ سے اس ادارے سے من حیث القوم بیزار اور علیحدہ ہیں۔ جو ملک میں سب سے آگے بڑھ کر "اجتماعی لائحۂ عمل کی صورت" پیش کرنے کا دعویدار ہے۔ مگر غیر مسلمانوں کو جانے دیجئے کہ ان کے متعلق آپ کا یہ ارشاد ہے کہ "ان کے ذہن میں مسلم تمدن اور زبان و کلچر کے مٹانے کا خوف پیدا کر دیا گیا ہے"! ہندو کو لیجئے جنہیں اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اپنے کلچر کے مٹنے کا بھی خوف نہیں ہے۔ اور جنہیں اس "زندہ پروگرام اور اجتماعی لائحۂ عمل" سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچنے کی امید ہے مگر اسی قوم کے ——— مہاسبھائیوں اور آریہ سماجیوں کی نہیں بلکہ ——— ان افراد کی جو "صحیح جمہوری حکومت" اور "ایسی انصاف پرست اور حقانیت پسند حکومت کا نقشہ بنا کر جس کی آخری منزل میں خلافت ارضی کا خواب پورا ہو سکتا ہو" پیش کرتے تھے آج یہ حالت ہے کہ انہوں نے تری پوری کے اجلاس میں ہٹلر اور مسولینی نام لے لیکر اور صاف الفاظ میں ڈکٹیٹرشپ کا اعلان

کر کے ان مسٹر گاندھی کو ہندوستان کا ڈکٹیٹر اور مختار کل قبول کیا ہے ـــــ اور اس پر سوشلسٹوں نے کھلے اجلاس میں خاموش رہکر اپنی اپنی رضامندی ظاہر کی ہے ـــــ جن کی مہاسبھائیت کو خود ڈاکٹر اشرف مان چکے ہیں (دیکھئے انکا مقالہ "ہماری قومی تحریک اور مسلمان") پھر انہیں ہندو سوشلسٹوں کی حالت کا نقشہ جو اپنے آپ کو مذاہب کے تمام اختلافات سے یکسر بالاتر ظاہر کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے اخبار اسٹیسمین ۳۱ر مارچ کے مقالہ افتتاحیہ میں یوں پیش کرتا ہے کہ

"علاوہ بریں ایک اور بات قابلِ غور یہ ہے کہ کانگریس کے بائیں بازو (سوشلسٹ) جو اپنے آپ کو ملک میں سب سے آگے لڑنے والی (استعمار شکن) جماعت ظاہر کرتے ہیں اور مارکس کے فلسفہ- سماجی انقلاب اور اسی قسم کے اور بہت سے اصولوں کا پرچار کرتے رہتے ہیں ان کی ایک بھاری اکثریت آج کھلے بندوں عام ہندو راج قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے. غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اسی بائیں بازو نے (حال ہی میں) ہندو مہاسبھا کے صدر مسٹر ساورکر کا استقبال کیا ہے اور انہوں نے بنگال میں جو اعلانات کئے ہیں وہ اور ان کے ساتھ ساتھ بنگال میں بائیں بازو کے اخبارات میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں- ان سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہوا کا رخ کس طرف کو ہے"!

"اے بنی اسرائیل دیکھو- یہ میرے خاندان والے نہیں بلکہ تمہارے ہی کنبہ کے لوگ ہیں جن کی تم تعریفیں کیا کرتے تھے"!!!

اس کے باوجود ڈاکٹر اشرف کا مسلمانوں سے ارشاد ہے کہ "یہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ طبقہ تمہارا واحد حکیمانہ ترجمان ہے" اگر واقعی انہیں کو "واحد حکیمانہ ترجمان" کہتے ہیں تو پھر مجھے کہہ لینے دیجئے کہ "ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو" مسلمانوں کے انہیں "واحد حکیمانہ ترجمانوں" نے اور بنگال میں ان کے اخبارات نے جو اپنے آپ کو بلاتفریق مذہب و ملت

کسانوں کا سب سے زبردست ہمدرد اور زمینداروں کا دشمن بتاتے ہیں بنگال کے قانون مزارعین کی ان الفاظ میں مخالفت کی تھی اور اسمبلی میں اس کے خلاف ووٹ دیئے تھے کہ "بنگال میں زمینداروں کی اکثریت ہندو ہو اور کسانوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ لہذا ہمیں خوف ہے کہ بنگال کا قانونِ مزارعین اس صوبہ میں ہندوؤں کے باقیماندہ اثر پر ایک کاری ضرب ہوگا"
(اخبار ایڈوانس)

خاص طور پر صوبہ جاتی خود مختاری کے نفاذ کے بعد سے اس قسم کی پچاسوں مثالیں ہر صوبہ سے اور خاص طور پر ہندو اقلیت کے صوبوں سے پیش کی جا سکتی ہیں لیکن بہرحال انہیں مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں اُن حضرات کی بھی جو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے ہیں اور تمام مذہبی اختلافات سے بالاتر بتاتے ہوئے بلا کسی امتیاز کے کسانوں وغیرہ کا ہمدرد پیش کرتے ہیں یہ حالت ہے کہ عملاً وہ یہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے کہ مسلمان کسان جب تک مسلمان ہے اسے روٹی بھی ملجائے اور ہندو زمیندار سے اپنی روٹی چھین سکے۔ اب اگر سوشلزم کے یہی معنی ہیں تو پتہ نہیں کہ مہا سبھائیت کا کیا مطلب ہے؟

مختصراً یہ حالت تو ہمارے ہندو سوشلسٹوں کی ہے جن میں سمپورنانند اور ٹنڈن وغیرہ جیسے سوشلسٹ سب شامل ہیں اب ذرا یہ بھی دیکھ لیجئے کہ سوشلزم کے اس "زندہ پروگرام اور اجتماعی لائحہ عمل" جماعتی تنظیم وغیرہ کو ہندو کسان اور مزدور کس حد تک قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اس دوران میں جب کہ اس کا زیادہ سے زیادہ پروپگنڈا کیا گیا ہے۔ انہوں نے کس حد تک اسے قبول کیا ہے یا بالفاظ دیگر مسلمان عوام کے سامنے انہوں نے کس حد تک جماعتی اور طبقاتی تنظیم کی غرض سے اپنا مصالحتی ہاتھ بڑھایا ہے؟

افسوس ہے کہ اس کا جواب بھی ہمیں ناامیدی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اخبار بین حضرات سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہوگا کہ آج کل کوئی دن ایسا منحوس جاتا ہوگا جب کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں قصبات و دیہات سے قتل و غارتگری کی واردات کی اطلاعات

نہ آتی ہوں۔ مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے مثال کے طور پر حال ہی کا ایک واقعہ لیلیجئے
نیاگاؤں (بہار) میں دس ہزار مسلح اور منظم ہندو کسان اور مزدوروں نے مسلمان
کسانوں پر حملہ کیا۔ ایک سو سے زیادہ مکانات اور تمام کھیتی اور سامان جلا کر خاک
سیاہ کر دیا۔ اور کافی تعداد میں مسلمان کسانوں کو زخمی کیا وغیرہ وغیرہ۔

آخر یہ اکٹھے دس ہزار حملہ آور کون تھے؟ وہی مسلمان کسانوں اور مزدوروں کے
اقتصادی مسئلہ میں عزیز ترین بھائی!!! انہوں نے کن پر لوٹ وغارتگری کے ساتھ یہ حملہ
کیا تھا؟ اپنے ان جماعتی اور طبقاتی بھائیوں پر جنہیں آج یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ تمہارا سب سے
بڑا دشمن ایک مسلمان زمیندار تو ہو سکتا ہے بلکہ ہے چونکہ اس کے اور تمہارے مفاد "متضاد
اور متصادم" ہیں۔ لیکن ہندو کسان تمہارا ہر حال میں بہترین بھائی ہے چونکہ تمہارے اور
اس کے مفاد کسی طرح اور کسی نقطۂ نظر سے بھی "متضاد اور متصادم" نہیں ہیں یہ حملہ کیوں
کیا گیا تھا؟ ان ہندو کسان اور مزدوروں نے روٹی کے بجائے مذہب۔ کلچر اور قومی روایات
کے نام پر!!! ——— یہ حملہ کب کیا تھا؟ اسوقت جب کہ ہندوستان کا مسئلہ محض اقتصادی
اور معاشی بتایا جاتا ہے!!! ——————— یہ ہے وہ "عملی اور زندہ پروگرام جو اس طرح اجتماعی
لائحۂ عمل کی صورت اختیار کر رہا ہے"!!!

غرض کہ روزانہ کے ان حالات و واقعات کے پیش نظر کون صحیح الدماغ انسان کہہ
سکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے سامنے ایک محض روٹی کا سوال ہے۔ آج تو ایک غیر سیاسی
اور غیر حکیمانہ مزاج رکھنے والا انسان بھی بلا خوفِ تردید کہہ دیگا کہ ہندوستان کے مسائل
کو محض اقتصادی سوال تک محدود کر دینا پرلے سرے کی حماقت ہے اور ہندوستان میں
سب سے بڑا جھگڑا جس نے تمام "ترقیوں" کو روک رکھا ہے وہ دو مختلف مذہب کا ہے اور
اس سے بھی کہیں زیادہ دو مختلف معاشرتوں کا۔ دو متضاد کلچروں کا اور دو متصادم تمدنوں
کا ہے اور ان بنیادی و اساسی اختلاف نے یہ صورت پیدا کر دی ہے کہ ایک طرف ایک قوم ہے

جو اپنی اکثریت کے زعم میں بلا کسی امتیاز و استثناء کے (گو مختلف لیبل لگا کر اور مختلف نام اختیار کر کے) اقلیت پر اپنا کلچر زبردستی ٹھونسنا چاہتی ہے اور دوسری طرف مسلمان بالکل فطری اور نفسیاتی طور پر اس چیز کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور اس کشمکش میں وہ اقتصادی و معاشی محرکات جو دونوں کو متحد و یکجا کر سکیں سب یوں ہی دہرے ہوئے ہیں اور جب تک یہ کشمکش جاری رہیگی وہ یوں ہی رکھے رہینگے۔ اور یہ کشمکش ظاہر ہے۔ کہ اسوقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمانوں کو بھی پورے طور پر اطمینان نہ ہو جائے کہ انکا قومی وجود و کلچر وغیرہ بالکل محفوظ ہیں اور اس کے لئے وہی صورت ہو کہ ان کے تہذیبی منطقے بالکل علیٰحدہ ہوں۔

افسوس ہے کہ یہ سوشلسٹ حضرات اعتراض تو کرتے ہیں کہ "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگایا جاتا ہے لیکن کبھی یہ اپنے عمل کو بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ خود اسی جرم کے برابر مرتکب ہو رہے ہیں۔ ایک ذرا سے تغیر کے ساتھ یہ خود اسی قسم کا نعرہ برابر لگا رہے ہیں کہ "روٹی خطرہ میں ہے" مگر اب اسکو کیا کیجئے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی فطری اور نفسیاتی طور پر اسکو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے کلچر وغیرہ کو تباہ کرا کے اور اپنے علیٰحدہ قومی وجود کو ختم کرا کے دوسروں کا کلچر قبول کرے اور دوسروں میں ضم ہو جائے۔ ممکن ہے ڈاکٹر اشرف وغیرہ روٹی کے پیچھے اس کو قبول کر لیں لیکن مسلمانانِ ہند تو جنہیں ڈاکٹر صاحب "ابھارنا اور عمل پر مائل کرنا چاہتے ہیں" اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں۔

کاش یہ حضرات روس کی اشتراکیت کی تاریخ کا وہ باب بھی کسی طرح پڑھکر ذہن میں رکھتے جس میں روسی تہذیب و کلچر کے اختلافات کی بنا پر ۱۵ خود مختار جمہوری ریاستوں میں منقسم نظر آتا ہے۔ آخر سوال یہ ہے کہ روس جیسے ملک میں جہاں روٹی کی اہمیت اور اشتراکیت لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کر کے سمجھائی اور پڑھائی گئی ہو وہاں یہ تہذیب کے اختلافات اور کلچر کے محرکات کیسے؟۔

ان حضرات سے یہ امید تو نہیں ہے لیکن اتنی خواہش ضرور ہے کہ کاش یہ ان واقعات
ے نقاب حقیقتوں پر غور کرتے اور قوموں کی نفسیات کا بغور مطالعہ کرکے کوئی اصول
تے اور ہندوستان میں تہذیب وکلچر کے محرکات واختلافات کے وجود سے انکار کرتے
اس "نیم حکیم خطرۂ جان" کی طرح عمل نہ کرتے جو ایک معمولی سے پیچیدہ مرض کو بھی اناڑی
کی وجہ سے تشخیص نہیں کر پاتا پیچھا چھڑانے اور سستا چھوٹنے کے خیال سے غور وخوض
کے بجائے دوسرے سے مرض کے وجود ہی کا انکار کر دیتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ نہ
میں کوئی افاقہ ہوتا ہے اور نہ مریض کو تسکین حاصل ہوتی ہے بلکہ بہت جلد ان حکیم
ب کو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مریض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے بدظن ہو چکا ہے اور اب نہ
اسکا ہی ارادہ ان کی طرف رخ کرنے کا نہیں ہے بلکہ چونکہ ان کی اس "حذاقت مآبی"
ر دور شہرت بھی ہو رہی ہے۔ لہذا عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جبکہ ان کی "طبابت"
ان کی ذات اور ان کے گھر تک محدود ہو جائیگی۔

از جناب مولوی عزیز الحق صاحب عزیزؔ۔ بی اے، بی ٹی (علیگ) شملہ

اس قدر آئی ہمیں حکمتِ مغرب پسند — اپنے محاسن سے بیر اسکے معائب پسند

چھین لی افرنگ نے ہم سے ہماری نظر — ہمکو وہی خوب ہے جو کرے "صاحب" پسند

انکا نظام و مقام اپنی نظر میں بلند — انکے مناصب عزیز انکے مراتب پسند

ان کی کتابیں بھی خوب انکے مضامیں بھی خوب — ان کے معانی پسند انکے مطالب پسند

نثر بھی ان کی بھلی نظم بھی ان کی قبول — پڑھتے ہیں ملٹن کو اب جنکو تھا غالب پسند

کالج و اسکول ہیں مرجعِ ہر خاص و عام — اپنے مدارس پسند اور نہ مکاتب پسند

مدرسہ میں جاکے دیکھ منظرِ تقلیدِ غیر — فرش کی جا، کرسیاں نے کی جگہ نب پسند

اپنی ہر اک چیز سے نفرت و بیزاریاں — ڈاکٹری پر مریں پر نہ کریں "طب" پسند

طالبِ دنیا تو خیر طالبِ عقبیٰ کو بھی — شیخ حرم سے عناد، گرجا کا راہب پسند

سادگی و پختگی مذہبِ فطرت میں تھی — اپنی طبیعت کو ہیں آج عجائب پسند

آہوئے دشتِ حجاز اور ہوا اسیرِ فرنگ — لذّتِ رم کے عوض قیدِ مصائب پسند

شکل بھی انکی سی ہو، وضع بھی انکی سی ہو — روح بھی ہوگی وہی جب ہے وہ قالب پسند

شپرہ چشمی نہیں گر تو ہے یہ اور کیا — چھوڑ کے خورشید کو آئیں کواکب پسند

سوچ کے مانگ لے عزیزؔ بندگی یا عزِ نفس
دیتی ہے قدرت وہی جو کرے طالب پسند

نقد و نظر

سیرت سید احمد شہید رح مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی۔ طباعت کتابت عمدہ۔ جلد مطلا۔ قیمت فی جلد عگر۔ جناب مرتب سے دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی سے طلب فرمائیے

اسلام ایک ایسے انقلاب عظیم کا نام ہے جو دنیا میں انسانوں کے وضع کردہ تمام نظام ہائے زندگی سے ٹکراتا ہے۔ اور ان میں سے ایک ایک کو توڑ کر انکی جگہ ایک ایسے محیطِ کل نظام حیات کو مسلط کرتا ہے جو قوانین الہیہ کا متعین فرمودہ ہے۔ اس نظام زندگی کے تمکن و تسلط کا نام استخلاف فی الارض ہے اور قرآن کریم کی نصوص صریحہ کے مطابق مومن کے ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ اس قسم کا استخلاف و تمکن ہے۔ اگر ایمان و اعمال صالحہ اس قسم کا نتیجہ پیدا نہیں کرتے یا اس قسم کے نتیجہ کی طرف منجر نہیں ہوتے تو بجائے اس کے کہ ہم اپنے آپ کو فریبِ نفس میں مبتلا رکھیں۔ ہمیں اس حقیقت کا مردانہ وار اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہمارے ایمان و اعمال قرآن کریم کی میزان میں پورے نہیں اتر رہے۔

یوں تو ایک مردِ مومن کی زندگی کا ہر لمحہ صحیح ایمان کی حرارت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن اسکے اعمال صالحہ کی تکمیل اس میدان جہاد میں ہوتی ہے جہاں وہ اپنے خدا کا نام بلند کرنے کے لئے یعنی دنیا میں حکومت الٰہی کے قیام کی خاطر اپنی جان عزیز جیسی گراں بہا متاع بلا مزد و معاوضہ قربان کر دیتا ہے۔ اور یوں اپنے خون کے ہر قطرہ سے اپنے ایمان محکم کی تصدیق کراتا ہے۔

یہ ہے صحیح اسلام اور یہ ہیں اس کے درخشندہ نتائج۔ لیکن اسلام کا یہ تصور ایک عرصہ ہوا مسلمان کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس نے بھی آہستہ آہستہ یہ سمجھ لیا کہ اسلام ایک ضابطۂ اخلاق کا نام ہے۔ جو محض پند و نصائح کے کام آتا ہے۔ یہ تصور پیدا ہونا تھا کہ اسلام جیسا جیتا جاگتا

مذہب چند رسوم و مظاہر کا مجموعہ بن کے رہ گیا۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل | یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خدامست خود آگاہ | یہ مذہب ملّا و نباتات و جمادات

آج تو پھر بھی مسلمانوں کو کچھ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ان کا موجودہ اسلام۔ صحیح اسلام سے کس قدر مختلف ہے (اور یہ احساس رہینِ منت ہے حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے پیغامِ حیات آفرین کا) لیکن گذشتہ صدی میں تو مسلمانوں کا تعطل و جمود انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ اور دیکھنے والی آنکھ دیکھتی تھی کہ

مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

لیکن اللہ کی رحمت کا کرشمہ دیکھئے کہ اسی خاک کے ڈھیر سے ایک ایسی چنگاری پیدا ہوئی جس نے اپنی حرارت خداداد سے تمام ماحول کو گرما دیا اور بجھے ہوئے افسردہ سینوں میں ایسی تمازتِ ایمان پیدا کر دی۔ جس سے دلوں میں امنگیں۔ نگاہوں میں بصیرت۔ سر میں سودائے عشق اور بازؤں میں قوت موج زن ہو گئی۔ اس آفتابِ جہاں تاب کا نام تھا مجاہد اعظم شہید ملت حضرت سید احمد بریلوی علیہ الرحمتہ

آسماں اسکی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

کتاب زیر نظر اسی مرد مومن کی مجاہدانہ سیرت کا مرقعہ ہے۔

ذرا اندازہ فرمائیے کہ ایک شخص ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ نہ دولت وحشمت ساتھ ہے نہ ساز و سامان۔ حالات ناموافق ماحول نامساعد۔ لیکن اس بظاہر بیکسی و بے بسی کے ہجوم میں ایک دُور کی آواز ہے جو علیٰ وجہ البصیرت اسے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

لا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين

وہ اس آواز کو سنکر اٹھتا ہے اور چند برسوں کی مجاہدانہ حراست کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پشاور کے

میدان میں ایک لاکھ مجاہدین کی جمعیت سازوسامان سے آراستہ ہتھیاروں سے مسلح۔اس کے حکم پر خدا کی راہ میں گردنیں کٹا دینے پہ آمادہ نظر آتی ہے۔اس سربکف جماعت میں کون لوگ ہیں۔شیخ الاسلام مولانا عبدالحی صاحبؒ۔ حجۃ الاسلام مولانا شاہ محمدؒ اسمٰعیل صاحب شہیدؒ اور دیگر بزرگانِ عظام رح)

جماعت۔امام۔مرکز۔بیعت۔کے الفاظ مسلمانوں کی زبانوں پہ موجود تھے۔لیکن ان کا مفہوم سمجھانے والا کوئی نہ تھا۔یہ مجاہدین کی جماعت تھی جس نے آکر ان بے روح لاشوں میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیا۔اور مسلمانوں کو بتادیا کہ ان الفاظ کے اندر انقلاباتِ عظیم کی کتنی کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں۔عقیدت وارادت کو دیکھئے تو یہ حالت کہ

"ایک مرتبہ سید صاحب نے شاہ صاحب کو خاص اپنی سواری کا گھوڑا دیا اور دہلی شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کی خبر کی تحقیق واطلاع کے لئے بھیجا۔مولانائے شہید ادب کی وجہ سے گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے کہ سید صاحب کا خاص گھوڑا ہے۔ بلکہ لکھنؤ سے دہلی تک اسکی لگام تھام کر آئے۔ (صفحہ ۳۹۸)

نیز یہ کہ

"ایک شخص نے شاہ صاحب سے کہا کہ حضرت آپ کی عمر اور سید صاحب کی عمر ایک ہے؟ فرمایا کہ عمر۔عمر سید صاحب کی ہے۔میری کیا عمر۔میں ان کا غلام ہوں اس لفظ کو مکرر کہتے رہے۔"

یہ تھی عقیدت وارادت۔لیکن دوسری طرف یہ حالت کہ

"سید صاحب نے جب شادی کی تو اتفاقاً ایک روز نماز میں کچھ دیر سے آئے۔اگلے دن پھر اتنی تاخیر ہوگئی کہ تکبیر اولیٰ ہو چکی تھی۔مولانا عبدالحی صاحب نے سلام پھیرنے کے بعد کہا۔کہ عبادت الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت۔

سید صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور پھر نماز میں اپنے معمولی طریقہ سے تشریف لانے لگے۔" (صفحہ ۹۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے مرشد اور مرید کا تعلق۔ اور دوسری طرف عجمی تصوف کی یہ کرشمہ زائیاں کہ

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا!

ہاں۔ تو مجاہدین کی یہ جماعت اٹھی۔ پنجاب کی طرف بڑھی۔ اور سرحد میں جاکر متمکن ہوگئی۔ کہ فی الحقیقت ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے پنجاب اور سرحد کا علاقہ ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اگر یہ علاقہ اسلامستان بن جائے تو سارا ہندوستان دار السلام ہوسکتا ہے۔ یہاں بیٹھکر سکھوں کی حکومت کو لکھا کہ

(۱) یا تو اسلام قبول کرو۔ اس وقت ہمارے بھائی اور مساوی ہو جاؤ گے۔ لیکن اتیں کوئی جبر نہیں

(۲) ہماری اطاعت اختیار کرکے جزیہ دینا قبول کرو۔ اس وقت ہم اپنی جان مال کی طرح تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

(۳) آخری بات یہ ہے کہ اگر تم کو دونوں باتیں منظور نہیں ہیں تو لڑنے کے لئے تیار رہو" (صفحہ ۱۴۳)

یہ ہے صحیح اسلامی سیاست۔ آج کے مجتہدینِ عظام اور علمائے کرام ہوتے تو مشورہ یہ دیتے کہ آؤ کفار اور مسلمان ملکر ایک متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالیں اور ایک ایسی جمہوری حکومت قائم کریں جس میں اکثریت کفار کی ہو۔ سچ ہے۔

وہ مذہبِ مردانِ خدامست و خود آگاہ — یہ مذہب ملّا و نباتات و جمادات

لشکر مرتب ہوا۔ شوقِ شہادت کا یہ عالم کہ بسینۂ شمشیر سے باہر تقادم شمشیر کا۔ میدان جہاد میں پہنچے۔ اللہ کی فتح و نصرت نے بڑھکر لبیک کہا۔ آسمان کے نورانی فرشتوں نے صلوٰۃ و سلام سے استقبال کیا۔ اسی اکوڑہ کے مقام پر جہاں گذشتہ دنوں عباداتِ الٰہی میں منہمک خاکساروں کی جماعت کو خاک و خون میں غلطاں کیا گیا ہے۔ کفار کے لشکروں کو پسپا کیا گیا فتح پر فتح ہونے لگی۔ پھر کیا ہوا وہی جو ہوتا

چلا آیا ہے ۔ یعنے خود مسلمانوں میں سے ایسے میر جعفر و میر صادق تیار کیے گئے جنھوں نے حضرت سید صاحب کو کھانے میں زہر دے دیا ۔ لیکن خدا کی شان یہ مرد مجاہد اس سے بھی جانبر ہو گیے ۔ دشمنوں کی سازشیں بے کار گئیں ۔ اس کے بعد ۔ وہ آخری تیر چلایا گیا ۔ جو ہمیشہ مسلمانوں کی جماعت میں تشتت وافتراق پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ یعنے "دہلی کے ایک مشہور عالم جن کے مزاج میں تیزی تھی" مجاہدین کے کیمپ میں تشریف لے آئے ۔ اپنے مخصوص مجتہدانہ انداز میں فقہی مسائل کی بحثیں چھیڑ دیں کہ مقدم فریضہ بیوی ۔ بچوں اور والدین کے حقوق ہیں ۔ جہاد کے لیے شرائط کیا کیا ہیں ۔ کون سے کفار سے مقابلہ ہے ۔ وقس علیٰ ذالک ہر چند یہ فتنہ جلد فرو کر دیا گیا ۔ لیکن جو فتنہ مذہب کی راہ سے پیدا کیا جاتا ہے اس کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے قصہ مختصر بالاکوٹ کے مقام پر آخری مقابلہ ہوا ۔ اور مجاہدین کی یہ جماعت جسے چشم فلک نے ایک مدت مدید کے بعد دیکھا تھا ۔ اللہ کی راہ میں سر کٹا کر حیاتِ ابدی سے بہرہ یاب ہو گئی ۔ بقیۃ السیف پہاڑوں اور وادیوں میں منتشر ہو گئے ۔ اور پھر ان کے ساتھ کیا کیا سلوک ہوے ۔ ان کی تفصیل طویل ہے جو کتاب زیر نظر میں ملے گی ۔

یہ تھی "وہابیوں" کی ابتدا ۔ اور ان کی انتہا آج یہ ہے کہ ان کے سامنے آمین بالجہر اور فاتحہ خلف امام کے مسائل کے علاوہ زندگی کا کوئی مسئلہ قابلِ اعتنا نہیں رہا ۔

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست ‌ ‌ ‌ ‌ یہ مذہبِ ملّا و نباتات و جمادات

اس جماعت مجاہدین کے ساتھ غیروں نے جو کچھ کیا اُسے تو چھوڑیے ۔ خود اپنوں نے کیا کیا اسے سنیے

"۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ سے لیکر اس دن تک جس کو سو برس سے زائد ہوئے شاید کوئی دن طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی جس کی اور فضیلتیں ہر طرف اس کی شہادت مسلّم اور شہدا کی مغفرت مسلّم تکفیر و تذلیل میں کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو ۔ لعنت و سب و شتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو ۔ علما کی مجلس میں اس پر اتنی لعنت کی گئی جتنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بنی امیہ کے دربار میں نہیں کی گئی فقہ و فتادے کی کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس کے کفر کے ثبوت میں نہ پیش کی گئی ہو ۔ وہ ابو جہل و ابو لہب سے زیادہ دشمن اسلام ، خوارج و مرتدین سے زیادہ

مارق من الدین وخارج از اسلام۔ فرعون و ہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر وضلالت کا بانی بے ادبوں وگستاخوں کا پیشوا۔ شیخ نجدی کا مقلد وشاگرد بتایا گیا۔ اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں اللہ کے لیے ایک پھانس بھی نہیں چبھی۔ جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا۔ جن کو خون چھوڑ کر اس کا ان کے یہاں کیا ذکر اسلام کی صحیح خدمت میں پسینہ کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کی ماؤں، بہنوں بیٹیوں کی عزت وعصمت بچانے کے لیے اس نے اپنا سر کٹایا۔ تو کیا اس کا یہی گناہ تھا اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھکر نظیر مل سکتی ہے۔ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان جان ومال۔ عزت وآبرو محفوظ نہ تھی۔ سکھوں کے گھروں میں مسلمان عورتیں تھیں۔ مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ اور ان میں گھوڑے باندھے جاتے تھے۔ اُس وقت یہ غیرتِ ایمانی وحمیتِ اسلامی والے جو ایک "کلمۂ کفر" برداشت نہیں کرسکتے۔ کہاں تھے؟ اور کیا آج بھی شاہ ولی اللہ کے پوتے کے علاوہ کوئی کافر نہیں " (ص ۴۱۰-۴۰۹)

لیکن اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ وہ کونسی تحریک ہو جس میں زندگی کے کچھ آثار نظر آتے ہوں اور "مولوی" نے اس پر کفر کا فتویٰ نہ لگا دیا ہو۔ آج بھی کیا یہی کچھ نہیں ہو رہا؟ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات۔

لذیذ بود حکایت دراز ترگفتم ——— اور اب بھی جی نہیں چاہتا کہ اس "قصۂ زلف" کو چھوڑ دیا جائے۔ لیکن عدم گنجائش مزید تفصیل سے مانع ہے۔ ہم جناب سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی خدمت میں بصمیم قلب ہدیہ تبریک وتہنیت پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت سے ایک ایسی عمدہ خدمت انجام دی ہے جس کے لیے ملتِ اسلامیہ انکی شرمندۂ احسان ہے۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اس سلسلہ کے دیگر ملفوظات کو بھی وقتاً فوقتاً شایع فرماتے رہیں۔ مثلاً حضرت سید صاحب کے خطوط کا مجموعہ، یا حضرت شاہ صاحب کی کتاب "منصب امامت" کی تلخیص وغیرہ۔

ہم ہر اس مسلمان سے جو اپنے سینے میں دھڑکنے والا دل رکھتا ہے بزور سفارش کریں گے کہ وہ کتاب زیر نظر کا ضرور مطالعہ کرے اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اس سلسلہ کی اور بہت سی چیزیں شائع ہوسکیں گی کہ یہی وہ سلسلۂ ربانی ہے جس کے احیاء سے یہ حقیقت سامنے آسکتی ہے کہ ؎

عالم ہے فقط مومن جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

رسالہ دینیات | مؤلفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی - مدیر ترجمان القرآن - طباعت ، کتابت کاغذ عمدہ - قیمت ۱۲ر فی جلد مع محصول ڈاک - ملنے کا پتہ :- دفتر ترجمان القرآن - لاہور

حلقۂ طلوع اسلام میں مولانا مودودی صاحب مدظلہ کسی تعارف کے محتاج نہیں زیر نظر رسالہ انہی کی تالیف ہے - اور "خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے لیے لکھا گیا ہے جو ہائی اسکولوں کی آخری جماعتوں یا کالج کی ابتدائی منزلوں میں تعلیم پاتے ہوں " حقیقت یہ ہے کہ آج ملت اسلامیہ میں ہر نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ خصوصیت کے ساتھ توجہ کا محتاج ہے - اس لیے کہ کفر و الحاد کے جس ماحول میں انکی تعلیم و تربیت سرانجام پا رہی ہے - اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ مذہب سے بے گانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو جائیں - پھر بدبختی یہ کہ ہمارے نام نہاد مدارس "اسلامیہ" میں جس طریق پر دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے وہ مذہب میں کسی قسم کی کشش پیدا کرنے کے بجائے اکثر اوقات اس سے نفرت کا موجب بن جاتی ہے - مولانا صاحب نے ان حالات کو پیش نظر رکھ کر یہ رسالہ تالیف فرمایا ہے - اور کوشش کی گئی ہے کہ طالب علم کو فقہی مسائل رٹانے کی بجائے اس کے دلمیں دین کی حکمت بالغہ کی عظمت پیدا کی جائے - ان کی یہ کوشش بڑی مبارک اور کامیاب ہے - اُمید ہے کہ مسلمان اسے بہ نظر استحسان دیکھیں گے - رسالہ میں مختصراً عقائد و عبادات کا صحیح صحیح تعارف کرادیا گیا ہے - اور قرآن کریم کے طرز استدلال کی پیروی کی گئی ہے - اس کی خاص ضرورت تھی کہ یہی طریقہ سب سے زیادہ درست اور مفید ہوسکتا ہے -

---

ہندوستانی انگریزی زبان میں ایک مختصر سا رسالہ۔ مصنفہ منشی دین محمد صاحب۔ الریاض ہال بازار۔ امرتسر۔ طباعت۔ کتابت۔ کاغذ عمدہ۔ قیمت ۲ ار فی جلد۔

سیاستِ حاضرہ میں زبان کا مسئلہ جس قدر اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ ناظرین طلوع اسلام سے مخفی نہیں۔ برادرانِ وطن جس دیدہ دلیری سے اُردو کو مٹانے اور ہندی کو رائج کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں وہ بھی ظاہر ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ خود بعض مسلمان (قومیت پرست) حضرات بھی دانستہ یا نادانستہ "سواگت" اور "نیائے" کی دَل دَل میں پھنس کر بزعمِ خویش اپنی کشادہ ظرفی، لیکن درحقیقت اپنے جذبۂ مرعوبیت کا ثبوت دینے لگ گئے ہیں۔ رسالہ زیرِ نظر میں اس متنازعہ فیہ مسئلہ پر سنجیدہ بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس باب میں برادران وطن کے منصوبے کیا ہیں۔

تنقیحات یہ رسالہ ان اہم مضامین پر مشتمل ہے، جو ہمارے محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے قلم سے ترجمان القرآن میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کی اہمیت یقیناً اس امر کی متقاضی تھی کہ انہیں الگ بھی شائع کیا جائے مولانا صاحب نے ان کی اس انداز کی اشاعت سے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ مضامین ایسے متنوع ہیں کہ ہماری زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا اہم گوشہ ہو جس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب۔ عقلیت کا فریب۔ تجدد کا پائے چوبیں دورِ جدید کی بیمار قومیں۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط۔ ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقص۔ انسانی قانون اور قانون الٰہی میں مسلمان کا حقیقی مفہوم۔ ایمان اور اطاعت، مرض اور اس کا علاج۔ یہ ہیں چند عنوان اس فہرست میں سے جو اس مجموعۂ مضامین کی مایۂ ناز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس رسالہ کی عام اشاعت ہو۔ جو ترجمان القرآن کے سائز پر ۲۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ۔ سرورق بالکل ترجمان القرآن جیسا قیمت غیر مجلد ۲ ار۔ محصول ڈاک ۴ ر۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ ملتان روڈ، لاہور سے طلب فرمائیے۔

دارالاسلام

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے — ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

ہندوستان کے مسلمان جن مصائب و آلام کے ہجوم میں آج گھرے ہوئے ہیں وہ کسی دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والے دل سے پوشیدہ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان مشکلات کا بیشتر حصہ کوئی نیا نہیں۔ بلکہ وہ ایک عرصہ سے مسلمانوں کے سر پر مسلط تھا۔ لیکن گوناگوں اسباب وعلل کی بنا پر آج ان کی شدت بہت بڑھ گئی ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اب " کارواں کے دل میں احساسِ زیاں " پیدا ہو رہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر وہ شخص جو ہندوستان میں مسلمانوں کی ملی ہستی کو برقرار رکھنے کا متمنی ہے دن کے چین اور رات کی نیند سے محروم ہے۔ لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کی وجہ سے حالت یہ ہو رہی ہے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس تشتت و افتراق۔ منزل کے عدم تعین۔ جادۂ مستقیم سے ناواقفیت۔ خضرِ راہ کی غلط شناخت کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر قدم ایسے ہیں جو اٹھتے ہیں لیکن منزل قریب نہیں آتی۔ کوششیں ہوتی ہیں لیکن نتائج کچھ برآمد نہیں ہوتے۔ اعمال غارت ہو رہے ہیں محنتیں اکارت جا رہی ہیں۔ مساعی نامشکور ہو رہی ہیں سے ڈور کو سلجھا رہے ہیں پر سرا ملتا نہیں

یہی تھی وہ تڑپ جس سے مجبور ہو کر آج سے کچھ سال پہلے پنجاب کے ایک غیر معروف گاؤں جمال پور کا ایک مخلص مسلمان (خانصاحب چودھری نیاز علی) اُٹھا۔ دورِ حاضرہ کی سب سے بڑی ہستی حکیم الامّت حضرت علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پہنچا۔ اور اپنی زندگی کا تمام حاصل اُن کے قدموں میں جا کر ڈھیر کر دیا کہ یہ ہے میری کل کائنات۔ اسے لیجئے اور ٹھکانے لگا دیجئے۔

سپردم بتو مایہ خویش را		تو دانی حساب کم و بیش را

حضرت علامہؒ کے ذہن میں ایک مدت سے ایک ایسی اسکیم کا خاکہ مشتقل ہو رہا تھا جس کی رو سے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی اس دنیا سے الگ کہیں کسی گوشہ میں ایک مختصر سی ایسی بستی بسائی جائے جو اسلامی ماحول کی آئینہ دار ہو۔ جہاں بہترین دل و دماغ کے چند منتخب نوجوان افرادِ ملت کو جمع کر کے ان کی صلاحیتوں کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھالا جائے۔ ان کے پیکر آب و گل میں قرآنی روح پھونک کر ان میں ایسی فولادی سیرت پیدا کر دی جائے کہ وہ دنیا میں ہر مخالف قوت کے مقابلہ میں چٹان محسوس ہوا کرتا ہوں۔

حضرت علامہ نے خالصۃً آپ موصوف کے اس ارادہ کو مبارک سمجھا۔ چنانچہ اس اسکیم کے خارجی انتظامات ان کے سپرد کر دیئے اور داخلی پہلوؤں کو اپنے زیر نظر رکھا۔ حضرت علامہؒ کے ذہن میں اس اسکیم کا نقشہ کیا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس مکتوب گرامی سے لگا سکتے ہیں جو انھوں نے اس ضمن میں جامعۃ ازہر (مصر) کے شیخ علامہ مصطفےٰ المراغی کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا۔ مکتوب کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ضروری تمہید کے بعد آپ نے تحریر فرمایا کہ

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں قائم نہیں کیا گیا۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں۔ اور وہ اپنی زندگیاں دینِ اسلامی کی خدمت کے لئے وقف کرنے کو تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیب حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں۔ جو کہ ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو۔ اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتب موجود

ہوں۔ علاوہ ازیں ہم ایک ایسا رہنما جو کامل اور صالح ہو اور قرآنِ حکیم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو اور نیز انقلاباتِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روح سے واقف کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں اُن کی مدد کرے۔ تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔

اِس تجویز کی اہمیت آپ پر منکشف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ خود اِس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میری تمنا ہے کہ آپ ازراہِ عنایت ایک مصری عالم، روشن خیال کو جامع ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں تاکہ یہ شخص ہم کو اِس کام میں مدد دے۔ چاہئے کہ یہ شخص علومِ شرعیہ اور تاریخ تمدنِ اسلامی میں ماہر ہو۔ نیز زبانِ انگریزی پر بھی قدرتِ کامل رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں مجھے مصری وفد کے اراکین سے جنھوں نے پچھلے دنوں ہمیں اپنی زیارت سے مشرف فرمایا تھا معلوم ہوا تھا کہ جامع ازہر اپنے خرچ پر ہندوستان میں چند مبلغین مختلف مقامات میں بھیجنے کا اِرادہ رکھتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مرکزِ اسلامی کی بنا، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے مقصدِ تبلیغ کے لئے مختلف مقامات پر مختلف مبلغین بھیجنے سے زیادہ اولیٰ و اقرب ہے۔ مجھے توقع ہے کہ دینِ حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف و اکناف میں پھیلے گا۔ اگر آپ میرے ساتھ اِس لائحہ عمل پر اتفاق کریں تو آپ کا بیحد ممنون ہونگا۔ اپنے خیال سے جلد از جلد مطلع فرمائیں۔"

شیخ المراغی نے اس مکتوب کے جواب میں معذرت لکھ بھیجی کہ سردست اِن صفات کا کوئی عالِم ہندوستان میں نہیں بھیجا جا سکتا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف اہل الرائے حضرات سے

اِس اسکیم کی عملی تشکیل کے متعلق استصواب کیا گیا۔ اور اُن کے قیمتی مشوروں کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ جہاں تک خارجی انتظامات کا تعلق تھا کام بڑی سُرعت سے آگے بڑھایا گیا۔ خان صاحب موصوف نے قریب ستر ایکڑ مزروعہ اراضی بذریعہ رجسٹری اِس غرض کے لئے وقف کردی۔ اس زمین کے ایک حصہ میں تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ مسجد۔ لائبریری۔ دارالمطالعہ۔ رہائشی مکانات۔ دارالاقامہ (ہوسٹل) کی عمارات مکمل کردی گئیں۔ قریب پچیس[۲۵] ایکڑ اراضی میں اعلیٰ ترین آم وغیرہ کے باغ لگانے کی ابتدا کردی گئی ہے جوانشا اللہ پانچ ہزار کی مستقل آمدنی کا ذریعہ ہوجائیگا۔ اس آبادی کا نام "دارالاسلام" رکھا گیا۔ اور اُس کے نظم ونسق کے لئے ایک بورڈ اوف ٹرسٹیز بنادیا گیا جو حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہے :-

(۱) میاں نظام الدین صاحب رئیس لاہور۔

(۲) خانصاحب شیخ محمد نصیب۔ بیرسٹر گورداسپور۔

(۳) خان صاحب چودھری نیاز علی خاں جمال پور۔

(۴) چودھری رحمت علی صاحب ڈپٹی کلکٹر انہار۔

(۵) خان بہادر مولوی فتح الدین صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت۔

(۶) مولانا محمد اسد صاحب (لیو پولڈ۔ نومسلم)

(۷) مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی مدیر ترجمان القرآن

کام شروع کرنے کے لئے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی حیدرآباد سے تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ دو چار رفقائے کار بھی شامل ہوگئے۔ اسکیم کی جزئیات کی ترتیب آہستہ آہستہ عملی شکل اختیار کرنے لگیں۔ حضرت علامہؒ کا ارادہ تھا کہ ان کو مرض سے کچھ افاقہ ہوجاتے تو وہ بنفسِ نفیس دارالاسلام میں منتقل ہوجائینگے۔ اور اس کے بعد پوری اسکیم حیطۂ عمل میں آنی شروع ہوجائے گی۔ اِدھر یہ تصورات وابستگان دارالاسلام کے لئے فردوسِ دماغ بن رہے تھے اور اُدھر کارکنانِ قضاء وقدر ہنس رہے تھے کہ کُل کے علم سے بے خبر انسان کس طرح تمناؤں کے کھلونوں کو

دل بہلاتا رہتا ہے۔ ابھی اس اسکیم کا پورا نقشہ بھی مرتب نہ ہونے پایا تھا کہ حضرت علامہؒ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور دارالاسلام ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا۔

دارالاسلام کے لئے یہی حادثہ کچھ کم جانکاہ نہ تھا کہ اس کے بعد ایک دوسرا حوصلہ شکن واقعہ رونما ہو گیا۔ مولانائے مودودی صاحب حیدرآباد سے ایک اسکیم اپنے ذہن میں لائے تھے۔ جب دونوں سکیمیں عملی لحاظ سے ایک دوسرے کے مقابل آئیں تو معلوم ہوا کہ ان کی اسکیم دارالاسلام کی اسکیم سے کچھ مختلف تھی۔ اور چونکہ وہ دارالاسلام کے موجودہ قالب میں ڈھل نہیں سکتی تھی اس لئے مولانا صاحب دارالاسلام چھوڑ کر لاہور تشریف لے گئے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ خارجی متعلقات (از قسم عمارات۔ باغ۔ مزروعہ۔ اراضی) سب مکمل ہیں اور ٹرسٹ کی نگرانی ان پر موجود ہے لیکن اسکیم معطل ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر حضرت علامہ کے تیار فرمودہ خاکہ کے مطابق اب بلا مزید توقف بتدریج اسکیم کو عملی شکل میں لایا جائے انشاءاللہ العزیز۔

سکونتی مکانات میں کئی متاہل حضرات کی رہائش کی جگہ موجود ہے۔ اور یہ کوارٹرز نہایت عمدہ تیار ہو تے ہیں۔ دارالاقامہ میں کم و بیش پچیس طلبار کی رہائش کا سامان موجود ہے۔ دارالمطالعہ ایک وسیع ہال کی شکل میں ہے۔ لائبریری بھی ابتدائی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ کام شروع کرنے کے لئے ایک یا دو ایسے "مرد مسلمان" یہاں مستقل طور پر قیام پذیر ہوں جو قلب دماغ اور علم و عمل کے اعتبار سے صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔ ایک طرف مشرقی اور مغربی علوم میں ماہر ہوں اور دوسری طرف اُن کی عملی زندگی ایک مرد مجاہد کی زندگی ہو۔ وہ دارالاسلام میں بیٹھ جائیں۔ دارالاسلام اُن کی ضروریات کا کفیل ہوگا۔

اس کے بعد ایسے طلبار کو یہاں رہنے کے لئے منتخب کیا جائے جو یا تو انگریزی تعلیم میں بہرۂ وافر رکھتے ہوں (مثلاً گریجویٹ ہوں) اور یا دینی مدارس مثل دیوبند وغیرہ کے فارغ التحصیل ہوں۔ ان طلبار کو جانچ لیا جائے کہ وہ ذکاوت و ذہانت۔ سنجیدگی و متانت اور حسنِ اخلاق کے

اعتبار سے اس قابل ہیں کہ انہیں دارالاسلام میں رکھا جائے۔ عربی داں طلباء علوم مغرب کا سبق پڑھیں۔ انگریزی خواں طالب علم مشرقی علوم کی تحصیل کریں اور اس کے ساتھ یہ دونوں گروہ اس ایک یا ایک سے زیادہ معلم سے نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کے خالص دینِ فطرت کا درس لیں اور دور حاضرہ کے انقلابات سے روشناس ہوں۔ اندازہ ہے کہ اس میں کم و بیش دو تین برس کا عرصہ صرف ہوگا۔ اس دوران میں طلباء کے خورد و نوش کی کفالت بھی دارالاسلام کے ذمہ ہوگی

(۲) دینی علوم کے ساتھ ساتھ دارالاسلام میں دیال باغ آگرہ کے نمونہ پر ایک صنعتی ادارہ کھول دیا جائے جس میں مختلف دستکاریوں کی تعلیم کا انتظام ہو تاکہ جب یہ طالب علم دارالاسلام سے مبلغ بن کر نکلیں تو دنیا میں آزادی سے رزقِ حلال کما سکیں۔ ان کا مقصدِ زندگی تبلیغ ہوگا۔ ایسی تبلیغ نہیں جو آجکل کے پیشہ ور مبلغین کے ذریعے ننگ اسلام بن رہی ہے۔ بلکہ اس قسم کی تبلیغ جس کی درخشندہ مثالیں ہمیں عہدِ صحابہؓ نظر آتی ہیں۔ دارالاسلام سے نکل کر یہ طالب علم مختلف مقامات پر اسلامی مراکز قائم کریں۔ اور قوم میں صحیح اسلامی اجتماعیت اور مرکزیت کی روح پھونکیں۔ شروع شروع میں جامع مساجد اور بعد میں عام مساجد کے ائمہ بھی اسی زمرہ سے مقرر کئے جائیں۔ یہ طالب علم جہاں بھی رہیں اپنا تعلق مستقل طور پر مرکز دارالاسلام سے وابستہ رکھیں گے۔

(۳) موسمِ گرما میں کالجوں میں تعطیلات ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں طالب علم بالعموم پرسکون مقامات کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ دارالاسلام دامنِ کوہسار (سلسلۂ ہمالیہ) میں ایک بہت بڑی نہر کے کنارے واقع ہے۔ شور و شغب سے دور۔ پرفضا ماحول اور اس کے ساتھ ہی عہد حاضرہ کی سہولتوں مثلاً ریل۔ موٹر۔ بجلی۔ ڈاکخانہ سے بہرہ یاب۔ تجویز ہے کہ اس موسم میں خواہشمند طلباء کے لئے واجبی اخراجات پر دارالاسلام میں رہائش کا انتظام کیا جائے۔ بشرطیکہ وہ احکامِ شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس دوران میں یہ بھی انتظام کیا جائے کہ دارالاسلام میں مختلف اکابرِ ملت کے لکچروں کا سلسلہ شروع ہو۔ اور یوں دو تین ماہ کے عرصہ میں متعدد لکچر مختلف اسلامی موضوعات پر ہو جایا کریں۔ ان خطبات کے لئے ہندوستان اور بیرونِ ہند سے ممتاز

زعمائے امت کو دعوت دی جائے۔

(۴) جو طلبا مستقل طور پر دارالاسلام میں قیام پذیر ہوں انھیں تحریر و تقریر کی بھی مشق کرائی جائے۔ دورانِ طالب علمی میں ان سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھائے جائیں اور مختلف اسلامی تقاریب پر اجتماعات منعقد کر کے ان سے تقاریر کرائی جائیں۔

یہ ہے مختصراً دارالاسلام کے مقاصد کا خاکہ۔ اگر اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیابی ہو جائے تو پھر یہ چیز بھی پیش نظر ہے کہ اس میں پانچ سال کے بچوں کو داخل کیا جائے اور آخیر تک ان کی تعلیم و تربیت اسی اسلامی ماحول میں ہو۔ اس خاکہ کو ایک عملی نظام بنانے کے لئے ہم ہندوستان کے تمام دردمند مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ حسب ذیل طریقوں سے ہماری معاونت فرمائیں۔

(۱) مذکورہ صدر اسکیم میں جہاں جہاں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس کریں اس سے ہمیں مطلع فرمادیں۔

(۲) اگر آپ اس اسکیم کے اصول سے متفق ہوں تو پھر فرمائیے کہ آپ کس حد تک اس میں عملاً شریک ہو سکتے ہیں۔ کم سے کم ادارہ کی رکنیت یا معاونت قبول فرمائیں جس کا چندہ سالانہ صرف دو روپیہ اور پانچ روپیہ علی الترتیب ہوگا۔

(۳) جن صفات کے معلمین کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کی تلاش میں ہماری راہنمائی فرمائیے یعنی اگر آپ کی نگاہ میں ایسے حضرات موجود ہوں تو ہمیں ان سے مطلع فرمایا جائے اور انھیں اس اسکیم سے متعارف کرا دیا جائے۔ ہم چاہتے تو یہ ہیں کہ کوئی ایک ہستی ایسی مل جائے جو ان تمام صفات کی جامع ہو (یعنی بیک وقت مشرق و مغرب کے علوم پر دستگاہ رکھے۔ اور اس کی زندگی عملی لحاظ سے صحیح اسلامی زندگی ہو) لیکن اگر دونوں علوم ایک جگہ نہ مل سکیں تو پھر مجبوراً دو حضرات کا انتخاب کر لیا جائے۔

(۴) جو طالب علم دارالاسلام میں قیام پذیر ہونا چاہیں وہ اپنے ارادے سے ہمیں مطلع فرمادیں۔

(۵) ابتدائی اخراجات کے لئے عطیات اور مستقل خرچ کے لئے مستقل امداد فرمائیں۔ واضح رہے

کہ دارالاسلام چونکہ باقاعدہ رجسٹری شدہ ہے اس لئے اس کا حساب کتاب باقاعدہ رکھا جاتا
نیز ٹرسٹیوں کی فہرست سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ یہ وہ حضرات ہیں جن کی دیانت بفضلہ
کے شبہ سے بالاتر ہے۔

(۶) دارالاسلام کے صنعتی شعبہ میں آپ کیا اور کس قسم کی مدد کر سکتے ہیں؟ نیز آپ کے
اس کی بابت کیا عملی تجاویز ہیں۔

یقین مانئے کہ دارالاسلام کی اسکیم بچوں کا کھیل نہیں۔ بلکہ اس کے اندر وہ روح کا
ہے جو قوموں کی تاریخ بدل دیا کرتی ہے۔ چہ عجب کہ اللہ تعالیٰ اس اسکیم ہی کو وہ ذریعہ بنا۔
جس سے ہماری انفرادیت اجتماعیت میں بدل جائے۔ اور یوں ہماری نکبت و زبون حالی پھ
سرفرازی و سربلندی میں تبدیل ہو جائے۔ واللہ علیٰ کلِّ شیٍٔ قدیر۔

اس باب میں خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کیجئے:۔

خان صاحب چودھری نیاز علی صاحب
دارالاسلام۔ نزد پٹھانکوٹ
پنجاب

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم

اراکین حضرات

کی خدمت میں درخواست ہے کہ ادارہ کی جانب سے ارسال کردہ
گشتی چھٹی کا جواب بہت جلد مرحمت فرمائیں۔ باعث شکریہ ہوگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

۱۔ مقالات حالی حصہ اوّل | مولانا حالی مرحوم کے ۳۲ مضامین کا مجموعہ، جو مذہب، اخلاق، تعلیم ادب، فلسفہ، اور سیاسیات وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہے۔ کتاب اعلیٰ درجے کے کاغذ پر بہت نفیس چھپی ہے۔ حجم ۳۱۰ صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے۔ بلا جلد تین روپے آٹھ آنے۔

۲۔ سب رس | اردو نثر کی نایاب اور سب سے قدیم کتاب بہت تلاش و جستجو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ اس کے مصنف مولانا وجہی، سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ قصہ عجیب اور طرز بیان بھی عجیب ہے۔ حجم ۳۰۰ صفحات قیمت مجلد چار روپے۔

۳۔ فاؤسٹ | گوئٹے (جرمنی کے الہامی شاعر) کا ڈراما "فاؤسٹ" دنیائے ادب و تخیل کا وہ کارنامہ ہے جو ایک صدی سے تمام عالم میں مشہور ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ (پی۔ ایچ۔ ڈی) نے ترجمہ کیا ہے۔ قیمت فی جلد چار روپے مجلد۔ بلا جلد تین روپے آٹھ آنے۔

۴۔ محاسن کلام غالب | ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا معرکتہ الآرا مضمون ہے۔ اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

۵۔ اندرون ہند | خالدہ ادیب خانم کی جدید تصنیف (Inside India) کا ترجمہ۔ نہایت دل چسپ کتاب ہے۔ قیمت مجلد سوا تین روپے۔ بلا جلد تین روپے۔

۶۔ حقیقت جاپان | اس میں جاپان کی معاشرت، تمدن اور تاریخ و ادب وغیرہ کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ تیس سے زیادہ بلاک کی تصویریں ہیں۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے۔ بلا جلد تین روپے۔

۷۔ اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری | نہایت جامع اور مکمل ڈکشنری ہے اسمیں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ جلد نہایت پائیدار، کاغذ بہترین قیمت سولہ روپے۔

۸۔ اسٹوڈنٹس انگلش اردو ڈکشنری | یہ بڑی لغت کا اختصار ہے لیکن جامع ہے۔ حجم ۱۴۶۲ + ۱۹ صفحے قیمت پانچ روپے۔ طلبا اور اُستادوں کے لیے نہایت مفید ہے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ، جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ تمام اُمتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اِس کا

نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا، قرآن کریم کے حقائق و علوم کی اشاعت، سیاساتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچی رہنمائی ہے۔

جو لوگ!

مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہو چکے ہیں اُن کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اُس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

بلند پایہ مضامین!

کا اندازہ اِس سے لگایئے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور و فکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ۵ر

• نمونہ مفت طلب فرما کر خریداری کا فیصلہ کیجیے! منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی

لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم
طلوعِ اسلام
بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مطبوعات ادارہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ واردھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہنچتا بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجئے قیمت ۴ر محصولڈاک ۱ر

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(ازجناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱۰ر

سوراجی اسلام

(ازجناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لئے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۳ر

زبان کا مسئلہ

(ازجناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں قیمت ۱ر علاوہ محصول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکز ملت ← [لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ] → مرکز ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایہا الذین اٰمنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا — استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو — بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کے لئے پکاریں جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار — لا اسلام الا بالجماعۃ

(فرمان رسولؐ) — (قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب

محمد ظہیر الدین صدیقی بی ایس سی

جلد (۲) شمارہ (۵)

بدل اشتراک: سالانہ پانچ روپیہ، ششماہی تین روپے

رجب المرجب ۱۳۵۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

نیشنلسٹ مُسلم

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد
کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا
پرستد مومن و کافر تراشد

نگہبانِ حرم معمارِ دَیر است
یقینش مُردہ و چشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہِ او تواں دید
کہ نومید از ہمہ اسبابِ خیر است
(اقبالؒ)

تحریکِ مدحِ صحابہؓ و تبرّا کے متعلق ہم پھر ایک عرصہ سے خاموش تھے۔ اسلیئے کہ ہمارا خیال تھا کہ فریقین باہمی کشاکش سے تھک چکے ہیں اور اُسکے ساتھ ہی صلح کی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔ لہٰذا یہ قضیۂ نامرضیہ اب خودبخود ختم ہوجائیگا۔ لیکن واقعات نے ان توقعات کی تغلیط کردی۔ اور مناقشات کی آگ بڑھتی ہی چلی گئی۔ سب سے بڑی حیرت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کی اِن دو جماعتوں میں وجۂ اختلاف۔ جو آج اسقدر افتراق و مخالفت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ کوئی نئی نہیں ہے، بلکہ مدّت ہائے دراز کی ہے جسکے باوجود یہ دونوں فرقے برابر صلح و آشتی کے ساتھ رہتے چلے آتے تھے۔ ہمارے نزدیک کسی بزرگ کی تعریف و توصیف کوئی بُرا فعل نہیں لیکن مدحِ صحابہؓ علی الاعلان نہ خدا نے ضروری قرار دیا ہے نہ اُسکے رسولؐ نے۔ اسی طرح تبرّا ممکن ہے کہ شیعہ مذہب کا جزو ہو مگر اس کا اعلان جس سے سُنّیوں کی دِل آزاری ہو۔ کبھی جزوِ دین نہیں ہوسکتی۔ اور نہ اسپر شیعہ حضرات کا عملدرآمد رہا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اسوقت معاملہ نے جسقدر طول کھینچا ہے۔ اس کی بنا رباہمی منافرت اور ضد پر ہے۔ جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہیئے۔

اس موقع پر ہم علّامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری مدّظلہٗ کا ایک تاریخی مضمون شائع کررہے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوجائیگا کہ فریقین کے اِس اختلاف کو مٹانے کے لیئے آج سے بہت پہلے نادرشاہ شاہنشاہِ ایران نے کس خوبی کے ساتھ مصالحت کی صورت نکالی جس پر ایران میں آج تک عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور دونوں فریق ایک ساتھ امن و امان سے

رہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اِس تاریخی مثال سے لکھنؤ کے سُنّی اور شیعہ بھی باہمی اتحاد کی صُورت نکال سکیں ۔

بعض حضرات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ :-

رست از یک بند تا اُفتاد در بندِ دگر

ہندوستان میں یہ حالت ہمارے مُسلم نیشنلسٹ حضرات کی ہے (زمانہ کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ آج مُسلم اور نیشنلسٹ اکٹھا لکھنا پڑتا ہے، حالانکہ کہاں ہمہ آفاقی مُسلم اور کہاں تنگ نائے نیشنلزم!) ان حضرات نے گاندھی جی کو اپنی کشتی کا ناخدُا اور اپنی "نمازوں" کا امام بنایا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد گاندھی جی بے نقاب ہونے شروع ہو گئے۔ اور ان لوگوں نے بچشم خود دیکھ لیا کہ :-

خضر جس کو یہ سمجھتے تھے ہلاکو نکلا !

چنانچہ بڑے بڑے قومیّت پرست اخبارات یہانتک لکھنے لگے ہیں کہ :-

"ممکن ہے ہندو قوم جو اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے بُت کو مسجود و معبود بنا لینے کی عادی ہے۔ گاندھی جی کی الوہیّت و بزرگی کے آگے گردنیں خم کر دے، مگر مُسلمان جو فطرتاً جمہوریت پسند ہے کسی شخص واحد کی پرستش نہیں کر سکتا جو ہندو کلچر۔ ہندو معاشرت۔ ہندی زبان اور ہندی روایات کا پیکر لئے اپنے دِل میں میٹھا زہر اور اسکی ترویج و ترقی کے اسباب پر غور کرتا رہتا ہے۔" (مدینہ۔ ۱۷/۲۹ ۲)

واقعات نے یہ کچھ کہنے پر تو مجبور کر دیا۔ لیکن افسوس کہ اِن حضرات میں اتنی جرأت نہ پیدا ہوئی کہ قرآن کریم کی اِس حقیقتِ ثابتہ کا اعلان کر دیتے کہ فی الواقع کفّار کسی صُورت میں بھی مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں ہو سکتے۔ گاندھی جی کا بُت ٹوٹا تو انہوں نے کسی اور سومنات کی تلاش شروع کر دی۔ اور بالآخر دُنیا کو بتا دیا کہ ؎

ماند نازشیہ بی بے خسر یدار !
اگر خسرو نباشد کوہ کن است

چنانچہ اب اِن حضرات نے گاندہی جی سے مُنہ موڑکر مسٹر بوس کی "پرستش" شروع کر دی ہے، اور اُسے اپنی امیدوں کا قبلہ مقصود بنا لیا ہے۔ حالانکہ اگر اِن حضرات کی نگاہ قرآنِ کریم کی حقیقتِ بالغہ پر ہوتی تو اِس بات کے سمجھنے میں کوئی دُشواری پیش نہ آتی کہ گاندہی اور بوس کا باہمی ہزار اختلاف ہو۔ دائیں اور بائیں بازو میں کتنی ہی وسیع و عریض خلیج کیوں نہ حائل ہو۔ اسلام سے عداوت اور مسلمانوں سے دشمنی میں یہ سب ایک ہیں جو ایسا نہیں سمجھتا اپنے آپ کو دہوکا دیتا ہے۔ الکفر ملۃ واحدۃ۔

مسٹر بوس کو چونکہ اپنے متبعین کی ایک جماعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اِسلیئے وہ اپنے آپ کو اقلیتوں کے حامی ظاہر کرتے ہیں اور نہایت فخر سے لکھتے ہیں :۔

"ہمارے مسلک پر تنقید کرنے والے لوگ غالبًا اس چیز سے حسد کرتے ہیں کہ جب اُنکے دائیں بازو کے احباب اقلیتوں کو اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہے ہیں، "فارورڈ بلاک" شروع سے اِس مسئلہ میں بہت کامیاب ہو گیا ہے اور اسے بڑی حد تک اقلیتوں کی ہمدردیاں حاصل ہو چکی ہیں"۔ (فارورڈ بلاک ۹ ستمبر ۱۹)

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر بوس کا مسلک اور منتہیٰ کیا ہے! وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ میں نے جو لائحہ عمل اختیار کیا ہے، اس سے میری غرض یہ ہے کہ :۔

"ملک میں مارکس کے نظریہ کی حامل ایک جماعت پیدا کرنے کے لیئے زمین تیار کیجائے"۔

چنانچہ وہ اپنے اِسی مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ہماری تمام جد و جہد کا ماحصل یہ ہوگا کہ ملک میں ایک نئی زندگی اور نئی جد وجہد کا دَور پیدا کر دیا جائے اور

"یہ نیا دَور بلا شک و شبہ سوشلزم کا دَور ہوگا"۔ (فارورڈ بلاک ۹ ستمبر ۱۲)

قدامت پرست گاندھی کو آپ دیکھ چکے۔ اور جدّت پرست بوس آپ کے سامنے ہے۔
اب اسکے بعد ہم اپنے قومیت پرست مُسلم حضرات سے صرف اتنا دریافت کرتے ہیں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما!

ایک عرصہ کے انتظار کے بعد جناب پرویز کے مشہور رسالہ "اسلامی معاشرت" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا۔ جن حضرات کو اسکے لیئے زحمت کش انتظار ہونا پڑا۔ ہم ان سے بدل معذرت خواہ ہیں۔ جو فرمائشیں اِس دَوران میں جمع ہوچکی تھیں۔ اُن کی تعمیل کردی گئی ہے اگر کسی صاحب کو اپنے ارشاد کی تعمیل میں رسالہ نہ ملا ہو۔ بَراہِ کرم مطلع فرما دیں یہ رسالہ یوں تو ہر پڑھے لکھے مُسلمان کے لیئے مفید ہے لیکن اسکا پورا پورا فائدہ اِس صورت میں اُٹھایا جاسکتا ہے جب یہ ہمارے اسلامیہ مدارس میں دینیات کے نصاب کے طریق پہ رائج کردیا جائے۔ تاکہ ہمارے بچوں کے دِل و دماغ کی عمارت اِلٰہی بُنیادوں پر قائم ہو۔ اِسلامیہ ہائی اسکول۔ شملہ۔ کے ارباب حل وعقد مستحق ہتریک ہیں کہ اُنھوں نے اِس باب میں سبقت فرمائی ہے۔ اور اِسلامی معاشرت" کو اپنے دینیاتی نصاب میں داخل کرلیا ہے ہم دوسرے اِسلامی مدارس کے کارکنان کی خدمت میں درخواست کرینگے کہ وہ اِس طرف توجہ فرمائیں۔ واضح رہے کہ یہ تحریک کسی" کاروباری" جذبہ پر مبنی نہیں ہے۔ اسلیئے کہ اس پمفلٹ کے منافع میں نہ تو جنابِ مصنف کا کوئی حصّہ ہے اور نہ کسی اور شخص کا۔ بلکہ اسکا مالک طلوعِ اسلام کا تبلیغی شعبہ ہے۔

یوں تو کتابت کی ہر غلطی جانکاہ ہوتی ہے لیکن سابقہ اشاعت میں حضرت علاّمہ علیہ الرحمۃ کی دو رُباعیوں میں ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جنکے لیئے ہم بہت نادم ہیں براہِ کرم صفحہ پر مندرج رباعیوں کی یوں تصحیح فرمالیں۔

(۱) فرنگ آئینِ رزّاقی بداند ٭
بایں بخشد ازو وا می ستاند ٭
بہ شیطاں آں چناں روزی رساند
کہ یزداں اندر آں حیراں بماند

---

(۲) اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است
جبینِ خود منہ جز بر درِ او ٭
سریں را ہم بہ چوبش دہ کہ آخر
حقے دارد بجز پالاں گرِ او

کاپیاں پریس کو جا چکی تھیں کہ ہمیں بعض اخبارات سے معلوم ہوا کہ مولانا حسرت موہانی صاحب نے اِس امر کی پُرزور تردید فرمائی ہے کہ وہ لیگ میں "بایاں بازو" پیدا کرنے کا خیال کر رہے ہیں ہمیں اِس تردید سے بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق اور استقامت عطا فرمائے کہ ہمارا ہر قدم انتشار سے اتحاد کی طرف بڑھے۔
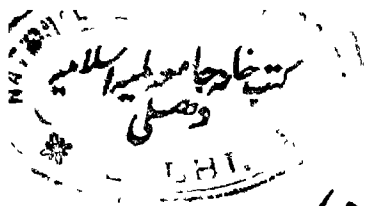
پاکستان

پاکستان ملی تحریک پر اظہار رائے کرتے ہوئے مسلمان عموماً اور ہندو خصوصاً جلد بازی اور نافہمی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ہندوؤں کو اس تحریک سے عناد اس وجہ سے ہے کہ یہ "مردِ مومن" کے فکر کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ وہ پاکستان تحریک کے اغراض و مقاصد پر غور و فکر کیے بغیر محض قومی تعصب اور سیاسی تنگ نظری کی بنا پر مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن بعض مسلمان بھی جن میں، کثرت متحدہ قومیت پر جان دینے والے علما اور سیاسی لیڈروں کی ہے۔ پاکستان کے تصور کو خطرناک اور دل آزار تصور کرتے ہیں اور اس بات سے خائف ہوتے ہیں کہ کہیں ان کے غیر مسلم پیشوا برہم ہو کر ان کی سرپرستی سے دست کش نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ اور بھی ہے جس کا خیال ہے کہ "پاکستان ایک محدود اور نامکمل تجویز ہے۔ جو مسلمانوں کی ہمہ گیر برادری کے منافی ہے۔ اور جغرافیائی لحاظ سے اس کی تقسیم ناممکن العمل ہے۔" یہ رائے ممکن ہے خلوص پر مبنی ہو۔ مگر دور اندیشی اور سیاسی بصیرت سے یکسر مبرا ہے۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ہندو ہر اس چیز سے بے زار اور سوگوار ہو گا جس میں مسلمان جماعت کی سلامتی اور منافع ہے اور خواہ اُسے مسلمان کی تنظیم اور درستگی سے کوئی نقصان نہ پہونچے مگر وہ حسد سے اس قدر مجبور ہے کہ جب تک وہ مسلمان کو برباد اور رسوا نہ دیکھ لے اس کی فطرت کو تسکین نہیں ہوتی۔ چنانچہ "پاکستان" کے نام پر اگر وہ غیظ و غضب میں آتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ مسلمان نے عدل و انصاف کا خون بہا دیا ہے یا ہندو کی حق تلفی کی ہے یا عالم گیر غارت گری سے دامن آلودہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو پاکستان کے ذکر کو ہندوؤں کے لیے "پیغام جنگ" تصور کرتے ہیں غلطی میں مبتلا ہیں۔ ہندو کے نزدیک تو ہمارا ہر قول و فعل "پیغام جنگ" ہے وہ اس وقت تک کبھی میٹھی نیند نہیں سو سکتا جب تک کہ ہم بالکل نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ مگر ہمارے عزائم ہرگز غاصبانہ نہیں ہیں۔ ہم کو اس سے تعرض نہیں کہ ہندو جنت نشان ہندوستان میں کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے گھر کی رونق اور امن کے تحفظ کے لیے ہر ممکن اور مفید تدبیر پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ لیکن اُسے دل و نظر میں اتنی

وسعت اور رواداری پیدا کرنی چاہیئے کہ اگر ہم بھی ان طریقوں کو اختیار کریں جن کا نام لے کر وہ بہ ظاہر "آزادی"
اور "خود مختاری" کی پری سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے تو اسے چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہم مشربی کے تقاضے سے
ہمارے ارادوں کو "مرحبا" کہنا چاہیے اور کامیابی کی "اشیرباد" دینی چاہیئے۔ کس قدر رنج کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو
غلامی اور ناداری کی مذمت میں قراردادوں کا ایک سلسلۂ لاانتہا ہی شروع کئے ہوئے ہوں جب ہمارے روبرو ہوں
تو اُسی زحمت کو رحمت کہیں اور اُسی زہر کو تریاق۔

اگر ہم سے بدسلوکی اور ناانصافی نہ بھی ہوتی اور بایں ہمہ ہم پاکستان کی جُداگانہ ہستی کا مطالبہ کرتے
تو بھی ہندو کو ملال نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ بدقسمتی سے ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور دونوں امن و سنتی کے
متلاشی ہیں۔ لیکن اب جبکہ اس نے ہم پر روز روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف غاصب اور خائن ہی
ہے بلکہ بدترین قسم کا دشمن اور ستم گر بھی ہے تو وہ کس مُنہ سے ہم سے توقع رکھتا ہے کہ ہم بے زبان جانور کی طرح
اس کا جور و تعدی سہتے رہیں اور اپنی زیست و حیات کا سرمایہ اُس کے ہاتھوں میں دے کر اس کے رحم و کرم کی
راہ گداگروں کی طرح تکتے پھریں۔ یہ چیز طبیعت پر اور بھی ناگوار گزرتی ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ رویّہ ان لوگوں
نے اختیار کیا ہے جو ہزارہا سال سے غلامی کی روزی کھا کھا کر عالی حوصلگی، بلند ہمتی، رواداری، بردباری، سیر چشمی
اور جہاں بانی کے محاسن سے قطعیؔ عاری اور مفلس ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں سے انصاف اور دل داری کی توقع رکھنا
جنت الحمقاء میں بسنے کے مترادف ہے۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید　　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لیکن اس سے بھی زیادہ شرمناک غلطی اور حماقت ان لوگوں کی ہے جو اُلٹا ہمیں ہدفِ ناوکِ بیداد بنا کر ہم
ہی سے خدمت اور ایثار کی توقع رکھتے ہیں ہم کس طرح اس چیز پر راضی ہو سکتے ہیں جو ہندوؤں کے لیے دولت اور
برکت کی نیک فال ہو اور ہمارے لیے سیاسی قتل نامہ کی دستاویز۔

ہم نے برسوں کی متواتر کوششوں کے باوجود دیکھ لیا ہے کہ ہندو اور مسلم متحد نہیں ہو سکتے۔ سب سے پہلے
اکبر نے مذہبی نسلی اور معاشرتی اتحاد کا علم بلند کیا اس واقعہ کو تین سو سال گزر چکے ہیں۔ لیکن جو حشر اس سعی لاحاصل
کا ہوا وہ مزید تصریح کا محتاج نہیں ہے۔ ہر گام پر قرآن کا اعلان ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ اسلام اور غیر اسلامی

نظریۂ حیات کا آپس میں بعد المشرقین ہے۔ نور اور تاریکی کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ یہ فطرت کا اصول ہے اور ہمارے مشاہدہ میں ہزار بار آ چکا ہے۔ چنانچہ ان سب پرانے تلخ واقعات کو دریا برد کر کے ہم امن و سکون کی نئی راہ تجویز کرتے ہیں جس سے ہندو اور مسلم کو غیر فطرتی اتحاد سے توڑ کر علیحدہ علیحدہ حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ روز روز کا فساد اور واویلا ہمیشہ کے لیے گہری نیند سو جائے۔ اور دونوں گروہ حسب استعداد اور حسب منشا اپنی اپنی راہ چلیں۔ تم دیکھتے نہیں کہ ایک باپ کی نسل مدت تک ایک گھر میں سما نہیں سکتی اور ضروریاتِ زندگی کی بنا پر انہیں مختلف گھرانوں اور ملکوں میں تقسیم ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جہاں سوال "صحبت ناجنس" کا ہو وہاں وقت گزارنا زہرہ گدازی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ پس ہمارے نزدیک ہندو مسلم منافرت اور جنگ و جدل کا ایک ہی سہل ترین اور آبرو مندانہ حل ہے اور وہ "پاکستان ملی تحریک" کی صورت میں ملک کے سامنے آ چکا ہے۔

پاکستان ملی تحریک پر مخالفین کئی قسم کے اعتراض کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے اعتراض تو ہر لحاظ سے غیر منصفانہ ہیں اس لیے ان کے جواب میں وقت ضائع کرنے کی ہمیں فرصت نہیں ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ "پاکستان کی جداگانہ اور خود مختارانہ ہستی ناممکنات سے ہے اور ایک ناممکن چیز کے حصول کے لیے قوت اور دولت صرف کرنا اور ہندو کو برافروختہ کرنا قرینِ عقل نہیں ہے۔" ہم اُن سے التماس کرتے ہیں کہ وہ تاریخ کے اوراق کھول کر اپنے آبا و اجداد کے زرین کارنامے پڑھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ موجودہ حالت سے کہیں زیادہ یاس انگیز اور خطرناک وقتوں میں اُنہوں نے جانوں پر کھیل کر اپنی آبرو کو داغ غلامی سے بچایا ہے اور وہ کامران اور کامگار رہے ہیں۔ طارق اور محمد بن قاسم ہماری ہی طرح انسان تھے جنہوں نے عین عالمِ شباب میں وطن اور وطن کی آسائشوں سے منہ موڑ کر چند ہزار لشکریوں کے ساتھ دور افتادہ اور وسیع ممالک پر تاخت کی اور اُنہیں زیر نگین کیا۔ انہی ممالک پاکستان اور ہندوستان پر ہمارے بزرگوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک اسلام کا جھنڈا لہرایا ہے اور وہ ہندوؤں کی کثرت اور برافروختگی سے مبہوت نہیں ہوئے تھے۔ کیا آج ہمیں اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ ہم اپنی زیست و حیات کی بقا اور مذہب و ملت کی احیا کے لیے اول ہندو کی خوشنودی اور منظوری حاصل کریں اور اگر وہ ہماری درخواست مسترد کر دے تو ہم مارے خوف کے اپنی اہم تحریکوں سے دست بردار ہو جائیں اور ہندو سے معافی اور امان مانگ لیں اور اگر ہم میں اتنی زبوں ہمتی اور پست حوصلگی نہیں تو کیا

وجہ ہے کہ ہم خدا اور اُس کے رسولؐ کو راضی کرنے میں اجتناب کریں اور ہندو کو برافروختہ کرنے سے حذر کریں کہ دنیا میں رسوائی کا طوق نصیب ہو اور آخرت میں خدا کا عتاب۔

ہمارے نزدیک اس تحریک کو ناممکن العمل کہنا عزم و ہمت کی کوتاہی کی دلیل ہے۔ جو قوم زندہ دل رکھتی ہے وہ موت سے کھیلنا اپنی آبرو کا نشان سمجھتی ہے اور اس کے لئے کسی چیز کے حصول کا خیال بفضل ایزدی "ناممکن" نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کو اکابر سلف کے واقعات خرق العادت نظر آتے ہیں اور ان کی پیروی میں نئے توحید کو نے کردشت و جبل میں پھرنا وبال جان معلوم ہوتا ہے تو کم از کم اُنہیں عصر حاضر ہی کے جواں مردوں کے کارناموں سے سبق لینا چاہیے جنہوں نے گو بحر و بر تاراج نہیں کیے اور مشرق و مغرب سے خراج وصول نہیں کیا لیکن جوش عمل اور قوت مدافعت سے اپنی جبیں کو غلامی کے داغ سے بچایا ہے۔

مسلمانوں میں ایک اور طبقہ ہے جو بزعم خویش پاکستان کی تحریک کو تنگ نظری پر محمول کرتا ہے ان کا خیال ہے کہ اسلام کو ایک خاص چار دیواری میں قید نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اُسے کل ہندوستان پر حاوی و طاری ہونا چاہیئے۔ ہمارے خیال میں ہر مسلمان کی یہی آرزو ہونی چاہیئے کہ اسلام کل ہندوستان کیا بلکہ سارے جہان پر پھیل جانا چاہیے جب عزائم اتنے بلند ہوں کہ سارے جہان پر اسلام کے تسلط کی آرزو دلوں میں موج زن ہو تو پاکستان کی نظریہ کو ناممکن العمل کیسے کہا جا سکتا ہے۔

یہ نیل گوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں　　　ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

لیکن اسباب و علل کی دنیا میں اتنے بڑے مقصد کو یک قلم مسخر کر لینا اس بات سے زیادہ مشکل ہے کہ پاکستان کو فی الحال اسلامی ریاست میں منتقل کیا جائے۔ سردست ہندوستان کے وسیع ملک میں ہماری قوتیں منتشر اور پراگندہ ہو رہی ہیں۔ اور ان کا آپس میں ربط اور ضبط تقریباً مفقود ہو چکا ہے سو ان دنوں حالات بہتر یہی ہے کہ پاکستان کی سرزمین کو مسلمانوں کی تنظیم اور استحکام کے لیے منتخب کیا جائے۔ کیوں کہ تھوڑے حصے کا انتظام زیادہ آسان ہے۔ ترکوں نے جب اپنے قوم کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہا تو اُنہوں نے قدیم عثمانیہ سلطنت کے بہت سے علاقوں سے ہاتھ اُٹھا لیا اور ایشیائے کوچک کے محدود علاقے میں جہاں اکثریت خالص ترکی قوم کی تھی محصور ہو کر اپنے سیاسی اور معاشرتی امراض کی اصلاح کی اور آج وہی ترک ہیں جن کے ساتھ دنیا

کی عظیم الشان سلطنتیں رابطۂ دوستی پیدا کرنے کو باعثِ فخر سمجھتی ہیں چنانچہ ہندوستان میں جس اکثریت کا فائدہ اٹھا کر ہندو ہم کو اپنے تسلط میں رکھنا چاہتا ہے پاکستان میں اسی اکثریت کی بنا پر ہم ہندو کی مداخلت سے مامون رہنا چاہتے ہیں۔

تحریکِ پاکستان اپنی قسم کی پہلی تحریک ہے جس کا واحد مقصد ہندو مسلم مناقشات اور اصل بنائے فساد کا استیصال ہے۔ اس کے منظرِ عام پر آنے کے بعد اور تحریکات معرضِ ظہور میں آئی ہیں جن کا وجود سراسر پاکستان تحریک کے تخیل کا مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ ہندوستان کو تاریخی، نسلی، ثقافتی اور جغرافیائی حیثیت سے تقسیم کرنے کی متعدد تحریکیں ملک و ملت کے سامنے ہیں۔ ہم نواب ممدوٹ اور سر سکندر حیات کی تجویزوں پر اجمال کے ساتھ تبصرہ کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہو کہ پاکستان تحریک تمام تحریکوں سے خوبی اور کمال میں گوئے سبقت لے گئی ہے اور بعض سیاست دانوں کا یہ اعتراض کہ پاکستان ایک "فلسفی اور شاعر" کے دماغ کی اختراع ہے اس لیے تخیلات کی بے روح سکیم ہے محض سطحی اور فردایانہ ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی سکیم اور نواب آف ممدوٹ کی اسکیم اصولی اعتبار سے قریب قریب یکساں ہیں۔ نواب صاحب کی اسکیم ہندوستان کو مذہبی بنا پر پانچ آزاد جمہوری ریاستوں میں تقسیم کرتی ہے لیکن اس میں نقص یہ ہے کہ ان پانچ ریاستوں کی تشکیل کرتے وقت بعض نہایت اہم اقتصادی اور جغرافیائی امور کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مثلاً شمال مغربی ریاست (پاکستان) میں سے کانگڑہ کی وادی خارج کر دی گئی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس علاقہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے لیکن یہ علاقہ جغرافیائی لحاظ سے طاس سندھ کا جزو لاینفک ہے۔ نیز کانگڑہ کے پہاڑوں میں جست، سیسہ اور لوہا کافی مقدار میں پایا جاتا ہے حال ہی میں کانگڑہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر تقریباً چودہ میل کے رقبہ میں بہترین قسم کے خام لوہے کی کان دریافت ہوئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر ارزاں ہائیڈرو الیکٹرک کے ذریعہ سے یہاں کان کنی کا کام شروع کیا گیا تو پنجاب قطعی طور پر بیرونی لوہے کی درآمد سے بے نیاز ہو جائے گا بلکہ نہایت آسانی سے لوہے کی کافی مقدار بیرونِ پنجاب بھی مہیا کی جا سکے گی۔ ان بیش قیمت معدنیات کے علاوہ یہ علاقہ "منڈی ہائیڈرو الیکٹرک پاور" کا سرچشمہ بھی ہے جو پنجاب کے تقریباً تین چوتھائی حصہ کو روشنی اور گرمی بخشتا ہے۔ اندازہ کیا

جاتا ہے کہ منڈی ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن آئندہ ایک دو سال میں ایک لاکھ بیس ہزار کلو واٹ
(KILOWATTS) بجلی پیدا کرے گا۔ جو تمام پنجاب کی ہر قسم کی ضروریات کے مکتفی ہوگی۔ ہائیڈ
الیکٹرک اور دیگر معدنیات کے بیش بہا دفینہ کو ہم پاکستان سے الگ کرکے اپنی قسمت کی عنان اغیار کے
میں سونپ نہیں سکتے۔ البتہ ہندوستان کی باقی ریاستوں کی تقسیم کے متعلق نواب صاحب کی اسکیم
ہمیں چنداں اختلاف نہیں ہے۔

سر سکندر حیات خاں کی اسکیم جغرافیائی لحاظ سے شاید صحیح ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ ثقافتی اقتصادی
اور تاریخی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ ان کی اسکیم اقتصادی بنا پر مستحکم ہے
جب وہ کرنسی (Currency) درآمد کے محصولات۔ ریلوے اور ڈاک و تار کے محکمہ جات مرکزی
کے ہاتھ میں دیتے ہیں تو اقتصادی استحکام کہاں رہتا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب تقسیم دولت کے جملہ
اور عمرانی اور اقتصادی ترقی کے تمام ذرایع صوبائی خودمختاری کے باہر ہونگے تو وہ صوبہ جات کس طرح
اقتصادی طور پر آزاد اور خوش حال رہ سکتے ہیں۔ زرعی صوبہ جات کی مانگ Demand بڑھانے
گاہک پیدا کرنے کے ضروری ذرایع حتیٰ کہ اجناس کے نرخوں کا تعین بھی بیرونی اثرات کے تابع ہوگا اور
حکومت کی اس حکمت عملی کا منت پذیر ہوگا جو وہ صنعتی صوبوں کے زیر اثر درآمد برآمد کے محصولات
(Currency.) اور شرح تبادلہ کے تعین کے سلسلے میں روا رکھے گی۔ پاکستان کی اسی فی صد
زراعت پیشہ ہے جو مرکز کے صنعتی مفاد پر قربان کر دی جائے گی اور اس ۸۰ فی صدی آبادی کی غربت اور
زد ریلوے اور محکمہ آب پاشی پر پڑے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتصادی ترقی کے یہ جدید ذرائع ابدی طور
اور نقصان سے دو چار رہیں گے۔ اور پاکستان ہمیشہ کے لیے صنعتی صوبوں کا نزار اور ناتواں غلام بنا رہے
آٹھ نو سال سے اجناس کی مسلسل ارزانی اور کسانوں کی تباہ حالی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ زراعتی اور
غریب کسانوں اور سرمایہ داروں کا مفاد مسلمانوں اور ہندوؤں کا مفاد ایک نہیں ہوسکتا۔ سر سکندر کی
ان تمام حقایق سے جن پر زرعی صوبوں کی اقتصادی زندگی کا انحصار ہے۔ صریحاً چشم پوشی کرتی
انکی اسکیم نہ صرف قابلِ قبول ہے بلکہ ناقابلِ عمل بھی ہے۔

پاکستان ملی تحریک اور دوسری سب تحریکوں میں اصولی اور بنیادی فرق جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہ ہے کہ پاکستان تحریک خالصتاً اسلامی مفاد اور اسلامی تہذیب کے تحفظ کی سکیم ہے اور وہ ہندوستان سے کلیتہً ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے علیحدگی کی مدعی ہے اور "ہندوستانی قومیت" کا عنصر بننے سے صریحاً انکار کرتی ہے۔ اس کا مطالبہ قریب قریب ان اصولوں پر ہے جن پر کاربند ہو کر لنکا اور برما ہندوستان خاص سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ تاریخی، جغرافیائی، نسلی اور ثقافتی لحاظ سے پاکستان ہندوستان سے الگ ملک ثابت کیا جا چکا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ اُسے علیحدہ حق زیست سے محروم کیا جائے۔ اور خواہ مخواہ اسے غلام آباد ہندوستان کی قسمت سے وابستہ کیا جائے۔ ہر تحریک جو مسلمانوں کی بہتری اور بہبودی کے لیے ہمارے سامنے ہو ہماری ہمدردی اس کے ساتھ ہے۔ لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کارکنان قضا و قدر، ہندوستان کے متعلق جو چاہیں فیصلہ کریں پاکستان کو اپنی ہنگامہ خیز تجویزوں اور معرکۃ الآرا بحثوں اور مجوزہ قطع و برید سے قطعاً مستثنیٰ رکھیں۔ کیوں کہ پاکستان اور ملک ہے اور ہندوستان اور۔

پاکستان تحریک سے ایک شکایت ان مسلمانوں کو بھی ہے جو ہندوستان خاص میں بستے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس تحریک سے فقط پاکستان کے مسلمانوں کا فائدہ مطلوب ہے۔ باقی مسلمان جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں ان کا اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ ان کا پاکستان کے مسلمانوں سے جو واسطہ اب ہے وہ بھی ساقط ہو جائیگا ان کو قدرتاً یہ خدشہ ہے کہ وہ اپنی برادری کے ایک بڑے حصہ سے منقطع ہو جائیں گے۔ انکی خدمت میں التماس ہے کہ "پاکستان ملی تحریک" کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں تفریق ڈالے۔ یا ہندو مسلم میں نفرت اور حقارت کے جذبات پھیلائے۔ بلکہ اس کا مقصد وحید محض یہ ہے کہ مسلمانوں کو پھر نئے سرے سے اس طاقت، عظمت، یک جہتی اور اخوت کی دعوت دی جائے جو صدیوں تک اس آسمان نیلی رواق کے نیچے ہمارا طرّۂ امتیاز رہا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی علیحدگی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ہرگز موجب نقصان نہیں ہے۔ اعداد اور شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو شامل کر کے مسلمانوں کا ہندوستان کی کل آبادی میں ½ ۲۳ فی صدی حصہ ہے۔ پاکستان کی علیحدگی سے مسلمانوں کا تناسب ½ ۱۰ فی صدی رہ جاتا ہے

یعنی اگر پہلی صورت میں ہم اقلیت میں رہتے ہیں تو دوسری حالت میں بھی اقلیت میں رہتے ہیں اور یہ ظاہر کہ موجودہ نظام جمہوریت میں اقلیت خواہ کتنی ہی مضبوط اور باثر کیوں نہ ہو، اکثریت کے سامنے بے دست و پا ہے اور اکثریت اقلیت کو "ڈرا دھمکا کر" فریب و دجل سے قابو میں رکھ سکتی ہے۔ اگر ہم پاکستان کا تحفظ نہ چاہیں اور بدستور ہندوستان خاص کا عنصر بنے رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سارے کے سارے آٹھ کروڑ مسلمان اغیار کے دستِ نگر ہو جاتے ہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ ہمیشہ کے لیے قہاری اور جباری کے سومناتھ کی دہلیز پر سر رگڑتے رہیں گے۔ لیکن اگر پاکستان کے تین کروڑ مسلمانوں کا تحفظ ہو جائے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم نے آدھی مہم سر کر لی ہے۔ اگر دو بھائی ایک ساتھ قید میں ہوں اور دونوں رہائی حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے ہوں اور اُن دونوں میں ایک کے آزاد ہونے کے امکانات زیادہ ہوں تو دوسرے کو بھی اُسی ایک کی رہائی پر زور لگانا چاہیئے کیوں کہ وہ آزاد ہو کر بیرونی اور خارجی اثر و رسوخ سے دوسرے کو بھی نجات دلا سکتا ہے۔ لیکن اگر دونوں طوق و سلاسل میں اسیر رہیں اور اس بات پر قانع رہیں کہ دونوں میں جُدائی نہ ہو تو وہ آزادی کے جنت الماویٰ کی خوشبو کو قیامت تک نہیں سونگھ سکتے۔

عالمگیر آزادی کی جدوجہد میں جب کہ ہماری برادری کے افراد نے یکے بعد دیگرے ترکی، عرب، ایران اور افغانستان کو ادبار، ذلّت اور نکبت کی زندگی سے نجات دلائی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اُن کی پیروی میں پاکستان کو آزاد نہ کرائیں۔ پاکستان آزاد ہوگا تو ہندوستان کی خزاں بھی بہار سے بدل جائے گی۔ فطرت کا اصول یہی ہے کہ درجہ بدرجہ ترقی کی جائے اور قدم بقدم منزل کی جانب بڑھا جائے۔

ہمیں ہندوستان کے مسلمانوں سے کوئی پرخاش نہیں ہے ان کا نقصان ہمارا نقصان اور ان کا فائدہ ہمارا فائدہ ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کون سا طریق کار اختیار کیا جائے، جو نسبتاً آسان ہو۔ پاکستان کے باشندوں میں قدرتاً قوتِ عمل، جوش اور استقلال ہندوستانیوں کی مقابلے پر زیادہ ہے۔ اس لیے ہر لحاظ سے وہ غلامی کے حصار سے باہر نکل کر اپنی باقی جماعت کے لیے زیادہ مفید اور کار آمد ہو سکتے ہیں۔

ہمیں آل انڈیا ہندو یا آل انڈیا مسلم فیڈریشن سے کوئی بحث نہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آل انڈیا جو بات

بھی ہوگی وہ ہندوؤں کے نظام کے متوازی ہوگی اور جو چیز اُنکے نظام کے متوازی ہوگی وہ آزادی سے صریحًا دور ہوگی اور زوال اور رجعت کے خمیر سے اس کی بنیاد پاک نہ ہوگی۔ لہٰذا اگر ہم ہندوستان کی چار دیواری کے اندر رہ کر ہندو کے دوش بہ دوش اپنی جُداگانہ ہستی کا مطالبہ خواہ مذہب وملت کا نام لے کر بھی کریں گے تو ہم کسی صورت میں بھی آزادی اور خوش حالی کے قریب نہیں ہونگے۔ بلکہ ہمارا حشر وہی ہوگا جو ہندو کا ہوگا اور ہمیں وہی چیز میسر آئے گی جس کی طلب وتقاضا ہندو، دولت برطانیہ سے کرے گا۔ ایسی صورت میں جب کہ ہمارا نصبُ العین۔ ہمارا منتہائے خیال اور ہمارا مقصد حیات ہندو سے سراسر مختلف ہو ہمارے لیے انسب اور واجب یہی ہے کہ ہم ہندو کے قائم کردہ معیار سے انحراف کریں اور اپنی سیاسی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کی بنیاد خالص اسلامی اصُولوں پر پاکستان کے اندر رکھیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال رح

"اسلام کی ثقافتی قوت کی بقا اسی میں ہے کہ ملک کے ایک
حصہ میں اس کی مرکزیت قائم ہو جائے۔"

پاکستان میں آزاد اسلامی ریاست کے قیام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُسے ہندوؤں یا کسی غیر اسلامی جماعت کے خلاف ناجائز طور پر استعمال کیا جائے۔ اسلام عدل وانصاف کا مذہب ہے۔ اور تاریخ کے اوراق اس کے پیروؤں کی خطاپوشی، رواداری اور جود وعطا کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان میں ہر غیر مسلم فرقہ یا جماعت کے حقوق کی پاسبانی خالص اسلامی قائم کردہ آئین کی رو سے کی جائے گی جو دُنیا کی "متمدن" حکومتوں کے نظام کے برعکس صحیح عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔ جب ہم غیر مسلموں کو فیاضی اور فراخدلی سے رعایت دینے پر تیار ہیں تو کیا وہ مسلمان جو ہمارے خیر اندیش بلکہ ہمارے جسم کا حصہ ہوں گے مگر پاکستان کے باہر ہوں گے۔ ہماری ہمدردی اور شفقت سے محروم رہ سکتے ہیں!

حمید پال۔ گوجرانوالا

نوٹ:۔ خریداران رسالہ کی خدمت میں التماس ہے کہ خط وکتابت کے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ "مینیجر"

قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب

رسول اللہؐ نے فرمائی تھی یا حضرت عثمانؓ نے

قرآن پاک کی عظمت وجلالت پر میری تصنیف "پیام امین" پر ریویو کرتے ہوئے آپ نے ماہ جون کے مجلّہ "طلوع اسلام" میں میری اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ "حضرت عثمانؓ نے ..... سورتوں کو ترتیب دے کر فتنہ تحریف کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔" اور اپنی یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ "سورتوں کو حضرت عثمان رضؓ نے ترتیب نہیں دیا بلکہ ترتیب آیات و سور بحکم خداوندی خود نبی اکرمؐ نے فرمائی تھی"۔

آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال سے علی حالہٖ قائم ہے اور یہ مختلف تدریجی منازل طے کرنے کے بعد عمل میں آئی تھی۔ جس کا تذکرہ ناظرین "طلوع اسلام" کے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

پہلی منزل

قرآن پاک کی ترتیب کی پہلی منزل یہ تھی۔ کہ جب کوئی آیت سرور کائنات (صلعم) پر نازل ہوتی تو وہ اس کا مقام ترتیب[1] مقرر کر دیتے۔ یعنے کسی سورہ میں جس جگہ بلحاظ مفہوم اس آیت کا درج کرنا مناسب ہوتا اس کی تعیین فرما کر کاتب وحی سے اس کو لکھوا دیتے۔ بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آیات کی ترتیب میں وحی الٰہی کو بھی دخل تھا۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ سورتوں میں آیات جس ترتیب سے درج ہیں۔ وہ رسول اللہ صلعم کے ارشاد و ہدایت کے مطابق واقع ہوئی ہے۔ صحابہ نے اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل روا نہیں رکھا یہی ترتیب اب تک قائم ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا ابہام یا اختلاف نہیں ہے۔

[1] ترمذی۔ ابواب تفسیر القرآن۔ اتقان نوع ۱۸۔

دوسری منزل

ابتدائے اسلام میں کتابت کا رواج نہ تھا۔ اس لیے کتابت کا کام حافظہ سے لیا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی حفاظت واشاعت بھی اُس زمانے میں حافظہ ہی کی رہین منت تھی اور تحریر وکتابت کے عدم رواج کی تلافی حفظ قرآن سے کی جاتی تھی۔ لیکن وفات نبویؐ کے بعد مسیلمہ کذاب کی برپا کی ہوئی جنگ یمامہ میں جب حفاظ قرآن بہ تعداد کثیر شہید ہوئے اور کلام الٰہی کے بہت بڑے حصے کے مٹ جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا تو حضرت عمرؓ کی تحریک سے حضرت ابوبکرؓ نے جو اس وقت مسند خلافت پر متمکن تھے۔ جمع قرآن کا کام شروع کیا اور یہ خدمت حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت (کاتب وحی) کے سپرد کی۔

اس سے پہلے قرآن کی سورتیں ہڈیوں۔ پتھروں، اور کاغذ کے ٹکڑوں۔ کھجور کی چھال وغیرہ پر مرقوم اور اوراق پریشاں کی مانند بکھری پڑی تھیں۔ حضرت ابوبکر کے حکم سے ان سب کو فراہم اور نقل کیا گیا جب تک حضرت ابوبکرؓ سریر آرائے خلافت رہے۔ یہ بے ترتیب مجموعہ ان کی تحویل میں رہا۔ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت عمر کے بعد حضرت حفصہ کے قبضے میں آیا۔ [1]

تیسری منزل

قرآن پاک کے یہ غیر مرتب اجزا حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوسرے سال یعنی ۲۵ھ تک حضرت حفصہ کے پاس رہے۔ اختلافِ قرارت تو پہلے سے موجود تھا۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اس اختلاف نے بڑھتے بڑھتے اختلافِ معنی کی صورت اختیار کرلی۔ اور فتنۂ تحریف کا آغاز ہوا تو حضرت عثمان نے اس کے مہلک نتائج کو بھانپ کر ایک قرارت اور ایک مصحف پر جمع کرنے کا تہیّہ کرلیا اور قریش اور صحابہ کو قرآن پاک کی کتابت پر مامور کیا۔

کتابت قرآن میں رسول اللہ (صلعم) کی قرأت ملحوظ رکھی گئی۔ اور جہاں کچھ شبہ ہوا۔ وہاں آیت لغتِ قریش کے مطابق درج کی گئی۔ حضرت عثمان نے ان اجزا کو محض یک جگہ نقل کروانے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ

---

[1] بخاری باب جمع القرآن۔

سورتوں کو بھی ترتیب دیا آپ نے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کو رکھا اس کے بعد طوال سورتوں کو۔ پھر مئین۔ پھر مثانی اور پھر مفصل کو۔ حضرت ابن عباس نے حضرت عثمان سے پوچھا۔ کہ آپ نے سورہ انفال کو جو مثانی سے ہے۔ اور سورۂ براۃ (توبہ) کو جو مئین سے ہے۔ کیوں ایک دوسرے سے ملا دیا اور ان کے درمیان بسم اللہ کیوں نہیں لکھی۔[1] اس کا جو جواب حضرت عثمان نے دیا اس سے ہمیں سروکار نہیں۔ مگر اس سے یہ ثابت ہے کہ سورتوں کو حضرت عثمان ہی نے ترتیب دیا تھا۔

نتیجہ

سطور بالا سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں :۔

(۱) رسول اللہ کی زندگی میں صرف آیات کو سورتوں میں ترتیب دیا گیا تھا۔ جو منتشر اوراق کی صورت میں رہیں۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ نے ان کو یکجا کر کے نقل کروا دیا۔ لیکن ان کی کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی۔

(۳) سورتوں کی ترتیب اور مسلسل اور مرتب صورت میں ان کی نقل حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں میں عمل میں آئی۔ یعنے قرآن پاک جس شکل اور ترتیب میں آج ہمارے سامنے ہے۔ یہ حضرت عثمان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس بارے میں مفصل بحث "پیامِ امین" میں موجود ہے۔ اور سطور بالا کی روشنی میں "پیامِ امین" کا یہ مشاہدہ واقعتہً اصلیت پر مبنی ہے کہ :۔

> حضرت عثمان رض جامع قرآن نہ تھے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ آپ نے قرأت کا ایک طریقہ رائج کر کے اور سورتوں کو ترتیب دے کر فتنۂ تحریف کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔"

امرتسر

۱۱ جمادی الاول ۱۳۵۸ھ

محمد عبداللہ منہاس مصنف "پیامِ امین"

---

[1] ترمذی۔ ابواب تفسیر القرآن۔

استدراک

ہم نے جون کے رسالہ میں بھی لکھا تھا اور اب بھی لکھتے ہیں کہ مصنف پیامِ امین کا یہ خیال تاریخ اسلام کی رُو سے قطعاً بے بنیاد ہے کہ سورتوں کی ترتیب حضرت عثمان رضؓ نے دی اُنہوں نے جس روایت سے یہ سمجھا ہے اس کا تعلق صرف سورۂ انفال اور سورۂ برائت کے اتصال سے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ عہدِ عثمانی تک قرآن کی سورتیں غیر مرتب اور منتشر تھیں اور لوگ بلا کسی ترتیب کے قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور حفاظ نے بھی اسے یونہی بلا کسی ترتیبِ سور حفظ کر رکھا تھا۔

امام جلال الدین سیوطی اپنی مفید کتاب اتقان میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب کے متعلق علما محققین کا قول یہی ہے کہ وہ توقیفی ہیں یعنے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرتب فرمایا تھا۔

قاضی ابوبکر کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے جس طرح آیات کی ترتیب آن حضرتؐ کو جبریلؑ نے بتائی تھی اسی طرح سورتوں کی بھی جس قدر قرآن اتر چکا تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف میں اس کو دہراتے تھے اور جبریل اس کو مرتب کرا دیتے تھے۔

کرمانی اور طیبی کا بھی یہی قول ہے کہ قرآن اگرچہ حسب اقتضائے ضرورت ٹکڑے ٹکڑے نازل ہوا لیکن اس کی اصلی ترتیب جو لوحِ محفوظ میں تھی اس کے مطابق آیتیں بھی اور سورتیں بھی آنحضرتؐ ہی نے مرتب فرما دیں

بیہقی لکھتے ہیں کہ قرآن کی تمام آیتیں اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں مرتب ہو گئی تھیں۔ صرف انفال اور برارت میں ترتیب نہ تھی (کیونکہ ان سورتوں کے نزول کا سلسلہ جاری تھا[1]) اور اس کی دلیل میں وہی حضرت ابن عباس والی روایت لکھی ہے جس سے پیامِ امین کے مصنف نے یہ سمجھا ہے کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب حضرت عثمانؓ نے دی

حضرت عثمان کا کام صرف یہ تھا کہ اُنھوں نے قراۃ کے اختلافات کو مٹا کر تمام اُمت کو ایک قرأت پر مجتمع

---

[1] سورۂ برائت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ اور آنحضرتؐ نے اس کے متعلق ارشاد نہ فرمایا کہ یہ جُداگانہ سورت ہے۔ اس وجہ سے حضرت عثمان نے صحابۂ کرام کے مشورے سے سورۂ انفال سے اس کو الگ تو کر دیا مگر بیچ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھوایا۔ کیوں کہ دونوں سورتوں کا مضمون ہم آہنگ ہے بس یہ ہے ساری کائنات جس پر پیامِ امین کے مصنف حضرت عثمان کو سورتوں کا مرتب قرار دیتے ہیں۔

کو بعینہٖ اُنہوں نے نقل کرا کے پانچ نسخے ولایات میں بھیجے اور ایک نسخہ اپنے پاس رکھا جس کا نام امام تھا اور بس۔ جو مصحف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر کے عہد میں لکھا گیا تھا اسی کر دیا۔

علامہ محاسبی لکھتے ہیں کہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ عثمان رض جامع قرآن ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اُنہوں نے تو صرف یہ کیا کہ اُمت کو ایک قرأت پر مجتمع کر دیا جو مہاجرین وانصار کی ایک معتبر جماعت کے اتفاق کے ساتھ بصحتِ روایت ودرایت طے کر کے لکھی گئی کیوں کہ اس وقت اہلِ شام وعراق نے قرأت میں اختلافات پیدا کر دئے تھے۔

علامہ ابن التین لکھتے ہیں کہ ابو بکر وعثمان رض کے جمع قرآن میں یہ فرق تھا کہ ابو بکر رض نے تو اس خوف سے جمع کیا تھا کہ کہیں وہ ضائع نہ ہو جائے کیوں کہ اس وقت وہ منتشر اور متفرق صحیفوں میں لوگوں کے پاس تھا۔ اُنہوں نے ان سب کو بے کر اسی ترتیبِ آیات وسور کے ساتھ جو آنحضرت سے سنی تھی ایک شیرازہ میں کر دیا۔ اور حضرت عثمان نے جب لوگوں کو وجوہِ قرأت میں اختلاف کرتے دیکھا تو اسی مصحف کو اصلی قریش کے لہجہ میں اس صحیح قرأت کے موافق جو عرضۂ اخیرہ کے مطابق تھی اور جس کی صحت میں مطلق شبہ نہ تھا نقل کرا دیا تاکہ اختلافات رفع ہو جائیں۔ اُنہوں نے اس کی ترتیب میں نہ تقدیم کی نہ تاخیر اور نہ کسی تاویل کو دخل دیا۔

(ماخوذ از تاریخ القرآن مؤلفہ علامہ اسلم جے راج پوری)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب بھی خود نبیٔ اکرم نے فرمائی تھی نہ کہ حضرت عثمان نے۔ طلوعِ اسلام

(اسد ملتانی)

سوال

کون ہوگا جسے توحید کا اقرار نہیں ! — کون ہم میں سے محمدؐ کا فداکار نہیں

کون رکھتا نہیں قرآں کی صداقت پہ یقیں — کون اسلام کی شوکت کا طلبگار نہیں

پھر سبب کیا ہے کہ باایں ہمہ ایمان و عمل ! — ہم جہاں میں کسی عزت کے سزاوار نہیں

جسنے اسلاف کو دنیا میں سرافراز کیا — کیوں میسّر ہمیں وہ دولتِ بیدار نہیں

جواب

نیک کاموں میں ہیں مصروف بہت لوگ مگر — ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہیں !

صاحبِ سیف بھی ہیں اہلِ قلم بھی ہیں بہت — لیکن افسوس کہ آپس میں مددگار نہیں

باغِ ملّت میں ہیں موجود ہر رنگ کے پھول — لیکن آراستہ پیراستہ گلزار نہیں !

یوں تو چلنے کو چلے جاتے ہیں چلنے والے — اک طرف سب کی نگاہیں دمِ رفتار نہیں

سرفروشوں کی کمی اب بھی نہیں ملّت میں — اُن سے جو کام لے ایسا کوئی سردار نہیں

قوم ترشی ہوئی اینٹوں کا اک انبار تو ہے — لیکن اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں !

زیب و زینت کے بھی اسباب مہیّا ہیں بہت — اُس عمارت کیلیے جوابھی تیّار نہیں !

پُوری تسبیح کے دانے ہیں فراہم لیکن — جیمیں اُن سب کو پرو دیں وہی اک تار نہیں !

بیشمار انجمنیں ہیں مگر اُن کا حاصل — کچھ بجز تفرقہ و فتنۂ پیکار نہیں !

اہلسنت ہیں مگر اہل جماعت ہیں کہاں — کان سُنتے ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں !

ہم نے جس چیز کو تنظیم سمجھ رکھا ہے ! — وہ بجز کوششِ نقالیٔ اغیار نہیں !

ہے اسعدؔ ہم میں کمی کوئی تو بس اتنی ہے ،

اک جماعت نہیں ، مرکز نہیں ، سردار نہیں

ادارۂ طلوعِ اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ طلب فرمائیے

اور

ملاحظہ کیجئے کہ ان میں سیاستِ حاضرہ کے اہم مسائل کا حل

کتاب و سنت کی روشنی میں

کس

حُسن و خُوبی سے پیش کیا گیا ہے

ادارہ کی جملہ مطبوعات کا تمام منافع طلوعِ اسلام کے شعبۂ تبلیغ کیطرف منتقل کردیاجاتاہے

پیغمبرِ محکوم؟

جناب محمد شریف صاحب چشتی ایم اے (علیگ)

معراجِ "مسلمانی" افرنگ کی محکومی!
نخچیری و دلگیری مجبوری و مظلومی
"الہام" یہ کہتا ہے کافر ہے مسلماں بھی گر اُس نے کلیسا کی دہلیز نہیں چومی!
"تا حشر رہے قائم فرعونی و نمرودی
یورپ کے خداؤں کی مسند شاہی قیومی"

صورتگرِ محشر بھی، غارتگرِ ملّت بھی!! محکوم "پیمبر" کے افکار کی "معصومی"
اس شوخ "نبوت" کے "الہام کا کیا کہنا!
اے وائے مسلماں کی شمشیر سے محرومی!

نادر شاہ اور اتحادِ سُنّی و شیعہ

از علاّمہ حافظ محمد اسلم صاحب جے راج پوری

ہرچند کہ نادر شاہ اپنی سفاکیوں کی بدولت چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور وغیرہ کی فہرست میں مندرج ہے۔ لیکن باوجود ان خونریزیوں کے اس کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور چاہتا تھا کہ اسلامی فرقے باہم متحد ہو جائیں۔

ایران میں شاہان صفویہ نے اپنے اغراض کے لیے خلفائے ثلٰثہ اور صحابۂ کرام کا سب و شتم رائج کر دیا تھا۔ نادر کو یہ دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا کہ اس قبیح فعل کی وجہ سے ایرانی تمام عالم اسلامی کی دشمنی مول لے رہے ہیں۔ اوران میں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں مثلاً ہندوستانیوں۔ افغانیوں اور عثمانیوں میں عداوت کی خلیج زیادہ وسیع ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے ہر وقت مصادمت کا خطرہ ہے۔

چنانچہ دشمنوں کو مغلوب اور ممالک کو مفتوح کرنے کے بعد سنہ ۱۱۴۶ھ میں صحرائے مغان میں جہاں امرائے ایران کا عظیم الشان اجتماع اس لیے ہوا تھا کہ اس کے سر پر ایران کی شہنشاہیت کا تاج رکھا جائے اس نے کہا کہ:۔

"شاہ طہماسپ و شاہ عباس در مہد و سریر موجود اند۔ ایشاں را یا ہر کس را کہ برازندۂ افسر سروری دانند بریاست و سلطنت بردارند۔ ما آنچہ حق کوشش بود دریں چند سال بجا آوردیم و ولایات ایشاں را با اُسرائے ایشاں از دستِ افغان و روس و رومی خلاص کردیم۔ (تاریخ جہاں کشائی نادری ص ۱۹۶)"

سب لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ اب ایران کا ایک بچہ بھی سوائے تمہارے کسی کی بادشاہی پر رضامند نہیں ہے لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا اس انکار و اصرار میں تقریباً ایک مہینے کا عرصہ گزر گیا اور جب لوگوں نے اس کا دامن نہ چھوڑنا چاہا تو اس نے کہا۔

"از زمان رحلتِ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چہار خلیفہ بعد از یکدگر متکفل امر خلافت شدہ اند
کہ ہند و روم و ترکستان ہمگی بخلافت ایشاں قائل اند در ایران ہم سابقاً ہمیں مذہب رائج و متداول
بود۔ شاہ اسمٰعیل صفوی در مبادی حال بنابر صلاح دولت خود ایں مذہب را متروک و مذہب تشیع را
مسلوک داشتہ بعلاوہ آں سب و رفض را کہ فعل بیہودہ و مایۂ مفاسد است در السنہ و افواہ عوام واوباش
دائر و جاری کردہ شرر شرارت بچقماق زد و برہم زنی انگیخت و خاک ایران را بخون فتنہ و فساد آمیخت
و مادام کہ ایں فعل مذموم انتشار داشتہ باشد ایں مفسدہ از میان اہل اسلام رفع نہ خواہد شد۔ ہرگاہ
اہالی ایران بسلطنت ما راغب و آسائش خود را طالب باشند باید کہ ایں ملت را کہ مخالف مذہب
اسلاف کرام ماست تارک و بمذہب اہل سنت و جماعت سالک شوند۔ لیکن چوں حضرت امام جعفر
صادق ذریہ رسول اکرم و ممدوح امم مستند و طریقۂ اہل ایران بمذہب آنحضرت آشنا ست
او را سر مذہب خود ساختہ در فروعات مقلد طریقہ و اجتہاد آنحضرت باشند"۔ (تاریخ جہاں کشائے
نادری صفحہ ۱۹۷)

اہل ایران نے اس کی بات قبول کرلی۔ اور محضر لکھ کر سب نے اس پر مہر لگائی۔ اس وقت نادر نے ایران
کا تخت قبول کیا اور کہا کہ چونکہ بادشاہ روم خلیفۂ اسلام ہے اس لیے میں یہ تمام سرگذشت لکھ کر
اس کے دربار میں بھیجتا ہوں تاکہ باہم مصالحت اور دوستی قایم ہو جائے اور اختلافات مٹ جائیں
نیز میں اس سے پانچ باتوں کی درخواست کروں گا۔

(۱) چونکہ اہل ایران اپنے سابقہ عقائد سے جو موجب عداوت تھے تائب ہو گئے اس لیے خلیفہ و علماء و
قضاۃ عثمانی سے درخواست ہے کہ مذہب جعفری کو ایک پانچواں مذہب شمار کر کے اسکی صحت تسلیم کریں

(۲) کعبہ میں جہاں چار مصلّے قائم ہیں وہاں ایک مصلّے جعفری مذہب کا بھی قائم کر دیا جائے تاکہ ایران
کے لوگ اس مصلے پر اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کر سکیں۔

(۳) ایرانی قافلہ حجاج کسی ایرانی ہی میر حاج کی قیادت میں ہر سال مکہ جایا کرے اور عثمانی امراء اس کے
ساتھ بھی وہی مراعات برتیں جو دوسرے ممالک مثلاً مصر یا شام کے قافلہ حجاج کے ساتھ مرعی رکھتے ہیں

(۴) دونوں دولتوں ایران و روم میں سے ہر ایک دولت کے پاس دوسرے کے جو اسیران جنگ ہوں وہ آزاد رکھے جائیں غلام نہ بنائے جائیں۔

(۵) دونوں دولتوں کی طرف سے قنصل ایک دوسرے کے پایۂ تخت میں رہا کریں تاکہ باہمی معاملات آسانی کے ساتھ طے ہوتے رہیں۔

نادر نے تخت نشین ہونے کے بعد بار بار سفیر عثمانی دربار میں بھیجے۔ مگر وہاں سے اس کے حسب منشا جواب نہ ملا۔ ۱۱۵۶ھ میں اس نے تیسری بار بغداد پر یورش کی تو وہاں کے والی احمد پاشا کے پاس برابر پیغام بھیجتا رہا کہ اس کے مطالبات تسلیم کیے جائیں۔ اس درمیان میں اس نے کرکوک وغیرہ کے متعدد قلعے فتح کر لیے۔ لیکن بغداد کو نہ لے سکا۔ آخر اس کے محاصرہ پر ایک کثیر فوج چھوڑ کر خود نجف اشرف کی زیارت کے لیے گیا۔ اور وہاں ایک عرصہ تک معہ لشکر و درگاہ و خیمہ و خرگاہ کے قیام رکھا۔

چونکہ صحرائے مغان کے عہد کی پوری تعمیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی اور ہندوستان، افغانستان، ترکستان اور ایران کے مختلف العناصر مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر سے باز نہیں آتے تھے۔ اس لیے اس نے تمام قلمرو میں فرمان بھیجا کہ مفتیان، علماء، امراء، اور رؤسا ہر ملک اور ہر طبقے کے دربار میں حاضر ہوں جب چہار سمت سے یہ لوگ نجف میں آگئے تو اس نے ان سب سے پھر صحرائے مغان کے عہد کی تجدید چاہی اور ہر فرقہ کے علماء سے کہا کہ تم آپس کے تفرقے مٹا ڈالو۔ میں کسی طرح یہ جائز نہیں رکھ سکتا کہ میری سلطنت کے مسلمان باہم ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ اس نے احمد پاشا والی بغداد کے پاس لکھا کہ کسی ایسے ممتاز اور معتبر عالم کو بھیجے جو ہمارے ان علماء کو ایک مرکز پر لا کر متحد کر سکے اور ان کے اختلافات کو مٹانے میں بطور حکم عادل کے شاہد رہے۔

احمد پاشا نے علامہ عبداللہ سویدی کو جو اس زمانے میں بغداد کے سب سے نامور عالم تھے اس کام کے لیے منتخب کیا اور نادر شاہ کے پاس بھیجا۔

• علامہ موصوف نے وہ تمام باتیں جو اس مرحلہ میں پیش آئیں یا جو بحثیں ان کو کرنی پڑیں خود قلمبند کی تھیں مصر کے ایک مطبع نے اس کو الحجج القاطعہ فی اتفاق الفرق الاسلامیہ کر

--

نام سے شائع کیا ہے ۔ ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں ۔ اسلم

۲۱ شوال ۱۱۵۶ھ یک شنبہ کے دن مغرب سے قبل میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ احمد پاشا والی بغداد کا ایک آدمی میرے بلانے کو آیا ۔ میں مغرب کی نماز پڑھکر والی موصوف کے دربار میں گیا ۔ وہاں ان کا ندیم احمد آغا ملا ۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پاشا نے آپ کو کیوں طلب کیا ہے ؟ میں نے کہا کہ نہیں ۔ بولا کہ پاشا آپ کو نادر شاہ کے حسب طلب اس کے دربار میں بھیجنا چاہتا ہے ۔ جہاں ہر طرف سے علماء عجم آکر جمع ہوئے ہیں ۔ آپ کو ان کے ساتھ مذہب تشیع کے متعلق بحث کرنی ہوگی ۔ اگر وہ غالب آگئے تو پھر پانچویں مذہب جعفری کی صحت کو تسلیم کر لینا پڑے گا ۔

میں نے جو یہ بات سنی تو میرا بدن کانپ اٹھا اور کہا کہ احمد آغا ! تم کو خوب معلوم ہے کہ نادر سخت جابر اور بڑا سفاک ہے ۔ اس کے دربار میں علماء عجم کے ساتھ جو لسکے ہم مذہب ہیں میں کس طرح بحث کر سکوں گا ۔ اور کیسے ان کے عقائد کے ابطال پر دلائل قائم کرنے کی جرأت کروں گا کیونکہ وہ نہ ہماری کسی حدیث کو مانتے ہیں نہ قرآن کی تاویل کو ۔ پھر جب اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ ہمارے اور ان کے ایک نہیں ہیں تو بحث کس بنیاد پر ہوگی ؟ مثلاً فرض کرو کہ میں مسح علی الخفین (موزوں پر مسح) کے جواز پر یہ دلیل پیش کروں کہ اس کو ۷۰ صحابہ نے روایت کیا ہے جن میں سے حضرت علی رضؓ بھی ہیں وہ کہیں گے کہ عدم جواز کی روایتیں ہمارے یہاں ۸۰ صحابیوں سے مروی ہیں جن میں سے ابوبکر بھی ہیں ۔ علیٰ ہذا ایک آیت کی تاویل بیان کر کے میں کسی روایت کی سند دوں گا تو وہ اس کے خلاف تاویل بیان کر کے اس کی سند کسی دوسری روایت سے دینگے لہٰذا جس طرح ممکن ہو احمد پاشا سے کہو کہ مجھے اس کام کے لیے نہ بھیجیں بلکہ حنفی یا شافعی مفتیوں میں سے کسی کو روانہ کریں ۔ آغا نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس میں آپ مطلق لب کشائی نہ کریں ۔ کیونکہ پاشا نے آپ کو بھیجنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے ۔ یہ سن کر میں دم بخود ہو گیا اس کے بعد خود احمد پاشا آگیا ۔ اس نے سارا حال سنا کر مجھے شاہ کے پاس جانے کا حکم دیا اور کہا مجھے اللہ سے امید ہے کہ تمہاری حجت کو قوی کرے گا اور تم کو غلبہ عطا فرمائے گا ۔ میں نے کہا لیکن نادر شاہ کی حالت تو آپ اچھی طرح سن چکے ہیں ۔ پاشا نے کہا کہ ہاں ۔ میں تم کو اس بارے میں آزاد چھوڑتا ہوں ۔ موقع دیکھنا تو مناظرہ کرنا ورنہ باز رہنا لیکن گریز کلیتہً نہ ہونی چاہیئے بلکہ مناسب طریقہ سے ان کا ابطال کرنا ۔ ایسا نہ ہو کہ مغلوب ہو کر ان کے مذہب کی صحت

تسلیم کرلو۔ پھر کہا کہ کل دوشنبہ ہے چہارشنبہ کی صبح کو تم کو شاہ کے پاس موجود ہو جانا چاہیئے۔ اس لیے کل ہی صبح روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد اس نے میرے لیے ایک خلعت کا حکم دیا اور سواری و خدّام وغیرہ کا بندوبست کردیا۔

دوسرے دن سویرے میں ان عجمیوں کے ساتھ جو بادشاہ کے یہاں سے آئے تھے روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر اسی خیال میں غرق رہا۔ دلائل سوچتا تھا اور اس کے جواب۔ پھر جواب الجواب۔ یہاں تک کہ ہجوم افکار سے میرا سر چکرانے لگا اور شام کو جو مجھے پیشاب آیا تو سرخ خون کی طرح۔ اب ہم حلّہ ابن مزید میں پہنچے۔ یہ آبادی اس وقت ایرانیوں کے قبضے میں آچکی ہے۔ یہاں چند اہل سنت والجماعت سے ملاقات ہوئی جن کی زبانی معلوم ہوا کہ شاہ نے ایران کے ۰۷ مفتی جمع کئے ہیں جو سب کے سب شیعہ ہیں اور مذہب جعفری کی صحت پر دلائل پیش کرینگے۔ یہ بات سن کر مجھے اور پریشانی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں تو مختار ہوں بحث نہ کروں گا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرا دل ترک بحث پر مطلقاً راضی نہیں ہوتا۔ اب میں سوچنے لگا کہ صاف صاف کہوں گا کہ اگر بحث منظور ہے تو کسی ایسے ثالث کے سامنے ہو جو نہ سُنّی ہو نہ شیعہ ہو اور میں مناظرہ کروں گا خواہ اس میں میرے قتل ہی تک نوبت کیوں نہ پہنچے

وہاں سے چلکر ہم شہر ذی الکفل میں آئے اور آبادی سے باہر ہی ٹھہر کر کچھ دیر آرام لیا۔ رات کے پچھلے پہر روانہ ہو گئے اور ببرُ دندان میں پہنچکر فجر کی نماز پڑھی۔ فارغ ہوتے ہی نادر شاہ کا ایک قاصد دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ جلد چلیے آپ کا انتظار ہے۔ اس مقام سے شاہ کا مخیم دو فرسخ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا شاہ کا یہی دستور ہے کہ جب کوئی آتا ہے تو اس کے استقبال کے لیے قاصد دوڑاتا ہے یا صرف اس موقع پر ایسا کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کبھی نہیں۔ بلکہ لوگ آتے بھی ہیں تو عرصے تک ان کو باریابی نصیب نہیں ہوتی۔ راستہ سے بجز آپ کے آج تک شاہ نے کسی کو نہیں بلایا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس عجلت سے بلانے کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ مجھ کو مذہب جعفری قبول کرنے پر مجبور کرے۔ پہلے ممکن ہے کہ دنیاوی لالچ دلائے۔ اگر میں نے اس کو قبول نہ کیا تو پھر سختی سے کام لیگا بہت کچھ استغفار توبہ اور لاحول وغیرہ پڑھنے کے بعد آخر میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ حق کا دامن نہیں چھوڑونگا

دین اسلام پہلی بار اس وقت رُک گیا تھا جب رسول اکرم کی وفات کے بعد ردّت کے معاملہ میں صحابہ نے ابوبکر کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اللہ نے انہیں کی بدولت اس کو چلایا۔ پھر دوسری بار اس وقت رُکا جب خلیفہ مامون نے علماء کو خلق قرآن کے اقرار پر مجبور کیا اس وقت احمد بن حنبل جیسا امام کھڑا ہو گیا جس نے اس کو آگے بڑھایا۔

آج اگر میں بھی ان ہی مثالوں کی پیروی کروں تو کیا عجب ہے کہ حق قائم رہ جائے۔ ورنہ میرے ساتھ لاکھوں مسلمان گمراہ ہو جائیں گے۔

آخر میں موت کے لیے ہر طرح پر تیار ہو کر کلمۂ توحید و شہادت پڑھتا ہوا روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد دو اونچے اونچے جھنڈے نظر آنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہی شاہی معسکر ہے۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ بڑے بڑے سات ستونوں پر شاہی خیمہ کھڑا ہے۔ راستہ پر کشک خانہ ہے جس میں پندرہ پندرہ خیمے بالمقابل کھڑے کیے گئے ہیں۔ شاہی خیمہ کے متصل رواق (شامیانہ) ہے۔ دائیں سمت میں چار ہزار سپاہی حفاظت کے لیے رہتے ہیں۔ اور بائیں سمت میں خالی خرگاہیں ہیں جن میں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔

جب کشک خانہ کے قریب آیا تو وہاں ایک درباری میرے استقبال کے لیے نکلا۔ اس نے مجھ سے بغداد کے امراء، رؤسا اور احمد پاشا اور اس کے متعلقین کے حالات نام بنام پوچھنے شروع کئے۔ میں اس کی واقفیت سے حیران ہوا۔ اس نے میرے تعجب کو دیکھ کر کہا کہ شاید آپ مجھے نہیں پہچانتے میرا نام عبدالکریم بیگ ہے میں مدتوں بغداد میں احمد پاشا کے پاس رہا ہوں۔ آج کل دولت عثمانیہ کی طرف سے شاہ کے پاس سفارت لے کر آیا ہوں اسی اثنا میں نو اشخاص ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے عبدالکریم ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ان لوگوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ عبدالکریم نے ان سب سے مجھ کو ملایا اور یکے بعد دیگرے ان کا تعارف کرانا شروع کیا کہ یہ حسن خاں معیار الممالک ہیں۔ یہ مصطفیٰ۔ یہ نظر علی خاں۔ یہ مرزا ذکی اور یہ مرزا کافی۔

معیار الممالک جو کرجی الاصل اور شاہ حسین کے موالی میں سے ہے نادر شاہ کا وزیر ہے۔ سرسری ملاقات کے بعد یہ لوگ مجھے شاہ کے دربار میں لے چلے۔ شامیانہ کے دروازہ پر پہنچکر پردہ اٹھایا گیا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جب ہم چلیں تو آپ بھی چلیں اور جب ہم ٹھہر جائیں تو آپ بھی ٹھہر جائیں۔ شامیانہ سے گزر گئے تو ایک طرف کشادہ جگہ دیکھی وہاں حرم کے خیمے تھے۔ سامنے ایک شاندار خیمے میں نادر کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو بلند آواز سے کہا، خوش آمدید عبداللہ آفندی۔ پھر قریب آنے کا حکم دیا۔ خوانین میرے دائیں طرف تھے اور عبدالکریم بائیں طرف۔ ہم سب دس قدم چل کر رک گئے۔ پھر شاہ نے کہا اور آگے آؤ۔ الغرض اسی طرح ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلتے اور رکتے اس کے پاس پہنچ گئے۔ جب صرف پانچ ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تو ٹھہر گئے۔

شاہ کا قد بلند ہے۔ چہرہ سے بڑھاپا ٹپکتا ہے۔ آگے کے چند دانت بھی گر گئے ہیں۔ عمر تقریباً اسی سال کی معلوم ہوتی ہے۔ داڑھی حنا اور وسمہ سے رنگی ہوئی ہے۔ دونوں ابرو کمان کی طرح کشیدہ ہیں اور آنکھوں سے زردی نمایاں ہے ایک سفید چوگوشہ کلاہ عجمی سر پر ہے جس پر عمامہ ہے جو موتی، یاقوت الماس اور ہر قسم کے جواہر سے مزین ہے گلے میں موتی کے ہار ہیں اور قبا کے دونوں مونڈھوں پر جواہرات ٹکے ہوئے ہیں۔ الغرض وہ اپنی شکل ولباس کے باعث پر تمکنت و جلال معلوم ہوتا ہے۔ جب میں نے قریب سے اس کو دیکھا تو وہ تمام رعب جو اس کا میرے دل پر بیٹھا ہوا تھا جاتا رہا۔ اس نے ترکی زبان میں میرے ساتھ گفتگو شروع کی پہلے احمد خاں (پاشا) کی خیریت دریافت فرمائی۔ پھر کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری سلطنت میں ترکستان وافغانستان بھی ہیں وہاں کے لوگ ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں اور ایرانی ان کو کافر سمجھتے ہیں حالانکہ سب ایک ہی امت کے ہیں اور ایک ہی دین کے پیرو۔ اسلیئے میں نہیں چاہتا کہ میری سلطنت میں ایسے مسلمان رہیں جو ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ میں نے آپ کو اسی غرض سے طلب کیا ہے کہ میری طرف سے وکیل بن کر ان کے باہمی مکفرات کو رفع کر دیجیئے۔ اور ہر فرقہ کو پابند کر دیجئے کہ وہ ان امور سے باز آجائے جن سے کفر عائد ہوتا ہے تاکہ کوئی ان کو کافر نہ بنا سکے جو کچھ آپ دیکھیں اور سنیں اس کو مجھ سے بھی آکر کہیئے اور بغداد پہنچنے پر احمد پاشا کو بھی سنائیے

اس کے بعد ہم کو وہاں سے واپسی کی اجازت ملی۔ اور میری میزبانی کے لیے اعتماد الدولہ نامزد کیے گئے۔ میں وہاں سے نہایت خوش ہو کر نکلا کیونکہ میرا جو خطرہ تھا اس کے برخلاف شاہ نے سارے مذہبی اختیارات میرے ہاتھ میں دیدیئے۔ اب ہم اعتماد الدولہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نظر علی خاں عبدالکریم بیگ اور ابوذر بیگ جو تینوں میری خدمت کے لیے مامور تھے۔ ساتھ ساتھ چلے۔ اعتماد الدولہ خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اس کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا لیکن بدستور بیٹھا رہا میرے دل میں اس سے سخت انفعال اور غصہ پیدا ہوا کہ اس شخص نے اپنی رعونت سے علم اور اہل علم کی اہانت کی اور میں سوچنے لگا کہ جب کہ نادر شاہ نے جملہ مکفرات کے اٹھا دینے کا وکیل مطلق مجھے بنا دیا ہے۔ میں اس سے اس کی شکایت ضرور کروں گا۔ اور اس کفر کو جو اسلامی شان کے بالکل خلاف ہے سب سے پہلے مٹاؤں گا۔ مگر جونہی کہ میں بیٹھ چکا اعتماد الدولہ کھڑا ہوا اور اس نے ادب سے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور میری طرف جھکتا ہوا مرحبا کہہ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ایرانیوں کا تعظیمی دستور یہی ہے۔ لہذا اب اس کی طرف سے کوئی شکایت مجھے نہیں رہی۔

اعتماد الدولہ دراز قامت، سفید رو، اور کشادہ چشم ہے۔ ڈاڑھی پر حنا اور وسمہ کا خضاب کرتا ہے۔ عاقل نرم خو اور خلیق ہے۔

جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حکم آیا کہ میں ملّا باشی (درباری علامہ ملّا علی اکبر) سے ملوں۔ میں سوار ہوا میزبانوں کی جماعت رفاقت میں تھی۔ راستہ میں ایک شخص افغانی لباس میں ملا۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ بولا کہ ملّا حمزہ افغانستان کا مفتی۔ میں نے کہا کہ شاہ نے مجھ کو وکیل مطلق بنایا ہے کہ ایرانیوں سے ہر قسم کے مکفرات اٹھا دوں۔ تم چوں کہ سنّی ہو اس لیے میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ اگر وہ کوئی فعل اس قسم کا کرتے ہوں جو منجر بہ کفر ہو اور مجھ سے اس کو چھپائیں تو مجھے مطلع کر دینا کیونکہ میں ان کے حالات، عقائد اور عبادات سے اس قدر واقف نہیں ہوں جس قدر کہ تم لوگ ہو۔

مُلّا حمزہ نے کہا کہ آپ شاہ کی باتوں سے دھوکے میں نہ آجائیں درحقیقت اس نے آپ کو ملّا باشی کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ مناظرہ کرے۔ ایران کے تمام علماء اس کا ساتھ دیں گے۔ لہٰذا آپ ہوشیار رہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے بحث کا زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ صرف ڈر یہ ہے کہ وہ ناانصافی نہ کریں یا جو کچھ مجلس مناظرہ میں میں کہوں اس کے خلاف شاہ سے جا کر بیان کریں۔ اس نے کہا کہ اس سے آپ خاطر جمع رہیں۔ اس مجلس میں شاہ کے مخبر ہیں۔ پھر ان مخبروں پر مخبر ہیں۔ ان کے علاوہ خاص جاسوس ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ بھی خلاف واقعہ شاہ کے سامنے کوئی بیان کر سکے۔

اب ہم ملّا باشی کے خیمہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ منتظر تھا۔ استقبال کے لیے نکلا۔ گندم گوں اور پستہ قد آدمی ہے۔ مجھ کو لے جا کر صدر پر بٹھایا۔ اور خود سامنے شاگردوں کی طرح ادب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجمع کثیر تھا۔ ہر ملک کے علما جمع تھے۔ پہلے اس نے مجھ سے رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد افغانی مفتی کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے ہادی خواجہ (قاضی بخارا) کو دیکھا؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ ——— ملّا باشی نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ اس نے اپنا لقب بحر العلم کیوں رکھا ہے اس کو تو علم سے ذرا بھی مس نہیں۔ بخدا اگر میں حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق دلیلیں بھی بیان کروں تو وہ ان کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اور وہ کیا اہلِ سنّت کے علمائے فحول سے بھی ان کا جواب بن نہ پڑے گا۔ اس آخری جملہ کو اس نے تین بار دُہرایا اس لیے لازم آگیا کہ میں ان دونوں دلیلوں کو پوچھوں اور

ان کے جو جواب ہو سکتے ہیں پیش کروں۔

میں:۔ جناب ذرا میں بھی سنوں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے ثبوت میں آپ کی وہ کونسی دو دلیلیں ہیں جن کا جواب آپ کے خیال میں کسی بڑے سے بڑے سنّی عالم سے بھی نہیں ہو سکتا۔

مُلّا باشی:۔ میں آپ سے پہلے یہ پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ آنحضرت کا یہ قول حضرت علیؓ کے متعلق آپ کے یہاں مسلّم ہے یا نہیں کہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الّا انہ لا نبی بعدی" (تم میرے ساتھ وہ نسبت رکھتے ہو جو ہارون کو موسےٰ کے ساتھ تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔)

میں:۔ ہاں یہ حدیث مشہور ہے۔

مُلّا باشی:۔ تو کیا اس حدیث کا منطوق و مفہوم صریحًا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ خلیفہ برحق علی ابن ابی طالب ہیں؟۔

میں:۔ دلیل کی صورت معرض بیان میں لائیے۔

مُلّا باشی:۔ جب آنحضرتؐ نے ہارونؑ کے تمام منازل و مراتب حضرت علی کے لیے قرار دیئے اور ان میں سے کوئی چیز بجز نبوت کے مستثنیٰ نہ کی تو ثابت ہو گیا کہ خلیفہ برحق حضرت علیؓ ہیں کیونکہ ہارون کا اولین مرتبہ تو خلافت ہی تھا اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور حضرت موسیٰ کے بعد ان کے خلیفہ ہوتے۔

میں:۔ آپ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کو قضیہ موجبہ کلیہ سمجھتے ہیں لہٰذا یہ بتایئے کہ اس ایجاب کلی پر کونسا لفظ دلالت کرتا ہے کہ ہارون کے تمام منازل حضرت علیؓ کو حاصل ہیں۔

مُلّا باشی:۔ اس لیے کہ منزلۃ ھارون میں جو اضافت ہے وہ بقرینہ استثنا استغراقی ہے۔

میں:۔ سنیئے۔ یہ حدیث اولاً تو نص جلی نہیں ہے اور آپ کے یہاں امامت یا خلافت کے ثبوت کے لیے نص جلی درکار ہے۔ ثانیاً محدثین نے اس کے متعلق اختلافات کیے ہیں کسی نے اس کو صحیح کہا ہے کسی نے حسن اور کسی نے ضعیف۔ یہاں تک کہ ابن جوزی نے جو نقد حدیث کا بہت بڑا امام ہے اس کو قطعاً موضوع قرار دیا ہے۔

مُلّا باشی:۔ نص جلی ہمارے یہاں شرط ہے نہ کہ آپ کے یہاں سو ہم حضرت علیؓ کی خلافت کے لیے دوسری

حدیثیں پیش کرتے ہیں جو نص جلی ہیں لیکن چونکہ اہل سنت کے نزدیک وہ نامقبول ہیں اس لیے ان کے واسطے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

میں :- یہ حدیث مختلف وجوہ سے دلیل نہیں بن سکتی۔ اولاً یہ کہ استغراق کا دعوے جو آپ نے کیا وہ ممنوع ہے۔ کیونکہ ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نبی تھے اور حضرت علیؓ میں یہ بات نہ تھی حالانکہ استثنا تو نبوت بعد از وفات کا ہے ثانیاً ہارون حضرت موسیٰؑ کے ماں جائے بھائی تھے اور حضرت علیؓ نبی کے ساتھ یہ رشتہ نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا استغراق کا دعویٰ تو قطعاً باطل ہوا۔ اب اس کی دلالت ظنی رہ گئی جو صرف ایک منزلت پر ہوگی۔ جیسا کہ منزلۃ کی تاء وحدت سے خود ظاہر ہے اسلئے یہ اضافت عہد ہے نہ کہ استغراق اور مقصود یہ ہے کہ علیؓ خلافت جنگ تبوک میں میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسےؑ کے ساتھ اس وقت تھی جب انہوں نے حکم دیا تھا "اُخْلُفْنِی فِیْ قَوْمِیْ" (میری قوم میں میری جانشینی کر)

مُلّا باشی :- تو پھر کیا اس استخلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ صحابہ میں افضل تھے اور نبی کے بعد انکی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق۔

میں :- نہیں، کیوں کہ حضرت علیؓ کے علاوہ اور صحابہ کو بھی آپ نے اپنی جانشینی کا زندگی میں شرف بخشا ہے مثلاً ابن ام مکتوم وغیرہ کو۔ پھر وہ بھی بعد وفات کے اس دلیل سے خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہونگے علاوہ بریں اگر یہ استخلاف کوئی فضیلت ہوتی تو حضرت علی اس پر ناراضی کا اظہار نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ کو کمزوروں بچوں اور بوڑھی عورتوں کے ساتھ چھوڑتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اسی کبیدگی کو دفع کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" فرمایا تھا۔

مُلّا باشی :- لیکن لحاظ عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔

میں :- خصوص سبب کو میں نے دلیل نہیں گردانا ہے بلکہ اس کو قرینہ بتلایا ہے کہ یہاں ایک منزلت جو مراد ہے اس سے صرف وہی خلافت مخصوصہ جنگ تبوک ہے نہ کہ اور کوئی خلافت آنحضرتؐ کے بعد

ملّا باشی خاموش رہ گیا اور اس کے کثیر طرف دار علما میں سے بھی جو اس کی حمایت کے لیے پس پشت بیٹھے ہوئے تھے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ اب اس نے اپنی دوسری دلیل شروع کی اور کہنے لگا کہ میری دوسری دلیل تو ایسی ہے کہ اس میں قطعاً کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

میں:۔ اس کو بھی بیان فرمائیے۔

ملا باشی:۔ وہ آیت مباہلہ ہے قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ (کہدے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تم کو پھر مباہلہ کریں)

میں:۔ استدلال کی شکل بیان کیجئے۔

ملا باشی:۔ جب نجران کے نصاریٰ مباہلہ کے لیے آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں حسینؓ کو اٹھایا حسن کا ہاتھ پکڑا۔ پیچھے فاطمہ تھیں اور ان کے پیچھے علی رضی اللہ عنہم۔ ظاہر ہے کہ دعا کے لیے وہی لوگ منتخب ہو سکتے ہیں جو سب سے افضل ہوں۔

میں:۔ یہ منقبت ہوئی نہ کہ فضیلت۔ اکثر صحابہ بعض خصوصیات سے مختص ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں اور یہ باتیں ان لوگوں سے مخفی نہیں ہیں جو تاریخ و سیر کا مطالعہ کرتے ہیں مگر یہ خصوصیات فضیلت کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ فرض کرو کہ دو قبیلوں میں جنگ ہو۔ ان دونوں کے رؤسا صرف اپنے اپنے خاص خاص متعلقین کو ساتھ لے کر مبارزہ کریں تو یہ دلیل اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ ان قبیلوں میں ان رؤسا کے خاص عزیزوں سے بڑھ کر کوئی بہادر نہ تھا اور یہ چونکہ دعا کا موقع تھا جس میں خاص متعلقین کی موجودگی سے خشوع زیادہ بڑھ جاتا ہے اس لیے مقتضائے مقام یہی تھا کہ آنحضرت انہیں حضرات کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

ملّا باشی:۔ ہاں تو خشوع نتیجہ ہے فرط محبت کا اور ہم یہی تو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت کو یہی حضرات سب سے زیادہ محبوب تھے۔

میں:۔ یہ طبعی اور جبلی محبت ہے نہ کہ اختیاری جس سے کوئی فضیلت ثابت ہو سکے انسان یہ یقین رکھتے ہوئے

کہ اس کے بیٹوں یا خاص عزیزوں سے دوسرے لوگ ہر لحاظ سے افضل ہیں پھر بھی طبعاً ان کی محبت پر مجبور ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کو سب جانتے ہیں۔

مُلّا باشی :۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک خاص نکتہ ہے جس کی وجہ سے ہم حضرت علیؓ کی افضلیت کی دلیل اس کو سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ابنائنا سے مراد ہیں حسنؓ وحسینؓ نسائنا سے فاطمہ اور انفسنا سے آنحضرتؐ اور علیؓ۔ اس لیے حضرت علیؓ نفس نبی ہوئے اور یہ انتہائی فضیلت ہے۔

میں :۔ یہ تو میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ تم اصول سے ناواقف ہو لیکن اب معلوم ہوا کہ عربیت سے بھی ناآشنا ہو۔ سنو! انفس جمع قلت ہے جو جمع متکلم کی طرف مضاف ہے اور جمع جب جمع کی طرف مضاف ہوتی ہے تو تقسیم احاد کی مقتضی ہوتی ہے مثلاً "رکب القوم دوابھم" اس کے یہ معنے نہیں کہ جملہ اشخاص سب گھوڑوں پر چڑھ گئے بلکہ ہر ہر شخص اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ قاعدہ متعارف ومتداول ہے اور کتب نحو میں بہ تصریح مذکور۔

یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب اس سے بن نہ پڑا۔ کہنے لگا میرے پاس ایک دلیل اور بھی ہے میں نے کہا کہ اسے بھی پیش کیجیے۔

ملا باشی :۔ آیت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُولُہٗ کی تفسیر میں جملہ اہل تفسیر کا اتفاق ہے کہ حضرت علی کے متعلق نازل ہوئی ہے اور آیت میں انما کلمۂ حصر ہے جس سے ان کا افضل امت ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

میں :۔ اس دلیل کے متعدد جوابات ہیں۔

میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے فارسی زبان میں اس سے کہا کہ یہ بحث چھوڑ دو۔ کیوں کہ یہ شخص تمہاری ہر دلیل کو توڑتا چلا جائے گا اور لوگوں کی نگاہوں میں تم اسی قدر گرتے جاؤ گے یہ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا کہ آپ فاضل شخص ہیں۔ میری ہر دلیل کا جواب دے سکتے ہیں لیکن میرا روئے سخن تو دراصل بحر العلم کی طرف تھا۔ میں نے کہا کہ آغاز سخن میں آپ نے فرمایا تھا کہ فحول علماء اہل سنت بھی میری دلیلوں کا جواب نہیں دے سکتے اس بنا پر میں نے گفتگو کی ورنہ مجھے کوئی بحث نہ تھی۔

ملا باشی :۔ میں عجمی شخص ہوں۔ عربی بولنے میں کبھی کبھی مقصود کے خلاف بھی الفاظ میری زبان سے نکل جاتے ہیں

میں :۔ اچھا اب میں دو سوال کرتا ہوں جس کی بابت مجھ کو یقین ہے کہ علمائے شیعہ میں سے کوئی بھی ان کا جواب نہ دے سکے گا۔

ملّاباشی :۔ وہ کیا ہیں؟

میں :۔ کیا تمہارے یہاں آرروایت مسلم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد تمام صحابہ (نعوذ) حضرت علی کی خلافت پر بیعت نہ کرنے کے) مرتد ہو گئے۔ بجز پانچ کے۔ حضرت علی۔ مقداد۔ ابو ذر۔ سلمان فارسی اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔

ملّاباشی :۔ ہاں مسلم ہے۔

میں :۔ اگر معاملہ یہ تھا تو پھر کیوں حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر کے ساتھ کیا؟

ملّاباشی :۔ مجبوراً دباؤ سے۔

میں :۔ بخدا تم نے حضرت علی کی ایسی منقصت پر عقیدہ رکھا ہے جس کو ادنےٰ عرب بلکہ اجلاف بازاری بھی اپنے لیے جائز نہ رکھیں گے۔ اگر جبراً کسی کی بیٹی کو کوئی بیاہ لے تو کیا اس کی زندگی بے غیرتی کی زندگی نہیں ہے؟ پھر تم کیسے دعوےٰ کر سکتے ہو کہ حضرت علی اسداللہ۔ شیر خدا۔ شاہ مرداں اور شجاع دوراں تھے۔

ملّاباشی :۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر کے یہاں بجائے ام کلثوم کے کوئی چڑیل یا جنّی رخصت کی گئی ہو۔

میں :۔ یہ جواب اس سے بھی عجیب تر ہے اگر اس احتمال کا دروازہ کھولا جائے تو شریعت کا کوئی نقطہ اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتا مثلاً ایک شخص اپنی منکوحہ کے پاس جاتا ہے وہ کہتی ہے کہ ممکن ہے کہ تم میرے شوہر نہ ہو بلکہ جن یا بھوت ہو۔ اگر وہ دو گواہ پیش کرے تو وہ کہہ سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ انسان نہ ہوں بلکہ غول بیابانی ہوں۔ علی ہذا ایک قاتل عدالت میں پیش کیا جائے وہ بیان کرے کہ میں نے قتل نہیں کیا ممکن ہے کہ کوئی جن میرا ہمشکل بن گیا ہو۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہب جعفری جس کو تم حق سمجھتے ہو ممکن ہے کہ امام جعفر سے نہ مروی ہو بلکہ کسی جن سے ہو جس نے ان کی شکل اختیار کر لی ہو۔ الغرض وہ اب کے بھی ساکت ہوا۔ اور ایک حرف آگے نہ چل سکا۔ اب میں نے دوسرا سوال پیش کیا اور پوچھا کہ ظالم خلیفہ کے افعال کی بابت تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

ملا باشی :۔ غیر نافذ ہیں شرعاً اور دیانتاً۔

میں : یہ بتایئے کہ حضرت علی کے بیٹے محمد بن الحنفیہ کی والدہ کس قبیلہ کی تھیں؟ اور کس نے ان کو مالِ غنیمت میں حاصل کیا تھا؟۔

ملّا باشی :۔ میں نہیں جانتا (میرے خیال میں اس نے صحیح نہیں کہا کیونکہ ممکن نہیں کہ وہ اس بات کو نہ جانتا ہو) لیکن علمائے شیعہ میں سے ایک نے کہا کہ وہ بنی حنیفہ میں سے تھیں۔ اور حضرت ابو بکر کے عہد میں ان کی حکم سے بنی حنیفہ کے ساتھ جو لڑائی ہوئی تھی اس میں گرفتار ہو کر قیدیوں کے ساتھ آئی تھیں۔

میں :۔ پھر حضرت علیؓ نے یہ کیسے جائز سمجھا کہ خلیفۂ ظالم کے مالِ غنیمت میں سے کنیز لے کر اس سے اولاد پیدا کریں۔ اس معاملہ میں تو نہایت احتیاط کی ضرورت تھی۔

ملّا باشی :۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس کو خود بنی حنیفہ سے بطور ہبہ کے مانگ لیا ہو۔

میں :۔ اس کی کوئی دلیل؟

اس پر ہر طرف خاموشی تھی۔

میں :۔ میں نے قصداً احتیاط رکھی کہ کوئی حدیث یا کوئی آیت آپ کے سامنے پیش نہ کروں اس لیے کہ ممکن ہے کہ ہم دونوں اس کی صحت یا اس کی تاویل میں متفق نہ ہوں۔ اور استدلال صرف انھیں باتوں سے ہو سکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلم ہوں۔ میرے یہ دونوں سوالات عقل وعرف کی بنا پر تھے۔

اس مناظرہ کی لفظ بہ لفظ صحیح صحیح خبریں شاہ تک پہنچ گئیں۔ اس نے حکم دیا کہ جملہ علماء باہم جمع ہو کر مکفرات کو اُٹھا دیں اور ایک دوسرے کی تکفیر سے دست بردار ہو جائیں اور میں ان کا حکم رہوں۔ اس لیے ہم سب ملّا باشی کے خیمہ سے نکلکر اس مجمع کی طرف چلے جو ضریح علیؓ کے متصل اس غرض کے لیے جمع ہوا تھا۔

علماء ایران کی تعداد ۷۰ تھی جن میں سے صرف ایک شخص مفتی اردلان سنی تھا اور باقی سب شیعہ۔ ان میں ممتاز حضرات کے نام میں نے اسی وقت لکھ لئے تھے۔

(۱) ملا باشی علی اکبر (۲) مفتی رکاب آقا حسین (۳) ملا محمد امام لاہجان (۴) آقا شریف مفتی مشہد رضا (۵) مرزا برہان قاضی شروان (۶) شیخ حسن مفتی اردبیہ (۷) مرزا ابو الفضل مفتی قم (۸) حاجی صادق مفتی جام

(۹) سید محمد مہدی امام اصفہان (۱۰) حاجی محمد زکی کرمانشاہ (۱۱) حاجی محمد شامی مفتی شیراز (۱۲) مرزا اسد اللہ مفتی تبریز (۱۳) ملا طالب مفتی مازندان (۱۴) ملا محمد مہدی نائب صدر مشہد (۱۵) ملا محمد صادق مفتی قلخال (۱ محمد مومن مفتی استرآباد (۱۷) سید محمد تقی مفتی قزوین (۱۸) ملا محمد حسین مفتی سبزوار (۱۹) سید بہار الدین مفتی کرمان (۲۰) سید احمد مفتی اردلان شافعی۔

افغانستان کے علما جو سب کے سب حنفی تھے حسب ذیل تھے۔

(۱) شیخ فاضل ملا حمزہ قلنجانی مفتی افغانستان (۲) ملا امین قلنجانی قاضی افغانستان (۳) ملا دینا خلف (۴) ملا طٰہٰ افغانی مدرس مدرسہ نادر آباد (۵) ملا محمد قلنجانی (۶) ملا عبد الرزاق قلنجانی (۷) ملا ادریس ابدالی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد علما ترکستان آئے جن کی تعداد سات تھی۔ ان کے آگے ایک شیخ تھا جس کے چہ رعب اور وقار برستا تھا ایک بڑا عمامہ سر پر۔ دیکھنے والے کو خیال گزرتا تھا کہ امام اعظم کے شاگرد رشید امام ابو چلے آرہے ہیں۔ ایرانیوں نے اس خیال سے کہ میں ان سے کوئی بات نہ کرسکوں۔ مجھ سے پندرہ آدمیوں کے فاصلہ پر بائیں طرف ان کو بٹھایا۔ اسی طرح افغانی علمار کو بھی بائیں طرف مجھ سے دور جگہ دی۔ ترکستانی علما کے نام یہ ہیں۔

(۱) علامہ ہادی خواجہ بحر العلم قاضی بخارا حنفی (۲) میر عبد اللہ صدر بخارا حنفی (۳) قلندر خواجہ بخاری حنفی (۴) ملا امید صدر بخاری حنفی (۵) بادشاہ میر خواجہ بخاری حنفی (۶) مرزا خواجہ بخاری حنفی (۷) ابراہیم بخاری حنفی۔

جب مجلس بیٹھ چکی ملا باشی نے بحر العلم کو مخاطب کیا اور کہا آپ اس شخص (میری طرف اشارہ کرکے) کو پہچانتے ہیں۔ بحر العلم نے کہا کہ نہیں۔ ملا باشی نے کہا کہ یہ فضلا اہل سنت میں سے ہیں شیخ عبد اللہ آفندی۔ ان کو احمد پاشا والی بغداد نے شاہ کے حسب طلب بھیجا ہے تاکہ اس مجلس میں ہمارے نگران اور شاہد رہیں۔ شاہ نے ان کو اپنا حکم بنا دیا ہے۔ جن امور پر ہمارا اتفاق ہوتا جائے گا یہ شاہد رہیں گے۔ لہذا آپ ان تمام امور کو بیان کریں جن کی بنا ہم شیعوں کی تکفیر کرتے ہیں تاکہ اگر واقعی وہ موجب کفر ہوں تو ہم ان سے باز آجائیں ورنہ حقیقت میں تو ہم کافر نہیں ہیں خود امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی۔ چنانچہ جامع الاصول میں ہے کہ اسلام کے پانچ مذاہب ہیں جن میں سے ایک مذہب جعفری بھی ہے۔ اسی طرح صاحب مواقف نے بھی امامیہ کو اسلام کا ایک فرقہ تسلیم کیا ہے اور امام ابو حنیفہ رح کا قول فقہ اکبر میں ہے کہ ہم اہل قبلہ کو کافر نہیں سمجھتے۔ شرح ہدایہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ صحیح یہ ہے

کہ امامیہ اسلام ہی کا ایک فرقہ ہے لیکن باوجود متقدمین کی ان تصریحات کے بھی متاخرین نے غلو اور تعصب سے کام لے کر ہم کو کافر بنانا شروع کیا جس طرح ہمارے فرقہ کے لوگوں نے آخر میں سنیوں کی تکفیر شروع کر دی۔ حالانکہ نہ ہم کافر ہیں نہ تم۔ بہرصورت ہمارے اندر کفر کی جو باتیں آپ کے خیال میں ہوں ان کو ظاہر کیجئے۔

بحر العلم:۔ سب شیخین۔

ملا باشی:۔ ہم نے اس کو چھوڑا

بحر العلم:۔ تم صحابہ کرام کو کفار، مرتد اور گمراہ کہتے ہو۔

ملا باشی:۔ سارے صحابہ عدول ہیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

بحر العلم:۔ متعہ کو حلال سمجھتے ہو۔

ملا باشی:۔ متعہ حرام ہے جو اس کی حلت کا قائل ہو وہ سفیہ ہے۔

بحر العلم:۔ تم علی رض کو ابو بکر رض پر فضیلت دیتے ہو اور کہتے ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی خلیفہ برحق تھے

ملا باشی:۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابو بکر رض۔ پھر عمر رض۔ پھر عثمان رض۔ پھر علیؓ رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کی خلافتیں بھی اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔

بحر العلم:۔ تمہارا اصول اور عقیدہ کیا ہے؟

ملا باشی:۔ ہم ابوالحسن اشعری کے عقیدہ پر ہیں۔

بحر العلم:۔ شرط یہ ہے کہ شرع کی کسی حلال چیز کو حرام یا حرام کو حلال نہ بناؤ۔

ملا باشی:۔ یہ شرط منظور ہے۔

بحر العلم نے اس کے بعد کچھ اور شرطیں بھی پیش کیں جن کو کفر سے علاقہ نہ تھا۔ ملا باشی نے ان سب کو قبول کیا پھر کہا کہ جب ان سب امور کے ہم پابند ہو گئے تو اب تم کو ہمارے مسلمان شمار کرنے میں کیا عذر ہے؟

بحر العلم:۔ شیخین پر تبرّا کفر ہے۔

ملا باشی:۔ ہم نے اس کو چھوڑا۔

بحر العلوم:۔ (کچھ دیر تک سکوت کے بعد) لیکن شیخین کو بُرا کہنا تو کفر ہے۔

ملا باشی:۔ جناب ہم نے تو اس کو چھوڑ دیا پھر بھی آپ ہم کو کفار ہی کہتے رہیں گے۔

بحر العلوم:۔ بہر صورت سب شیخین تو کفر ہے۔

مراد بحر العلوم کی یہ تھی کہ سب شیخین چونکہ کفر ہے[1] اور جن سے کفر صادر ہو مذہب حنفی کے مطابق اس کی توبہ قبول نہیں۔ پھر میں کیسے تسلیم کر لوں کہ شیعہ مسلمان ہیں جب کہ یہ کفر اُن سے سرزد ہو چکا ہے۔

آخر مفتی افغان ملا حمزہ نے کہا کہ ہادی خواجہ! کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت موجود ہے کہ ان سے سب شیخین کا کفر صادر ہوا ہے جو تم ان کی توبہ نہیں قبول کرتے۔ بحر العلوم نے کہا کہ نہیں۔ ملا حمزہ نے کہا کہ جب وہ حتمی وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تبرا نہ کہیں گے تو پھر اس کے قبول کر لینے میں کونسی شے مانع ہے۔ اس پر بحر العلوم نے کہا کہ اچھا۔ یہ لوگ بھی مسلمان ہیں جو ہمارے حقوق وہ ان کے حقوق۔

جب یہ بات طے ہو گئی تو شیعہ حنفی اور شافعی تینوں فرقوں کے علماء، امراء اور اعیان کھڑے ہو گئے باہم مصافحہ اور معانقہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہونے لگے۔

اس وقت ہمارے پس پشت اور گرد عجمی امراء اور تماشائیوں کا ہجوم دس ہزار سے کم نہ تھا جو سب کے سب جوش سرور اور فرط مسرت سے آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

یہ مجلس بحسن و خوبی چہارشنبہ کے دن مغرب سے پہلے ختم ہو گئی۔ رات کو دس بجے شاہ کی طرف سے ایک آدمی آیا جس نے کہا کہ شہنشاہ آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی مساعی کے شکر گزار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ کل کی مجلس میں جب آج کی باتوں کا عہد و پیمان ہوگا اور ہر فریق محضر پر دستخط کرے گا آپ بطور شاہد اور میرے وکیل کے موجود رہیں گے اور محضر کی پیشانی پر خود اپنے قلم سے اپنی شہادت تحریر کریں گے اور مہر لگائیں گے۔

میں نے کہا کہ بسر و چشم میں اس حکم کی تعمیل کروں گا۔

دوسرے دن یعنی پنجشنبہ ۲۵ شوال کو ضریح علیؑ کے سامنے دوپہر سے پہلے اجتماع ہوا ہم سب لوگ وہاں پہنچے حاضرین کی تعداد کم سے کم ساٹھ ہزار تھی۔ محضر نامہ سات بالشت کے کاغذ پر فارسی زبان میں لکھا گیا تھا

---

[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ سب شیخین کفر ہے نہ ناقابل توبہ۔ یہ فتادے جن لوگوں نے دئے ہیں ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص خاص اسباب سے وہ شیعوں سے ذاتی تعصب اور عداوت رکھتے تھے۔ اسلم

شی نے مفتی رکاب آقا حسین کو جو بلند آواز شخص تھا اس کے سنانے کا حکم دیا اس نے مجمع عام میں پڑھا۔ اس کا
ن یہ تھا۔

"اللہ جل شانہٗ اس دنیا میں سلسلہ وار رسول بھیجتا رہا سب کے آخر میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے اپنا رسول بنا کر بھیجا جن پر رسالت ختم کردی۔ ان کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق ابوبکر صدیق ابن ابی قحافہ کو ان کا جانشین بنایا اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ حضرت علیؓ نے بھی بطیب خاطر بلا جبر و اکراہ بیعت فرمائی۔ اور باجماع صحابہ وہ امت کے امیر اور خلیفہ ہو گئے پھر اُنہوں نے بذریعہ عہد کے عمر بن خطابؓ کو اپنا جانشین کیا۔ ان کے ہاتھ پر بھی جملہ اصحابؓ معہ حضرت علیؓ کے خوشی کے ساتھ بیعت کی۔ عمرؓ نے خلافت کو اپنے بعد چھ امیدواروں میں بطور شورے کے چھوڑ دیا جن میں سے ایک علیؓ بن ابی طالب بھی تھے۔ کثرت رائے سے حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو گئے۔ جب وہ اپنے گھر میں باغیوں کے ہاتھ سے شہادت پا گئے اور اُمت بلا خلیفہ کے رہ گئی۔ اس وقت صحابہ نے حضرت علی کو خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ چاروں خلیفہ ایک زمانے میں تھے۔ ان میں کبھی باہم کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ ایک دوسرے کو ساتھ محبت رکھتا تھا اور اس کی تعریف کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب علیؓ سے شیخین کی بابت سوال کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ وہ دونوں امام عادل اور برحق تھے اور اسی پر مرے۔ اسی طرح جب حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگ بیعت کرنے لگے تو اُنہوں نے فرمایا کہ تم میں علی موجود ہیں۔ پھر بھی تم میرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو۔

اہل ایران تم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ ان کی افضلیت اور خلافت اسی ترتیب پر ہے جس طرح بیان کی گئی۔ سو جو شخص ان کی تحقیر یا ان کی بابت کوئی ناشائستہ کلمہ زبان سے نکالے گا۔ اس کا مال، اولاد اور خون سب شہنشاہ کے لیے حلال ہوگا اور اس کے اوپر اللہ ملائکہ اور جملہ بنی نوع انسان کی لعنت ہو گی۔

میں نے صحرا مغان میں تخت نشینی کے وقت یہی عہد لیا تھا۔ اب جو کوئی صحابہ کو بُرا یا شیخین پر تبرّا

کہے گا اس کو اس کے اہل و عیال سمیت قید کروں گا اور مال و جائداد ضبط کر لوں گا ۔ یہ بدعت ایران میں کبھی نہیں تھی ۔ اس کا ظہور اسماعیل شاہ صفوی کے عہد ۸۵۷ھ سے ہوا جو اب تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے ۔"

یہ حصہ شاہ کی طرف سے تھا ۔ اس کے نیچے چند سطریں تھیں جن میں باشندگان ایران کی طرف سے عہد تھا کہ :-

"ہم صحابہ کو بُرا نہ کہیں گے ۔ اور تبرے سے دست بردار ہوئے خلفائے اربعہ کی فضیلت اور خلافت کے ہم اسی ترتیب کے ساتھ قائل ہیں جو اس محضر میں مندرج ہے جو اس کے خلاف کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سارے آدمیوں کی لعنت ہو اور شہنشاہ کے لیے اس کا مال، عیال اور خون حلال ہے ۔"

اس کے نیچے علما، اور عمائد ایران کے دستخط ہوئے اور ان کی مہریں لگائی گئیں ۔ پھر اس کے بعد یہی مضمون چند سطروں میں کربلا، نجف، حلہ اور خوارزم کے باشندوں کی طرف سے تھا اس پر انکی مہریں ثبت ہوئیں ۔ مہر لگانے والوں میں سید نصر اللہ بن قطہ اور شیخ جواد نجفی وغیرہ ممتاز افراد تھے ۔

پھر اس کے تحت میں چند سطریں علما افغانستان کی طرف سے تھیں کہ ایرانی جب ان باتوں کی پابندی کریں گے جو اس محضر میں ہیں تو ہم ان کو کافر نہیں سمجھیں گے بلکہ ان کو اپنے بھائی مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرینگے اس کے نیچے ان کے دستخط ہوئے اور ان کی مہریں لگائی گئیں ۔

بعینہ یہی مضمون ترکستانی علما کی طرف سے بھی تھا ۔ انہوں نے بھی اس پر مہریں لگائیں ۔ عنوان پر میں نے اپنی شہادت لکھ کر دستخط کیا اور مہر لگائی ۔

جب یہ تمام کارروائی ختم ہو گئی تو مجمع سے ایک خوشی کا نعرہ بلند ہوا سنّی اور شیعہ سب کے سب فرحناک تھے اور نہایت گرم جوشی سے باہم گلے مل رہے تھے .... اس کے بعد شاہ کی طرف سے چاندی کی سینیوں میں خدام حلوے اور مٹھائیاں لیے ہوئے آئے اور خالص سونے کے جڑاؤ عطر دانوں سے جو مشک و عنبر سے بھرے ہوئے تھے مجمع کی خاطر کی گئی ۔

پھر شاہ نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ میں آپ کا اور ساتھ ہی احمد خاں (پاشا) کا شکر گزار ہوں کہ مسلمانوں کو

باہمی تکفیر اور خونریزی سے بچانے میں سعی فرمائی ہیں ازراہ شکر نہ کہ ازراہ فخر یہ کہتا ہوں کہ اس کام کو اللہ نے میرے ہاتھ سے کرایا کہ صحابۂ کرام پر تبرّا کرنے سے لوگ تائب ہوئے ورنہ سلاطین عثمانیہ نے کس قدر خونریز جنگیں کیں اور بارہا لشکر لے کر چڑھائی اور لڑائی کرتے رہے مگر یہ سعادت ان کے حصّہ میں نہ تھی اور میں نے بلا ایک قطرہ خون بہائے شاہان صفویہ کی اس بدعت قبیح پر جو سارے ملک پر چھائی ہوئی تھی فتح حاصل کر لی۔

میں نے کہا کہ انشاءاللہ سارا ایران جیسے پہلے سنی تھا اب پھر ہو جائے گا۔ شاہ نے کہا رفتہ رفتہ۔ اس کے بعد سر اُٹھا کر بولا کہ میں اگر فخر کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری ذات اس وقت مجموعہ ہے چار عظیم الشان سلاطین کا یعنی ہندوستان۔ افغانستان۔ توران اور ایران۔ کیوں کہ ان چاروں ممالک کی زمام حکومت میرے ہاتھ میں ہے لیکن رفع تبرّا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تائید الٰہی سے یہ امر حاصل ہوا ہے اور چونکہ میں ذریعہ ہوں۔ اس لیے تمام عالم اسلامی کی یہ خدمت مجھ سے ہوئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ صحابۂ کرام میرے اس فعل سے خوش ہونگے اور آخرت میں میری شفاعت کرینگے۔

اس کے بعد مجھ سے کہا کہ تم ابھی ٹھہر جاؤ۔ کل جمعہ ہے اور میں نے حکم دیا ہے کہ جامع کوفہ میں جمعہ پڑھا جائے اور منبر پر حسب ترتیب خلفا کا نام لیا جائے آخر میں خلیفہ عثمانی کے لیے دعا کی جائے اس کے بعد میرے لیے کیوں کہ میں ان کو اپنا بڑا اور بزرگ بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کے باپ دادا پشتہا پشت سے اسلام کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں اور تم جانتے ہو کہ میں جب دنیا میں آیا تو میرا باپ سلطان نہ تھا۔

میں دربار سے واپس آیا دیکھا کہ ہر ہر خیمہ میں ایرانی بیٹھے ہوئے اسی میثاق کا تذکرہ کر رہے ہیں اور اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے فضائل آیات و احادیث سے نکالتے اور شاہان صفویہ کی اس رسم تبرّا پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔

دوسرے دن اعتماد الدولہ ظہر کے وقت مجھے لینے کے لیے آیا کہ چل کر جمعہ میں شرکت کروں میں نے کہا کہ جامع کوفہ میں حنفیہ کے نزدیک بھی جمعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ آبادی نہیں ہے اور شافعیہ کے نزدیک بھی کیوں کہ باشندوں کی تعداد چالیس تک نہیں پہنچتی۔ اس نے کہا کہ آپ جمعہ نہ پڑھیں وہاں تو صرف آپ کی موجودگی درکار ہے۔ چنانچہ میں گیا۔ جماعت میں امرا۔ خوانین۔ علما اور عوام تقریباً پانچ ہزار تھے۔ منبر پر شاہی امام تھا اس نے

خطبہ میں خلفا کا حسب ترتیب نام لیا اور ان کی مدح کی پھر خلیفہ عثمانی اس کے بعد نادر شاہ کے لیے دعا مانگی اور امامیہ کے قاعدہ کے مطابق نماز پڑھائی۔ شام کے وقت شاہ نے مجھے واپسی کی اجازت دی۔ اور میں بغداد کو روانہ ہو گیا۔

صاحب جہاں کشائے نادری نے لکھا ہے کہ نادر شاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو روانہ کیا کہ وہ تمام ایران میں دورہ کر کے خطبوں میں خلفائے اربعہ کا نام داخل کریں اور سارے ملک میں اس محضر کی اشاعت کر کے تعمیل کرائیں۔

باب عالی میں بھی یہ ساری کیفیت لکھ کر درخواست کی کہ اب خلیفہ کو اس کے پانچوں مطالبات منظور کر لینے چاہئیں۔

ایک مدت تک سفیروں کی آمد و رفت ہوتی رہی مگر ترکی کے شیخ الاسلام اور سلطان محمود خاں نے اس کی دو باتوں سے انکار کر دیا یعنی نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی نہ کعبہ میں پانچواں مصلّےٰ منظور کیا۔ باقی تین مطالبات تسلیم کر لیے۔

نادر شاہ بھی مصلحت وقت دیکھ کر ان دو امور کے مطالبہ سے دست بردار ہو گیا۔ بالآخر محرم ۱۱۶۰ھ میں فریقین میں عہد مصالحت لکھا گیا جس پر سلطان کی طرف سے لطیف آفندی عثمانی سفیر نے دستخط کیے۔

تنقید و تبصرہ

فرہنگ عامرہ

زبان اردو کی ترویج کے راستہ میں ایک مشکل یہ بھی درپیش ہے کہ ہمارا نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ عربی اور فارسی سے ناآشنا ہوتا جارہا ہے جس کی وجہ سے اُردو کا اندازِ تحریر جو آج سے بیس پچیس برس اُدہر سلیس اور آسان سمجھا جاتا تھا اب مشکل اور مغلق تصور کیا جاتا ہے۔ لکھنے والوں کی دشواری یہ ہے کہ بلند خیالات کا اظہار مجلسی زبان میں مشکل ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس مشکل کا حل یہی ہوسکتا ہے کہ پڑھنے والے حضرات اخذ مطالب میں کسی لغت کی مدد حاصل کریں۔ لیکن مشکل درمشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں فارسی کے لغت بہت پرانے انداز کے حامل ہیں اور اُردو میں کوئی ایسا لغت ملتا نہیں تھا جو جدید اصول کے مطابق مرتب کیا گیا ہو، اس باب میں مولوی محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد عربی، فارسی، ترکی کے قریب چالیس ہزار ایسے الفاظ کا لغت مُرتب کیا ہے جو ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ ہماری قدیم لغت کی کتابوں میں تلفظ کی تشریح کے لیے عام طور پر تائے مکسور۔ یائے مجہول۔ واؤ معدولہ۔ الف مقصورہ" کے قسم کے الفاظ استعمال ہوئے تھے جو بجائے خویش کے محتاج ہوتے تھے اور پھر صحیح تلفظ کے سمجھنے میں دقت بھی باقی رہتی تھی۔ لیکن فرہنگ عامرہ میں "تلفظ کی تشریح کے لیے انگریزی ڈکشنریوں کا طرز بیان بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً "جُدول" کے سامنے لکھا ہے (جَدْ دَل) ۔ وغیرہ یہ اس فرہنگ کی بڑی خوبی ہے۔ معانی مختصر دیئے ہیں لیکن تفہیم مطالب کے لیے کافی ہیں البتہ اصطلاحات کے معانی بیان کرنے میں مزید تشریح کی ضرورت تھی۔ مثلاً "اشتراکیت" کے معنی لکھے ہیں "جمہوریت پسندی"۔ یہ معنی اس اشتراکیت کا صحیح مفہوم سامنے نہیں

لاتے جو دورِ حاضرہ میں ایک سیاسی عقیدہ میں رائج ہے۔ بایں ہمہ یہ فرہنگ ہماری موجودہ ضروریات کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔ جی چاہتا تھا کہ ایسی مفید کتاب ذرا اچھے کاغذ پر چھپتی اور کتابت بھی قدرے صاف ہوتی۔ کتاب مجلد ہے اور چھوٹے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس کی قیمت دو روپے کچھ بھی زیادہ نہیں۔ قارئین طلوع اسلام میں سے وہ حضرات جو رسالہ کے انداز تحریر کی مشکل پسندی کی شکایت کیا کرتے ہیں اس فرہنگ سے ضرور فائدہ حاصل کریں۔ ہمیں حیرت ہے کہ وہ خورجہ (یو۔پی) جو باہر کی دنیا میں صرف "اچار شلغم" کی وجہ سے معروف ہے وہاں جناب خویشگی جیسی ہستیاں بھی موجود ہیں۔ کتاب جناب مؤلف سے "فیروز منزل متصل جامع مسجد" کے پتہ سے مل سکتی ہے +

کانگریس بے نقاب

ہم شروع سے لکھتے چلے آرہے ہیں کہ:۔

(i) متحدہ قومیت کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ وہ دو یا دو سے زیادہ مختلف قومیں جو اس متحدہ قومیت کے عناصرِ ترکیبی ہوں۔ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جائیں کہ انہیں کوئی وجہ امتیاز باقی نہ رہے۔ ان کی تہذیب، تمدن نظریاتِ زندگی فلسفۂ حیات۔ زاویۂ نگاہ بایں نمط ایک ہو جائیں کہ:۔

"تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

(ii) چونکہ مسلمان دنیا میں ایک مستقل اور مخصوص نظریۂ زندگی اور فلسفۂ حیات کے قائل ہیں۔ جسے ضابطہ خداوندی کہا جاتا ہے اور جو اُن کی تہذیب اور تمدن کا سرچشمہ ہے اسلئے وہ بجائے خویش ایک مستقل قوم (حزب اللہ) ہیں، لہذا نہ تو مسلمان کسی متحدہ قومیت کا جزو بن سکتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی غیر مسلم اُن کی جماعت کا رُکن بن سکتا ہے، تا وقتیکہ وہ اسلام لاکر اُن میں کا ایک نہ ہو جائے۔

اور

(iii) موجودہ تحریکِ آزادی سے ہندوؤں کا مقصد محض اتنا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی ان ملّی خصوصیات کو مٹا کر ملک میں "رام راج" قائم کر لیا جائے۔ اپنے اِن دعاوی کے ثبوت میں ہم بارہا ہندو کانگرسی زعماء کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات اِن صفحات پر پیش کر چکے ہیں۔ جن میں یہ حقیقت چھلک کر سطح پر آجاتی رہی ہے۔ لیکن ہمارے مسلمان قومیت پرست

حضرات انگریز یہ کہہ کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش کرتے رہے، کہ یہ خواہ مخواہ کی بدگمانی ہے۔ چونکہ ہمارے دعاوی اس فراست قرآنی پر مبنی تھے جو ایک مسلمان کے لیئے دُنیا کے ہر گوشہ میں بہترین رُاہ نما ہوسکتی ہے اس لیے، ہمیں یقین تھا کہ حالات خود بخود بتا دینگے کہ ہمارا مسلک بُدگمانی پر مبنی ہے یا حقیقت پر۔ الحمدللہ کہ اس باب میں ہمیں زیادہ دیر تک زحمت کشِ انتظار نہیں ہونا پڑا۔ اور واقعات اس تیزی سے بڑھتے آرہے ہیں کہ جلدی یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہوتی جارہی ہے اور قومیت پرست حضرات میں سے اکثر و بیشتر اتنا محسوس کرنے لگ گئے ہیں کہ تحریکِ آزادی کی "نیلم پری" محض ایک دھوکا ہے جس کی آڑ میں ہندو راج کے منصوبے پرورش پا رہے ہیں۔ ذیل میں ہم آچاریہ کرپلانی۔ جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی۔ کا ایک مبسوط بیان شائع کرتے ہیں جس سے معلوم ہوجائے گا کہ موجودہ تحریکِ آزادی سے کانگریس کا مفہوم کیا ہے۔ اس بیان پر ہم اپنی طرف سے کوئی تنقید نہیں کرینگے۔ بلکہ اسکے بعد ایک ایسے اخبار کا تبصرہ من وعن شائع کردیں گے، جو اپنے مسلکِ قومیت پرستی میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ اس بیان اور تبصرہ کے مطالعہ کے بعد خود اس نتیجہ پر پہونچ جائینگے کہ ہمارے مُسلم قومیت پرست حضرات تحریکِ آزادی کے فریب میں قوم کو تباہی اور بربادی کے کس جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جارہے ہیں۔

بیان آچاریہ کرپلانی

گاندھی جی نے زندگی کا کوئی ایسا فلسفیانہ نظام پیش نہیں کیا ہے جو منطقی حیثیت سے مکمل ہو۔ لیکن پھر بھی انھوں نے سیاست و معاشرت کا جو خاکہ تیار کیا ہے اسکے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ اِن تمام اجزاء کا بُنیادی اُصول ایک ہی ہے۔ اور ان سب میں زبردست اتحاد پایا جاتا ہے۔ ان اجزاء کو نہ تو بنیادی اُصولوں سے جُدا کیا جاسکتا ہو

اور نہ باہم ایک دوسرے سے اُنکا جو تعلق ہے اُسے توڑا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا کیا جائیگا تو سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اگر ہم گاندھی جی کے بتلائے ہوئے بُنیادی اصُولوں کو نہ مانیں تو پھر ہمارے کام کا سارا پروگرام بے رُوح ہو کر رہ جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر ہم اصُول کو تو مانیں۔ لیکن اُس کے ساتھ جو پروگرام وابستہ ہے اُسکے مختلف اجزاء کے باہمی ربط کو نہ مانیں تب بھی ہم پروگرام کی اہمیت کو زائل کر دینگے اس لیئے وہ لوگ جو کانگرس کے پروگرام کو تو مانتے ہیں۔ لیکن اُس سیاسی عقیدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں جس پر گاندھی جی نے کانگرس کے پروگرام کی بُنیادیں قائم کر رکھی ہیں، وہ درحقیقت نہ تو کانگریس کی حالیہ تاریخی ترقی سے واقف ہیں۔ اور نہ یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات (آئڈیالوجی) نے کانگریس میں کیا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ ایسے لوگوں کو معلُوم ہونا چاہیئے۔ کہ اب کانگرس صرف ایک ایسی سیاسی جماعت ہی نہیں ہے۔ جو مُلک کو پردیسی اقتدار سے آزاد کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ حیثیت کو بھی بالکل بدل ڈالنا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد ایک بالکل نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے، جب تک گاندھی جی کا اثر کانگرس پر غالب نہیں ہوا تھا۔ اسوقت تک کانگرس کے لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ کانگرس کو صرف سیاست کے دائرہ میں محدود رکھنا چاہیئے۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ ہماری سیاسی غُلامی کو ہماری معاشرتی حالت سے براہِ راست کوئی بُنیادی تعلق نہیں ہے۔ اِسی لیئے اِن لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگرس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے۔ وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ ممکن تھا کہ مختلف معاشرتی نظریئے رکھنے والے انسان سیاسی حیثیت سے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ گویا ان لوگوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا:۔ ایک سیاسی زندگی اور دوسری معاشرتی زندگی — لیکن گاندھی جی نے آکر اس اصول کو توڑ دیا۔ انھوں نے پُرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دے کر یہ بتلایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے ہم اپنی اخلاقی، رُوحانی، اور

معاشرتی زندگی سے جُدا کر سکیں، اس لیئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے ۔

گاندھی جی نے کانگرس کو یہ بتلایا کہ ہمارا کام صرف یہی نہیں ہے کہ مُلک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دیدیں، بلکہ سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ زندگی پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور رُوحانیت سب کچھ داخل ہو، بالفاظ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ اُسے رُوحانی اور اعلیٰ فلسفہ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی ہی متاثر ہو، بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہو اور ہماری زندگی کا ایک بالکل نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا ایک نیا دَور کہہ سکیں ۔

زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعہ ہندوستان میں لانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس میں بڑی دقتیں ہیں۔ لیکن ان تمام دقتوں کے باوجود گاندھی جی کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس جامع انقلاب کو کانگرس کے ذریعہ کیا جائے ۔

اس انقلاب کی اہمیت کو سمجھ لینے کے بعد یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہم گاندھی جی کے بتلائے ہوئے عقیدہ ـــــ یعنی عدم تشدد اور صداقت یا اہنسا اور ستیہ ـــــ کو نہ مانیں۔ لیکن کانگریس کے پروگرام کو قابلِ عمل سمجھیں، اسلیئے کہ یہ عقیدہ اور پروگرام دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں جس طرح جانور کی ٹانگ اُسکے جسم کے ساتھ یا درخت کی شاخیں اس کی جڑ کے ساتھ۔ اگر آپ جڑ کو کاٹ دینگے تو شاخیں کہاں رہیں گی۔ جس چیز کو آپ پروگرام کہتے ہیں وہ دراصل اسی عقیدہ ہی سے تو نکلا ہے۔

ہم سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ چرخہ، کھادی، دیہات سدھار، اور اچھوت ادھار کو

انقلاب سے کیا تعلق۔ لیکن اگر ہم مذکورۂ بالا امور کو پیشِ نظر رکھیں تو پھر یہ سوال نہیں کرینگے۔ کانگرس کے لیئے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی لحاظ سے اس کی رائے کچھ اور ہو، اور معاشرتی اعتبار سے کچھ اور، سیاست ومعاشرت دونوں کے متعلق کانگرس کا نقطۂ نظر ایک ہونا چاہیئے۔

ستیہ اور اہنسا یا صداقت وعدم تشدد ایک قسم کی مذہبی اصطلاحیں ہیں۔ لیکن ہمیں ان اصطلاحوں کو قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں بر روئے عمل لانا ہے، رُوحانی اصول زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتے ہیں، انہیں زندگی کے کسی ایک پہلو سے متعلق کرکے باقی پہلوؤں کو اُن سے بے نیاز کرنا ناممکن ہے۔ خلاصہ یہ کہ گاندھی جی نے ہماری زندگی کے عملی کام کا جو پروگرام پیش کیا ہے، ہمیں صرف اسی کو چلانا ہوگا۔

ان باتوں کو سمجھ لینے کے بعد ہندومسلم اتحاد کے سوال کو سمجھ لینا بے حد آسان ہے، گاندھی جی نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ اس سوال کو حل کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو رعائتیں، نشستیں اور سیاسی حقوق دیدیں یا مُسلم عوام کے ساتھ براہِ راست رابطہ پیدا کرنے کی اسکیمیں چلاکر کانگریس کے رجسٹر میں مسلم ممبروں کی تعداد بڑھالیں۔

گاندھی جی جس رابطہ عوام کو چاہتے ہیں وہ اِس طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسکا ذریعہ صرف یہ ہے کہ صداقت وانصاف کے ساتھ نہ کہ لین دین کے محض سیاسی جذبہ کے ساتھ اکثریت رکھنے والا فرقہ ہر ساعت اقلیت والے فرقہ کی خدمت کرے۔ ہندومسلمانوں کے درمیان نفرت وبداعتمادی کے بہت قدیم اور تاریخی اسباب ہیں۔ ان اسباب کو نہ تو رعایتوں اور معاہدوں سے دُور کیا جاسکتا ہے اور نہ مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بناکر ہی اُن کو رفع کردینا ممکن ہے۔ اگر نفرت وبداعتمادی کے ان اسباب کو رفع کیئے بغیر مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بنا لیا جائے تو وہ کانگرس کے اندر ایک لاینحل مسئلہ بن جائینگے لیکن مسلمانوں کا کانگرس کے باہر رہ کر

ایک لاینحل مسئلہ بنا رہنا اِتنا بُرا نہیں ہے جتنا بُرا یہ ہے کہ وہ کانگرس میں آکر کانگرس سے اند
عقدۂ لاینحل بَن جایئں۔ اِس لیئے گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے وہی
سب سے بہتر طریقہ ہے جو اُنکے بنیادی اُصول یعنی عدم تشدّد اور صداقت پر مبنی ہے ٭

بہرحال اسوقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کانگرس
اور پروگرام میں باہم گہرا تعلق ہے۔ نیز اسکے تمام مختلف پروگرام بھی ایک دوسرے کے ساتھ ا
جڑے ہوئے ہیں جیسے جسم کے ساتھ اعضائے جسم۔ اِس لیئے کسی ایک پروگرام کو دوسرے پروگرا
جُدا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی ذی رُوح جسم کے اعضا کو چیر پھاڑ کر کے جُدا جُدا کرنا ٭

عقیدہ اور پروگرام کا یہ اتحاد ہی دراصل گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کا دوسرا نام ہے۔ یہ فا
صفات کے لحاظ سے انقلابی ہے۔ لیکن اِس انقلاب میں تشدد کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ اس انقلا
اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم زندگی کو دیکھنے کا نیا نقطۂ نظر پیدا کریں۔ اور ہر چیز پر ایک بالکل نئی حیثیت
ڈالیں یا ایک رُوحانیت پرست کی زبان میں یوں کہیئے کہ ہم چیزوں کی ابدی و سرمدی حقیقت
کریں اور پھر اپنی زندگی کو اسکے مطابق ڈھالیں ٭

لیکن تمام اُصول اور پروگرام بیکار رہیں تاوقتیکہ انکو چلانے والی عملی شخصیت موجود نہو یہ شخ
غیر محسوس اصولوں اور پروگراموں کا محسوس مجسمہ ہوتی ہے۔ آج کل اِس قسم کی شخصیت صرف گاندھ
شخصیت ہے اسلیئے اگرچہ اُن کی بعض اسکیمیں بظاہر موجودہ زمانہ کے لحاظ سے نامناسب نظر
پھر بھی ان میں عجیب و غریب طاقت ہوتی ہے۔ گاندھی جی کا فلسفہ ایک مکمل انقلابی فلسفہ
اور سچائیوں پر مبنی ہے وہ ہماری ساری زندگی کو ایک بالکل نئے سانچے میں ڈھال دینا چا
یہی وجہ ہے کہ وہی گاندھی جو ایک زمانہ میں کونسلوں میں جانے کا شدید مخالف تھا۔ ا
کونسلوں میں جانیکا حامی ہے۔ بلکہ عہدے قبول کرنے کے حق میں بھی ہے۔ اور پھر اس کی
کیجیے کہ جیسے ہی کانگرسیوں نے وزارت کی کرسیاں سنبھالیں۔ اُس نے فوراً ہی اسکیم

شروع کر دیں ــــــــ شراب کی بندش کی اسکیم، تعلیم کی ایک بالکل نئی اسکیم۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ کانگرس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائیگی۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ کسی اسکیم کو کسی اور فلسفۂ زندگی کے اصول پر چلا سکیں کانگرسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ پر نہیں لگا یا جا سکتا یہ فلسفہ زندگی دُنیا کے کسی اور فلسفہ زندگی کا ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس سوشلسٹوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سوشلزم اور گاندھی ازم بالکل جُدا جُدا چیزیں ہیں جن میں کوئی مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

بہر حال گاندھی جی کا فلسفہ زندگی ایک ایسا مکمل فلسفہ ہے۔ جس سے اجتماعاً قوم بھی صحیح رہبری حاصل کر سکتی ہے اور فرداً فرداً اشخاص بھی اس سے سیدھا راستہ پا سکتے ہیں اصول اور پروگرام دونوں ایک ہی ہیں۔ اِس لیئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کانگرس کے فلاں پروگرام کو تو مانتے ہیں۔ لیکن اُس کے فلاں اصول کو نہیں مانتے، کیونکہ گاندھی جی کے اصول وپروگرام میں ذی رُوح جسم کے مختلف اعضا کا سا تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں اور دونوں ملکر قوم سے ایک خاص نوع کی زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اسی مطالبہ کی روشنی میں تعلیم کا نیا نظام ترتیب دیا گیا ہے۔ چرخہ، کھادی، دیہات سُدھار، اچھوت اُدھار، ہندو مسلم اتحاد وغیرہ وغیرہ سب ایک ہی اصول کے ماتحت ہیں۔ اور جب تک اس اصول کو نہ سمجھا جائے ان چیزوں کی اصلیت، نیز ان سب کے باہمی ربط کو سمجھنا مشکل ہے۔ اِس ایک ہی اصول کے پیشِ نظر گاندھی جی نے تعلیم کی ایک نئی اسکیم تیار کی ہے۔ اِس تعلیم کے ذریعہ بچوں کو گاندھی جی کی نئی سوسائٹی میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لیئے تربیت کیا جائے گا اِس نئی سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق بچوں کی ذہینت کو ڈھالا جائے گا۔ بنا بریں تعلیم کی اسکیم کو گاندھی کے سیاسی و معاشرتی پروگرام کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیئے"۔

مقالہ افتتاحیہ | صفحہ ۴ پر آچاریہ کرپلانی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جو مضمون شائع کیا جا رہا ہے، وہ کانگرس کے تقریباً ۹۵ فیصدی ممبروں کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اِس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) آج سے پہلے کانگرس صرف ایک سیاسی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب سے گاندھی جی کا اثر اسپر غالب ہوا ہے۔ یہ صرف سیاسی جماعت نہیں رہی، بلکہ اُسکا دائرہ عمل اخلاق، معاشرت اور روحانیات سب پر حاوی ہوگیا ہے۔ اب کانگرس، گاندھی جی کی رہنمائی میں ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ایک انقلاب بپا کر دینا چاہتی ہے۔

(۲) یہ انقلاب ہماری زندگی کو بالکل اُسی طرح بدل دیگا۔ جس طرح فرانس اور روس کے انقلاب نے وہاں کی ہر چیز کی قدر و قیمت اور ہر رسم و رواج کی نوعیت و حیثیت کو یکسر متغیر کر کے رکھ دیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگرس اس انقلاب کو تشدد سے نہیں، عدم تشدد سے لانا چاہتی ہے۔

(۳) گاندھی جی ہم کو ایک نئی زندگی اور ایک نئی سوسائٹی سے رُوشناس کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے مختلف موانع کے باوجود انھوں نے کانگرس کو منتخب کیا ہے۔

(۴) اس انقلاب کا عملی نمونہ وہی ہے جو ہمیں گاندھی جی کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

(۵) کانگرس کے ہر ممبر کے لیئے ضروری ہے کہ وہ گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو دنیا کے تمام دوسرے فلسفہ ہائے زندگی سے بہتر سمجھے۔ اور کانگرس کے پروگرام کو گاندھی جی کے فلسفہ کی روشنی میں دیکھے۔ جو شخص ایسا نہیں کرسکتا وہ کانگرس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

(۶) گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی اور اُنکے عملی پروگرام میں ایک ذی روح جسم کے مختلف اعضاء کا سا تعلق ہے۔ اس لیئے یہ ناممکن ہے کہ آپ صرف پروگرام کو مانیں اور اصول کو نہ مانیں یا ان میں سے کسی ایک جزو کو مانیں اور دوسرے کو نہ مانیں۔ بہ الفاظِ دیگر:۔ جو شخص گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو نہیں مانتا، یعنی سیاست، معاشرت اور اخلاق و روحانیات وغیرہ کے متعلق انکا جو نقطۂ نگاہ ہے۔ اُس کی نظری یا عملی کسی شکل کو بھی کُلاً یا جزءً صحیح تسلیم نہیں

کرتا، وہ سچا کانگرسی نہیں بن سکتا ؛

(۷) علیٰ ہذا القیاس وہ لوگ بھی سچے کانگرسی نہیں ہیں جو صرف سیاسی آزادی کے مقصد میں کانگرس سے متحد ہیں۔ لیکن تمدنی، معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی نظریوں میں گاندھی جی سے اختلاف رکھتے ہیں ؛

(۸) ہم نہیں چاہتے کہ جب تک مسلمان ان باتوں کو نہ مانیں کانگرس میں داخل ہوں اسلیئے کہ ابتک تو وہ کانگرس کے باہر ہمارے لیئے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اپنے موجودہ عقائد ہی کے ساتھ وہ کانگریس میں داخل ہوگئے تو پھر کانگریس کے اندر ہمارے لیئے اِس سے کہیں زیادہ مصیبت بنجائیں گے ؛

(۹) گاندھی جی نے وزارتیں قبول کرنے کا مشورہ صرف اسلیئے دیا ہے تاکہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق وہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب برپا کرسکیں، تعلیم کی جدید اسکیم اس انقلاب کا پہلا دروازہ ہے۔ اس اسکیم کے ذریعہ نئی نسل کی ذہنی تربیت گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کے مطابق کی جائیگی ؛

اتحاد کے بجائے ادغام

یہ تمام باتیں مسلمانوں کے لیئے قابل قبول ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ آجکل قومی اتحاد و یکرنگی کا جو نظریہ ہے اُس کی رُو سے ان کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔ آپ نیشنلزم کے قائل ہوں یا سوشلزم کے، دونوں صُورتوں میں آپ کا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے فلسفۂ زندگی کی کم ازکم بنیاد ایک ہو گاندھی جی یہی چاہتے ہیں، اور چونکہ وہ ہندو ہیں اور ہندو بھی نہایت پرجوش و راسخ العقیدہ قسم کے، اسلیئے قدرتاً اُن کی خواہش ہے کہ اس فلسفہ زندگی کی بنیاد ہندو فلسفہ، ہندو تاریخ۔ اور ہندو روایات پر ہو، اُردو کے مقابلہ میں ہندی کو فروغ دینے کی جو دیوانہ وار کوششیں اُنھوں نے کیں اور کر رہے ہیں وہ اسی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اچھوتوں کو ہندوؤں میں شامل کرنے کے لیئے انھوں نے اپنی جان پر کھیل جانیکی جو دھمکی دی تھی اس کی تہ میں بھی صرف یہی تمنا کام کر رہی تھی اور اب ودیا مندر اسکیم اور واردھا

اسکیم کے نام سے تعلیم کی جو اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ اُن میں بھی یہی آرزو چھپی ہوئی ہے۔ لیکن ہم اس آرزو کو کسی بدنیتی، خباثت، یا شرارت پسندی پر محمول نہیں کر سکتے۔ گاندھی جی ایمانداری سے جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، اُسے رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اس سلسلہ میں گاندھی جی کو بُرا بھلا کہنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ ان حالات میں مسلمانوں کا سیاسی رویہ کیا ہونا چاہیئے۔ یعنی آیا وہ ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے ساتھ اس طرح مل جل جانا چاہتے ہیں کہ یہاں جاپان و جرمنی کی طرح ایک قوم پیدا ہو جائے، یا وہ اپنی تہذیبی اور معاشرتی خصوصیتوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر:- آیا آپ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و اشتراک چاہتے ہیں یا ادغام و انضمام؟

کچھ دن ہوئے راقم الحروف نے اِن خطرات کو حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کی خدمت میں پیش کر کے اُن سے دریافت کیا تھا کہ:-

> مسلمان کانگرس میں صرف حصولِ آزادی کے مقصد میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراک کرنے کے لیے داخل ہوئے ہیں، وہ نیشنلزم یا سوشلزم کے یورپی نظریوں کے قائل ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن آج نیشنلزم یا سوشلزم کا کھلا ہوا پرچار ہو رہا ہے، جس سے عام دماغ قدرتًا متاثر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہو۔ آیا وہ کانگرس میں رہ کر اس قسم کے خیالات کی تردید کریں یا اُن پر سکوت اختیار کریں لیکن تردید کرنا بے سود ہے۔ اور سکوت کرنا مضر، پھر علاج کیا ہو ___؟

اس پر مولانا نے ارشاد فرمایا تھا کہ:-

> "دفاعی قومیت اسلام کے منافی نہیں، البتہ ہجومی (جارحانہ) قومیت اسلام کے منافی ہے، مگر اسوقت ہماری جدوجہد میں سوال ہجومی قومیت کا نہیں بلکہ دفاعی قومیت کا ہے۔ یعنی اسوقت ہمارے سامنے ہندوستان کو غاصبوں کے چنگل

سے نجات دلانے کا سوال ہے سو اس امر میں مسلمان کو ہندوؤں کے ساتھ ایک قوم بنکر دفاع کی کوشش سے پرہیز نہ کرنا چاہیئے۔ اس قسم کی قومیت اسلامی توسع کے خلاف نہیں۔ مسلمان کو صاف طور سے یہ اعلان کر دینا چاہیئے۔ اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیئے۔ کہ وہ ہندویت میں جذب ہونے کے لیئے ایک لمحہ کے واسطے بھی تیار نہیں۔ بحیثیت مسلمان کے اُن کی جو تہذیبی خصوصیات ہیں ان کو وہ نہ صرف باقی رکھیں گے، بلکہ اُن کو ترقی دینگے۔ کانگریس میں شریک ہونے اور ملک کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلمان اپنی کسی ایک ملی خصوصیت کو بھی چھوڑ دیں" +

لیکن کرپلانی جی کے مذکورہ بالا اعتراف اور گاندھی جی اور اُنکے پرستاروں کے مسلسل عمل کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے اِن خیالات سے بالکل متفق نہیں ہیں۔

مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ :-

"ہمیں اسوقت مستقبل کا پورا نقشہ ترتیب نہ دینا چاہیئے، بلکہ صرف راستہ کے پتھر ہٹانے چاہئیں، یہ نہ سوچنا چاہیئے کہ پانی جو آرہا ہے وہ اپنا رُخ کدھر بنائے گا اور کون سا راستہ اختیار کرے گا۔ اس چیز کو مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیئے"

چنانچہ جو مسلمان کانگریس میں شامل رہے انھوں نے حصولِ آزادی کے سوا باقی اور تمام باتوں کو چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھ کر نظر انداز کیا۔ لیکن اُسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کا سوال تو ہنوز ایک اُمید بعید بنا ہوا ہے۔ البتہ زندگی کا نقشہ روز بروز تیار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر ہندوستانی کے دماغ پر اس نقشہ کے نقوش منقش کیئے جا رہے ہیں، بالخصوص وزارتوں کے قبول کے بعد تو یہ کام کافی تیزی کے ساتھ جاری ہو گیا ہے۔ اس لیئے اب بھی مسلمانوں کا صرف راستہ کے پتھر ہٹاتے رہنے پر اکتفا کرنا اپنی ملی ہستی کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کے مترادف ہوگا +

ہندو مسلم کشیدگی کا سبب کون ہے ؟

گاندھی جی نے ایبٹ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ

"مجھے اپنے باپ کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب راجکوٹ کے ہندو اور مسلمان آپس میں
شیر و شکر رہتے تھے اور ایک دوسرے کی خانگی تقریبات اور شادی بیاہ کی رسوم میں
حقیقی بھائیوں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زمانہ پھر آئے گا"

لیکن گاندھی جی کتنے ہی بھولے بنیں، وہ اس حقیقت کو جھٹلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ انکے باپ زمانہ کے خوشگوار دنوں کو بدل کر ہندو مسلم اتحاد کو ہندو مسلم کشیدگی میں تبدیل کرنے کی زبردست ذمہ داری خود گاندھی جی پر عائد ہوتی ہے گاندھی جی نے یہ کوشش کی کہ ہندوؤں کی قدیم معاشرت و تصورات کو زندہ کیا جائے اور پھر مسلمانوں سے اشتراک کے بجائے ادغام کا مطالبہ کیا جائے گا۔ گاندھی جی کے باپ کے زمانہ میں سیاست و معاشرت کو گڈمڈ کرکے یہ کوشش نہیں کی جاتی تھی کہ ہندو مسلمان سب ایک ہی فلسفۂ زندگی کی اتباع کریں۔ اس زمانہ میں یہ کوشش نہ ہوتی تھی کہ چونکہ اُردو میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اس لیے اُسے چھوڑکر "ہندی اتھوا ہندوستانی" بولو، نہ اُس زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ چونکہ فلاں لباس یا فلاں طریق بود و ماند مسلمانوں کا لایا ہوا ہے اسلئے اُسے ترک کرو اس زمانہ کی کانگرس کے پنڈال میں "بھوجنالہ" کے اندر رسوئی پر وسنے" کی کوشش نہیں ہوتی تھی ——— غرض اُس زمانہ میں اُن باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تھی جو گاندھی جی کے طفیل سے اب پیدا ہوگئی ہیں۔ اور ابھی کیا ہے

شور و شغب کی راتوں کو ہمسائے تنہا رہے کیا روئیں
ایسے فتنے کتنے اُٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

جو ہندو مسلم اتحاد و اتفاق صرف اس لئے تھا کہ اُس زمانہ میں

کیا ہو؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہو؟ یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمان کانگرس میں اس لیے نہیں گئے ہیں کہ آچاریہ کرپلانی کے بیان کے بموجب گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو دُنیا کے تمام دوسرے فلسفوں پر ترجیح دیکر اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔

اُنکا مقصد ہندوں کے ساتھ صرف سیاسی اشتراک ہے لیکن اسوقت مطالبہ ہے، سیاسی معاشرتی اور تہذیبی ادغام کا۔ آج کل کانگرس کی جدوجہد صرف یہی ہے۔ صرف اسی وجہ سے اڑیسہ اور سی پی میں مُسلمان وزیر لینے سے انکار کیا گیا۔ اور اسی بنا پر مشترک انتخاب کو رائج کرنیکی کوشش ہے اسی طرح اور بہت سی باتیں ہو رہی ہیں جنکی بنیاد صرف اس تصور پر ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ تہذیبی حیثیت کو فنا کر کے ہندوستان کی متحدہ قومیت میں انہیں جذب کر لیا جائے اب تک مسلمان ان کوششوں کا مقابلہ کرتے تھے، لیکن اب کانگرس کے آئین کی ترمیم اور ڈسپلن کی سختی کے بعد یہ بھی ممکن نہیں۔ بائیں بازو سے مسلمانوں کو کچھ توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ ترمیم شدہ آئین کی رُو سے شہر کے مقابلہ میں دیہات کے نمائندوں کی تعداد بڑھا کر ہمیشہ کے لیئے یا کم از کم ایک غیر معین مُدت کے لیئے بائیں بازو کو منسوخ کر دیا گیا ہے، سوبھاش چندر بوس کو اخراج کا فرمان مل ہی چکا ہے اور اسی طرح اور جو لوگ گستاخی کے مرتکب ہوں گے انکا کان پکڑ کر باہر نکال دیا جائیگا۔ گاندھی جی جو آج کل کانگرس کے آئینی ڈکٹیٹر ہیں اُنکا حال جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ پھر کانگرس کو مسلمانوں سے پاک رکھنے کی جو منظم کوششیں کی جا رہی ہیں وہ بھی کسی سے پُوشیدہ نہیں۔ صاف طور پر یہ چاہا جاتا ہے کہ اگر مسلمان کانگرس میں آتے ہیں تو صرف اِس طرح آئیں ـــــــــ

"جیسے دریوزہ گری کرنے کو گدا آتے ہیں!"

بہت سی بے عنوانیاں صرف اِسی غرض سے کی جاتی ہیں جن میں سے بعض کو تو نادانستہ غلطی کہہ کر تسلیم کر لیا جاتا ہے اور بعض کی تاویل یہ کر دی جاتی ہے کہ "کیا کریں مسلمان آتے نہیں اب ہم لوگوں کو کہاں تک روکیں"

سُبحان اللہ پہلے تو مسلمانوں کو آنے سے رُوکا جاتا ہے اور جب وہ نہیں آتے تو پھر اُنہیں موردِ عتاب بنایا جاتا ہے +

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں تو بھی تو دِلدار نہیں

(دوسری قسط۔ مدینہ مورخہ ۲۱ ش/۳۹)

پچھلے پرچہ میں جو کچھ کہا جا چکا ہے، اُس سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ اب کانگرس محض ایک سیاسی جماعت نہیں رہی بلکہ اب یہ معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی جماعت بھی ہوگئی ہے۔ اب یہ گاندھی جی کی رہنمائی میں سیاسی انقلاب بپا کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور آدابِ اخلاق میں بھی ایک انقلاب رُونما کر دینا چاہتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں نانگا پربت سے لیکر راس کماری تک ہماری معاشرت تہذیب و تمدّن زبان اور اخلاقی و رُوحانی ضابطہ بُنیادی اور اُصولی طور پر ایک اور صرف ایک ہو۔ اور آج سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں ہندو مسلمان کے آداب معاشرت اور آئینِ اخلاق میں جو امتیاز نظر آتا ہے، وہ یک قلم فنا ہو جائے۔ یہ وہی تصور ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مُسلمان اِس چیز کو قبول کرنے کے لیئے تیار ہوسکتے ہیں؟ اسکا جواب صاف ہے۔ اُن چند مُسلم سوشلسٹوں اور نیشنلسٹوں کو چھوڑ کر جو اسلامی اُصول و آئین کو دفترِ پارینہ سمجھ کر "غرقِ مے ناب" کر دینا چاہتے ہیں یا اُن چند افراد سے قطع نظر کر کے جو تجدد و انتہا پسندی کے شوق میں زمانہ کی رُو کے ساتھ بہتے رہنا ہی باعثِ فخر سمجھتے ہیں، باقی تمام مُسلمان اِس قسم کی نیشنلزم کو قبول کرنے کے لیئے نہ تیّار ہیں نہ ہونگے۔ اور نہ ہوسکتے ہیں مولانا ابُوالکلام آزاد اِسوقت مُسلمانوں میں سب سے زیادہ ممتاز و راسخ العقیدہ کانگرسی ہیں اور گزشتہ ۲۰ سال سے آج تک ایک لمحہ کے لیئے بھی انہوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ لیکن پھر بھی وہ صرف دفاعی نیشنلزم کے قائل ہیں۔ ہندوستان کے تعمیری اور اصلاحی نظام میں ہندو مسلمانوں کو ازروئے معاشرت و تہذیب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مدغم کر دینا کہ مسلمانوں کی جُداگانہ ملّی حیثیت فنا ہو جائے، مولانائے ممدوح کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔ یہی حال جمعیتہ علما کے اُن مقتدر ارکان ہے جو کانگرس کی حمایت میں سب سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ پیش پیش ہیں۔ علاوہ ازیں عام کانگرسی خیال کے مسلمانوں کا بھی یہی نقطہ نظر ہے ——

لیکن افسوس ہے کہ اس کے باوجود آج تک اُن حضرات نے کبھی اِس پر غور نہ کیا کہ موجودہ تبدیل شدہ حالات میں اُنکا عملی پروگرام کیا ہونا چاہیئے۔ انھوں نے کانگرس کی حمایت کا اعلان آج سے بیس پچیس سال پہلے اس زمانہ میں کیا تھا جب کانگرس خالص سیاسی جماعت تھی اور جب مسلمانوں کے جداگانہ تہذیبی و معاشی امتیازات کو متحدہ قومیت میں جذب کرنے کا نصب العین کانگرس کے سامنے نہ تھا۔ لیکن اب کرپلانی جی جیسی ذمہ دار شخصیت اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ جب سے گاندھی جی کانگرس کے سیاہ و سفید کے مالک ہوئے ہیں یہ صرف سیاسی انقلاب ہی نہیں چاہتی، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کو بھی وطنیت و قومیت کے اُصول کے بموجب تبدیل کر دینا چاہتی ہے۔ ان بزرگوں کو اپنے سابقہ عقائد و خیالات کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کرنی چاہیئے اور نئے ارادوں اور منصوبوں نے حالات میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر چیز کا جائزہ لینا چاہیئے۔

آزادی

اب صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ "پہلے آزادی لے لو پھر مستقبل کے نقشے بنانا۔" آزادی جتنی کچھ ملنا تھی مل چکی۔ اور ہندوستان کی عظیم اکثریت اُسے قبول بھی کر چکی۔ یہ خیال کہ فیڈریشن کے سوال پر کانگرس وزارتوں کو چھوڑ کر پھر انقلابی جد و جہد میں مصروف ہو جائیگی ایک خیال خام نظر آتا ہے اور پھر اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ کیا ہوگا؟ اِس سوال پر غور کرتے وقت ہمیں محض پرجوش جذبات یا دور از کار موہوم تصورات سے کام نہ لینا چاہیئے۔ "ہم کبھی فنا نہیں ہوسکتے۔ ہم تو نو کروڑ ہیں۔ ہم نے بدر و حنین میں کم ہونے پر بھی فتح پائی ہے۔ شمال میں اسلامی ممالک کا ایک لمبا سلسلہ یورپ و افریقہ تک چلا گیا ہے جو ہر وقت ہماری مدد کریگا۔۔۔۔۔۔" اس قسم کی جذباتی یا افسانوی باتوں سے قوموں کی تقدیریں بگڑا ہی کرتی ہیں بنا نہیں کرتیں۔

پھر یہ صحیح ہے کہ کانگرس میں بائیں بازو کے نام سے جو جماعت بن رہی ہے وہ یقیناً آگے چلکر طاقت حاصل کرے گی اور انقلابی جدوجہد کے جس سررشتہ کو وزارت پسندوں نے چھوڑ دیا ہے اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔ لیکن اس جماعت کی انقلاب پسندانہ نکتہ چینیوں کو سُنکر ہمیں یہ بھُول نہ جانا چاہیئے کہ اسوقت جو کچھ ہو رہا ہے اُسے یہ جماعت ناپسند نہیں کرتی۔ بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور چاہتی ہے بخلاف اسکے مسلمان موجودہ حالت کو ناپسند بھی کرتے ہیں، بائیں بازو قومیت و وطنیت کے مسئلہ میں گاندھی جی سے سو فیصدی متفق ہے۔ اس بارے میں اُسکا نظریہ بالکل وہی ہے جو گاندھی جی کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ موجودہ اختیارات کو ادھورے سمجھ کر زیادہ وسیع اختیارات چاہتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ان اختیارات کے ملجانے پر اُسکا عمل بھی بجنسہٖ بعینہٖ وہی ہوگا جو آج دائیں بازو کا ہے۔

مسلمانوں کا نقطہ نظر

مسلمان کانگرس میں کیوں نہیں آتے؟ ہم اِس سوال کے جواب میں اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ ـــــ مسلمان بےحس ہیں، جاہل ہیں، سیاست سے ناآشنا ہیں، اب تک صرف مذہب کے نام پر اُبھارے گئے ہیں، اِس لئے آج بھی یہی چاہتے ہیں، اُنکے لیڈر مکّار و غدار ہیں، وہ انہیں مذہب کے نام پر دھوکا دیکر اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں، مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے، وہ ہر وقت ایران و عرب کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، وہ واقعات کی دُنیا کے بجائے خیالی دنیا میں بسنا چاہتے ہیں اُنہیں پان اسلامزم (اخوتِ اسلامیہ) نے غلط توقعات دِلا رکھی ہیں، وہ انگریز کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اگر اِن تمام باتوں کو صحیح مان لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اب تک ان کی اصلاح کیوں نہ کی ؎

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

اگر واقعی مسلمانوں کے کانگرس میں نہ آنے کی وجہ صرف اسی قسم کے چند غیر حقیقی اسباب ہوتے تو اُنکا دُور کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے تو پھر موجودہ حالات کا کوئی نہ کوئی حقیقی سبب تو ہونا چاہیئے۔

دِل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا۔

ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ کانگرس یا کانگرسی حکومتیں مُسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتیں اور اس لیئے وہ لوگ یقیناً جھُوٹے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کانگرسی حکومتوں میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے، اذان دینے، قرآن کی تلاوت کرنے یا اسی قسم کے اور مذہبی معاملات کو بجالانے میں دقتیں پیدا کی گئی ہیں یا آئندہ کی جائیں گی۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا از روے معاشرت، تہذیب و تمدّن اور سیاست ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اس طرح ایک قوم بنکر رہیں جیسے انگلستان میں یہودی اور عیسائی رہتے ہیں یا اپنی تمام موجودہ امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ اس طرح رہیں جیسے کناڈا میں انگریز و فرانسیسی رہتے ہیں۔ یعنی آیا وہ ہندوؤں کے ساتھ معجون مرکب بن کر ایک ہو جائیں یا اپنے تمام امتیازات کو باقی رکھتے ہوئے اُنکے ساتھ صرف اتحاد و اشتراک کے پیوند سے منسلک ہو کر رہیں؟ سوال کی اصلی اور حقیقی نوعیت صرف یہی ہے اور ہمیں صرف اسی پر غور کرنا چاہیئے۔

اتحاد کے امکانات

لیکن اِسوقت صُورتِ حالات یہ ہے کہ اتحاد کے امکانات ایک ایک کرکے ختم کیے جارہے ہیں اور مسلمانوں کو صرف ادغام کی دعوت دی جارہی ہے۔ کبھی اُنہیں معاشی پروگرام کے نام پر بلایا جاتا ہے اور کبھی روٹی کے سوال پر، کبھی لینن کے اُصول دکھلا کر اور کبھی مارکس کا نام سُنا کر۔ حالانکہ

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا!
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور پھر مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ان اصلاحات و انقلابات کا قلم اُس کی قدیم روایات و تاریخ کی شاخ پر نصب کیا جائے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ماضی سے یکسر بے تعلق ہو کر صرف راماین و مہابھارت کی زمین پر اپنی عمارت قائم کرنے پر وہ راضی ہو جائے۔

بہرحال اِس وقت سوال یہ ہے، اور یہ سوال کوئی ایسا سوال نہیں جو صرف آج پیدا ہو رہا ہے، دُنیا میں جہاں کہیں اس قسم کے حالات پیدا ہوئے ہیں، وہاں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ کناڈا، سوئٹزرلینڈ، اور رُوس وغیرہ کی پچھلی ایک صدی کی تاریخیں اس قسم کے حالات کو دُہرا چکی ہیں، بنابریں ہندوستان کے حالات کو آنکھیں بند کر کے انگلینڈ و امریکہ پر قیاس کر لینا اور پھر جمہوریت کا نام لے کر مسلمانوں کو اپنی ملّی ہستی فنا کر دینے کی ترغیب دینا کبھی کارگر نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ عام کانگرسی مسلمانوں میں بالعموم اور علمائے کرام کے طبقہ میں بالخصوص بہت کم ایسے افراد ہیں جو مسئلہ کی اِس پیچیدہ و غور طلب نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اب اِس قسم کی سہل انکاری روز بروز نقصان رساں ہوتی جا رہی ہے مسلم لیگ نے ہندوؤں پر بے حجابانہ تبرا کرنے کی جو رسم ڈال دی ہے وہ اگرچہ مسلمانوں کے لیئے نقصان رساں ہے۔ لیکن پھر بھی اہنیں اپیل کرتی ہے۔ اِسلیئے اِس وقت اِس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کانگرس سے مندرجۂ ذیل باتیں طے کرائی جائیں

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی حیثیت بالکل جُدا رہے گی اور متحدہ قومیت کے اُصول کے بموجب ہندوستان کی دوسری اقوام میں اُن کو مدغم نہ کیا جائے گا۔

(۲) آچاریہ جی کے بیان کردہ نیشنلزم کے بموجب ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو ایک ہی فلسفۂ زندگی کی زنجیر میں نہیں جکڑا جائیگا بلکہ اُنکے ملّی و قومی امتیازات کو باقی رکھ

جائے گا۔

(۳) بجز دفاعی قومیت کے مسلمانوں کے وجود کو قریب قریب ایک جُدا قوم کے ہم پلہ سمجھا جائے گا۔ اور انکے ساتھ ادغام نہیں بلکہ اتحاد و اشتراک کا سلوک ہوگا۔ پھر صرف اس اعلان ہی سے کام نہ چلے گا بلکہ ضرورت اس کی بھی ہے کہ ہمارے کانگرسی لیڈران چیزوں پر کانگرس اور کانگرسی حکومتوں سے عمل بھی کرائیں تاکہ ذہنیت کی تبدیلی کا علم عوام کو ہوسکے"۔

یہ ہے وہ تبصرہ جو آچاریہ کرپلانی کے بیان پر معاصر مدینہ نے اپنی دو اشاعتوں میں کیا اس میں شبہ نہیں کہ آچاریہ جی کا بیان ہے ہی ایسا کہ جو شخص بصارت کے ساتھ کچھ بھی بصیرت رکھتا ہے وہ اربابِ کانگرس کے اصلی منصوبوں کے متعلق مزید دھوکے میں نہیں رہ سکتا۔ بایںہمہ معاصرِ مدینہ مستحق تبریک ہے کہ اُسنے اظہارِ حقیقت میں اتنی جرات سے کام لیا۔ ورنہ مسلکِ قومیت پرستی کا تقاضا تو کچھ اس قسم کی مصلحت کوشی تھی جس کا ثبوت ہمارے بڑے بڑے نیشنلسٹ علما و زعماء کیطرف سے ایسے مقامات پر بالعموم ملا کرتا ہے۔ مثلاً آچاریہ جی کا بیان مسلم قومیت پرست حضرات میں سے ہر ایک کی نظر سے گزرا ہوگا۔ لیکن آقایانِ واردھا کی خوشنودیِ مزاج کا جذبہ کچھ اس انداز سے گلوگیر ہو رہا ہے کہ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی اسکی نسبت نہیں نکل سکا۔

معاصر مدینہ نے اس بیان سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کی صحت میں کسے شبہ ہو سکتا ہے لیکن ہمیں افسوس ہوا کہ اس مشکل کا جو حل اس نے تجویز کیا ہے وہ (اشربوا فی قلوبھم العجل) کے مطابق۔ کانگرسی دیوتاؤں کی اس عقیدت و محبت کا پردہ نہ ہوتا تو وہ دیکھ لیتا کہ جس طریقِ کار کیطرف وہ دعوت دے رہا ہے اس میں کس قدر اُصولی اور منطقی غلطیاں ہیں۔ مثلاً علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ "کانگرس سے یہ طے کرا لیا جائے کہ ہندوستان میں مسلمانوں

ع کی صاف صاف غمازی کر رہا ہے جو ایک مدت کی گوسالہ پرستی سے ان کی رگ رگ میں رچ چکی ہے اگر ہمارے معاصر کی آنکھوں پر اس محبت و عقیدت

کی تہذیبی اور معاشرتی حیثیت بالکل جداگانہ رہیگی اور متحدہ قومیت کے اصول کے بموجب ہندوستان کی دوسری اقوام میں ان کو ہضم نہ کیا جائے گا" اس کی بابت امور ذیل غور طلب ہیں :-

(۱) اس تجویز میں یہ نہیں واضح کیا گیا کہ کانگرس سے یہ باتیں طے کون کرائے۔ ظاہر ہے کہ طے کرانے والے مسلمان ہونگے۔ تو سب سے پہلے ہمارے معاصر نے غیر محسوس طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ کانگرس کسی غیر مسلم ادارہ کا نام ہے۔ ورنہ اگر کانگرس کو ایک مشترکہ ادارہ تسلیم کیا جائے اور اس میں سے ایک عنصر (مسلمان) اس سے الگ ہو کر کچھ شرائط طے کرانا چاہیں تو کانگرس اسوقت مکمل کانگرس نہیں رہے گی۔ بلکہ "کانگرس منفی مسلمان" ہو گی۔ لہذا یہ منطقی طور پر غلط ہے کہ "کانگرسی مسلمان کانگرس سے یہ شرائط طے کرائیں"۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہا جائے کہ "فلاں سوسائٹی کے ممبروں کو چاہیئے کہ سوسائٹی سے فلاں فلاں شرطیں طے کرالیں۔ جب تک مسلمان کانگرس سے الگ نہیں ہوتے۔ اور کانگرس کو ایک غیر مسلم ادارہ تسلیم کیا جاتا۔ اس سے شرائط طے کرانے کا سوال بے معنیٰ ہے :-

(۲) کانگرس اگر ایک مشترکہ ادارہ ہے تو اُس کی ہستی ہی متحدہ قومیت کے اصول پر قائم ہے آج کانگرس سے یہ حقیقت تسلیم کرا لیجئے کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت نہیں بلکہ مختلف اقوام بستی ہیں۔ پھر دیکھئے کہ کانگرس کا وجود کس طرح ہوا میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں پہونچکر کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے رُک جاتی ہے۔

(۳) کانگرس سے مجوزہ شرائط طے کرانے کے لیے کوئی مقابل کی جماعت ہونی چاہیئے نہ کہ افراد۔ مسلم قومیت پرست حضرات اپنے آپ کو کتنی ہی اہمیت کیوں نہ دے لیں یہ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت انفرادی ہے۔ جماعتی نہیں۔ مسلمانوں کی پوری جماعت (تھوڑے سے افراد کو چھوڑ کر) اُنکے مسلک کے خلاف ہے۔ اِس لیئے کانگرس سے اُنکا معاہدہ یا سمجھوتہ جماعتی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ کانگرس سے معاملات طے کرنے کے لیئے نہایت ضروری ہے کہ :۔

(۱) کانگریس کو غیر مُسلم اِدارہ تسلیم کیا جائے اور

(۲) اُسکے مقابلہ میں مُسلمانوں کی ایک جُداگانہ غیر مخلوط جماعت ہو جس سے کانگریس سمجھوتہ کرے۔ پھر اوراِس طرح

(۳) اِن دونوں جماعتوں میں من حیث الاقوام اتحادِ عمل ہو۔

یہی ہے وہ مسلک جس کی طرف ہم پہلے اُن سے دعوت دے رہے ہیں زیادہ نہیں تو کم ازکم ہمارا وہ پمفلٹ ہی مُلاحظہ فرمالیا جائے جو "مُسلم لیگ کا بُنیادی مطالبہ" کے عنوان سے بکثرت شائع ہوچکا ہے۔

(۴) معاصر مدینہ کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ "ایسے معاہدات کے لیے صرف اعلان ہی کافی نہیں" لیکن کافی کیا ہے؟ یہاں پھر معاصر موصوف نے یہ کہہ کر غلطی کھائی ہے کہ "ہمارے کانگرسی لیڈر کانگرس اور کانگرسی حکومتوں سے اسپر عمل کرائیں"۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ معاصر موصوف نے مُسلم قومیت پرست حضرات کی کانگرس میں بے بسی اور بے وقعتی کا کس بُری طرح سے اقرار کیا ہے۔ یعنی اُنکے پاس کوئی ایسی قوت نہیں، جس سے وہ اپنے مطالبات منوا سکیں۔ اور معاہدات کی پابندی کرا سکیں وہ اپنے آپ کو کانگرسی لیڈروں کے رحم وکرم پر چھوڑتے ہیں اوران سے درخواستیں کی جاتی ہیں کہ وہ کانگرسی حکومتوں سے اس بات پر عمل کرائیں تاکہ عوام کو اِس تبدیلیٔ ذہنیت کا علم ہو جائے!

ہم معاصر موصوف کی خدمت میں باادب گزارش کرینگے کہ معاہدات کی توقیر منت وسماجت سے نہیں ہوا کرتی بلکہ اپنے اندر قوت پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔ اور قوت پیدا ہوتی ہے اپنی مرکزیت۔ اپنی اجتماعیت اور اپنی جداگانہ ملی تنظیم سے۔

(۵) معاصر موصوف نے یہ کہہ کر "مُسلمانوں کے وجود کو قریب قریب ایک جدا قوم کے ہم پلّہ سمجھا جائے"۔ ایک طرف اپنی قائم کردہ عمارت کو بنیادوں سے ہلا دیا۔ اور دوسری طرف غیر شعوری طور پر اُس جذبۂ خوف کا مظاہرہ کیا ہے جو ہندوؤں کے سامنے اپنے آپ کو ایک

جُداگانہ قوم کی حیثیت میں پیش کرنے میں ہر قومیت پرست کے دل میں جاگزین ہے کیا معاصرِ موصوف کو مسلمانوں کے ایک مستقل غیر مخلوط۔ پوری پوری جُداگانہ "قوم" کے وجود میں شبہ ہے ؟ مسلمان قومیت پرست حضرات کی یہی ارتیابی کیفیت ہے جو اِن کو ہندوؤں کی غلامی سے نجات نہیں دِلا سکتی۔ اِن حضرات کو مسلمانوں کی جُداگانہ ملّی حیثیت میں یقین نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک افراد کو اپنے دعوے اور مسلک پر پورا پورا یقین نہ ہو۔ قوم کا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

---

(۶) سب سے بڑھ کر افسوسناک غلطی وہ ہے جو معاصرِ موصوف کو مولانا ابوالکلام آزاد کو "دفاعی قومیت" کے کھلونے سے لاحق ہوئی ہے۔ مولانا صاحب نے مسلکِ قومیت پرستی تو اختیار کر لیا لیکن چونکہ اِس مسلک سے اُنکا قلب کبھی ہم آہنگ نہیں ہوا۔ اِس لیئے وہ ضمیر اور مصلحت کی کش مکش کو ہمیشہ لفظی گورکھ دھندوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں اُن سے پوچھیے کہ یہ "دفاعی قومیت" کس بَلا کا نام ہے ! سوال بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں باہمی ادغام سے ایک قومیت کے رشتے میں پروئے جا سکتے ہیں یا نہیں اگر اس سوال کا جواب اُنکے نزدیک مثبت میں ہے تو یہی متحدہ قومیت دفاعی بھی ہوگی اور جارحانہ بھی۔ اگر اسکا جواب نفی میں ہے تو ایسی قومیت نہ دفاعی ہو سکتی ہے نہ جارحانہ۔ اگر "دفاعی قومیت" سے مطلب صرف اتنا ہے کہ انگریز کے مقابلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ محاذ قائم ہو تو اُسے "بین الاقوامی" معاہدہ کہا جائیگا۔ نہ کہ "دفاعی قومیت"۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں جب چند اقوام باہمی معاہدہ سے دوسری اقوام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیئے ہوئے تھیں تو ان معاہد اقوام کے اتحاد سے کون سی نئی "دفاعی قومیت" پیدا ہو گئی تھی ! اِن معاہد اقوام

نام "دوّلِ متحدہ" تھا۔ اسی طرح اگر ہندوستان میں مسلمان ایک جُداگانہ قوم ہیں اور ہندو الگ قوم۔ تو اِن دونوں کے اتحاد سے انگریز کے خلاف جو متحدہ محاذ قائم ہوگا تو اسکا نام زیادہ سے زیادہ "ہندو مسلم متحدہ محاذ" ہوسکتا ہے نہ کہ "دفاعی قومیت"۔ قومیت ہمیشہ باہمی ادغام سے اسوقت وجود میں آتی ہے۔ جب وہ مختلف اقوام جو اس متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی ہوں۔ اپنا اپنا جُداگانہ ملی تشخص کھو دیں۔ اس کو اتحاد نہیں کہتے۔ بلکہ ادغام کہتے ہیں۔ اتحاد میں ہر قوم اپنا اپنا جُداگانہ قومی تشخص برقرار رکھتی ہے۔ لیکن یہ باتیں تو ہم اسے سمجھائیں جسے معلوم نہ ہوں جو سب کچھ جانتا بُوجھتا۔ دیدہ دانستہ چشم پوشی کرے۔ اُسے کون سمجھائے۔ سوتے کو جگانا آسان ہے۔ لیکن جو جاگتا آنکھیں بند کرلے اُسے کون جگا سکتا ہے۔ ورنہ کیا آپ باور کرسکتے ہیں کہ مولانا آزاد "قومیت" اور "اتحاد بین الاقوام" میں بھی فرق کرنا نہیں جانتے! وہ جانکر قومیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اس سے ہندوؤں کا مطلب پُورا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی تاویل سے مسلمانوں کو تھپکیاں دیکر سُلانا چاہتے ہیں کہ میرا مطلب متحدہ محاذ سے ہے، ادغام سے نہیں۔ چلیئے!

گاندھی جی بھی خوش رہیں راضی رہے سرکار بھی

ہم اپنے معاصرِ موصوف اور اس طرح ہندوستان کے تمام مسلم قومیت پرست حضرات کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اب جبکہ خود کانگرس کے اتنے بڑے ذمہ دار عہدہ دار کی طرف سے کانگرس کا نصب العین اور مسلک واضح الفاظ میں سامنے آچکا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ حقائق کا مردانہ وار اعتراف کرتے ہوئے اپنی تبدیلیٔ مسلک کا واضح الفاظ میں اعلان کردیں اور یہ مسلک اسکے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ

(۱) مسلمانوں کی اپنی الگ غیر مخلوط جماعت ہو۔

(۲) اپنا جُداگانہ مرکز ہو۔

(۳) کانگریس کو غیر مسلم ادارہ تسلیم کیا جائے۔
(۴) اِن دونوں جماعتوں میں من حیث الاقوام معاہدہ کرکے مشترکہ مقاصد کے حصول
میں اتحاد و تعاون کیا جائے۔ اور
(۵) مسلمانوں کا نصب العین ہندوستان میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو۔
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

رُباعی

نگاہِ تو عتاب آلود تا چند
بُتانِ حاضر و موجود تا چند
دریں بُت خانہ اَولادِ براہیم
نمک پروردۂ نمرود تا چند

(اقبال)

(۱) برطانوی سنگینیں اور اہنسا کے پجاری

قارئین طلوع اسلام کو یاد ہوگا کہ جس زمانہ میں اسمبلی میں فوجی بل پیش ہوا ہے کانگرسی زعماء اور ان کے خانہ زاد غلامانِ ازلی نے لیگ کے خلاف کس قدر قیامت برپا کر رکھی تھی اور یہ بھی یاد ہوگا کہ ہم نے طلوع اسلام میں فوجی بل کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں بدلائل و براہین ثابت کیا تھا کہ وہی ہندو جو مسلمانوں کو مُوردِ الزام ٹھیراتے ہیں اس چیز کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ مُلک سے فوجی طاقت کم کر دی جائے۔ لیگ کے خلاف اس شور و پکار سے اُنکا مقصد صرف اتنا تھا کہ مُلازمت کے دیگر شعبوں کی طرح فوج میں بھی ہندو عنصر کی اکثریت ہو۔ ہندوؤں کی اس تحریک کے بعد کئی ایک مواقع ایسے آئے۔ جہاں انکے یہ خفیہ ارادے جن کی طرف ہم نے اپنے مذکورہ صدر مضمون میں اشارہ کیا تھا طشت ازبام ہوگئے آج کی صحبت میں ہم اِسی قسم کا ایک اور واقعہ درج کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں حکومتِ ہند کے محکمۂ فوج نے ایک حکم نافذ کر دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر صوبائی حکومتیں اپنے نظم و نسق کے قیام کے لیئے، فوجی خدمات کے لیئے درخواست کریں تو مقامی فوجی افسروں کو چاہیئے کہ اُسکے لیئے پہلے حکومتِ ہند کی اجازت حاصل کرلیں۔ معاملہ صاف تھا اس پر کسی کو اعتراض کیا ہو سکتا تھا، لیکن کانگرس کے ترجمان "ہندوستان ٹائمز" نے اپنی ۲۳ رجولائی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں اس پر ایک لمبا چوڑا شذرہ لکھکر اپنے قلبی اضطراب کا بری طرح مظاہرہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس نئے حکم کی رو سے صوبائی حکومتوں کو (جو اہنسا کے اوتار

گاندھی جی کے چیلوں کی حکومتیں ہیں، قیام امن میں سخت مشکلات پیش آجائیں گی۔ کیونکہ انہیں ضرورت کے وقت فوجی امداد فوراً حاصل نہیں ہو سکے گی اس کے بعد نہایت لجاجت سے دریافت کیا ہے کہ حضور! یہ تو فرمائیے کہ ہم سے آپ کو خدشہ کیا ہے جو اس طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں پھر یہ لکھا ہے کہ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ یو پی میں چار فوجی چھاؤنیاں توڑ دینے کا ارادہ ہے اگر ایسا ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صوبہ کی حکومت انتظام کس طرح قائم رکھ سکے گی۔

یہ ہیں اہمسا کے پرستار، عدم تشدد کے مجسمے۔ فوجی طاقت کے سب سے بڑے مخالف، اب آپ نے سمجھ لیا کہ برطانوی سنگینوں اور رام راج میں کیا تعلق ہے کیا اس حقیقت میں اب بھی کوئی شبہ ہے جس کی طرف ہم نے اپنے پہلے پرچہ میں اشارہ کیا تھا کہ ہندو چاہتا ہے کہ گائے کے سینگ انگریز پکڑے رہیں اور دودھ ہندو دوہیں۔ اس چیز کے بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ سنگینیں کن کے سینوں میں پیوست کرنے کے لئے طلب کی جاتی ہیں اس کا جواب کانپور، لکھنؤ اور بمبئی کے ان مظلوم مسلمانوں سے پوچھئے جن کے سینے اس لئے گولیوں سے چھلنی کر دئیے گئے کہ وہ حکومت کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج کیوں بلند کرتے ہیں اس ضمن میں سردار پٹیل کے یہ الفاظ فراموش کئے جانے کے قابل نہیں ہیں جو انہوں نے بھاؤنگر کے ریاستی باشندوں کی کانفرنس کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر مسلمان یہی کچھ کرتے رہے تو ملک میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی

---

(۲) عوام یا لیڈر

لیگ کی طرف سے جب کوئی مطالبہ پیش کیا جاتا ہے تو اسے فوراً یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ تو مسلمانوں کے چند خود ساختہ لیڈروں کے مطالبات ہیں مسلم عوام میں جائیے اور ان سے پوچھئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں چنانچہ مسلم رابطۂ عوام (Mass Contact) تحریک کی بنیاد ہی اس دلیل پر تھی کہ مسلم لیڈروں کی رائے قابل وقعت نہیں ہو سکتی عوام کی رائے قابل اعتماد ہوتی ہے اور اسے کانگرس براہ راست معلوم کرے گی۔ یہ تو ہے ارباب کانگرس کا رویہ مسلمانوں کے متعلق خود اپنے ہاں کیا حالت ہے

یہ بھی سن لیجئے۔ یو پی آسمبلی میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کے متعلق ایک مسودہ قانون کے ضمن میں تقریر کرتے ہوئے مسز لکشمی پنڈت نے فرمایا کہ جب ہم پبلک کی رائے ، کہتے ہیں تو ضروری نہیں کہ اس کا مفہوم رائے عامہ ہی ہو، پبلک کی رائے سے حقیقی مطلب ان لوگوں کی رائے ہوتا ہے جو پبلک کی راہ نمائی کرتے ہیں (ہندوستان ٹائمز ۲۳ رجولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی مسلمان لیڈروں کی رائے قطعاً قابل اعتنا نہیں کیونکہ وہ عوام کی رائے نہیں ہوتی لیکن ہندو لیڈروں کی رائے واقعی عوام کی رائے ہوتی ہے۔ بن آئی کی باتیں ہیں:-

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

---

(۳) کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ گاندھی جی کبھی صاف صاف نہیں بتائیں گے کہ سوراج سے ان کا مفہوم کیا ہے؛ اور وہ صاف صاف بات کہتے کون سی ہیں ؟ اول تو اس کے متعلق کہتے ہی کچھ نہیں لیکن اگر کبھی لب کشائی پر مجبور ہو جاتے ہیں تو کچھ اس انداز سے کہتے ہیں کہ

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

پچھلے دنوں نیویارک ٹائمز کے ایک نامہ نگار نے براہ راست سوال کر دیا کہ آزادی سے آپ کا مفہوم کیا ہے، اب سنئے کہ اس کا جواب کیا ملتا ہے۔ فرماتے ہیں، "آزادی سے میرا مفہوم یہ ہے کہ برطانوی قوت کو ہندوستان سے بالکل خارج کر دیا جائے " کتنا واضح جواب ہے لیکن اس پر یہ اضافہ بھی فرما دیا کہ "البتہ اس سے وہ اشتراک عمل خارج نہیں جو دو آزاد قوموں کے درمیان ہوسکتا ہے۔ اچھی بات! لیکن ابھی فقرہ مکمل نہیں ہوا وہ یوں ہوتا ہے " لیکن ضروری نہیں کہ یہ آزادی درجۂ نوآبادیات (Dominion Status) سے مختلف ہو " ابھی اور اضافہ ملاحظہ فرمائیے۔ " لیکن شاید ہندوستان جیسے ملک کے لئے جو جنوبی افریقہ، کنیڈا، آسٹریلیا وغیرہ سے مختلف واقع ہوا ہے درجۂ نوآبادیات

کی اصطلاح (Dominion Status) کچھ زیادہ خوشگوار نہ ہو۔ لیکن یہ اصطلاح بھی تو انگریزی دستور سیاسی کی طرح اپنے اندر بڑی لچک رکھتی ہے۔ ہاں اور اگر (Dominion Status) کی تعریف کچھ ایسی کر دی جائے جو ہندوستان جیسے ملک پر بھی منطبق ہو سکے اور اگر ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ایک باعزت معاہدہ ہو سکے تو میں لفظوں کے اختلاف پر جھگڑا نہیں کرونگا۔ اگر انگریز ارباب سیاست اس باعزت معاہدہ کے لئے (Dominion Status) کی اصطلاح استعمال کرنا پسند کریں تو یونہی سہی میں اس کی بابت جھگڑنا نہیں چاہتا" (ہریجن ۱۲؎ ۳۴)

معلوم نہیں کہ نامہ نگار صاحب اس سے کیا سمجھے ہوں گے لیکن ہم تو اس سے اتنا ہی سمجھ سکے ہیں کہ یہ پریشانی انکار اگر گاندھی جی کی عمر کا تقاضا نہیں تو پھر یہ الفاظ ان کی اس سعی لاحاصل کی بُری طرح غمازی کر رہے ہیں جو وہ اپنے دلی ارادوں کو مصلحت کوشی کے چلمنی پردوں میں چھپانے کے لئے صرف کرتے رہتے ہیں۔

غالباً گاندھی جی کے پیش نظر وہی "معاہدہ" ہے جس کی طرف پچھلے دنوں مسٹر ستیہ مورتی نے اپنی ایک تقریر میں اشارہ کیا تھا۔ فیڈریشن کے متعلق ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "اگر فیڈریشن کانگرس کے سر تھوپ دی گئی تو کانگرس ہر ایک نشست پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گی، تاکہ کوئی دوسری جماعت فیڈریشن کو چلا نہ سکے لیکن مجھے اُمید ہے کہ سلطنتِ برطانیہ کانگریس کے ساتھ ایسا سمجھوتہ کرے گی جس سے اس قسم کے تصادم کی ضرورت نہ پڑے" (اسٹیٹس مین ۹؎ ۱۸)

یہ ہیں مکمل آزادی کے مُدعیان کے ارادے اور یہ ہیں اُن کی آرزوئیں +

---

(۴) مخلوط انتخاب

جو مسلمان حضرات "مخلوط انتخاب" کو مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کا بہترین ضامن کہا کرتے ہیں وہ مسٹر ستیہ مورتی کے ان الفاظ کو غور سے سُنیں، انھوں نے اپنی محولہ بالا تقریر میں فرمایا:۔

"اگر تمام جُداگانہ انتخابات منسوخ کر دیے جائیں تو کانگرس۔ ہندوستان کے تمام گیارہ صوبوں پر قابض ہوسکتی ہے۔ اور پھر ہمارے اور "پورنیہ سوراج" کے درمیان کوئی شئے حائل نہیں ہوگی۔" (ایضاً)

مخلوط اور جُداگانہ انتخاب کے متعلق ایک قومیت پرست اخبار کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"مشترک وغیر مشترک انتخاب کا سوال ہندوستان میں سب سے بڑا سوال ہے جو ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت کی پیداوار ہے۔ آج تک ہندوستان کے کسی حصہ میں مشترک انتخاب کا کوئی تجربہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ کلکتہ کارپوریشن میں عرصے سے مشترک انتخاب جاری ہے مگر تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس سے فرقہ وارانہ بداعتمادی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔" (مدینہ ۲۵ ۷/۹)

ان اُمور کا اعتراف بھی ہے۔ لیکن بایں ہمہ کانگرس کی ہمنوائی بھی ہے۔

(۵) ایک نیا خطرہ

مسلم لیگ ابھی بمشکل چند قدم چل سکی ہے کہ اسکے اندر بھی ان خطرات کے آثار شروع ہوگئے ہیں جو بڑی بڑی منظم جماعتوں کو تباہ کرکے رکھ دیتے ہیں۔ چونکہ ہماری سیاست کے ماخذ کتاب و سنت کے بجائے بالعموم دساتیرِ افرنگ ہیں۔ اس لیئے اُن کی دیکھا دیکھی لیگ میں بھی دائیں اور بائیں بازو کا شاخسانہ چھڑتا نظر آرہا ہے۔ ہمیں مولانا حسرت موہانی کے اخلاص اور جوشِ عمل کا اعتراف ہے لیکن قوموں کی تنظیم کے لیئے ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ اصابتِ رائے اور استقلالِ مزاج کے جوہر بھی لابدُ ہیں۔ جس نازک دَور سے آج مسلمانانِ ہند گزر رہے ہیں۔ اس میں ایسا اقدام جس سے ملّت میں انتشار و تشتت پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو کسی صُورت میں بھی مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیئے مولانا صاحب کی یہ تحریک کہ لیگ میں ایک "بایاں بازو" پیدا کر دیا جائے کچھ اچھے نتائج کی حامل نہیں ہوسکتی۔ ملتِ اسلامیہ کو اس سے کس قدر نقصان پہونچے گا۔ اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایئے کہ مسٹر ایم۔ این رائے

جیسا شخص اس کی پُر زور تائید کر رہا ہے کہ لیگ میں مولانا صاحب کے مسلک کی پُر جوش حمایت کی جائے (نیشنل کال ۱۶ جون ۳۹) جسوقت یہ سطور ناظرین کے سامنے ہوں گی۔ لیگ کی مجلس عاملہ اِس مسئلہ کے متعلق کچھ فیصلہ کر چکی ہو گی۔ لیکن ہم مولانا صاحب کی خدمت میں مفادِ ملتِ اسلامیہ کا واسطہ دیکر گزارش کرینگے کہ وہ وقت کی نزاکت کو اپنے جذبات کے سیلاب میں بہا کر نہ لے جائیں اور قوم کو مزید تشتت سے بچالیں۔ اور لیگ کو اپنے معیار کے مطابق فعّال جماعت بنانے کے لیئے کوئی اور اقدام فرمائیں۔

ضروری اطلاعات

ان تمام حضرات کو جو اپنا فائل مئی ۱۹۳۸ء تا اپریل ۱۹۳۹ء مکمل کرنا چاہتے ہیں، اطلاع دی جاتی ہے کہ متعدد اعلانات کے باوجود جون۔جولائی ۱۹۳۸ء اور جنوری ۱۹۳۹ء کے پرچے حاصل نہ ہوسکے۔ اس لئے اس فرمایش کو پورا کرنے سے ہم مجبور ہیں۔ اسی لئے دوسری جلد کے رسالے کافی مقدار میں زیادہ طبع کئے جاتے ہیں جو یکم مئی ۱۹۳۹ء سے شروع ہوتی ہے۔

رسالہ ہر ماہ کی پہلی کو نہایت پابندیٔ وقت سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی دس تک دفتر میں پہنچنی چاہئے ورنہ تعمیلِ ارشاد سے ہم مجبور ہونگے۔ ڈاکخانہ کی بدنظمی کے باعث بعض حضرات کو تین مرتبہ رسالہ بھیجا گیا۔ اور آخر تک وہ شکایات تحریر کرتے ہیں۔

کیا آپ نے مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ سمجھ لیا ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو دفتر سے جلد طلب فرمایئے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تحریک آزادی میں اشتراکِ عمل کی صحیح اسلامی شکل کون سی ہوگی۔ قیمت ۱ر صرفہ ڈاک ۱ر

خریدارانِ رسالہ سے گذارش ہے کہ وہ جواب طلب امور کیلئے اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور دیا کریں۔ ورنہ تعمیلِ ارشاد نہ ہوسکے گی۔ نمبر خریداری ہر پتہ کی چیٹ پر درج ہوتا ہے۔

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریۂ قومیت کے جواب میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے چونکہ علامہ اقبالؒ کے انتقال کے چھ ماہ بعد یہ جواب منظرِ عام پر آیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ حضرت مولانا نے نہایت غور و فکر کے بعد اسکو مرتب فرمایا ہے اسلیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے اسکا ایک مفصل جواب شائع ہو۔ یہ رسالہ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" اسی کا مدلل اور مسکت جواب ہے، جس میں شرح و بسط کیساتھ مولانا مدنی کے دلائل کا جواب کتاب و سنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں متحدہ قومیت کا تصور کیا ہے، اور فرنگی لغت میں اس کی کیا تشریح ہے، اسلام کا نظریہ، فرنگی یا یورپی نظریہ سے کس طرح متصادم ہوتا ہے مغرب کے ایجاد کردہ قومی تصور میں کیا کیا مفاسد پوشیدہ ہیں، یہ کتاب آجکل کے جملہ قومی و سیاسی مباحث کے لیے قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے،

قیمت ۲ر علاوہ محصول

ناظم۔ طلوعِ اسلام بلیماران دھلی

اندرونِ ہند نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کی جدید تصنیف (INSIDE INDIA) کا بہترین ترجمہ جو مولوی سید ہاشمی صاحب نے بہت فصیح اور سلیس زبان میں کیا ہے انھوں نے مختلف یونیورسیٹیوں میں لیکچر دیئے اور اس مُلک کو خوب دیکھا۔ یہاں کے بڑے بڑے مُدبرین سے مُلاقاتیں کیں۔ ان سب ملاقاتوں کا حال اور خاتون موصوفہ کے تاثرات اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے ٭ قیمت مجلد سواتین روپے بغیر مجلد تین روپے ٭

اسٹینڈرڈ اُردو انگلش ڈکشنری یہ نہایت جامع اور مکمل ڈکشنری ہے اس میں تقریباً دولاکھ انگریزی الفاظ ومحاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ اس میں ادبی بمعامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنیٰ بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم وفنون کی اصطلاحات سے ہے ٭ قیمت سولہ روپے۔

اسٹوڈینٹس اُردو انگلش ڈکشنری یہ بڑی لغت کا اختصار ہے۔ لیکن جامع ہے۔ طلبار پروفیسران وکلاء اور ادبی ذوق کے حضرات کے اصرار پر اس کی قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ ضرور ایک کاپی خریدیے قیمت پانچ روپے۔

حقیقتِ اسلام اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک نہایت دلآویز اور حکیمانہ استدلال سے پُر ہے ٭ قیمت بارہ روپے ٭

فہرست اور کتابیں طلب کرنے کا پتہ

بک ڈپو انجمن ترقی اُردو۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی!

نوٹ:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی تمام مطبوعات کی ہم نے تمام ہندوستان کے لیے سول ایجنسی لے لی ہے۔ لہذا انجمن کی کتابیں ہمیشہ ہم سے طلب فرمائیں۔ اردو کی بہترین ادبی، مذہبی، اور سیاسی کتابیں برائے فروخت موجود ہیں۔

Printed at the Jayyed Press Delhi Published by Z A K from Tulu-e-Islam Office Delhi.
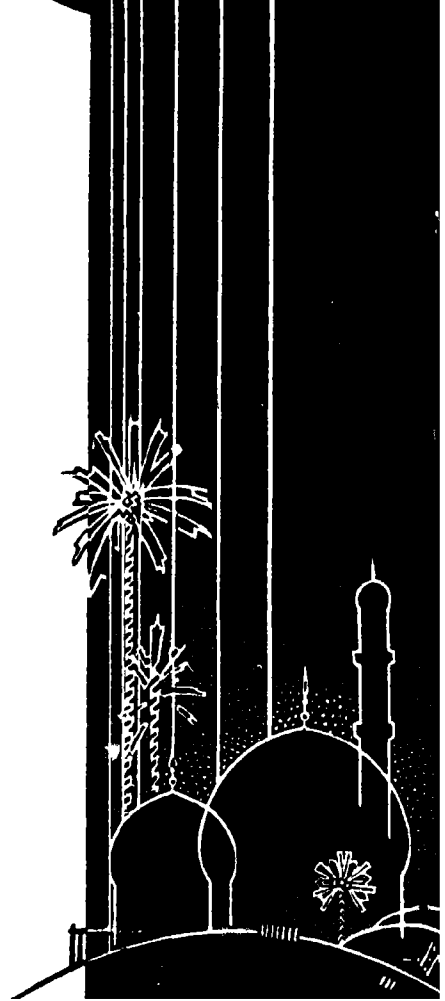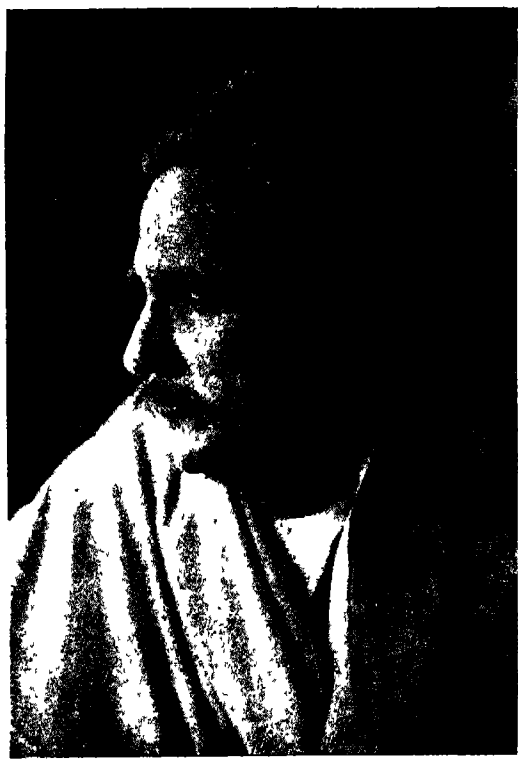
علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم
طلوعِ اسلام
بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریۂ قومیت کے جواب میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب
نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے چونکہ علامہ اقبالؒ کے انتقال کے چھ ماہ بعد یہ جواب منظرِ
عام پر آیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ حضرت مولانا نے نہایت غور و فکر کے بعد اسکو مرتب
فرمایا ہے اسلیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے اسکا ایک
مفصل جواب شائع ہو۔ یہ رسالہ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" اسی کا مدلل
اور مسکت جواب ہے، جس میں شرح و بسط کیساتھ مولانا مدنی کے دلائل کا جواب
کتاب و سنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں متحدہ قومیت
کا تصور کیا ہے، اور فرنگی لغت میں اس کی کیا تشریح ہے، اسلام
کا نظریہ، فرنگی یا یورپی نظریہ سے کس طرح متصادم ہوتا ہے
مغرب کے ایجاد کردہ قومی تصور میں کیا کیا مفاسد پوشیدہ ہیں،
یہ کتاب آجکل کے جملہ قومی و سیاسی مباحث کے
لیے قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے،
قیمت ۲ر علاوہ محصول

ناظم۔ طلوعِ اسلام بلیماران دھلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← [لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ! مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ] → مرکزِ ملت

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

اِعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا — اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

اِسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ — بات مانو اللہ و رسول کی جب تمہیں اس بات کیطرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ

(فرمان رسولؐ)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِالْجَمَاعَةِ

(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا اِلٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دور جدید)

مرتب

محمد ظہیر الدین صدیقی بی ایس سی

جلد (۲) شمارہ (۶)

بدل اشتراک پانچ روپیہ سالانہ

ششماہی تین روپے

شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

تہذیب؟

انساں کہ رُخ زغازۂ تہذیب برفروخت
خاکِ سیاہِ خویش چو آئینہ وانمود

پوشید پنجہ را تہِ دستانۂ حریر
افسونئ قلم شد و تیغ ازکمرکشود

ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت
رقصید گردِ او بنواہائے چنگ وعود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید
جز "یسفِکُ الدِّما" و "خَصِیمٌ مُّبِین" نبود

اقبال علیہ الرحمۃ

لمعات

عصرِ حاضر کو "زمانۂ رفتار" Age of Speed کہا جاتا ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ موجودہ زمانہ میں وسائل رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت اس درجہ تیز رفتار واقع ہوئے ہیں، خود حالات زمانہ اِس برق رفتاری سے بدل رہے ہیں کہ پہلے جو انقلابات کہیں صدیوں میں ہوا کرتے تھے۔ اب دِنوں میں رونما ہو جاتے ہیں۔ واقعات کی یہ تغیر انگیز سرعت زمانۂ امن میں ہی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن جنگ چھڑ جانے سے تو نفس زمانہ میں جو ان کی سی سیلابی قوت آگئی ہے۔ آپ کہہ نہیں سکتے کہ دُنیا کو جس حالت میں چھوڑ کر آپ سوئے تھے صبح اُٹھیں گے تو اُس حالت میں کیا کیا تغیرات پیدا ہو چکے ہونگے۔ اِن حالات کے ماتحت ایک ماہوار رسالہ کے لیے تغیر واقعات پر ساتھ کے ساتھ تبصرہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ قارئینِ کرام کا وہ دیرینہ اور مستقل تقاضا کہ طلوعِ اسلام کو کم از کم ہفتہ وار صورت میں کر دیا جائے۔ ماہِ رواں میں شدّت اختیار کر گیا۔ لیکن ——— ہم کچھ لکھنے کو تھے کہ کسی غیب کی آواز نے پکارا کہ ؎

مُسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

یہی وجہ ہے کہ ہمیں جزئیات سے بحث کرنے کے بجائے صرف اُصولات تک محدود رہنا پڑتا ہے۔

بالآخر جنگ چھڑ گئی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہی ایک خبر کا گونہ بھی سامنے آگیا۔ یعنی جناب وائسرائے نے اپنی تقریر میں فیڈریشن کے التوا کا اعلان کر دیا۔ اور یوں وہ بلائے بے درماں جو مرگِ مفاجات کی طرح مسلمانوں کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ کچھ عرصہ کے لیئے بانشستین ہوگئی۔ قوموں کے لیئے اس

قسم کی مہلت مغتنمات سے ہوتی ہے۔ لیکن مُہلتوں سے فائدہ بھی زندہ قومیں اُٹھایا کرتی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مُسلمان اس مُہلت سے کس حد تک فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ بہر حال ہم اربابِ مُسلم لیگ کی خدمت میں پُرزور درخواست کرینگے کہ وہ اِس مُہلت کو غنیمت سمجھیں اور اپنے آپ کو اِدھر اُدھر کے مسائل میں اُلجھانے کے بجائے، تمام توجہات صرف ایک نقطہ ماسکہ پر مرکوز کر دیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا آئینی مستقبل کیا ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ لیگ کے سامنے اس باب میں بہت سی اسکیمیں موجود ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم فیڈریشن کو بنیاد فرض کرکے کسی عمارت کا نقشہ مُرتب کریں فیڈریشن۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے خاکہ کے مطابق، یا فرعی تبدیلیوں کے ساتھ۔ حالات کی اِن تیز رو تبدیلیوں کے ماتحت جو ہمارے سامنے آ رہی ہیں مسلمانوں کی مشکلات کا حل نہیں ہو سکتی۔ مُسلمانوں کے مصائب کا صحیح حل صرف ایک اسکیم میں ہے اور وہ اسکیم مکمل علیحدگی کی ہے۔ وہ "بدنصیب" مُسلمان جنہیں ہندؤں کے ساتھ کسی معاملہ میں سابقہ پڑتا ہے خوب جانتے ہیں کہ ایسی قوم کے ساتھ ملکر رہنے میں، مادی نقصانات کے علاوہ، کس قدر روحانی کوفت اور ہر وقت کی ذہنی کاوش ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی قوم ایک عرصہ تک ایسے حالات کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور رہو تو رفتہ رفتہ اس کی اپنی اخلاقی قوتیں مضمحل۔ اس کی حیاتِ لطیفہ افسردہ اور اسکے جوہرِ انسانیت زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ ہندو اپنے منافع کے حصول اور دوسرے کے جائز حقوق کے غصب کرنے میں جائز و ناجائز ہر طریق کار بلا محابا اختیار کر لیتا ہے۔ ہمیں اِس سے بحث نہیں کہ اِس طریقِ عمل سے خود اسکا قومی کیرکٹر کس قدر پست ہو چکا ہے۔ اسلیئے کہ جو قومیں اپنا نصب العینِ حیات ہی "لکشمی دیوی" (دولت) کی پرستش قرار دے لیں۔ اُنہیں اخلاقی شعور کا پاس ہی نہیں رہا کرتا، لیکن اِس مسلسل جور و تعدی کے ماحول میں مسلمانوں جیسی مخصوص زاویۂ نگاہ رکھنے والی قوم کے اخلاقی شعور پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ انگریز کی قوت ہندو اکثریت کے ساتھ ہے۔ اسلیئے۔ "اللہ والی ہے میاں سلّو کا" مسلمان جب اپنے آپ کو مظلوم و مقہور دیکھتا ہے اور جابر قوتیں عدل و انصاف کا کوئی راستہ اُسکے سامنے کھُلا نہیں رکھتیں تو پھر یا تو اس میں احساسِ عوبیت

(Inferiority Complex) پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اکثر اوقات اسکے سیاسی ارتداد کا موجب بنتا ہے۔ اور یہ اسلام سے مایوس ہو کر اپنے شجرِ ملت سے کٹ جاتا ہے۔ اور دوسروں کے نخلِ تمنّا سے اپنا پیوند لگانے ہی میں کامیابی سمجھتا ہے، اسی کا نام "نیشنلزم" ہے۔ اور یہ اپنے آپ کو حوالۂ تقدیر کر کے اپنی رہی سہی عملی قوتوں کو بھی مفلوج کر لیتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اسلام کی تعلیم کے خلاف اور سچے مسلمانوں کی فطرت کے منافی ہیں لیکن اگر آپ موجودہ حالات کو ایک عرصہ تک بدستور رہنے دینگے، تو آپ کی تمام قوم میں یہ مہلک جراثیم سرایت کر جائینگے اور کچھ عجب کہ انمیں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں جو اپنے غصب شدہ حقوق کی واپسی کے لیئے مجبوراً فریقِ مخالف سے غیر منصفانہ طریقِ عمل کو جائز سمجھنے لگیں (جو پھر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہوگا)۔ آپ اِس چیز کا اندازہ شاید اسوقت نہ لگا سکیں کہ مُسلمانوں جیسی قوانینِ الٰہیہ کی وارث قوم کے لیئے ملّی کیریکٹر کے بدلجانے سے صرف اس قوم کا نہیں، بلکہ نوعِ انسانی کا کس قدر نقصان ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ان نتائج کا اندازہ آج لگایا جائے کہ وقت گزر جانے کے بعد اِس نقصان کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔
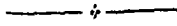
بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس "علیحدگی" کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندو اور مسلم دونوں قومیں ہمیشہ کے لیئے ایک دوسرے کی دُشمن ہو جائیں گی۔ لیکن ایسا وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنکے سامنے نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ مُسلمانوں کی تاریخی روایات۔ اسلیئے کہ جس شخص کے سامنے یہ چیزیں ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ مُسلمان دوسری قوموں کے ساتھ حسنِ سلوک، رواداری اور معدلت گستری کے لیئے اپنے خدا کیطرف سے کس درجہ مجبور ہے۔ لہٰذا اِس قوم کی طرف سے "دشمنی" کا خطرہ کیسا؟ اِس شاہیں کو تو یہاں "صحبتِ زاغ" خراب کر گئی۔ ذرا اسے آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کُشائی دیجیئے، پھر دیکھیئے کہ اسکے فطری جوہر کس طرح اُبھرتے ہیں اور وہ تمام نوعِ انسانی کے لیئے کس درجہ امن و سلامتی کے ضامن بنتے ہیں۔ ہندوؤں نے یہاں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے اسکے پیشِ نظر انکا یہ مزعومہ خطرہ اُنکے نزدیک درست بھی ہے کہ مُسلمان آزاد ہو کر شاید انتقام پر اُتر آئے، لیکن اُنہیں معلوم ہونا

چاہیئے کہ مسلمان اس ذاتِ گرامی صلعم (فداہ ابی و امی) کے دابستہ دامن ہیں کہ جب عمر بھر کے سخت ترین دشمن مفتوح و مغلوب ہو کر پابہ زنجیر سامنے آئے تو حضور نے بلا تامل فرمایا کہ :-

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (جاؤ تم سب آزاد ہو۔ کسی پر کوئی مواخذہ نہیں)

جنگ کے سلسلہ میں کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے اپنے فیصلہ کو ایک طویل و عریض بیان کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اگرچہ اِس بیان کے بہت سے گوشے توضیح طلب ہیں لیکن ہم اِسوقت اِس کی ایک "دلیل" کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں، بیان میں جو کچھ لکھا ہے اُسکا ملخص یہ ہے کہ "جنگ کے سلسلہ میں انگریز۔ ہندوستان سے اِسلیئے تعاون واشتراک کا طالب ہے کہ اسکا دعویٰ ہو کہ وہ جمہوریت کی خاطر لڑائی کر رہا ہے۔ لیکن اس کی جمہوریت میں وہی امپیریلزم پوشیدہ ہے۔ جو فاشزم اور نازی ازم کی آمریت میں پنہاں ہے۔ اگر انگریز جمہوریت کی خاطر جنگ کرتا ہے تو اُسے سب سے پہلے ہندوستان کو جمہوریت عطا کرنی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ"

ارباب کانگرس کے نزدیک جمہوریت کے متعلق انگریز کی ستم ظریفی قابل داد ہے لیکن ہمارے نزدیک کانگرس کے دعوے جمہوریت کی ستم ظریفی اس سے بھی زیادہ قابلِ تاسف ہے۔ کوئی اِن سے پوچھے کہ کانگرس میں جو پوزیشن انھوں نے گاندھی جی کو دے رکھی ہے۔ وہ جمہوریت کی آئینہ دار ہے یا اُس آمریت کی جسکا یہ رونا روتے ہیں۔ اور کیا جمہوری نظام اس کو کہتے ہیں جس کی رُو سے کانگرسی حکومت کے صوبوں میں مسلم اقلیتوں پر گوشۂ عافیت تنگ کیا جا رہا ہے! دوسروں کو امپیریلزم کا طعنہ دینے والے ذرا اپنے گریبان میں مُنہ ڈالکر دیکھیں تو سہی کہ اُنکے سینہ میں جمہوریت کے جذبات پرورش پا رہے ہیں یا صحیح امپیریلزم کی اُمنگیں مچل رہی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب ہو یا مشرق۔ جمہوریت کے معنی کہیں بھی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ تا وقتیکہ قرآن کریم سامنے نہ ہو۔ اسکے بغیر تو جمہوریت اور ملوکیت میں صرف قالب کا فرق ہوتا ہے۔ روح دونوں جگہ ایک ہوتی ہے۔

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

کانگرس کے مذکورہ صدر بیان کے بعد گاندھی جی کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا جس کے دوران میں وہ لکھتے ہیں کہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں "افسوس ہے کہ میں اکیلا اس بات کا حامی تھا کہ برطانیہ کو جو کچھ مدد دی جائے وہ غیر مشروط طور پر دینی چاہیئے۔ یہ خالص عدم تشدد کی بنیادوں پر ہو سکتا تھا" یعنی جنگ کے لیئے امداد کی تائید ہو رہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ خالص عدم تشدد (اہمسا) کی بنیادوں پر ہے۔ جنگ اور عدم تشدد! کس قدر مضحکہ انگیز امتزاج ہے!! لیکن ہمیں تعجب گاندھی جی کے دماغ پر نہیں جو اس فلسفہ کا مخترع ہے کہ ان کی "مہاتمیت" کا تو راز ہی اس قسم کے معموں میں ہے، تعجب ہے اس قوم کی عقل و بینش پر جو با ایں ہمہ انہیں اپنا دیوتا بنائے ہوئے ہے۔ اور اُن سے زیادہ اُن راہ گم کردہ مُسلم "میت پرست" حضرات پر جو اپنے ہاں قرآن کریم جیسی سراپا نور ہدایت رکھنے کے باوجود گاندھی جی کو اپنا امام بنائے بیٹھے ہیں۔

جنگ کے متعلق مسلم لیگ کے ریزولیوشن پر تنقید کرتے ہوئے "لالہ آرتھر مور" (مدیر اسٹیٹس مین) نے ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے۔ یوں تو اس مقالہ کا ایک ایک حرف اس جہالت اور لاعلمی کی غمازی کر رہا ہے جو مغرب کے ان ہمہ داں استادانِ فن کو اسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے جذبات کے متعلق ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسکا مقطع کا بند بڑا ہی شاندار ہے۔ جہاں "لالہ صاحب" ایک مجتہد العصر، مفسر قرآن، فقیہ ملت" کی دستارِ فضیلت زیب سر فرما کر اپنی پوری شانِ "شیخ الاسلامی" کے ساتھ فرماتے ہیں کہ

"جہاں تک اسلام کو ہم سمجھ سکے ہیں۔ لیگ کا یہ ریزولیوشن اُسکی تعلیم کے یکسر خلاف ہے"

اللہ اکبر! ہمارے لیئے اب اسلامی فتاویٰ کن ٹکسالوں میں ڈھلنے لگے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جنابِ لارنس لاوارث نہیں مرے۔ اپنا خرقہ و سجادہ ٹھکانے لگا کر گئے ہیں۔

اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات و منات

اور لیگ کا یہ ریزولیوشن بھی عجب ہے کہ

اپنے بھی خفا اس سے ہیں۔ بیگانے بھی ناخوش

انساں بھی اِک طرفہ تماشا ہے۔

اِسے عبادتگاہوں میں سر جھکائے دیکھو تو آسمان کے فرشتے اسکے اندازِ عبودیت پر نثار ہوتے ہیں اس کی خاک آلودہ پیشانی پر سطوت و ثروت کے ہزار طرّۂ ہائے فلک بوس قربان ہوتے ہیں اسکے ذوقِ جبیں سائی پر جاہ و جلال کی لاکھوں غلغلہ اندازیاں اور شوکت و حشمت کی کروروں طنطنہ خیزیاں تصدق ہوتی ہیں اسکی جھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے حوروں کی معصومیت ہیچ اور اسکے قطراتِ عرقِ انفعال کے مقابل کوثر و سلسبیل کی گہر باریاں ناقابلِ التفات۔ اسکا ایک ایک سجدہ زمین و آسمان کو وجد میں لاتا ہے اور اسکے جذبۂ تعبد و تذلل کی شانِ رعنائی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

تیرے سنگِ دَر نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پھر اسے کبھی محبت کے حریمِ قدس میں دیکھو تو کسی کی یاد میں اسکے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلّوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ ظلمت کدۂ عالم میں شمعِ کافوری کا کام دے۔ آفتاب اس کی آتشِ پنہاں سے کچھ حرارت مستعار لیتا ہے کہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کرے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کی تپشِ خلش اور سوز و گداز سے اپنے اندر زندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کی آہِ سحرگاہ اور نالۂ شامِ فراق اِس حقیقت کو بےنقاب کرتے ہیں کہ۔

عشق سکون و ثبات۔ عشق حیات و ممات
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات!

پھر جب یہ حیرت خانۂ علوم و فنون میں جلوہ ریز ہوتا ہے تو زمین کی پستیوں سے آسمان کی

بلندیوں کے راز ہائے سربستہ فاش کرتا ہے۔ مہر و مہ و ستارہ سب اس کی کمندِادراک کے آ
ہوتے ہیں وہ زہر سے تریاق بناتا ہے جو نوعِ انسانی کے رِستے ہوئے ناسوروں کے لیئے جاں بخش
مرہم کا کام دیتا ہے۔ اِسکے فنونِ لطیفہ کی اختراعاتِ جمیلہ، ِس حارو یابس مجلس آب و گل کو جذ
و احساسات کی حسین جنت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس کی صنعتی گل کاریاں۔ تہذیب و تمدن
قصرِ بلند میں نور و نکہت کے سامان ارزاں کرتی ہیں۔ اور وہ اِن نوادرات کی متاعِ گرانبہا
کے پیشِ نظر خالقِ کائنات کے سامنے بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ :۔

توشب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم !
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

لیکن

یہی انسان جب جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے خلا
غم و غصّہ میں بھرا ہوا اٹھتا ہے تو عبودیت کا عجز و انکسار، محبت کا سوز و گداز۔ اور علم و حکمت کا
بصیرت۔ سب ایک ایک کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور اُسوقت اس کی خوفناک سبعیت و بر
وحشی سے وحشی درندوں سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ یہ ایک روح فرسا اژدھا کی طرح پھنکا،
اور ایک ہیبت ناک شیر کی طرح گرجتا اٹھتا ہے اور تہذیب و تمدن عقل و ہوش علم و بصی
عدل و انصاف، رحم و کرم، غرضیکہ جوہرِ انسانیت کی ایک ایک خصوصیت کو کچلتا۔ روندتا ایک
بھیانک عفریت کی طرح اپنا آہنی پنجۂ استبداد فریقِ مقابل کے سینہ میں گاڑ دیتا ہے اور ا
دندانِ حرص و آز کو اس کی شہ رگ میں پیوست کر کے اسکے چشمۂ زندگی سے اپنی ہوس
خون آشامی کی تسکین کرتا ہے۔ اسوقت وہ نوعِ انسانی کی تباہی و بربادی کے لئے کر

حربے استعمال کرتا ہے۔ اسکا کچھ اندازہ اخبارات کی ان خبروں سے لگایئے جو مرکزِ دانش و بینش، منبع علم و ہنر، معدنِ حکمت و فلسفہ، مصدرِ تہذیب و تمدّن یعنی وسطی یورپ کے میدانِ کارزار سے آتشیں گولوں کے ظلمتناک دھوئیں میں لپٹی ہوئی فضائے عالم میں پھیل رہی ہیں آسمان میں آگ، زمین میں آگ، خشکی میں آگ، پانی میں آگ، انفس میں آگ، آفاق میں آگ، غرضیکہ ایک جہنم ہے، جو اپنی پوری شعلہ فشانیوں اور آتش باریوں سے نوعِ انسانی پر مسلّط ہو رہا ہے۔ بم، گولے، بارود، گیس کے اِس طوفانِ حدود فراموش و سیلِ قیود ناآشنا میں محارب و غیر محارب کی کیا تمیز ہو سکتی ہے؟ ماں کو بچّے کی خبر نہیں، باپ کو بیٹے کا ہوش نہیں۔ بہن کو بھائی کا پتہ نہیں، میاں کو بیوی کا علم نہیں۔ ایک محشر ہے جس سے اس قیامتِ کبریٰ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، جس کا تذکرہ اِن الفاظ میں ہوا ہے کہ:۔

إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ۔ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ۔ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَارَىٰ۔ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ○ 22/1-2

اُس معینہ گھڑی کا زلزلہ ایک بڑی رہیبت ناک، چیز ہوگی جس دن تم دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے شیرخوار بچوں کو بھول جائیں گی۔ اور حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، اور تو لوگوں کو نشہ کی حالت میں دیکھے گا، حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہونگے بلکہ اللہ کا عذاب ہی ایسا سخت ہوگا۔

ایسا ہوش رُبا سانحہ کہ:۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ۔ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ۔ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔ 80/34-37

جس دن آدمی اپنے بھائی سے۔ اور اپنی ماں سے، اپنے باپ سے۔ اپنی بیوی اور اولاد

سے بھاگے گا اُس دن ہر شخص کو اپنی ہی ایسی (پریشانی) ہوگی کہ وہ کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گی!

جس دن کی آتش فشانی کا یہ عالم ہوگا کہ:-

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۔ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ۔ ۳۲/۳۳

بڑے بڑے محلات جیسے گولے برسائے گا جیسے بڑے بڑے چتلے کالے کالے اونٹ ہوتے ہیں

اس آگ اور دھوئیں سے تمام کائنات کا حلیہ بگڑ جائیگا ۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۔ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۔ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۔ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۸۱/۱-۶

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا ۔ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑینگے ۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائینگے جب گابھن اونٹنیاں بے مہار چھٹی پھریں گی ۔ جب وحشی جانور (مارے ہیبت کے) اکٹھے ہو جائینگے ۔ جب سمندر بھی بھڑک اٹھیں گے

مصیبت اور پریشانی کا یہ عالم کہ:-

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۔ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۱۰۱/۴-۵

جب انسان پریشان پروانوں کی طرح (اڑتے) پھرینگے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اُون کی طرح (ریزہ ریزہ) ہو جائیں گے!

پوچھئے کسی ایسے شخص سے جنے لڑائی کا میدان دیکھا ہو کہ وہاں کا نقشہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے یا نہیں؟ عمارتیں کھنڈرات بن جاتی ہیں ۔ آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں چلتے پھرتے انسان لاشوں کے ڈھیر بنکے رہ جاتے ہیں ۔ جو جیتے ہیں ان پر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا ہے ۔ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں سڑتی گلتی لاشوں کی تعفن بھوک ۔ افلاس، خانماں خرابی ۔ دشمن کے حملہ کا خطرہ اسیری و غلامی کا دھڑکا ۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۔ عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ (بہت سے چہرے ذلیل و خوار) اور مصائب کی وجہ سے خستہ و خراب یہ ہے ماحصل انسان کے علم و حکمت

اور تہذیب و تمدّن کا!
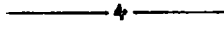
ہمیں تسلیم ہے کہ بعض حالات میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اور دُنیا میں قیام امن و سلامتی کے لیۓ اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام جیسا صلح و آشتی اور امن پسندی کا مذہب بھی خاص حالات کے ماتحت اُسے لابد سمجھتا ہے لیکن صرف بحیثیت دوا کے نہ بطور غذا کے۔ ہم اسوقت اِس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ وہ کون سے حالات ہیں جنکے ماتحت اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے (یہ ایک جُداگانہ بحث ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دَورِ حاضرہ کے مہذّب اور متمدن انسان کے طرقِ جنگ اور اسکے نتائج کے مقابلہ میں اُس دَور کے آیئنِ جنگ کیا تھے جسے آج کا انسان اپنی کوربصری کی وجہ سے "دَورِ جہالت" قرار دیتا ہے لیکن اگر وہ نگہِ حقیقت شناس سے دیکھے تو خود اعتراف کرے کہ اُس دَور کی مزعومہ "جہالت" پر عصرِ حاضر کی ہزار "دانش اطواریاں" قربان کی جا سکتی ہیں *

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ قرآن کریم نے انسانی زندگی کا کس قدر احترام سکھایا ہے فرمایا۔

كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ أَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا * ٥/٣٢

ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جسنے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔ علاوہ اِن صورتوں میں کہ مُلزم نے کسی کی جان لی ہو۔ یا وہ دُنیا میں فتنہ و فساد کا موجب ہو تو یوں سمجھو کہ گویا اُس شخص نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ اور جس شخص نے کسی ایک جان کو بھی بچایا تو اسنے گویا تمام نوعِ انسانی کو بچایا *

اِس آیۂ مقدسہ میں احترامِ نفسِ انسانی کے ساتھ قتلِ انسان کی دو ایسی صُورتیں بیان فرمادیں جہاں اِسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔ انفرادی صورت

تو ہر روز ہمارے سامنے آتی ہے۔ امن پسند انسانوں کو ایک ظالم و سرکش قاتل کے جور و استبداد سے محفوظ رکھنے کی آخری صورت یہی ہے کہ اسکے جُرم کی پاداش میں اُسے بھی حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔ اگر ایک شریر النفس انسان کے ضائع ہو جانے سے سینکڑوں سعید رُوحیں بچ سکتی ہیں۔ تو با مر مجبوری ایسا کرنا ہی قرین مصلحت ہوگا۔ وہ اُنگلی جس کا زہر بھرا لاعلاج ناسُور تمام جسم کے لیئے پیام موت لئے ہوئے ہو۔ یقیناً اس قابل ہے کہ اُسے کاٹ کر الگ کر دیا جائے تاکہ باقی جسم خواہ مخواہ ضائع نہ ہو جائے۔ یہ انفرادی شکل ہے لیکن اگر فتنہ و فساد کا جذبہ ایک فرد کے بجائے ایک قوم میں موجزن ہو تو نوعِ انسانی کی حفاظت کے لیئے اس کی آخری تدبیر بھی یہی ہے کہ اُس قوم کی بڑھتی ہوئی قوت کو توڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ خود بھی شرافت کی زندگی بسر کرے۔ اور دوسروں پر بھی گوشۂ حیات تنگ نہ کرے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر فرمایا کہ ان حالات کے ماتحت۔

فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔ ۴۷/۴

ترجمہ

اُن سے لڑائی کرو۔ یہاں تک کہ جب اُن کی کمرِ ہمّت ٹوٹ جائے تو اُن کو مضبوط باندھ لو، پھر یا تو بطور احسان چھوڑ دو۔ یا معاوضہ لے کر۔ یہاں تک کہ خود لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

اسلیئے کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ خرمن انسانی میں فتنہ کی چنگاری کا موجود رہنا اسکا سر کچل دینے سے کہیں زیادہ مہیب و خطرناک ہے۔ لیکن مقصد صرف فتنہ کی سرکوبی ہے فساد کا استیصال ہے۔ اپنی جارحانہ قوتوں کا مظاہرہ نہیں اسلیئے جسوقت یہ دیکھو کہ فساد برپا کرنے والی قوتوں کی کمرِ ہمّت ٹوٹ گئی ہے۔ اُن کی گردنِ فرعونیت حق کے سامنے جُھک گئی ہے۔ اسی وقت رُک جاؤ اگر اُسکے بعد کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو یاد رکھو اِنَّ اللّٰہ لَا یُحِبُّ المعتدین۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سُورۂ بقرہ کے چوبیسویں رکوع میں اس حدود بندی کی

تشریح اِن الفاظ میں ملتی ہے۔

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں۔ لیکن زیادتی مت کرو۔ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (جب اس شکل میں لڑائی ہو جائے تو) پھر انہیں جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے اُنہوں نے تمہیں نکال باہر کیا تھا، تم بھی اُن کو نکال دو۔ کہ فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ لیکن مسجدِ حرام کے قریب جنگ مت کرو۔ جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔ ہاں اگر خود ہی لڑنے لگیں تو تم بھی ان کو مارو (ایسے) کفار کی یہی سزا ہے۔ لیکن اگر وہ باز آجائیں تو اللہ غفور الرحیم ہے۔ اور ان سے لڑائی کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو پھر سوائے ظالموں کے اور کسی پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی...... جو تم پر زیادتی کرے۔ تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور یقین جانو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

سورۂ نساء میں ہے۔

"بعض لوگ تمہیں ایسے بھی ضرور ملیں گے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ (لیکن) جب کبھی انہیں فتنہ و فساد کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں جا گرتے ہیں۔ پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں۔ تو تم اُنہیں پکڑو اور جہاں پاؤ اُنہیں مارو اور ہم نے تمہیں اُن پر صاف حجت دی ہے۔"

یعنی فتنہ و فساد روکنے کی جب کوئی اور صورت باقی نہ رہے تو اس وقت جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ لیکن جب اطمینان ہو جائے کہ فساد کا استیصال ہو گیا ہے تو پھر جنگ جاری رکھنے کی کبھی اجازت نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر صلح و امن پسندی۔ عہد و میثاق کے بعد سرکش تو تیں پھر آمادۂ جنگ ہوں۔ تو اُن کی فرعونیت کو پھر روکو۔ جتنے کہ وہ اس قسم کی تدابیر سے باز آجائیں فرمایا۔

"اگر یہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کرنے لگیں۔ تو تم اس غرض سے کہ یہ لوگ ان حرکات سے باز آجائیں۔ ان پیشوایان کفر سے لڑو۔ اس لیے کہ اس صورت میں اُنکا عہد و میثاق باقی نہیں رہا" ۹/۱۳-۱۲

اس لیے کہ اگر اُن کی فساد انگیز قوتوں کی مدافعت نہ کی جائے تو تمام کائنات فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنجائے۔ فساد کے مقابل میں عدل و اصلاح اور باطل کے مقابلہ میں حق کا غالب رہنا نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیۓ از بس ضروری ہے۔ کہ :-

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۲۳/۷۱

اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے۔ تو زمین و آسمان اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے سب میں فساد برپا ہو جائے

سب سے بڑی چیز یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کمزور جماعتوں کی حفاظت قوی جماعتوں کے ہاتھوں نہ کرائے تو دُنیا سے مذہبی آزادی سلب ہو جائے۔ جس جماعت کو غلبہ حاصل ہو جائے وہ مغلوب جماعتوں کے مذہبی شعائر کو منہدم کر کے رکھ دیں۔

"اگر اللہ انسانوں کی بعض جماعتوں کو دوسری جماعتوں کے ذریعے روکتا نہ رہے تو گرجے اور صومعے اور مندر اور مساجد جن میں اللہ کا ذکر بکثرت ہوتا ہے سب گرا دیے جائیں" ۲۲/۴۰

اس اُصول کو بیان کر کے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کو دُنیا میں قوت و غلبہ حاصل ہو گا تو اُن کا مسلک جور و تعدی نہیں ہو گا۔ بلکہ یہ دُنیا میں رہیں گے تو اسلیۓ کہ خدا کی عبودیت کے اُصول کو قائم کریں۔ دولت مندوں کے مال سے غریب اور کمزور انسانوں کی مدد کریں۔ جہاں جہاں بُرائی ہو اُسے روکیں اور اسکی جگہ بھلائی کا حکم دیں۔ گویا مسلمان اللہ کا ایک سپاہی ہے۔ جہاں کہیں کسی مظلوم پر زیادتی ہو اُس کی تلوار اس کی حفاظت کے لیۓ بے نیام ہو جانی چاہیۓ۔ فرمایا :-

"یہ تو وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں غلبہ حاصل ہو گا تو یہ خدا کی عبادت کو قائم کرینگے

زکوٰۃ دینگے۔ بھلائی کا حکم دینگے۔ اور برائی سے روکیں گے۔ اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ [۲۲]

اسلام کے نزدیک جنگ صرف قوانینِ الٰہیہ کی حفاظت اور تنفیذ کے لیے جائز ہے اِسکے علاوہ کسی اور جذبہ کے ماتحت جنگ کی جائے تو حرام ہے۔ اگر حسد و رقابت۔ بغض و عداوت، باہمی منافست۔ جوع الارض کے جذبات جنگ کے محرک ہیں تو وہ جنگ اسلام کے نزدیک کبھی جائز نہیں ہوسکتی۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا:۔

لا تباغضو۔ ولا تحاسدو۔ ولا تدابروا

ایک دوسرے سے دل میں بغض و عداوت نہ رکھو۔ باھم گر حسد نہ کرو۔ اور ایک شخص کو ہٹا کر اُس کی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرو +

پھر اِسلامی جنگ میں کسی قسم کی وحشت و بربریت جائز نہیں۔ بوڑھوں۔ بچوّں۔ اور عورتوں کو قتل کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ کسی کہن سال کو۔ بچے کو۔ کمسن کو۔ عورت کو قتل نہ کرو۔ دُشمن کو پکڑ کر اور باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں۔ (ایضاً)۔ دشمن کی جو سپاہ میدانِ جنگ میں آکر مقابلہ کرے صرف اُسکے خلاف ہاتھ اُٹھانے کی اجازت ہے۔ اُنکے گھروں میں گھُس کر غیر محارب (Civil) آبادی کو تنگ کرنا قطعتاً ممنوع ہے۔ ابو داؤد میں حضرت انس جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں کسی غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا۔ لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر اُنہیں تنگ کیا۔ لوٹا مارا۔ آپنے ایک شخص کو بھیجا اسنے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اُسکا جہاد قبول نہیں" پھر لوٹ کھسوٹ کا مال بھی اسلامی جنگ میں ناجائز ہے، (مالِ غنیمت الگ شے ہے) سُنن ابو داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی اکرمؐ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے بھوک کی سخت تکلیف ہوئی۔ اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں۔ انہیں لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے" اور جو کمان ہاتھ میں تھی اُس سے دیگچیاں

اُلٹ دیں۔ اور فرمایا کہ "لوٹ کی چیز مُردہ سے بڑھ کر حلال نہیں" پھر دُشمن کے قاصدوں کو کبھی قتل نہیں کیا جاسکتا مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اُس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ نے فرمایا کہ "قاصد کا قتل کرنا جائز نہیں، ورنہ تو قتل کر دیا جاتا" اسیرانِ جنگ سے اپنے عزیز مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا جب حضورؐ نے اسیرانِ بدر کو صحابہ کے حوالہ کیا تو تاکید فرمادی کہ اُنہیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہؓ خود تو کھجوروں پر گذارہ کرتے تھے۔ اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ دشمن کو آگ کا عذاب نہیں دیا جاتا تھا کیونکہ حضورؐ نے فرمایا کہ آگ کا عذاب صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔ مقتولین کے اعضاء کاٹنے (مثلہ) کی وحشت انگیز رسم کی بھی شدت سے ممانعت فرمادی سب سے بڑی چیز یہ کہ عہد کی سخت پابندی کی جاتی تھی۔ قرآن کریم میں اسکے متعلق جابجا تاکیدی احکام موجود ہیں۔ عہدِ نبوت اور خلفائےؓ راشدین کے زمانہ میں پابندیٔ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔ اِن تمام متفرق احکامات، جنگ کی بنیاد اس محکم اُصول پر ہے کہ لڑائی صرف "خدا کا نام بلند کرنے" کے لیئے ہوگی۔ کسی ذاتی جذبہ کے ماتحت نہیں ہوگی۔ ایک شخص نے حضورؐ صلعم سے دریافت کیا کہ کوئی شخص غنیمت کے لیئے، کوئی نام کے لیئے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لیئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائیگا۔ حضورؐ نے فرمایا۔

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ العلیا۔ جو شخص اِس لیئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اور خدا کا بول بالا اسی طرح ہوتا ہے کہ دُنیا میں اس کی بادشاہت قائم ہو۔

ان اُمور کو پیش نظر رکھیئے اور پھر دَورِ حاضرہ کے "متمدن" انسانوں کے طُرقِ جنگ و آئینِ حرب پر نگاہ ڈالیئے اور خود اندازہ فرمایئے کہ وہ تمام "علمی ترقیاں" جنہیں آج کا انسان اس قدر گرانبہا متاع شمار کرتا ہے، بربادی اور تباہی کے آلات و ذرائع کے سوا اور کس کام آرہی ہیں لیکن اگر یہی علمی ترقیاں۔ آئینِ خداوندی کے ماتحت ظہور میں آئیں تو دُنیا کی جہنم، سکون و طمانیت کی جنت میں تبدیل ہوجائے۔ وَفِیۡھَا اٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝

حقائق

(اسد ملتانی)

یکے را جنگ ازاں مقصود گردد	کہ جنگ اندر جہاں نابود گردد
دگر کس جنگ ازیں اندیشہ جوید	مبادا تیغ زنگ آلود گردد

نظام آنست شایانِ قیامے	کہ باشد موجبِ امن و سلامے
وگرنہ آں ہم آئینے بدارد	اگر گیری ز قزّاقاں نظامے

چو رہزن را بدست آید خزانہ	سخاوت می کند شاہنشہانہ
نگوید کس کہ مالِ او حرام است	اگر تقسیم باشد منصفانہ
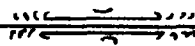
حق و صداقت کی راہ

اخبارات میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ، ناظم دارالعلوم دیوبند و صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، ضلع سورت، کا ایک مکتوب گرامی شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ موجودہ سیاسی کش مکش میں مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل کونسی ہے۔ ہم اس مکتوب کو جریدہ عصر جدید (کلکتہ) کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ تاکہ وہ حضرات جو کہا کرتے ہیں کہ "کوئی مقتدر عالم دین شرکت کانگریس کے مسلک کی مخالفت نہیں کرتا" عوام کو دھوکے میں مبتلا نہ کرسکیں۔ طلوع اسلام

مولانا عثمانی صاحب کا مکتوبِ گرامی

بعد سلام مسنون آں کہ آپ نے شرکت کانگریس کے متعلق میرے خیالات دریافت کئے ہیں، اس مسئلے کے متعلق میں اپنے خیالات کا اعلان پہلے بھی کرچکا ہوں اب پھر لکھتا ہوں کہ میں نہ کبھی کانگریس میں شامل ہوا اور نہ اب شامل ہوں بلکہ اس شمول پر میں نے کانگریسی علماء سے کئی دن تک بہت شد و مد سے بحث کی جس کا تذکرہ اخبارات میں آچکا ہے۔

قومیت متحدہ کا نظریہ جو کانگریس کے دستور اساسی کا بنیادی پتھر ہے اس معنی میں جو کانگریس کے ائمہ اس سے ارادہ کرتے ہیں میرے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے کبھی قابل تسلیم نہیں ہوسکتا۔

میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں نہ سیاسیات میں کوئی خاص اشتغال رکھتا ہوں تاہم اپنی قوم کے سود و بہبود کو سوچنا اس کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے میرے لیے بھی ناگزیر ہے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے لیے سب سے پہلے ایک خالص اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے اس کے بدون کسی نام نہاد قومیت متحدہ کے تیز رَو

دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے کو ڈال دینا خودکشی کے مرادف ہے۔

مسلمان دوسری قوموں سے صلح کر سکتے ہیں، عہد و پیمان کر سکتے ہیں، بہت سے اُمور میں تعاون اور اشتراکِ عمل کر سکتے ہیں، لیکن وہ اپنی مستقل ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کر سکتے۔ میں اپنے لیے فرقہ پرست کا خطاب پسند کرتا ہوں مگر اپنی قوم کا غدار یا قوم فروش کہلانا کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ شاعر حکیم اکبر مرحوم (الٰہ آبادی) نے خوب کہا ہے ؎

لطفِ دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی	کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی
دَیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی	بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو
اے ثمر چشمِ محبت میں تری خامی بھلی	پختہ ہو کر اپنی شاخِ وطن سے ہوتا ہے جُدا

اسی کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ ہماری ناکامی و نامرادی کا اصلی سبب شریعت کاملہ محمدیہ کے اصول و احکام سے اعراض و انحراف ہے اور اسی کے نتیجے میں اس تخریب و تفرق کا عذاب ہم پر مسلط ہے جس کی طرف قل هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى ان يَّبْعَثَ عليكم عذابا من فوقكم او من تحتِ ارجلكم اَوْ يَلْبِسَكُم شيعا وَّيذيق بعضكم بَأْسَ بعض میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اسی لیے میرا سب سے بڑا مطمحِ نظر یہ ہے کہ جہاں تک استطاعت میں ہو مسلمانوں کو اتباعِ شریعت اور تمسک اسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ نیز ان کی پارٹی بندیوں کو اگر بالکلیہ ختم نہ کیا جا سکے تو ان کو کم کرنے اور ایک کو دوسرے سے قریب لانے اور خلاف و شقاق کے مضار کو محدود کر دینے کی سعی جاری رہے

رہا دارالعلوم دیوبند کا معاملہ جیسا کہ پہلے بھی بار بار اعلان کیا جا چکا ہے وہ مسلمانانِ ہند کی ایک محبوب و مشترک متاع ہو۔ سیاسی پارٹی بندیوں سے اس کو کوئی تعلق نہیں یہی وہ مسلک ہے جو میرے زمانے میں مجلس عاملہ دارالعلوم نے بالاتفاق طے کیا ہے اور دارالعلوم کے تمام ملازمین و مدرسین کو سختی کے ساتھ اس کا پابند کیا

جو خبریں اس کے خلاف شائع کی جا رہی ہیں بعض بالکل بے اصل اور بعض سخت مبالغہ آمیز ہیں۔

راقم شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از ڈابھیل، ضلع سورت ۳ رجب ۱۳۵۸ھ

(ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ مجلس عاملہ دار العلوم دیوبند کے مذکورہ صدر فیصلے کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے کانگریس کی عملی حمایت کی "اجازت خصوصی" کیسے حاصل کر رکھی ہے۔ اور جب وہ اس فیصلے کے باوجود اپنی روش پر قائم ہیں تو مجلس عاملہ ان کے خلاف کوئی چارہ جوئی کیوں نہیں کرتی۔ ارباب دار العلوم اس باب میں اگر کچھ تصریح فرمانا چاہیں تو طلوع اسلام کے صفحات اس کے لئے کھلے ہیں۔ طلوع اسلام

ادارۂ طلوع اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ طلب فرمایئے اور ملاحظہ کیجئے کہ

ان میں سیاست حاضرہ کے اہم مسائل کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں کس

حسن و خوبی سے پیش کیا گیا ہے

ادارہ

کی جملہ مطبوعات کا منافع طلوع اسلام کے شعبۂ تبلیغ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے

مسلمان کی زندگی

(بہ سلسلۂ "خدا کی بادشاہت" وغیرہ)

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز، بی۔اے

انسان پر جب مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں ظلمت کدۂ عالم میں اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی تمام اسباب وعلل ایک ایک کر کے جواب دے دیتے ہیں تو اس کا دل مبٹھ جاتا ہے۔ زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے۔ عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش خاک کے ذرّوں سے ابھرتے چلے آتے ہیں۔ وہ انکی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی اُسے مسلسل مصائب وتکالیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے۔ انسان اسے ایک بے کس وبے بس مجبور ومظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی جیرہ دستیوں نے جور وستم اور ظلم واستبداد کی الم ناک صعوبتیں جھیلنے کے لیے اس وحشت ناک کرہ میں بھیجا ہو چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اُسے دیکھے۔ اس لیے جب وہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں مسرت وشادکامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی۔ ہر چہرہ تبسم ناآشنا اور ہر پیشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے وہ سوچتا ہے اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ :۔

"زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے خالص اور دوامی مصائب۔ ہر آرزو ایک مستقل تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ لہذا سکون واطمینان عدم آرزو میں ہی ہے" (مہاتما بدھ)

وہ حیات انسانی کو ایک لغو وباطل شے قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ" زندگی محض سراب ہے۔ دھوکا ہے۔ مایا کا جال ہے" (اپنشد) وہ "زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق خیال کرتا ہے" (شوپنہار) وہ اس مصیبت کدہ سے دور بھاگنا چاہتا ہے اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ چوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ناکامیوں کے پردوں میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں۔ اس لیے اسے عام انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور عام انسانوں میں سے چونکہ صاحبان ثروت واقتدار کو وہ اپنی قسمت

ہوئی مسرت کا غاصب سمجھتا ہے۔ اس لیے دولت و ثروت۔ شوکت و سطوت کے خلاف اس کے دل میں
ایک گرہ سی بیٹھ جاتی ہے وہ انسانوں کی بستیوں کو چھوڑ کر دور جنگلوں میں جاکر بسیرا کرلیتا ہے اگر اسے انسانوں
میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت و عزت کے خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق سمجھتا ہے وہ یہ کہہ کر اپنے
قلب محزوں کو تسلی دے لیتا ہے کہ خیر اس دنیا میں تو یہ جو جی چاہے کرلیں "آسمانی بادشاہت" میں توان
لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ ستم رسیدہ کمزور، ناتوان ضعیف مغلوب و مقہور انسانوں کو یہ کہہ کر
مطمئن کردیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لیے نہیں ہے۔ اس کے طالب خدا کی نگاہوں میں مردود و ملعون ہیں
البتہ اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے ایک اور جنم ملنے والا ہے۔ جس میں دولت و حشمت کے مالک
ذلیل و خوار ہوں گے۔ اور جو آج ذلیل و خوار ہیں وہ معزز و مکرم۔ آسمانی بادشاہت انہیں مفلس و غریب
انسانوں کی وراثت ہو۔ نروانا میں یم کے مقرب یہی لوگ ہوں گے۔ دیولوک میں برہما کے ہم آغوش ہونے
والے یہی بھگت ہیں۔ یہی تعلیم کنیسے صومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے۔ یہی فلسفہ تارک الدنیا سنیاسی
اور تیاگی بھکشو کا سچا دھرم ہے۔ اس فلسفہ اور مشرب کی لِم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کرکے مستقبل کو مزیّن
بنایا جائے۔ دنیا کی رسوائیاں عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں۔ یہاں کی ذلت آنے والی
زندگی کی عزت ہو۔ یہاں جتنا پست ہو وہاں اتنا ہی بلند ہو۔ یہاں کا محتاج وہاں کا غنی۔ یہاں کا
تباہ حال وہاں کا خوش حال۔ اور یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو، وہ یہاں کے مصائب و آلام کو بلا بلا کر
اپنا گھر دکھائے کہ یہ اُسے وہاں کی ابدی مسرتوں کا پیام دے رہے ہوں غرضے کہ وہ دنیا و آخرت کے
درمیان ایک ایسے ناقابل شکست آئینہ کی سدِ سکندری قائم کردے کہ جس میں یہاں کا ہر نقش
معکوس دکھائی دے۔

لیکن کیا یہ تعلیم فطرت کی تعلیم قرار دی جاسکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجبور و
مقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اس جیل خانے میں عمر قید رہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقع
یہی منشا ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فنا کردینے میں ہی
اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابل نفرت و ملامت ہیں۔ کیا یہاں کی ہر سہانی

شئے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے۔ کیا مقصدحیاتِ انسانی۔ ذلت و رسوائی۔ محتاجی و ناداری۔ نکبت و مسکنت۔ افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے۔ پھر کیا ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم۔ یہاں کی رسوائیاں اور ذلتوں کے معاوضے میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصہ ہوگی جو دنیا میں ہر قوت سے ڈرتی دبکتی دن گزار رہی ہو؟ کیا خدا کا مقرب وہی ہوگا جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرے۔ کیا دولت و حشمت۔ عزت و وقار کی زندگی واقعی جنت سے محرومی کا سبب ہوگی؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا باب السلام قطعاً مسدود ہوگا۔ کیا یہاں کے چاندی اور سونے کا ہر ٹکڑہ جہنم کے طوق و سلاسل بنانے کے کام میں لایا جائے گا۔ ذل و مسکنت کیا واقعی خدا کی رحمت ہے۔ وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے؟

ان سوالات کا جواب۔ آپ اپنے دماغ سے، کہ جس پر ایک عرصہ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے قفل پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ ہی دیجئے اور اس سے مطمئن ہو جائیے لیکن آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم ان کی بابت ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے کہ وہی تعلیم تعلیم فطرت اور وہی حکم حکم خداوندی ہوگا۔

قرآن کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جملہ موجوداتِ عالم اس کی خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (۴۵/۱۳)	پستیوں اور بلندیوں (ارض و سموٰت) میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔

لہٰذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابعِ فرمان بنائے فطرت کی ہر چیز سے کام لے کہ ایک مدتِ معینہ تک یہ سب اس کی متاع ہیں۔ دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدائے تعالیٰ نے قطعاً حرام نہیں کیں (۷:۳۲) بلکہ ان میں انسان کے لیے ایک خاص کشش و محبت رکھی ہے (۳:۱۳) ان سے تمتع حاصل کرنا۔ ان سے فائدہ اٹھانا۔ ان کو کام میں لانا ہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کی فراوانی اور اس کے غلط استعمال سے انسان میں بعض عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا غلام بن جانے سے بہت سے انسانی جوہر زائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے مطلب نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے۔ اگر دولت و قوت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلت

وپستی کی زندگی بھی تو انسانی تخلیق کی غرض وغایت نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انبیا کرام کی تعلیم ہمیشہ اس افراط وتفریط کو مٹانے کے لیے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازلی پیغام جو ان حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دُنیا میں آتا رہا۔ اس باب میں اس کا شروع سے آخیر تک ایک ہی اور ایک ہی لَم رہی ہے۔ یعنی وہ ان عیوب ونقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت وسطوت کی زیادتی اور اس کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف وناتواں لوگوں کو اُبھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو ایسی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیب پیدا نہ ہوں جو "مترفین" میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ دولت ثروت کے غلط استعمال سے خشیت الٰہی۔ جسے قرآنی اصطلاح میں تقوےٰ کہا جاتا ہے۔ لوگوں کے دلوں سے اُٹھ جاتی ہے جس سے تمام نظام انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حضرات انبیا کرام جن مستضعفین کو اُبھار کر بلند سطح پر لاتے تھے۔ انہیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا! تم ان حدود اللہ کی نگہداشت کرنا۔ ورنہ ان کے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے وہ قوانین الٰہی سے منہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا ضابطہ انہیں بتا دیتے تھے جس سے ان اور خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس کی خشیت اور تقویٰ کو وہ کسی وقت نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اور اس کے بعد زمین اور آسمان کی بادشاہت کے وارث بنتے چلے جائیں بس یہی خلاصہ تعلیم فطرت جو انسانوں کی ہدایت کے لیے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اور اسی پر عمل پیرا ہونے کا نام دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سُرخروئی ہے۔ میزان خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے۔ نظام انسانیہ کی گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار رہنے چاہئیں آزادیوں کی فضائے بسیط میں اُڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے ابھر نہیں سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں۔ جہاں پہنچنے سے قدسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر خشیت وتقویٰ کہ جسے آپ روحانیت کہہ لیجئے۔ خدا کی رحمت وبخشش ہے تو دنیاوی شوکت وعظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاد دہانی اقوام عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے۔ جھ

ھُودؑ نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ خدا کی اس نعمت و قدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قوم نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض کی بخشش سے نوازا اور تمہیں قوت و حشمت میں برتری عطا فرمائی۔ لہذا۔

فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۷:۶۹) اللہ کی یہ نعمت یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔

یہی حضرت صالحؑ نے قوم ثمود سے کہا:۔

"تم خدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اس نے تم کو قوم عاد کے بعد جانشین بنایا۔ اور تمہیں زمین میں متمکن کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو۔ اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (محفوظ) عمارات تعمیر کرتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو پیش نظر رکھو۔ اور زمین میں فساد مت پیدا کرو" (۷:۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین میں قلیل تھے اور اس نے تمہیں کثرت عطا فرمائی۔ (۷:۸۶)۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی حسنات دی گئیں اور آخرت میں بھی (۱۶:۱۲۰)۔ اور آلِ ابراہیمؑ۔ کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ "ملک عظیم" کی بھی مالک بنائی گئی۔ (۴:۵۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ حضرت یوسفؑ کو اس قدر ابتلا و آزمائش کے بعد جس نعمت عظمیٰ سے سرفراز کیا گیا وہ یہی تمکن فی الارض تھا۔ اور اس عطیۂ کبریٰ کو ان کے صبر و تقوےٰ کا اجر جزیل کہا گیا۔

"اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین میں صاحب حکومت بنا دیا۔ (تمکن فی الارض کر دیا) جہاں چاہیں رہیں سہیں۔ ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں پہنچا دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے"۔ (۱۲:۵۶)

حضرت موسےٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت و حشمت۔ تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جس تکرار و اصرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ کوئی اور واقعہ اس شد و مد سے دہرایا نہیں گیا۔ اس تمکن کو کمزوروں پر خاص کہا گیا ہے۔

"ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کر دیا گیا تھا۔ ان پر احسان کریں۔ اور ان کو دوسروں

کا امام بنا دیں۔ اور ان کو (ملک کا) وارث قرار دے دیں۔ اور ان کی حکومت کو زمین پر قائم کر دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔" (۲۸: ۵-۶)

چنانچہ اسی ضعیف و ناتواں، اسی محکوم و مغلوب قوم کو بالآخر مشارق و مغارب کا حکمران بنا دیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا ۔ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ (۷: ۱۳۷)	اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور شمار کی جاتی تھی۔ اس بابرکت زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا اور آپ کے رب کا وعدۂ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہو گیا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ اور فلک بوس عمارات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

صبر و توکل، سعی و عمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لیے حضرت موسیٰ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔

"موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدائے تعالےٰ سے مدد مانگو۔ اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے چاہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بنا دے۔ اور آخری انجام تو متقین کے لیے ہی ہے۔" (۷: ۱۲۸)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی ہے۔

"اے بنی اسرائیل۔ یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا۔ اور تمہیں تمام اقوامِ عالم پر برتری عطا کی تھی۔" (بقرۃ و دیگر مقامات)

اور جب اسی قوم نے قوانین الٰہی سے سرتابی اختیار کر لی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عتاب ان پر نازل ہوا وہ اسی نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱)	اور ان پر ذلت اور مسکنی کی مار ماری گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

مذکورہ صد قصص۔ قرآن کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں بلکہ ہر قصّہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم امم گزشتہ کے احوال وظروف کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتا ہے اور بار بار تاکید کرتا ہے۔ کہ غور وفکر سے دیکھو کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ جن قوموں نے قوانین الٰہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف توجّہ دلانا ہی مقصود ہے۔ کیونکہ اُخروی انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے آ نہیں سکتا۔ ان میں سے بہت سی قومیں تو قانونِ خداوندی کے مطابق صفحۂ کائنات سے حرف مکرر کی طرح مٹ گئیں اور ان کی محض داستانیں باقی رہ گئیں وجعلناھم احادیث (۲۳ : ۴۴) اور بعض قومیں گو زندہ رہیں (اور اب بھی زندہ ہیں)۔ لیکن ان کی حالت عبرت ونصیحت کی زندہ داستان ہے۔ پھر قرآن کریم نے ان تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ واضح الفاظ میں یہ ذہن نشین کرادیا کہ اس دنیا میں عزّت وتوقیر کی زندگی اللہ کی رحمت ونعمت ہے اور یہاں کی ذلّت وخواری اس کا غضب اور عذاب ہے۔ مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ "تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا بادشاہ بنائے گا" (۵۵ : ۲۴) کہیں یہ تشریح ہے کہ "جو کوئی عمل صالح کرے گا۔ وہ مرد ہو یا عورت۔ شرط یہ ہے کہ مومن ہو۔ تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔ اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے" (۹۷ : ۱۶) جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس دنیا میں بہتر بن گھر دیا جاتا ہے۔ (۱۶ : ۴۱) جو اس کے دئے ہوئے کی قدر کرتا ہے، اپنی قوتوں اور اسکی نعمتوں کو صحیح صحیح طور پر مصرف میں لاتا ہے۔ کہ یہی عملاً شکر نعمت ہے۔ اللہ ان نعمتوں میں اور زیادتی کرتا جاتا ہے۔ (۱۴ : ۷)۔ برعکس اس کے "جو اس سے بلا علم وہدایت۔ بلا دلیل وبرہان جھگڑتا ہے۔ اس کے قوانین سے منہ موڑ لیتا ہے۔ خود بھی منزل مقصود تک لے جانے والے راستہ سے بہک جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلت وخواری نصیب ہوگی اور اس کے بعد کی زندگی میں عذاب حریق ملے گا" (۲۲ : ۸) اسی طرح جو اس کے قوانین اس طرح سے ملنے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اُسے اختیار کرے۔ اور جسمیں کسی قربانی وایثار کی ضرورت ہو اور وہ طبع سہولت پسند

پر گراں گزرے۔ اس سے پہلو تہی کرے۔ اس کے لیے بھی خزی فی الحیٰوۃ الدنیا کا رسوائی آمیز عذاب بتایا گیا ہے۔ (۲:۸۵) ایک دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں اس اعتقاد کو دلوں میں اچھی طرح جاگزیں کر دینے کے بعد اب مسلمانوں کے لیے ایک دستور العمل ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا کہ جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے۔ جو اقوام گزشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود تھا۔ ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (۷:۹۶)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے۔

اور اسی ایمان و تقویٰ سے مسلمانوں کو دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

"اے ایمان والو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائیگا اور تمہاری لغزشوں کو دور کر دے گا۔ اور تم کو معاف کر دے گا اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔ (۸:۲۹)

اس لائحہ عمل کی رو سے جو قرآن کریم نے تجویز کیا ایک مسلم کی تمام زندگی مسلسل جدوجہد۔ غیر منقطع سعی و عمل۔ ان تھک کوشش۔ کوہ شکن عزم۔ غیر متزلزل استقامت۔ پیہم جہاد اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی جس کا مقصد محض عاقبت سنوارنا ہی نہ تھا۔ بلکہ اپنے حسن عمل۔ اپنے اعمال صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا۔ ذلت و پستی کی زندگی۔ محتاجی و فلاکت کی زندگی۔ مجبوری و بے بسی کی زندگی۔ کہ جسے قرآن نے غضب کی زندگی قرار دیا تھا نصیب اعداء کر کے خود عزت و وقار کی زندگی۔ خوش حالی و خوش بختی کی زندگی عظمت و شوکت کی زندگی۔ حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھا کہ یہی قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و عمل صالحہ کرنے والی جماعت کی حیات طیب ہو سکتی تھی۔ ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا ماحصل اپنے اللہ کو راضی کر کے خود اس سے راضی ہو جانا تھا۔ اور اس سے دین و دنیا کے حصے لینا تھا۔ (۳:۱۴۷) وہ قوم بننا تھا جسے خدا نے تمام اقوام عالم سے وراثت کتاب کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ (۳۵:۳۲) جسے نوع انسانی میں سے بہترین امت قرار دیا تھا (۳:۱۰۹) ایسے عباد صالح بننا تھا جن کے لیے وراثت ارضی مقدر ہو چکی تھی۔ (۲۱:۱۰۵) اور عملاً تا دنیا

تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کے لیے ایک عظیم الشان پیغام موعظت ہے۔ بلاغ مبین ہے (۲۱:۱۰۶) اور ساری دنیا کو دکھا دینا تھا کہ ہاں جو سچے مومن بن جائیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (۱۰:۶۴)

ان کے لیے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں۔ اور آخرت میں بھی یہ قانون الٰہی غیر متبدل ہے۔ اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نہیں بلکہ یہ ثابت کر دینا تھا۔ کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں۔ (۴۰:۵۱) یوں پورا ہوا کرتا ہے۔ سکان ارضی کو عملاً بتا دینا تھا کہ کس طرح صبر و صلوٰۃ سے استعانت طلب کی جاتی ہے۔ (۲:۴۵) کس طرح دشمنوں کے جمِ غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و ظفر رکاب چومتی ہے۔ (۸:۴۵) الغرض انہیں اپنے اعمال سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کرکے یہ دکھا دینا تھا کہ یاد رکھو تمام خوبیاں۔ ہر قسم کی کامیاں صرف مومنین کے لیے ہیں۔ مجاہدین کے لیے ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹:۸۸) اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ اُنہوں نے یہ کچھ کرکے دکھا دیا اور انکے رب نے وہ تمام وعدے پورے کر دئے جو ان سے کئے گئے تھے۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۳۳:۲۷)

اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور انکے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا۔ اور اس سرزمین کا بھی کہ جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے۔ اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے۔ لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کے لیے ان کے خوابوں میں انہیں دشمن تھوڑے دکھلائے جاتے۔ (۸:۴۳) جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں کہ جس سے یہ انہیں زیادہ دکھائی دیں۔ (۸:۴۴) کہیں ایسے لشکروں کو بھیج کر ان کی مدد کی جاتی کہ جن کو کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعدا کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا۔ (۸:۱۲) کبھی ان میں

کا ایک ایک دَو دَو پر بھاری ہوتا۔ (۸:۶۶) کبھی دس دس پر۔ (۸:۶۵) ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ اس کی لپٹی ہوتی۔ (۸:۱۷-۸) ان کے مقابلے میں دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی اور نہ قوت۔ اس لیے کہ یہ قوانین خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے۔ اور وہ ان راستوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ میں اور ہر میدان ان کے قبضے میں ہوتا۔ اور اس طرح سے بتادیا جاتا کہ فانصرنا علی القوم الکافرین کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کیا کرتا یہ اس کا وعدہ ہے چنانچہ اس وعدے کے مطابق وہ ننھا سا پودا جو دنیا بھر کی تیز و تند مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا۔ چند ہی سال کے عرصے میں ایک شجر طیب کی طرح بڑھا۔ پھولا، پھلا کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوجِ ثریا پر تھیں اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتا تھا۔

"محمد، اللہ کے رسول۔ اور ان کے ساتھی۔ کفار کے مقابلہ میں سخت آپس میں محبت والے۔ تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع کر رہے ہیں۔ کبھی سجدوں میں پڑے ہیں۔ اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ انکے اوصاف توریت میں ہیں۔ اور انجیل میں ہیں۔ جیسے کھیتی کہ جس نے پہلے اپنی سوئی نکالی۔ پھر اس نے اس کو قوی کیا۔ پھر وہ اور موٹی ہوئی۔ پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ کہ دلسے دیکھ دیکھ کر کسان کا دل مسرت سے اچھل پڑے۔ اور اس سے حاسدین کو جلائے اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا (جو) وعدہ کر رکھا تھا۔ (وہ یوں پورا ہو کر رہا)" (۴۸:۲۹)

چنانچہ اللہ کے یہ صحیح مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے اور وہ وقت انہیں یاد آتے "جب وہ قلیل تھے۔ زمین میں کمزور و ناتواں شمار کیے جاتے تھے۔ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ مخالف انہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لے جائیں۔ سو ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی اور اپنی مدد سے انہیں قوت دی اور ان کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں۔ کہ وہ خدا کے شکر گذار بندے بنیں" (۸:۲۶) تو مسرت کے سجدے

تھے جن کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کرکے اعلان کرتے کہ:

یہ وادیٔ ضجنان وہی ہے جس میں مَیں ایک اونی کرتا پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ وہ سخت مزاج آدمی تھے۔ کام لیتے تھے تو تھکا دیتے تھے۔ کم کام کرتا تھا تو پیٹتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی تیسری قوت حائل نہیں۔"

لیکن یہ دور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین۔ عبادات کا صحیح مفہوم۔ اعمال صالح کی سچی تفسیر دنیا اور آخرت کا اصلی تعلق۔ قرآن کریم کی عملی شکل۔ اسوۂ رسول اللہ کی بین تصویر۔ ہر مسلمان کے سامنے تھی۔ بہت جلد ختم ہوگیا۔ خلافت ملوکیت سے بدل گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام خرابیاں ایک ایک کرکے اسلامی کلچر میں نمودار ہوگئیں۔ اور اس کی انتہا عہد عباسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب اسلامی تھا اور روح یکسر عجمی ہو چکی تھی۔ سامان تعیش کی فراوانی سے طبائع عافیت کوش ہو چکی تھیں۔ وہ مجاہدانہ زندگی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل ایمان تھی۔ اب بیگار کے بھرتی شدہ۔ مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ کجا محویتی کی وہ فاروقیؓ روح جو خالد ابن ولید کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمتما اٹھتی تھی۔ (حالانکہ وہ میدان جنگ میں تھے اور جنگی ضرورت سے اُنہوں نے ایسا کیا تھا) اب عہد کہن کا افسانہ بن چکی تھی۔ تقسیم عمل سے عملی برہمنیت پیدا ہو چکی تھی۔ علماء کا طبقہ بجائے تیر و سنان کے اب لفظی تاویلات کی جنگ میں مصروف تھا۔ اربابِ طریقت وحدت وجود کے تباہ کن نظریہ کے ماتحت قوائے عملیہ کو مفلوج کر بیٹھے تھے۔ یہ سب سامانِ ہلاکت جمع ہو چکے تھے کہ شامتِ اعمال نے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی۔ اسلام کی مرکزی قوت فنا ہوگئی۔ اجتماعیت کی شان بگڑ گئی۔ مذہب کے علمبردار حضرات اب مختلف گوشوں اور زاویوں میں جا دبکے (الّا ماشاءاللہ) قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔ حوصلے پست ہو گئے تھے۔ دنیا ہاتھ سے نکل گئی۔ عزت و وقار کی جگہ ذلت و پستی آگئی۔ شوکت و حشمت کی بجائے ذل و مسکنت چھا گئی۔ نماز۔ روزہ حج زکوٰۃ۔ مناسک و شعائر کی شکل تو وہی تھی جو عہدِ اولیٰ میں تھی۔ لیکن اب ان کے نتائج وہ نہ تھے جو اس وقت مترتب ہوتے تھے۔ قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے بدلنے سے بدل جاتی ہیں۔ اور ایسے ایسے موڑ شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں اگر اس وقت نصیبہ یاوری کرتا۔ ہمارے اعمال کے سزا کی مدت ختم ہو جانے والی ہوتی تو ذہنیتوں

میں یہ اعتقاد پیدا کیا جاتا کہ یہ تمام عبادات یہ تمام اعمال جن کی شکل اسلامی ضرور ہے اس وقت تک ح
معنوں میں اعمال صالح نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہوں۔ جو عہد
رَسُولُ اللہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ میں ہوئے تھے لیکن بدبختی کہ زاویۂ نگاہ اُلٹی طرف بدلا۔ قرآن کریم نے جہاں ح
کامیابی۔ فلاح، سرخروئی، فوزِ عظیم، رزق کریم، حسنِ مآب مومنین کے لیے مخصوص کیا تھا۔ ان سب کو آخ
زندگی سے متعلق کر دیا گیا۔ اس دنیا کو یکسر دارالعمل اور اُخروی زندگی کو دارالجزا قرار دے دیا گیا۔ اور ا
ایسا باقی نہ رکھا کہ جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہو سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ باوجود عقیدہ کی شدت
وصلوٰۃ۔ تسبیح وتحلیل کی پابندی کے دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست — یہ مذہبِ مُلّا وجمادات ونباتات

اُس وقت بجائے اس کے کہ یوں سمجھا جاتا۔ کہ ان الفاظ واعمال کی روح ان سے مفقود
اس لیے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو یوں اطمینان دے لیا کہ یہ تمام" اع
نہیں جا رہے۔ البتہ ان کا نتیجہ اُخروی زندگی میں برآمد ہوگا۔ غیر مسلم خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے بجا
کہ ان پر رشک آتا۔ ان کو اپنے لٹے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھتے۔ اپنے آپ کو یوں سمجھانے کی کوشش
کی زندگی ہے جس میں انہیں مہلت دی گئی ہے۔ اُخروی زندگی میں ہم جنتِ جاودانی اور یہ جہنم ابدی
عیسائی راہبوں کا فلسفۂ ترکِ علائق۔ یونانی مشائین کی حکمتِ ترکِ دنیا۔ ہندومت کا سنیاس۔
سنیاس تیاگ۔ ایک ایک کر کے اسلامی تمدن میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا ترکِ دنیا۔ ترکِ علائق۔ ترک
"ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خط وخال قرار پا گئے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شراب ا
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا۔

نظام انسانیت کو تباہیوں کی طرف لے جاتاہے۔قرآن کریم نے ایسی حالت سے محترز رہنے کے لیے تاکید کی تھی کہ دیکھنا کہیں ایسی زندگی کو ہی نصب العین حیات نہ سمجھ لینا۔ یہ دنیا اور اس کی متاع سب عارضی ہے تمہاری منزل مقصود اس سے کہیں بلند ہے۔ اب جہاں جہاں قرآن کریم میں ایسی تعلیم تھی۔ اُسے دنیاوی متاع واشیاء سے نفرت دلانے کے لیے بطور نص صریح پیش کرنے لگے۔ یعنے طبیب نے بڑھتی ہوئی حرارت کو روکنے کے لیے سر پر برف رکھنے کی تاکید کی تھی۔ کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے۔ یہ اسی برف کا استعمال فالج کے مریض پر کرنے لگ گئے۔ دنیاوی زیب وزینت کی چیزوں کو قرآن کریم نے بالتصریح حلال فرمایا تھا۔ وہ سب حرام قرار پاگئیں چیتھڑے پہننا۔ بھوکے رہنا خستہ وخراب ہونا، بے گھر بے در زندگی بسر کرنا" خدا کے بندوں" کی علامات مقرر ہو گئیں۔ غرضیکہ ایک ایک کرکے اس رہبانیت کی تمام باتیں جزوِ اسلام (بلکہ اصل اسلام) بن گئیں جس کو روکنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ اور جس کو اس نے بدعت قرار دیا تھا (۲۷: ۵۷)۔ اسلام رہبانیت کا اس لیے مخالف نہیں کہ اس سے لوگ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کرلیتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ اس سے ایک ایسی انفرادی نجات کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے جس کو اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام افراد کی اصلاح اس لیے چاہتا ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ افراد کا تزکیہ نفس ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم مرتب ہوگی وہ خود مزکی ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان ایک عظیم الشان مشینری کا پرزہ ہے جس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ساری مشینری پر اثر انداز ہوتی ہے اگر ہر ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ یاقوت اور الماس کے ریزوں پر قائم ہو۔ خالص سونے اور چاندی کا بنا ہو لیکن اس کی حرکت کا تعلق باقی پرزوں سے وابستہ نہ ہو تو اس مشینری کے لیے ایسے پرزے کا عدم اور وجود برابر ہے اس کا فی ذاتہ صالح (درست) ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر اسلام کا نصب العین ایسی انفرادی اصلاح ہی ہوتا تو رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کو غاروں میں چھپ کر نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے تو کوئی نہیں روکتا تھا لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ ایک ذہنیت کے بدل جانے سے اس تمام تعلیم کی روح بدل گئی۔ اور عبادات کا مفہوم اسی قسم کی انفرادی اصلاح سمجھ لیا گیا جسے اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ تمام عالم اسلامی میں اس عجمی ذہنیت کے مہلک جراثیم پھیل گئے۔ اور آہستہ آہستہ اسلام کی تمام شوکت وحشمت۔ ذل ومسکنت میں

بدلتی چلی گئی حتّٰی کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم جس کے نزدیک خدا کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر کے مترادف
تھا۔ یاس و حرمان کا مجسمہ بن کے رہ گئی ہے۔ اور چوں کہ وہی تعلیم جو اس واماندگی۔ ضعف و ناتوانی۔ پریشا
و پراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی۔ اصل اسلام بن چکی ہے۔ لہٰذا عوام تو اس نشے میں مست ہیں۔ کہ یہا
جس قدر ہو سکے تباہ حال ہو جائیں۔ جونہی آنکھیں بند ہوئیں اور ہم جنتِ جاودانی میں جا بیٹھے۔ اور جنہیں مسل
کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب انکی مذہب پرستی کا نتیجہ ہے۔ اسلام سے (یعنی ا
اسلام سے جسے اسلام کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے) بے زار ہو جاتے ہیں۔ دین کے علمبرداروں کو شکایت۔
کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں اور بے دین بننے والوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین داران کی دنیا بھی تباہ کر ر
ہیں۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔ اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں وہ صاحب اوصا
حجازی نہ رہے۔ لہٰذا ان دونوں میں ایک ایسی حدِ فاصل۔ ایک ایسی گہری خلیج حائل ہو چکی ہے۔ کہ دونوں
اپنے شعبوں کو۔ دین اور دنیا کو ناقابلِ اتصال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔ حامیانِ دین نے آ
وجہ سے دین کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے کہ وہاں ابھی ان کی عزت باقی ہے مسلمان غرباء کے طبقہ کی حالت آ
خون کے آنسو رلا دینے والی ہو چکی ہے۔ کاشت کار مسلمان۔ وہ پنجاب کا زمیندار ہو یا یوپی کا مزارع۔ آبادی کا
آئے حصہ ہے لیکن حالت اس کی یہ ہے کہ ایک آنہ روز اس کی آمدنی کی اوسط نہیں پڑتی (حالاں کہ جیل خ
کے قاعدہ کی رو سے ایک قیدی کا سالانہ خرچ بھی نوّے روپے سے کم نہیں ہوتا)۔ لیکن "دین" کی تمام خدمات کا
اسی غریب و نادار طبقہ کے ذمّہ ہے مولوی آتا ہے اور اپنا خمس وصول کر کے اسے عذابِ قبر اور نارِ جہنم سے بچنے
دعائیں سکھا جاتا ہے۔ شیخ طریقت اپنا ٹیکس لے کر پاس انفاس اور ذکرِ خفی و جلی سے روحانیت بڑھ
کا "صراطِ مستقیم" دکھا جاتا ہے۔ واعظ آتا ہے تو قرآن کریم کے رزقِ کریم اور حیاتِ طیبہ کے وعدوں کو ہمیشہ عا
پر اٹھا کر اسے تھپک تھپک کر سلاتا جاتا ہے۔ کہ یاد رکھو وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ میں نے ایک بہت بڑ
مسجد میں جمعۃ الوداع کے وعظ میں خود سنا کہ "امام آخر الزماں کا ظہور اس وقت ہو گا جب مسلمانوں کا ز
و انحطاط اپنی انتہائی حالت کو پہنچ جائے گا۔ چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں ان پر چھا جائیں گی۔ امید
کوئی کرن باقی نہ رہے گی۔ اگر اس وقت تک امام صاحب نے نقاب نہیں الٹا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی مسلمانو

زوال اس آخری حد تک نہیں پہنچا جس وقت مسلمانوں کی تباہ حالی اس آخری حد تک پہنچ جائیگی تو آنے والا آئے گا اور تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے گی ۔" جو لوگ کچھ آسودہ حال ہیں ان پر ان حضرات کی نظر کرم اور قسم کی ہے ۔ آئے دن آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ " ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کر دے کہ نماز میں آمین بالجہر نہیں کہنی چاہیے ۔" ان مقتدیان دین نے اپنے اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں ۔ معتقدین کا حلقہ گرد ہوتا ہے ۔ ہزاروں روپے ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کرا دئے جاتے ہیں ۔ دوسری جماعتوں کے ائمہ و مشائخ ، علماء و اسلاف کو گالیاں دی جاتی ہیں ۔ مقدمے چلتے ہیں ۔ ہزارہا روپیہ طرفین سے صرف ہو جاتا ہے ۔ دینے والے اسے فی سبیل اللہ سمجھ کر جنت کے خریدار بنتے ہیں لینے والے اپنے جہاد کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں ۔ اور پھر احسان بھی رکھتے ہیں ۔ حالاں کہ غور سے دیکھیے کہ اللہ نے اس سلسلۂ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لیے تخلیق کر کے اسے حضرت انسان کے تابع فرمان کر دیا ۔ پھر ان انسانوں میں سے امت مسلمہ کو خیر امتہ کہہ کر اس خاص مقصد کی تحصیل کے لیے انہیں چن لیا تو گویا وہ مقصد عظیم وہ نصب العین جو فاطر کائنات نے اس اجتباء و انتخاب کے اندر مضمر رکھا تھا ۔ اس کا حصول اس کا دارو مدار اس بات پر ہو گا کہ نماز میں آمین آہستہ کہنی چاہیے یا بآواز بلند ۔ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیر ناف ۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ درصل قصور ان کا بھی نہیں ۔ اصل یہ ہے کہ جس چیز کو اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے اور جن اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے ۔ ان کی بنیاد غلط ہے ۔ فلاح و سعادت کو محض اخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دینے سے مطلب ہی یہی ہے کہ یہاں کے اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے ۔ بلکہ محض نظری لحاظ سے پرکھا جائے ۔ یعنے ایمان و اعمال صالح کی پہچان حسن مآب نیک انجام ۔ کامیاب زندگی ، حیات طیبہ ، استخلاف فی الارض نہ ہو ۔ بلکہ ان کی سند اس قسم کے سرٹیفکٹ ہوں جو مصری خلفا کے عہد میں ہر مسلمان کو اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی شہادت میں اپنی جیب میں رکھنے پڑتے تھے ۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تخیل نہیں بدلتا کوئی تبدیلی کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی ؎

نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

آپ اس طبقہ کو چھوڑ یے جو اسلامی منا سک وعبادات پر عامل نہیں۔اس طبقہ کو دیکھیے جو ان عبادات پر کاربند ہے۔ ان کی دنیاوی حالت کیسی ہے؟ قرآن کریم نے ان ہی لوگوں کو کامیاب کہا تھا قد افلح المؤمنون (۲۳ : ۱-۱۱) انہی کے لیے آیا تھا۔ اور اس تاکید کے ساتھ آیا تھا جو قد کا خاصا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ روز بروز بجائے افلح واصلح ہونے کے ناکام ونامراد ہوتے جارہے ہیں کیا محض اس لیے نہیں کہ یہ کامیابی یہ فلاح واصلاح محض آخرت سے منسلک کر دی گئی ہے؟ قرآن کریم نے کہا تھا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ - (۴۷ : ۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے اعمال صالح کیے یعنے ایمان لائے۔ اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے ان سے ان کی برائیاں دور کر کے ان کی حالت کو بہترین بنا دیا جائے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جسے صالح کہا جاتا ہے اس کی زندگی قابل رحم گزر رہی ہے کبھی سوچا بھی کہ یہ کیوں ہے؟ اور حیرت ہے کہ قرآن کریم کے اس کھلے ہوئے ارشاد کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ حالت کی بہتری کا مقام فقط حیات آخرت ہی۔ یہ دنیا نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ۔

وہ کل کے غم وعیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا   جو آج جگر سوز وخود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا   جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

قرآن کریم میں ہے :-

" بداعمال لوگ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے کہ ان سب کا مرنا اور جینا۔ حیات وممات یکساں ہو جائے یہ بہت برا فیصلہ ہے۔ (جو یہ کیے بیٹھے ہیں) " (۴۵ : ۲۱)

یعنے قرآن کریم کی رو سے ایک مومن وصالح کی زندگی ایک بداعمال کی زندگی کے برابر نہیں بلکہ متمیز اور ذی شان ہونی چاہیئے یہ خدائے تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اور جو اس کے خلاف سمجھے وہ سراسر غلطی وگمراہی پر ہے

لیکن کیا واقعی آج ان کی زندگی جنہیں مومن وصالح کہا جاتا ہے ۔ بداعمال کفار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے واقعات تو اس کے خلاف جا رہے ہیں ۔ قرآن کریم نے تو اعمال وایمان کے صلہ میں رزق کریم ۔ عزت وآبرو کی روٹی (۲۲:۵۰) دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ پھر آج یہ کیوں ہے ۔ کہ سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کی روٹی مسلمان کو مل رہی ہے ۔ یہ محض "زیب داستان" نہیں ۔ بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روٹی کی خاطر مسلمانوں کو ذلت وخواری کی وہ منازل طے کرنی پڑتی ہیں جنہیں ایک شریف انسان سن نہیں سکتا ۔ جائیے! اور بڑے بڑے شہروں میں دیدۂ عبرت سے دیکھئے کہ مسلمانوں کی شرافت ونجابت ۔ عصمت وعفت کن داموں بک رہی ہے اور یہ کسی عیش وطرب کی خاطر نہیں ۔ بلکہ شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ پیٹ کی مجبوریوں کی خاطر ۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری زبوں حالی اس لیے ہے کہ ہم نے اسلام چھوڑ رکھا ہے ۔ بجا اور درست ۔ لیکن اس اسلام چھوڑنے کی تفصیل کیا ہے؟ صرف اس قدر کہ لوگ انگریزی پڑھنے لگ گئے ۔ شکل وصورت سے کرسٹان ہو گئے ۔ ان کے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے یہ سب اسلوب درست اور صحیح ہیں ۔ جو آپ کے معیار کے مطابق پکے مومن ہیں وہ کونسی خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ آپ کچھ ہی کہہ لیجئے ۔ لیکن یہ ساری خرابی اس نظریے کی ہے جو اسلام کے ضعف وانتشار کے زمانے میں پیدا ہوا ۔ اور جس کی رو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا ۔ اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے ۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو جگا جگا کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو ۔ دنیا کی ذلت وخواری خدا کا عذاب ہے ۔ یہاں کی شوکت وحشمت کی زندگی ہی عین اسلامی زندگی ہے ۔ مسلمان دنیا میں ایک امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے ۔ عزت ووقار جاہ وسطوت ۔ سربلندی وسرفرازی ۔ اس کے اعمالِ صالح کے لازمی نتائج ہونے چاہئیں ۔ جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صورت اسلامی ہو تو ہو ۔ ان کی روح ہرگز اسلامی نہیں ۔ جو یہاں ذلیل ہے اور اس ذلت پر قانع ہے وہ آخرت میں کیسے معزز ہوگا جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اس رسوائی میں مطمئن ہے ۔ وہ عاقبت کیا سنوارے گا ۔

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷:۷۲) جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا

یقین مانیے کہ اس تعلیم کی اشاعت میں آپکی سخت سے سخت مخالفت ہوگی ۔ معتقدات کا چھڑانا افیون

چھڑانے سے کم نہیں ہوتا ؎

گرفتم حضرتِ مُلّا ترش اوست نگاہش مغز را نشناسد از پوست

اگر با این مسلمانی کہ دارم مرا از کعبہ می راند حق اوست

لیکن اگر آپ کو تسلیم ہے کہ یہ تبدیلی از بس لابدی ہے تو کسی مخالفت کی پرواہ نہ کیجئے۔ کہیے اور برملا کہیے۔ بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت۔ ایک دفعہ اس اسلامی رہبانیت کے اعتقاد کو توڑ دیجئے اور صحیح اسلامی تعلیم سامنے لے آیئے۔ پھر دیکھیے کہ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوٰتیں وہی نتائج پیدا کرتی ہیں یا نہیں جو ایک مومن کی اس دنیا کی زندگی کے خصوصی امتیازات ہیں۔ اور آخرت کا تو پھر پوچھنا ہی کیا۔ جب خدا کی کتاب زندہ ہے۔ اس کے رسولؐ کا اسوۂ حسنہ زندہ ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اس پر عمل کرنے والی قوم دنیا میں زندہ نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی اسی قوم کو ہے کہ بقا للاصلح قانون فطرت ہے۔ اور اس قوم کا ہر عمل۔ عملِ صالح ہے جو اس کے اندر زندہ اور پائندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ اقوام مغرب نے قرآن کریم کے اسی اصول کو۔ اللہ تعالیٰ کی ہی سنتِ جاریہ کو کہیں سے سن پایا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں جو نتائج برآمد ہوگئے ظاہر وباہر ہیں۔ لیکن ان کی بدبختی کہ انکے اعمال کی بنیادیں ایمان پر نہ تھیں خشیت باری تعالیٰ۔ تقویٰ اور خدا پرستی ان میں نہ تھی۔ اس لیے انکے اعمال کی ظاہری زینت تو ان کو مل گئی۔ مگر انکی حقیقی لذّت سے وہ بہرہ یاب نہ ہوسکے اور تمام ملک عدم اطمینان و فقدان سکون کا جہنّم زار بن کے رہ گیا۔ لیکن بایں ہمہ کچھ تغلّب تو حاصل ہوا۔ کچھ تسلّط تو مل گیا۔ ناپائیداری سہی تسخیرِ فطرت تو ہوئی۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے اس غلط اعتقاد سے تو ان کی یہ حالت ہوگئی کہ:۔

قبضے سے اُمّت بچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمالِ صالحہ ہو جائیں تو پھر اس جنتِ ارضی کا پوچھنا ہی کیا فی عیشۃ رّاضیہ ایسی جنت کہ جس میں اس جہنّم کا گذر ہی نہ ہو۔ جس میں یورپ آج گزر رہا ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض۔ یعنے اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے۔ استبداد و ملوکیت کی لعنت نہیں۔

یاد رکھیے جس ایمان وعمل صالح کا جیتا جاگتا۔ زندہ و پائندہ نتیجہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام نہیں۔ جماعت مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں ضابطہ الٰہی کے مطابق جہاں بانی و جہاں رائی نہیں۔ وہ ایمان قرآنی ایمان نہیں۔ وہ اعمال اسلامی اعمال نہیں انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے۔ نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لیے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے باقی فریب نظر ہے۔

زقرآں پیشِ خود آئینہ آویز   دگرگوں گشتۂ ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را   قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

اور یہ نتائج صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ مسلمان انفرادی زندگی کو چھوڑ کر ملت کے اندر جذب ہو جائے۔ مرکزیت کی زندگی سے یک نگہی پیدا کرے اور احکام الٰہی کی اطاعت کے "جبر" سے "اختیار" کے تمام مراتب طے کرتا ہوا سرفرازی و بلندی کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کے اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ ہو۔ ... اس کے سوا کوئی زندگی "مسلمان کی زندگی" نہیں۔

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است   زکارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقش دگر ملت بریزیم   کہ ایں ملت جہاں را بارِ دوش است

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد   دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
نگردد با یکے عالم رضامند   دو عالم را بہ دوشِ خویش گیرد

اقبال

کانگرس بے نقاب سابقہ اشاعت میں اسی عنوان کے ماتحت ایک مفصل مضمون شائع کیا جاچکا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ آچاریہ کرپلانی سکرٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بیان کے مطابق کانگرس کا نصب العین ہندوستان میں اس فلسفۂ زندگی کا ازسرنو رائج کرنا ہے جسے بھارت ورش کی پرانی تہذیب کہتے ہیں۔ اور جسکے علمبردار گاندھی جی ہیں۔ آچاریہ جی کے اس بیان کے خلاف ہمارے دمّہ دار مُسلم قومیت پرست علقہ سے کوئی آواز نہیں اُٹھی جس سے ظاہر ہے کہ یہ حضرات خود کانگریس کے اِس نصب العین سے متفق ہیں۔ مُسلم کانگرسی حضرات کے غیر معروف حلقہ میں اسکے متعلق البتہ کچھ تحرک پیدا ہوا ہے۔ اور اس طبقہ کے بعض حضرات کے خیالات ہمعصر مدینہ کی ۵ ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں جنہیں سے بعض کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

(اقتباس از اخبار مدینہ)

مولانا ابوالاقبال محمد جمیل الرحمن صدر مجلس احرار سبوہارہ نے مولانا ابوالکلام آزاد، اور خان عبد الغفار کی خدمت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی حیثیت سے ایک کھلا خط لکھکر ان بزرگانِ کرام سے مندرجۂ ذیل سوالات کئے ہیں۔

(۱) کرپلانی جی نے کانگرس کے مقصد و مسلک کی جو توضیح کی ہے اُس کی آئینی حیثیت کیا ہے۔ اور کانگرس نے اسے کس تاریخ سے اپنے عقیدۂ سیاسی کا جزو بنایا ہے۔

(۲) کرپلانی جی نے کانگرس کے موجودہ نصب العین یعنی گاندھی جی کے فلسفہ کی جو وسیع حدود بیان فرمائی ہیں۔ کیا آپکے نزدیک مذہب کی حدود اسکے سوا کچھ اور ہیں، یا مذہب کا کام

بعینہٖ یہی ہے ؟

(۳) کیا آپ آچاریہ جی کے اس بیان کی روشنی میں کوئی بیان دے سکتے ہیں"۔

حکیم ابوالاقبال صاحب انبالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

اس بیان کے بعد علمائے کرام کو اپنا فرض محسوس کرکے مسلمانوں کو مشورہ دینا چاہیئے کہ وہ اب کیا کریں۔ نیز انھیں کانگرس میں باقاعدہ اس سوال کو اٹھا کر یا تو کرپلانی صاحب سے جواب طلب کرنا چاہیئے۔ اور یا اگر انکا یہ اعلان کانگرس ہی کا اعلان ہے تو پھر سابقہ فیصلوں میں ترمیم کرانی چاہیئے۔ تاکہ مسلمان آیندہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ کرپلانی صاحب کا بیان مسلمانوں کے لیئے سخت تشویش و دلازاری کا موجب بنا ہوا ہے جو شکوک مخالفین کانگرس کی طرف سے ظاہر کیئے جایا کرتے تھے۔ ان کو اس بیان نے پختہ کرکے کانگرسی مسلمانوں کو نادم کرنے کا پورا موقعہ دیدیا ہے"!

دہلی سے محمد عبدالرزاق صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"حضرت مولانا ابوالکلام۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مفتی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید صاحبان و نیز دیگر اراکین جمعیت علمائے ہند بغیر کسی تاویل کے جلد از جلد صاف صاف بیان دیں کہ آیا کرپلانی صاحب کے اس بیان کے بعد کانگرسی بننے کے بعد دامنِ رسولِ مدنی بھی ہاتھ میں رہ سکتا ہے یا نہیں اور اسلامی تمدن۔ معاشرت۔ سیاست و تعلیم اور روحانیت و مدنیت کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو ترجیح دے کر مسلمان بھی رہ سکتا ہے یا نہیں"۔

پیلی بھیت سے مسٹر محمد منیر خاں ممبر کانگریس تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"یہ بیان مسلمانانِ ہند کے واسطے عموماً اور کانگرسی مسلمانوں کے واسطے خصوصاً کھلا ہوا الٹی میٹم ہے۔ اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے، کہ کانگریس ایک خالص سیاسی جماعت ہے لیکن اچاریہ کرپلانی جی کا یہ بیان ہمارے لیئے تازیانۂ عبرت ہے۔

توقع یہ تھی کہ اس بیان کے بعد ہی اراکین جمعیۃ علما، یا حضرت مولانا آزاد مدظلہ کا کوئی

بیان مسلمانوں کی پوزیشن صاف اور واضح کرنے کے واسطے شائع ہوگا مگر افسوس ابتک ایسا نہیں ہوا۔ بہرحال اب جو حالات درپیش آرہے ہیں اور مختلف صوبوں میں جو صورتِ حالات نظر آرہی ہے۔ اُس کی موجودگی میں ان زعمائے گرامیٔ قدر سے بادب استفسار کرتا ہوں۔ کرپلانی جی نے تو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی طرف سے اپنا راستہ بتلا دیا۔ لیکن اب مسلمانوں کا راستہ کون سا ہوگا ؟ کرپلانی جی کا بیان واقعی کانگرس کی صحیح ترجمانی کرتا ہو تو پھر یہ کہنا پڑیگا کہ یہ جماعت مسٹر گاندھی جی کی سندھی تحریک کا ایک نیا رُوپ ہے۔

مسٹر تاج الدین۔ بی۔ ایس سی بی۔ ٹی (علیگ) اپنی بصیرت سے کانگرسی حکومتوں کے نظام تعلیم پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"کرپلانی صاحب کے بیان کے بعد یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ گاندھی جی یا کانگرسی حکومتیں اپنی تعلیمی اسکیموں کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتی ہیں، جسے کسی زمانہ میں اسپارٹا، عیسائی کلیسا اور نپولین نے کیا تھا۔ جاپان، روس، اور جرمنی میں آج کل ہو رہا ہے، یا جس پر اب تک ہندوستان میں انگریز عمل کرتے رہے ہیں، گاندھی جی کا فلسفہ ہندو فلسفہ ہے وہ جس اخلاق و تہذیب معاشرت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں وہ یقیناً ویدک تہذیب و معاشرت ہے جس کا وہ خود ایک عملی نمونہ ہیں۔ چنانچہ اسوقت جو تعلیمی اسکیمیں کانگرسی وزارتوں کے زیرِ غور ہیں ان کو دیکھ کر یہ شبہ باسانی کیا جاسکتا ہے کہ کرپلانی جی کے بیان کے بموجب انکا مقصد گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے مطابق بچوں کی ذہنیت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنا ہے"۔

(اقبال ہم ۱)

ایک چیز وضاحت طلب ہے۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ "اگر کرپلانی جی کا بیان کانگرس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے ۔۔۔ وغیرہ"۔ کرپلانی جی کانگرس کے جنرل سکریٹری ہیں اور کسی ایک کانگرسی

نے بھی اُن کے بیان کی تردید نہیں کی۔ اسکے بعد "اگر" کا کیا سوال ہے؟ مدینہ کے اسی پرچہ میں میرٹھ پولیٹیکل کانفرنس کی رُوئداد کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ کرپلانی جی نے کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ "گاندھی جی کی تعلیمات کو الہامات خداوندی سمجھنا چاہیئے۔ اور اس لیئے گاندھی جی کا درجہ نائب خدا کا درجہ ہے"! ان واقعات کے بعد ہمارے "مقتدر" مسلم قومیت پرست حضرات اور "جلیل القدر" علمائے کرام کے لبوں پر مُہرِ سکوت جن معانی خیز مصالح کی غمازی کرتی ہے وہ کسی دیکھنے والی آنکھ سے پوشیدہ نہیں! اور اسکے باوجود ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم شرکت کانگرس سے لیئے عوام مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیکر اسلام کی عظیم الشان خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ خدا اسلام کو ایسے "دوستوں" سے بچائے۔

گلۂ جفائے وفا نما۔ جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے!
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"!!

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ دائرۂ حمیدیہ (سرائے میر) کے رسالہ الاصلاح کا اگست کا پرچہ نظر سے گذرا۔ یہ پرچہ بھی کانگرس کی "مولویانہ" حمایت میں پیش پیش رہا کرتا ہے لیکن الحمدللہ کرپلانی جی کے بیان نے اس کی بھی آنکھیں کھول دیں۔ چنانچہ اس میں زیرِ بحث بیان کی بڑی شدت سے مخالفت کیگئی ہے اور اخیر میں لکھا ہے کہ:۔

"ہم مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا حسین احمد کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمائیں کہ اگر کانگریس یہی ہے تو دونوں برائیوں میں سے کون اشد ہے؟ انگریز یا کانگریس؟ اور "وطنی قومیت" کا مخترع اور مجہول فلسفہ اتنی کھلی ہوئی ڈکیتی اور ایسی علانیہ خدا اعی کے ساتھ اگر "خودکشی" نہیں تو اور کیا ہے؟

اس مضمون کی روح اگر اچاریہ کرپلانی کے اندر گاندھی جی کے اندر سے آئی ہے۔ اور ہندو لیڈروں کی عام ذہنیت یہی ہے تو ہندوستان کا دو حصوں میں تقسیم

ہونا قطعی اور لازمی ہے۔ اور اس کی ذمہ داری ان ہندو لیڈروں کے سر ہوگی جن کو اکثریت کے گھمنڈ۔ انگریزوں کی تائید کے اعتماد اور مسلمانوں کے انتشار نے بالکل مغبوط کر دیا ہے۔ بے شبہ مسلمان آج منتشر ہیں۔ لیکن کرمالانی جی کے اس طرح کے مضامین ان کو مجتمع بھی کر دیں گے۔ اور اس وقت کرپلانی جی دیکھیں گے کہ مسلمان اپنے اوپر گاندھی کے فلسفہ کو مسلط ہونے سے کس طرح روک دیتے ہیں اور ان میں اپنے مذہب اور تہذیب کی حفاظت کے لئے متحدہ ہو کر مرنے اور مٹنے کا کتنا جذبہ ہے۔"

یہ ہیں مہاتما! بمبئی کی کانگریسی حکومت نے گاندھی جی کی ہدایت کے ماتحت امتناع شراب کا قانون رائج کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ شراب کے ساتھ سٹہ۔ قمار بازی سینما۔ گھوڑ دوڑ کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔ آپ ہریجن میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اگر میں قمار بازی کے خلاف مہم شروع کر دوں تو خطرہ ہے کہ میں ان لوگوں کو ہاتھ سے کھو دوں گا جو میری مستقل طور پر روپے سے امداد کرتے ہیں۔ اگر گھوڑ دوڑ کے خلاف جہاد کروں تو وائسرائے سے لے کر معمولی آدمی تک میرے خلاف ہو جائینگے اگر سینما کے خلاف تحریک کی جائے تو اس سے مقبول بعض اشخاص کے تعلیمی اور اخلاقی مقاصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ اگر میں ان تمام برائیوں کو بھی وہی حیثیت دوں جو شراب کو دی گئی ہے۔ اور ان کے خلاف پکٹنگ کا انتظام کروں تو میری مہاتمائی ختم ہو جائے گی۔ اور کیا عجب کہ میں اپنے سر کو بھی ضائع کر دوں جس کی اس عمر میں کوئی زیادہ حیثیت نہیں۔ چونکہ میں ان سہ گونہ نقصانات کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے مجھے خط لکھنے والے بیشک یہ کہتے پھریں کہ میں اپنے فرائض کا احساس نہیں کر رہا ہوں۔ میں ان برائیوں کو جانتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مجھ سے زیادہ مصلح ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرے

لئے یہی اقدام کافی ہے جو کیا جا چکا ہے"۔

چندہ "مہاتما" اپنے اندر کس قدر کشش کے سامان رکھتے ہیں کہ ان کی قیمت پر ان برائیوں کے استیصال کی کوشش جنہیں یہ خود برائیاں تسلیم کرتے ہیں مصلحت بینی کے خلاف ہے باقی رہا سر جانے کا سوال۔ تو یہ تو محض برائے بیت لکھدیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ سٹہ اور قمار بازی روکنے میں جان کا خطرہ چہ معنی! البتہ حضور وائسرائے کی خفگی یقیناً ایسی چیز ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

اب بات سمجھ میں آ ئی کہ بمبئی میں امتناع شراب کی "جرأت" کیوں کی گئی تھی۔ شراب کی بندش میں اقتصادی نقصان عام طور پر پارسیوں کا ہوا۔ اور حکومت کو جو خسارہ ہوا اسے جائیداد پر ٹیکس لگا کر وصول کر لیا گیا۔ جس میں پھر مسلمانوں اور پارسیوں ہی کا زیادہ حصہ تھا۔ "مہاتما جی" نے خدمت خلق کی نیک نامی بھی حاصل کر لی۔ اور ہندوؤں کے مفاد بھی محفوظ رہے۔ یہ ہے "بنیا بدھی"۔ دیوی کے درشن اور کھاٹ کا بیوپار! اسے کہتے ہیں۔

الکفر ملۃ واحدۃ

ڈاکٹر مونجے نے البرٹ ہال۔ کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مہاسبھا جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے اس کا نصب العین یہ ہے کہ

(۱) ہندوستان کی آبادی میں پھر سے ہم رنگی پیدا کی جائے۔ مذہب۔ نسل۔ کلچر ہر شے میں ہم رنگی

(۲) تبدیلیٔ مذہب کی ہر ممکن ذریعہ سے ممانعت کر دی جائے ذاتی کوششوں سے یا بذریعہ قانون۔

(۳) بنگال سے "حق منسٹری" کو ختم کرکے اس کی جگہ ایسی حکومت قائم کی جائے جس کا وزیر اعظم ہندو ہو۔ (اسیٹرن ٹائمز ۲۹/۹ ء)

مذہب۔ کلچر وغیرہ میں یکرنگی پیدا کرنے کے لئے آپ اچاریہ کرپلانی کا بیان پڑھ چکے

ہیں جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کانگریس تحریک کا نصب العین ہی یہی ہے ۔ کہ ہندوستان میں پھر سے قدیم آریائی تہذیب اور مذہب کی ترویج کی جائے۔

تبدیلیٔ مذاہب کے خلاف بالواسطہ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں کافی تبلیغ مسند ما چکے ہیں۔ کیونکہ ان کے نظریہ کے مطابق جب عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں تو پھر ایک مسلمان کو کیا حق حاصل ہے کہ کسی ہندو کو یہ کہہ کر دعوتِ اسلام دے کہ دنیا میں سچا مذہب یہی ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس کی تفسیر کے حوالہ سے تحریک تبلیغ کے خلاف یہی دلیل پیش کی تھی۔ مولانا آزاد کی مساعی حسنہ کی تکمیل واضعین واردھا اسکیم نے فرما دی جس میں "قومی تعلیم" کا سنگ بنیاد یہی نظریہ قرار دیا گیا ہے۔ زمین یوں تیار کر دی گئی ہے۔ اب فیڈریشن کے بعد اس قسم کا قانون نافذ کر دینا بھی کچھ مشکل نہ ہوگا۔ جب تک مسلم نیشنلسٹ حضرات کا عنصر ہندوؤں کے ساتھ ہے انہیں اس قسم کی تدابیر کے بروئے کار لانے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی ۔

اب رہا "حق مسٹری" کا انہدام۔ اور اس کی جگہ ہندو منسٹری کا قیام۔ سو اس کے لئے کانگریس پہلے ہی سے کوشاں ہے۔ اور اس "کار خیر" کی تکمیل کے لئے بھی مسلمانوں کی کمی نہیں۔ جن حضرات کی تگ و دو آسام میں "سعد اللہ منسٹری" کی جگہ "ہندو منسٹری" قائم کر سکتی ہے۔ بنگال میں وہ کیوں پیچھے رہیں گے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے نصب العین اور منتہائے نگاہ میں کچھ بھی فرق ہے۔ اور مسلمانوں کی تخریب کے لئے مسلم نیشنلسٹ حضرات کی "مساعی حسنہ" اور مونجے اور ساورکر کی تدابیر میں کچھ بھی اختلاف ہے ؟

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

بانیٔ تحریکِ پاکستان

پاکستان کی تحریک کا چرچہ مدت سے ملک کے اطراف واکناف میں ہو رہا ہے اور تقریباً ہر تعلیم یافتہ اور اخبار خواں متنفس اس اسلامی ریاست کے نظریے سے روشناس ہو چکا ہے "پاکستان" کا نام آج اس قدر زبان زدِ خلائق ہے کہ اس لفظ کے معنی ہر اس علیٰحدگی کے مترادف سمجھے جانے لگے ہیں جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے مطلوب ہے۔ اس تحریک کی اہمیت اور صداقت کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ پنجاب کے تمام مسلم اخبارات نے پاکستان اسلامی ریاست کے مطالبے کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت بھی اس کی پشت پر ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے بہت سے شہروں میں پاکستان کے نام پر مجالس بھی کھل گئی ہیں۔ لیکن ابھی تک ملتِ اسلامیہ اس تحریک کے بانی اور صدر چودھری رحمت علی صاحب کے حالات سے کماحقہٗ واقف نہیں ہے جنہوں نے اس شہرۂ آفاق تحریک کی پرورش اور اشاعت جان ومال کی قیمت سے کی ہے اور صبر آزما محنت اور شبانہ روز کی کوشش سے اسے زوال اور انحطاط کی چیرہ دستیوں سے بچایا ہے۔ کسی خبر تھی کہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا پیغام جو صدا بصحرا ہو کر رہ گیا تھا انگلستان سے پھر براڈکاسٹ (Broadcast) ہوگا اور چند ہی سال میں ہوا اور روشنی کی طرح کرۂ ارض کے طول وعرض میں پھیل جائے گا۔ سوائے ربِ ذوالجلال والاکرام کی شان خسروانہ کے اور کون اس کا حقیقی ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

چودھری صاحب کا وطن مالوف ضلع ہوشیارپور (پنجاب) ہے۔ آپ اپنے علاقہ کے باقتدار زراعت پیشہ خاندان سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد آپ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں آپ نے کالج کے نوجوانوں کی تنظیم اور اتحاد کے لیے متعدد انجمنیں بنائیں اور کالج کی بہبود اور تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہی دنوں میں آپ کا تعارف علامہ ڈاکٹر اقبال رحمہ سے ہوا جن کی شفقت کا چودھری صاحب کو اب تک بجا ناز ہے۔ بی۔ اے کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کی لیکن سرکاری ملازمت نے

احتراز کیا تاکہ ان کی نظریہ آزادی میں کوئی چیز مخل ہو کر اُن کی زندگی کو دوسرے قالب میں نہ ڈھال دے۔ آپ کو علم کی تکمیل اور سیاحت کا شوق بدستور تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں آپ عازم انگلستان ہوئے اسی سال حضرت علامہ نے اپنے نقید المثال خطبۂ صدارت (الٰہ آباد) میں ملتِ اسلامیہ کو اس نظریہ سے رُوشناس کرایا جس کی بُنیاد وں پر بعد میں پاکستان کی تحریک قائم ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب حضرت علامہؒ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (Round Table Conference) میں لندن تشریف لیگئے تو چودہری صاحب نے کیمبرج (Cambridge) میں حضرت علامہؒ کے نظریہ کو تحریک پاکستان کی شکل میں پیش کیا۔ اُس وقت سے آج تک آپ نے اکتسابِ علم کے ساتھ ساتھ پاکستان کا پروپیگنڈا بھی جاری رکھا ہے۔ ان نامساعد حالات میں جبکہ فضا غیر مُلکی ہو اور تعلیمی مصروفیتیں بھی ہوں اور سیم و زر کا ذخیرہ بھی وافر نہ ہو۔ پاکستان جیسی انقلاب آفریں تحریک کی پیہم نشر و اشاعت کرتے رہنا اور اُسکے حق میں ولایت کے مشہور اخبارات سے خراجِ تحسین حاصل کرنا۔ قوتِ ارادی اور جوشِ عمل کی حیرت انگیز مثال ہے۔ انگلستان۔ آئرستان۔ جرمنی اور فرانس کے متعدد ذی اثر اخبارات نے تحریک پاکستان کو ایک جائز اور آئینی مطالبہ قرار دیکر اس کی حمایت کی ہے۔

چودہری صاحب نے کیمبرج کی یونیورسٹی سے ایم اے (انگلش) اور ڈبلن یونیورسٹی سے بی اے۔ ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ کچھ عرصہ سے آپ فارغ التحصیل ہیں مگر آپ ایک کتاب "پاکستان ملی تحریک" کے نظریہ اور دستور العمل پر لکھ رہے ہیں۔ گزشتہ موسم بہار میں آپ انگلستان سے بوسٹن (Bostan) امریکہ تشریف لے گئے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ غالباً نومبر میں پاکستان تشریف لے آئینگے۔ اُس روز انشاء اللہ پاکستان کی کامرانی کا ماہِ مبین اپنی پُوری درخشانی کے ساتھ طلوع ہوگا۔

چودہری رحمت علی صاحب میں فطرت کی کرم گستری سے وہ تمام اوصاف بطریق احسن موجود ہیں، جنکا ایک "لیڈر" میں ہونا لازمی ہے۔ اخلاص (Sincerity) ہر نیکی اور خوبی

کی جڑ ہے۔ جو کام بھی اسکے بغیر ہو گا۔ اُس کی بُنیادنقشِ بَرآب ہو گی۔ جوشِ عمل۔ جرأت مردانہ ثبات اور ایثار۔ فیروزمندی اور کامرانی سب اِسی کی فروعات سے ہیں۔ چنانچہ اخلاص چودہری صاحب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ آپ میں اسلام کی پرستاری اور خدمت کا جذبہ "جنون" کی حد تک ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ جب تک کسی بات کا جنون نہ ہو۔ راستے کی دشواریاں اور صعوبات۔ مخالفین کی شرانگیزیاں۔ اور منافقین کی فتنہ پردازیاں مسخر نہیں ہوسکتیں۔ لیڈر کا بڑا کمال یہ ہے کہ اُس کی گفتار اور کردار میں تفاوت نہ ہو اور وہ جماعتوں کی تنظیم کر سکے، اور اُمورِ انتظامیہ میں کماحقہٗ مہارت اور فطری دلچسپی رکھتا ہو جو سالار اپنے کارواں کی ضروریات اور کوتاہیاں نہیں سمجھتا اور اس کی اصلاح اور غمگساری نہیں کرتا وہ اپنی جماعت کا کامیاب پیشوا نہیں ہوسکتا۔ انسانی فطرت کی شناخت اور جذباتِ صحیحہ کا واجب احترام ایسی صفتیں ہیں جو لیڈر کو ہر دل عزیزی کا تاج پہناتی ہیں جو لیڈر اپنی جماعت سے اپنی اولاد کی سی محبت کرتا ہے۔ اور جو عفو اور درگذر کے اُصولوں پر کاربند ہوتا ہے وہ اپنے متبعین سے خون کا آخری قطرہ تک خوشدلی سے طلب کر سکتا ہے۔

آج ہمیں ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو اسلامیات کو ہر شئے پر ترجیح دے اور جو اپنی قوم کی نجات اور سلامتی سایۂ رحمت اللعالمین میں دیکھے جو افراط و تفریط سے اپنا دامن بچائے جو ہر مسئلہ کا اسلام کی روشنی میں تجزیہ کرے جسکا ہر قدم قرآنی نصب العین کیمطابق رہے۔ جو کسی کے سینہ پر کابوس بنکر نہ بیٹھ جائے، بلکہ خورد و کلاں سے شفقت سے پیش آئے اور انہیں آزادانہ رائے زنی کی جرأت دلائے جو پُراسرار اور ناقابلِ تقلید زندگی بسر نہ کرے۔ اور جو کسی طاقت اور شخصیت سے مرعوب نہ ہو اور جسکا سر کائے ذاتِ بے ہمتا کے کسی کے سامنے خم نہ ہو۔ جسکے دل میں اسلام کا عشق اور جس کی نگاہوں میں قرآنی بصیرت ہو۔

چودہری رحمت علیصاحب نے انگلستان کی غیر اسلامی فضا کے حصار میں رہکر اپنے

قلب و دماغ کو ہر غیر اسلامی عنصر سے محفوظ رکھا ہے اور مذہبی روایات کی سختی سے پابندی کی ہے۔ آپ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو ہمیشہ راست بازی۔ اسلام دوستی کفایت شعاری و ایثار کی تلقین کیا کرتے ہیں البتہ آپ نازک مزاج۔ سہل نگار اور زنانہ خصلت کا مظاہرہ کرنے والے نوجوان کی سخت مذمت کرتے ہیں جو لوگ ایفائے عہد نہیں کرتے۔ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ مکر و فریب سے کمال اور تفوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہرگز چودھری صاحب کے نزدیک لائق ستائش نہیں ہیں۔ خواہ وہ قارون سے زیادہ خزانے اور چنگیز سے زیادہ قوت رکھتے ہوں ۔

ہمیں ایسے لیڈر کی ضرورت نہیں ہے جسکے قول و فعل میں تضاد ہو جو سیم و زر پر حریص ہو جو نام و ناموس کے گلی کوچوں میں گداگری کرتا پھرے۔ جو مشرق و مغرب کے علوم سے تہی داماں ہو جو قوم کے جوش اور وفا کا ناجائز استعمال کرے جو اپنے لیے ہر طرح کا سامان تعیش فراہم کرے۔ خواہ قوم بیچاری مفلوک الحال اور قرضہ کے بارسے خمیدہ کمر ہو۔ ہم "ابن الوقتوں" سے بیزار ہیں جو ایک بات پر قائم نہیں ہوتے اور جنکا نصب العین گرگٹ کی طرح بدلتا رہتا ہے ہمیں ایسا لیڈر درکار ہے جس کی فطرت فولاد کی سی مضبوط ہو۔ جسے ہم خیر و عافیت کا ضامن قرار دے سکیں اور جو تمیز بندہ و آقا کو فساد آدمیت سمجھے ۔

چودھری صاحب تعلیم نسواں کے زبردست حامی ہیں مگر اُس آزادی کے قائل نہیں جو عورتوں کو بارگاہِ مغرب نے عطا کر رکھی ہے اور جس پر اب یورپ خود پشیمان اور نادم ہے بلکہ اس صحیح آزادی کے مبلغ ہیں جو عورت کو بارگاہ قرآن سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جس میں دُنیا اور عاقبت کی سرخروئی کا راز پنہاں ہے ۔

پاکستان کی زبان کے متعلق چودھری صاحب کی رائے ہے کہ اُردو اس کی مُلکی اور قومی زبان ہونی چاہیئے اُن کا خیال ہے کہ اُردو زبان ہندوانہ تعصب اور بے انصافی کی نذر ہو کر ہندوستان سے ملک بدر ہو جائیگی اور اپنے قدیمی وطن اور جائے پیدائش پاکستان میں مراجعت کر آئے گی جہاں اُسے ہم اپنی انجمنوں کی شمع

بنائیں گے چودہری صاحب خالص عشقیہ شاعری۔ یا وہ گوئی، افسانہ نویسی اور ادب لطیف یعنی "ٹیگورانہ" ذہنی گورکھ دہندوں کو پسند نہیں کرتے۔ اُنکا عقیدہ ہے کہ جو قلم یا زبان ملت اسلامیہ کی تعمیر میں معاون نہ ہو وہ ہرگز لائق تحسین نہیں ہے۔

قارئین کرام چودہری صاحب کی تعلیمی زندگی سے یہ قیاس نہ فرمائیں کہ چودہری صاحب محض ایک گرم جوش انسان ہیں جو گرمیِ خون اور زورِ بازو سے ایک ناممکن چیز کے درپے ہو رہے ہیں اور اُنکا ذہن دانش اور فراست سے خالی ہے۔ آپ کی عمر اسوقت تقریبًا پنتالیس 45 سال ہے اور یہ عمر وہ ہے جس میں بالعموم انسان کے عزم اور استقلال میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے، آپ نے تحریکِ پاکستان کا پروگرام نہایت متانت اور سنجیدگی سے تیار کیا ہے اور اس تحریک کے خلاف ہر اعتراض کا جواب آپ کے پاس مع دلائل اور اسناد موجود ہے۔

آپ کشیدہ قامت ہیں۔ بدن کچھ ہلکا ہے خط و خال اور لباس سے سادگی ٹپکتی ہے لیکن جب آپ گفتگو کرتے ہیں تو اس قدر اثر میں ڈوبی ہوتی ہے کہ سیدھی دلمیں اُتر جاتی ہے آپ کے کلام میں شاعروں کی نزاکت اور ادیبوں کی سی شیرینی تو نہیں مگر لب ولہجہ میں سپاہیانہ اور مجاہدانہ انداز ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اُن کی مضطرب روح اور بے چین دل کی ترجمانی صحیح انداز میں کرتی ہے اور سننے والے کو اُن کی صداقت کا قائل کر دیتی ہے۔ آپ صاحب قلم بھی ہیں۔ مگر بحث ومباحثہ کے لیۓ آپ کے پاس فرصت کم ہے۔ نکتہ چین۔ کج رو۔ آرام طلب، خودغرض۔ فضول گو عیش پرست اور بداعتقاد سے یوں دامن بچاتے ہیں گویا وہ خار دار جھاڑیاں ہیں۔ جن سے حتی الامکان کترا کر نکلجانا ہی دانش اطواری ہے۔

ڈبلن آئرستان کے اخبار "آئرش انڈیپنڈنٹ" (Irish Independent) کے مُدیر نے چودہری صاحب سے پاکستان کے سلسلہ میں مُلاقات کی اُسکے تاثرات ہمارے بیان کی وضاحت کے ساتھ تائید کرتے ہیں :-

"اولین نگاہ میں مجھے معلوم ہوگیا کہ مسٹر رحمت علی ایک خوشگوار اور دل کش شخصیت کے مالک ہیں وہ طبعًا ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، وہ انگریزی نہایت روانی اور بے تکلفی سے بولتے ہیں۔ مگر اُن کی فطرتی مناسبت زبردست جذبۂ قومیت کی وجہ سے ابھی مادری زبان "اردو" سے ہے جیکے ساتھ اُنہیں والہانہ دل بستگی ہے جو ہم میں سے اکثر لوگوں کو اپنی مادری زبان "آئرش" سے بھی نہیں ہے۔ وہ بے پناہ جذبۂ حب وطن (پاکستان) کے زبردست مبلغ ہیں جس کی بنیاد مذہب پر ہے +

مَیں نے کافی عرصہ مسٹر رحمت علی کی صحبت میں گذارا ہے۔ اُنکا شمار اُن با ایمان لوگوں میں سے ہے جو اپنے نصب العین کی مذہبی شیفتگی سے پرستش کرتے ہیں۔

یہاں میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اُنکا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ وہ ایک مسلم مسولینی یا نئے چنگیز خاں بنیں یا ازیں قسم آمریت کے داعی ہوں۔ بلکہ اُنکا مقصد محض یہ ہے کہ وہ ملت پاکستان کو مجتمع کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہونچایئں۔ غیر مسلموں سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور نہ اُس تنگ نظری کو روا رکھا جائے گا جس کی بدولت ہندوستان نے چھ کروڑ اچھوت پیدا کیئے" +

"چودہری صاحب موصوف کی شخصیت میں مشرق اور مغرب دونوں ملے ہوئے ہیں وہ پنجاب کے بی اے، کیمبرج کے ایم اے اور ڈبلن کے ایل۔ ایل۔ بی۔ اور نہایت ستسنہ مزاج انسان ہیں، مغرب میں جو تعلیم آپ نے حاصل کی ہے اُس نے آپ کے جذبۂ مذہب کو اور تیز کر دیا ہے۔ اب وہ مستقبل میں اپنے آبائی وطن میں واپس تشریف لے جانے اور وہاں جاکر بیش از بیش خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

(آئرش انڈیپنڈنٹ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۵ء)

ایڈیٹر اخبار "ڈیلی ٹیلگراف" لندن نے ۹ ستمبر 1935 کی اشاعت میں پاکستان کا نقشہ شائع کر کے مندرجۂ ذیل شذرہ سپرد قلم کیا۔

"مجھے چند خوبصورت اور دیدہ زیب پمفلٹ پاکستان ملی تحریک کے بانی اور صدر مسٹر رحمت علی کی طرف سے موصول ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا نام پانچ اسلامی صوبوں پنجاب۔ افغانی صوبہ کشمیر۔ سندھ اور بلوچستان سے حاصل کیا گیا ہے۔ پاکستانی قوم ہندوستان کے لیے فیڈریشن کے نفاذ کو ناپسند کرتی ہے اور اس کا مطالبہ ایک ملی وطن یعنی پاکستان کا قیام کا ہے جو پاکستانی صوبہ جات پر مشتمل ہو"۔

لفظ "پاکستان" چودھری رحمت علی صاحب کا ساختہ ہے۔ چنانچہ مدیر اخبار موصوف آگے چلکر چودھری صاحب کے لفظوں میں پاکستان کی یوں تشریح کرتا ہے:۔

"پاکستان کے معنی ہیں "پاک" لوگوں کی سرزمین۔ لفظ "پاک" کا مفہوم انگریزی میں کما حقہٗ ادا نہیں ہوسکتا۔ اِس سے ہر وہ چیز مُراد ہے جو انسانی زندگی میں مقدس اور پاک ہے مسٹر رحمت علی (جنہوں نے یہ نام وضع کیا ہے) کا خیال ہے کہ لفظ "پاک" پاکستانی قوم کی صحیح روح کا ترجمان اور آئینہ دار ہے"۔

ترکی کی شہرۂ آفاق خاتون خالدہ ادیب خانم نے سیاحتِ ہند کے حالات ایک کتابی صورت میں قلمبند کیے ہیں اس کتاب کا نام "اندرون ہند" (Inside India) ہے پاکستان ملی تحریک پر آپنے ایک مستقل باب باندھا ہے۔ اُس سلسلہ میں آپنے چودھری صاحب کا ذکر بھی مختصر الفاظ میں کیا ہے جو ہمارے بیان کی تائید مزید ہے۔ فرماتی ہیں:۔

"مسٹر رحمت علی نے اپنی تعلیم انگلینڈ میں مکمل کی ہے۔ جہاں اُنھوں نے کیمبرج اور ڈبلن کی یونیورسیٹوں سے ایم۔اے۔ اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ آپ ایک قابل قانون داں تھے اور آپ کو سیاسی تاریخ کے تعمیری پہلو میں خاص شغف تھا لیکن آپ نے وکالت کا پیشہ ترک کرکے "پاکستان ملی تحریک" کا اجرا کیا۔ اور اِس وقت آپ کی حیات کا غالب جذبہ اور مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل ہے۔ میں نے ملاقات

کے دوران میں محسوس کیا کہ وہ تلخی جو مسٹر رحمت علی کے دل میں ہندو مہاسبھا نیانہ اور اسلام دشمنی کی ذہنیت سے جوانی میں پیدا ہوگئی تھی، ہرگز اُنکے نظریۂ پاکستان پر اثرانداز نہیں ہوئی۔ اور وہ اِس تحریک کی بنیاد ہندو کی عداوت پر نہیں رکھتے۔ فی الحال نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریک ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے میں کہاں تک عملی طور پر مفید ہو لیکن ہندوستانی حالات کے غیرجانب دار مُبصر کو اِسے نگاہ میں رکھنا چاہیئے"

مندرجۂ بالا سطور سے چودہری رحمت علیصاحب کا سرسری تعارف قارئین کرام سے کرایا گیا ہے ممکن ہے ذاتی تعلقات کی وجہ سے (جس کی بنیاد بھی اسی مشترک مقصد پر ہے جو ہم پاکستانیوں کی زندگی کا نصب العین قرار پاچکا ہے) اِس تعارف میں غیرمحسوس طور پر اپنے عزیز دوست کی مدحت سرائی کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگیا ہو۔ لیکن جو کچھ ہمنے عرض کیا ہے اس میں دانستہ کسی مبالغہ کا شائبہ نہیں۔ بایں ہمہ چودہری رحمت علیصاحب انسان ہیں۔ ہم مسٹر گاندہی کے پیروکاران کی طرح یہ غلط دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے کہ چودہری صاحب کی ذات ہر نقص اور عیب سے منزہ ہے۔ کیونکہ معصوم ذات تو صرف انبیا ہی کی ہوسکتی ہے، البتہ ہمیں ضرور یقین ہے کہ پاکستان کی کشتی کا ناخدا بننے کی صلاحیت آپ سے زیادہ کسی میں نظر نہیں آتی اور بحیثیت بانی اور صدر تحریک ہونے کے چودہری صاحب کو اس بات کا استحقاق بھی پہونچتا ہے۔ نیز اس لیئے بھی کہ پاکستان کا نظریہ جس جلیل القدر ہستی کی نگہ بصیرت نواز کا رہینِ کرم ہے اسکا پیغام حیات آفریں چودہری صاحب کے خون کے ہر قطرہ میں سرایت کرچکا ہے۔ اور اب جو کچھ یہ کہتے ہیں اُس میں الفاظ تو اِنکے ہوتے ہیں لیکن روح حضرت علامہؒ کی نقاب پوش ہوتی ہے۔

حمید پاک گوجرانوالہ

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

جناب محمد اکرم خاں صاحب مُدیر روزنامہ شمس، ملتان شہر

ابتدائی تعلیم کے نصاب کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ادارۂ اشاعت "مکتبہ جامعہ" کی طرف سے پانچ کتابوں کا ایک سلسلہ شائع ہوا ہے جس کے متعلق اخبارات میں بعض تنقیدی مضمون ہماری نظر سے گزرے اور بعض مقامات سے یہ اطلاعات بھی آئیں کہ مسلمان اس سلسلۂ کتب کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس صورت حال میں ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کتابوں کا خود مطالعہ کر کے آزادانہ طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہ مضمون اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔

پانچوں کتابوں کا مشترکہ عنوان "نئی کتاب" ہے۔ پہلی کتاب کو قاعدہ اور باقی چار کو پہلے۔ دوسرے۔ تیسرے اور چوتھے حصے کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس وقت تک ان کتابوں پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر زبان اور مذہب کے پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے علاوہ ان کتابوں کی تعلیمی حیثیت کو بھی پوری طرح جانچا جائے۔ لہٰذا ہم آگے چل کر ان سب پہلوؤں پر الگ الگ بحث کریں گے لیکن قاعدہ چونکہ بنیادی چیز ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل کے ساتھ علیحدہ تبصرہ کیا جائے۔

نیا قاعدہ

نئے قاعدے میں شروع ہی میں پڑھانے والے کو سب سے پہلی ہدایت یہ کی گئی ہے:۔

"سارے قاعدے میں حرفوں کے نام نہ بتائے جائیں بلکہ ان کی صرف آواز بتائی جائے جس طرح ہندی میں رائج ہے۔"

یعنی الف بے جیم دال کے بجائے اَ بَ جَ دَ کی آوازیں بتائی جائیں۔ صرف یہ نہیں کہ حرفوں کے نام شروع میں نہ بتائے جائیں بلکہ سارے قاعدے میں نہ بتائے جائیں گویا اُردو کے مروجہ نام بالکل

موقوف کر دے جائیں اور ہندی کی آوازوں کا طریقہ رائج کیا جائے۔ ہدایت کا آخری ٹکڑا خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہندی اور اُردو کی بحث میں ہندی والوں کی طرف سے اُن کے حروف تہجی کی برتری کی بالعموم یہی دلیل دی جاتی ہے کہ ہندی میں حروف کے نام آوازوں کے مطابق ہیں لیکن اردو (اور اسی طرح عربی اور فارسی) میں حروف کے نام صوتی نہیں لہٰذا غیر فطری اور مشکل ہیں۔ اس نئے قاعدے نے ہندی والوں کی اس سطحی دلیل پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یہ ہے اس نئے نصاب کی بسم اللہ!

حروف تہجی قاعدہ کو مروجہ طریقے کے مطابق حروف تہجی سے شروع نہیں کیا گیا بلکہ تصویروں کے ذریعے لفظ اور لفظوں کے ذریعے حرف پہچاننے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ جدت چنداں قابل اعتراض نہ سہی لیکن اس سلسلے میں یہ نوٹ خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ

"پہلے پہل ہندی کے عام مستعمل حروف سے روشناس کرایا گیا ہے۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اردو کی مروجہ الف بے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک حصے میں ۲۱ حرف رکھے گئے ہیں جو ہندی میں عام طور پر مستعمل ہیں۔ ۴۸ صفحوں کے قاعدے میں ۴۳ صفحے انہی حروف اور ان کے مرکبات کے لیے وقف کیے گئے ہیں اور صرف آخری ۵ صفحوں میں "عربی فارسی کے باقی ۱۴ حرف" کے عنوان سے یہ حرف اور ان سے مرکب چند لفظ اور جملے دیے گئے ہیں۔

متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے حامیوں کی طرف سے حروف تہجی کی یہ فرقہ وارانہ تقسیم بظاہر تعجب انگیز معلوم ہوگی لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ متحدہ قومیت کی بنیاد یعنی جذبۂ وطنیت کو پختہ کرنے کی خاطر یہ تقسیم مناسب سمجھی گئی ہے۔ یعنی بچوں کے ذہن میں شروع ہی سے یہ بات بٹھا دی جائے کہ ہماری زبان میں اتنے حرف "دیسی" ہیں اور اتنے "بدیسی"، گویا آگے چل کر ہماری زبان سے غیر زبانوں یعنی عربی و فارسی کے حروف و الفاظ نکال دینے کی تحریک کے لیے ابھی سے زمین تیار ہو جائے۔ اس وقت تو عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ اس قدر گھل مل چکے ہیں کہ اُردو تو بجائے خود، ہندی جاننے والے بھی بالعموم ان کی شناخت نہیں کر سکتے۔ لیکن اس نئے قاعدے نے امتیاز کی یہی بنیاد رکھ دی ہے کہ ایک وقت خود اُردو جاننے والوں میں بھی یہ احساس پوری طرح پیدا ہو جائے۔

رسم تحریر۔ ہندی میں مستعمل حرفوں کی شناخت کرا دینے کے بعد ایک نقشہ دیا گیا ہے۔ اس میں ان حرفوں سے بنے ہوئے ایسے الفاظ پیش کیے گئے ہیں جن میں اعراب اور حروفِ علت کا استعمال نہیں ہے۔ بعدازاں حروف علت (ا۔و۔ی) کی مشق کے لیے الگ الگ سبق رکھے گئے ہیں۔ ان سبقوں کے اندر رسم تحریر میں چند ایسی انوکھی جدّتیں پیدا کی گئی ہیں جو اصولی غلطیوں کی حدود تک چلی جاتی ہیں

مروّجہ رسم تحریر میں **ی** کے حرفِ ماقبل پر کوئی اعراب نہ ہو تو یہ مجہول ہو جاتی ہے۔ حرف ماقبل مکسور ہو تو معروف بن جاتی ہے اور مفتوح ہو تو **ی** پھیلی ہوئی آواز دیتی ہے مثلاً (۱) دِیْر۔ بِیْر (۲) مِیْر تِیْر (۳) سَیْر۔ خَیْر۔ اس نئے قاعدے میں حرفِ ماقبل سے بالکل قطع نظر کر کے حرف **ی** کے اندر ہی مختلف آوازیں نمایاں کرنے کی صورتیں تجویز کی گئی ہیں۔ چنانچہ ان الفاظ کو اس طرح لکھا گیا ہے۔ (۱) دیر۔ بیر (۲) میر۔ تیر (۳) سیْر۔ خیْر۔ اس میں (۱) کے الفاظ تو صحیح پڑھے جا سکتے ہیں اور کسی حد تک (۲) کے بھی لیکن (۳) کی تحریر اور تلفظ دونوں غلط ہیں کیونکہ محض جزم کے نشان (^) کو زبر اور جزم (ؕ) کا قائم مقام بنانا بالکل بے جا ہے۔ علاوہ ازیں اس رسم تحریر سے اعراب کا بالکل غلط تصوّر پیدا ہوتا ہے کیونکہ درحقیقت جزم صرف سکون کی علامت ہوتی ہے اور خواہ وہ تحریر میں آئے یا نہ آئے اوپر کے تمام لفظوں میں اسے ی پر موجود سمجھا جائے گا۔

یہی سلوک **و** کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں بھی حرف ماقبل کو چھوڑ کر خود **و** کے اندر تمام آوازیں پیدا کی گئی ہیں۔ مثلاً مروّجہ رسم تحریر کے ان لفظوں (۱) کوٹ۔ بوْل (۲) کُوٹ۔ دُوْر (۳) کوْن۔ دَوْر کے لیے یہ صورتیں تجویز کی ہیں (۱) کوٹ۔ بول (۲) کوُٹ۔ دوُر (۳) کوْن۔ دوْر۔ ظاہر ہے کہ ان میں بھی (۱) درست پڑھے جا سکتے ہیں (۲) میں تکلف بے جا ہے اور (۳) بالکل غلط کیونکہ جزم کے ہوتے ہوئے بھی حرفِ ماقبل کی زیر۔ زبر یا پیش **و** کی آواز کو بدل سکتی ہے۔

ہمزہ اور یائے مجہول کی ملی ہوئی آواز کو عام طور پر اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔ اُٹھیئے۔ کھائیے وغیرہ اس قاعدے میں اُٹھیئے جیسی مُتّصلہ صورت کو تو اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے لیکن کھائیے کی جگہ کھاءے تجویز کیا گیا ہے۔ یہ نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ اس میں ہمزہ کے ذرا آگے پیچھے ہو جانے سے کھائیے

اور کھاسے کا فرق ہی اُڑ جاتا ہے۔

اس جدید رسم تحریر کے متعلق زیادہ لکھنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے بے جا اور ناقابلِ عمل ہونے کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ خود اسی قاعدے میں بھی اس کو پوری طرح نبھایا نہیں جاسکا۔ مثلاً صفحہ ۲۷ پر تیر۔ پیدل۔ ایسا۔ لیسے پر زبر موجود ہے۔ اور قاعدے سے آگے باقی کتابوں میں تو یہ رسم تحریر بالکل استعمال ہی نہیں کی جاسکی۔

ذخیرۂ الفاظ۔ بچوں کے ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ پہلے آسان آسان لفظ سکھائے جائیں اور ٹھوس (Concrete) چیزوں سے خیالی (Abstract) چیزوں کی طرف تدریجی ترقی کی جائے۔ لیکن اس قاعدے میں اس نفسیاتی اصول کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے اس کے برعکس تصویروں سے بھی ٹھوس چیزوں کے بجائے خیالی باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے مثلاً سب سے پہلے ایک انگلی اُٹھائے ہوئے ہاتھ کی تصویر ہے اور اس تصویر سے "ہاتھ" کا لفظ سکھانے کے بجائے "ایک" کا تصور دلایا گیا ہے۔ تین آدمیوں کی تصویر سے "لوگ" کا خیال پیدا کرایا گیا ہے ناچتے ہوئے مور کی تصویر سے محض مور کے بجائے "ناچ" کا اور گیند کی تصویر سے گیند کے بجائے "گول" کا مفہوم ادا کیا گیا ہے۔

ہندی میں مستعمل حرفوں سے بنے ہوئے جن لفظوں کا نقشہ دیا گیا ہے اس میں لفظ کسی اصول کے ماتحت نہیں چنے گئے۔ چار کالموں میں سے پہلے کالم میں تو تمام لفظ دو حرفی ہیں لیکن باقی تین کالموں میں کوئی خاص التزام نہیں حالانکہ اگر دو حرفی سہ حرفی اور چار حرفی الفاظ بھی الگ الگ کالموں میں دے دئے جاتے تو بہتر ہوتا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ لفظ ایسے چنے جائیں کہ خاص حرف کسی کے شروع کسی کے درمیان اور کسی کے آخر میں آئے۔

پھر اس نقشے کے بعد جب ان لفظوں کے استعمال کا سبق آتا ہے تو اس میں بعض نئے لفظ ڈال دئے گئے ہیں۔ مثلاً ڈگر پر چل۔ تٹ پر ہے۔ ڈھب سے دو۔ ان میں ڈگر۔ تٹ اور ڈھب ایسے لفظ ہیں جو نقشے میں نہیں آئے۔

یہ الفاظ معنوی لحاظ سے بھی قابل توجہ ہیں۔ بالخصوص لفظ "تٹ" تو ان میں ایسا ہے جس کے لیے فرہنگ آصفیہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ تب جا کر معلوم ہوا کہ ہندی کا یہ لفظ کنارے یا ساحل کے معنوں میں صرف گیتوں کے اندر استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ذیل میں کچھ اور لفظوں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں جو قاعدہ پڑھنے والے بچوں کے لیے یقیناً مشکل ہیں۔

(۱) غیر مانوس ہندی لفظ :- وچن۔ دھنک۔ ڈگر۔ تٹ۔ گاد۔ لابھ۔ واگھ ناتھ۔ داسی۔ مورکھ۔ دھرتی۔ ڈھور۔ گئو۔

سُدھ۔ دھرم۔

(۲) عربی فارسی کے مشکل لفظ :- ید۔ وگر۔ حالی۔ خاکی۔ ذاکر۔ تاش۔ دائرہ۔

(۳) وہ لفظ جن کا بچوں کو تصوّر دلانا مشکل ہے :- کھٹک۔ چھب۔ بچن۔ شِشر۔ باس۔ مات۔ یاس۔ لاج۔ ساکھ۔ اثر۔ راز۔ طرز۔ لحاظ۔ فن۔ ثابت قدم۔ رتن۔

نقشے میں ایک لفظ "بدر" بھی ہے معلوم نہیں یہ عربی کا بَدر ہے یا فارسی کا بَدَر۔ بہر کیف دونوں صورتوں میں یہ بچوں کے لیے مشکل ہے۔ خاص طور پر "باس" کا لفظ تو ایسا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا مفہوم کوئی استاد کسی بچے کے ذہن نشین کیوں کر کرا سکتا ہے۔

تعلیمی پہلو سے تو قاعدے کی یہ حیثیت ہے اس کی زبان کے متعلق بھی کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ باقی رہی اسکی معنوی حیثیت اور خاص خیالات کی اشاعت اس کا ذکر باقی کتابوں کے ساتھ یکجا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نئی کتابوں کی زبان

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگرچہ پانچوں کتابیں اُردو رسم الخط میں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں لفظ "اُردو" کے استعمال سے جان بوجھ کر پہلو بچایا گیا ہے۔ چنانچہ قاعدے

میں "ہندی" کا لفظ کئی بار آیا ہے۔ کتابوں میں "ہندوستانی" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے لیکن کہیں نہیں آیا تو صرف لفظ "اُردو" نہیں آیا۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ دوسرے حصے میں "ہماری زبان" کے عنوان سے جو مضمون دیا گیا ہے اس میں زبان کے متعلق اپنے مقصد کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے۔

"ہمارا دیس ہندوستان اور ہماری زبان ہندوستانی ہے ...... ہندوستانی زبان کا جنم بھی سب قوموں کے میل سے ہوا ...... پہلے مسلمان فارسی بولتے تھے اور ہندو پراکرت میں بات چیت کرتے تھے لیکن ایک دوسرے کی نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں نے مل کر ہندوستانی زبان نکالی .... یہ ہمارے دیس کی زبان ہے جیسے ہمیں اپنا دیس ہندوستان پیارا ہے ویسے ہی اپنے دیس کی زبان ہندوستانی پیاری ہے۔"

اس کے بعد سوال صرف یہی رہ جاتا ہے کہ کیا ہندوستانی سے مراد اُردو ہی ہے یا کوئی اور زبان۔ اگر اُردو کے علاوہ کوئی اور زبان مراد ہے تو کیا وہ کوئی موجودہ زبان ہے یا آئندہ چل کر بننے والی کوئی نئی زبان۔ اوپر کے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی کسی موجودہ زبان کا نام ہے لیکن ان پانچ کتابوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ یقیناً کوئی موجودہ زبان نہیں ہے نہ تو وہ اردو ہے اور نہ ہندی بلکہ ان دونوں کو بگاڑ کر ایک نئی زبان کا ڈھانچا تیار کیا گیا ہے۔

زبان کی غلطیاں۔ زبان کا ادبی معیار تو ایک طرف رہا۔ ان کتابوں میں اتنی احتیاط بھی نہیں کی گئی کہ بچّوں کے لیے صاف ستھری زبان استعمال کی جائے جو غلطیوں سے پاک ہو۔ مثلاً ذیل کے ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

قاعدہ ص ۱۴۔ ڈھب سے دو۔ ایک شک ہے ص ۲ دولا کھ ہے۔

پہلا حصہ ص ۲۸۔ چند اماموں جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ ص ۴۸ بھو دو۔ دکتے کی آواز کو انگریزی میں بو وو کہتے ہیں لیکن اردو میں تو بھوں بھوں ہی کہا جاتا ہے) ص ۷ اٹھیں ہو کر مگن۔

دوسرا حصہ ص۲۲ ۔ دیکھو تو جمنا کی دھارا ص۴۷ ایک نوکری رکھ لی ۔ ص۲۰ کھسیا کر

تیسرا حصہ ص۵۹ ۔ اب پورا چین ایک دل ہو رہا ہے ۔ اگر یہی ایک دلی رہی ص۹۶

سوچ اور بچار ۔

زبان کی ناہمواری ۔ علاوہ ازیں اُردو کو بگاڑ کر ہندوستانی بنانے کی کوشش میں زبان کی ہمواری بالکل جاتی رہی ہے اور اکثر فقرے بالکل انمل بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں مثلاً :۔

قاعدہ ص۳۳ ۔ مولا کو یاد کر ۔ ہری کھجن گا ۔

پہلا حصہ ص۱ سارے جگ کا داتا تو ہے ۔ مالک تُو ہے آقا تُو ہے ۔

دوسرا حصّہ ص۱۱ کشمیر ہمارے ہی دیس کے اُتر میں ہے ۔ ایسی بہار کی جگہ ہے کہ سب لوگ اُسے دنیا میں جنّت کہتے ہیں ۔ ص۱۴۲ علم اور گیان ۔

تیسرا حصّہ ص۲۴ دیس کی بھلائی کے لیے جان کی بھینٹ دینے میں جو مزا ہے وہ غلامی کی زندگی میں کہاں ۔

چوتھا حصہ ص۹ انسان کی خدمت کرکے اپنے بھائیوں کی سیوا کرکے ۔ ص۱۴۶ کرشن جی کی تو ساری عمر ظالموں اور پاپیوں کو سزا دینے اور مظلوموں کی مدد کرنے بیتی تھی ۔

یہ مثالیں مُشتے نمونہ از خروارے ہیں ۔ اس قسم کے بے شمار نمونے مل سکتے ہیں ۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان فقروں میں ہندی کے جو الفاظ بھی آئے ہیں وہ اُردو میں عام طور پر مستعمل ہیں ۔ اور انفرادی طور پہ خالص اُردو کے لفظ قرار دئے جا سکتے ہیں ۔ لیکن ایسے فقروں میں جس انداز سے اور جن الفاظ کے ہمراہ استعمال ہوئے ہیں اس سے زبان کی سلاست اور ہمواری باقی نہیں رہ سکی ۔

غیر مانوس ہندی لفظ ۔ مصنوعی ہندوستانی زبان بنانے کی خاطر ہندی کے بے شمار الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں کہ یہ بات ان کتابوں کا ایک خصوصی امتیاز بن گئی ہے اس قسم کے الفاظ سے پانچوں کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن محض نمونے کے طور پر چند ایک مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں

جن سے ان کوششوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قاعدہ ص۲۹ اشنان کر۔ ص۳۷ دھوپ سے دھرتی تپ رہی ہے۔
ڈھور کے بدن میں لہو نہیں گئو کے تھن میں دودھ نہ رہا۔

دوسرا حصہ ص۱۴ ہندوستان ہمارا دیس دل سے پیارا دیس ہے ...... ہم اس کے داس ہیں۔ ص۱۵ اس کا ہمالیہ پربت سب پربتوں سے بڑا ہے۔ کشمیر میں بارہ ماس ٹھنڈ پڑتی ہے۔ ص۱۶ ہمارا دیس بڑا سندر دیس ہے ص۲۰ اس کمشتی میں ایسے کون سے گُن ہیں۔ ص۱۹ دنیا کے بندھنوں کو توڑا جائے۔ ص۱۳۰ اسکا ئی کرلی۔ ص۷۵ پرجا کی سیوا۔ ص۸۴ تپاجی۔ ص۸۵ پرارتھنا۔ ص۸۶ اہنسا۔

تیسرا حصہ ص۲۳ دلیس غلام ہوجاتا تو پتی کا جینا بھی کس کام کا تھا۔ ص۴۰ آنگن۔ ص۸۰ پریم کی کیسی پیاری ریت۔ ص۹۰ گیان دھیان۔ ص۱۱۹ دین اور دیس کی سیوا۔

چوتھا حصہ۔ ص۱۳۱ دیش کی آنکھ کے تارو آو۔ ص۴۹ ان گنت۔ ص۱۴۶ راج سیوگ منایا۔ ص۱۴۷ جان کا پنچھی۔ ص۲۱۵ شریمتی کچوری۔ ستیہ گرہ ص۱۴۲ نیوتا۔ ص۱۴۳ متھرا باسیوں۔

ہندی کے لفظوں کے استعمال میں قوم وطن اور مذہب تک کی موزونیت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ مثلاً "سید احمد خاں نے دلی میں جنم لیا۔" زرتشت کے حال میں ایران کے متعلق لکھا ہے کہ "وہاں کے راجہ نے آپ کا مذہب اختیار کرلیا۔" اسی طرح زرتشت کے بارے میں لکھا ہے کہ "اسی لڑائی میں وہ شہید ہوگئے۔" ولیم ٹیل کے ڈرامے کا آخری فقرہ ملاحظہ ہو۔ "ٹیل کی جے۔ زندہ باد ٹیل۔ سوئزرلینڈ کی جے۔"

علمی معیار

ان کتابوں کی زبان کا انداز تو آپ نے دیکھ لیا۔ افسوس یہ ہے کہ علمی لحاظ سے بھی ان کا درجہ بہت پست ہے۔ قاعدے کے متعلق تو تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے لیکن قاعدے کی بعد باقی حصوں کی بھی علمی حیثیت کچھ اچھی نہیں، وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ بعض خاص تبلیغی مقاصد اور خاص سیاسی خیالات کی اشاعت کی خاطر کتابوں کے علمی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

حصہ نظم۔ نظموں کے انتخاب میں بچّوں کی دل چسپی اور ذہنی ضروریات کے بہ نسبت وطن پرستی اور متحدہ قومیت کی تبلیغ کو زیادہ مدّنظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ چند ایک اچھّی نظموں کے سوا باقی سب تبلیغی ہیں۔ ان مقاصد کی دُھن میں اشعار کی صحت تک کا خیال نہیں رکھا گیا۔ بعض اشعار کو تو شاید کاتب کے قلم نے زخمی کیا ہے۔ مثلاً :۔

دوسرا حصہ ص۱ ساری دُنیا کے مالک + راجا اور پرجا کے مالک (پہلے مصرع میں "اے" چھوٹ گیا ہے)

چوتھا حصہ ص۲ دُور دُنیا کا مرے دل سے اندھیرا ہو جائے۔ ("دَم" کی جگہ "دل" لکھا گیا ہے)

ص۲۴۹ بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو ("بودھ" لکھنے سے شعر درست ہوتا ہے)

لیکن بعض اشعار میں فی الواقع زبان اور وزن کی غلطیاں موجود ہیں۔ مثلاً :۔

پہلا حصہ ص۱۲ دعا کے عنوان سے نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

سارے جگ کا داتا تو ہے۔ مالک تو ہے آقا تو ہے

تمام شعر اسی وزن پر ہیں لیکن آخری شعر اس طرح بدل گیا ہے۔

لَو تجھ ہی سے لگاتے ہیں + تیرے ہی گُن گاتے ہیں

دوسرا حصہ ص۱۰۲ ہندوستان ہمارا دیس + ہندوستان پیارا دیس (پیارا
بروزن ہمارا توجہ طلب ہے)

تیسرا حصہ ص۱۹۱ ان کی بولی شانِ خدا ہے + شان نہیں پہچانِ خدا ہے (پہچانِ
خدا کی ترکیب دل چسپ ہے)

غلط اشعار کے علاوہ ان نظموں کا علمی و ادبی معیار بہت پست ہے۔

پہلا حصہ ص۲۵ میں کیا ہوں۔

دوسرا حصہ ص۱۳۰ چڑیا چڑے کی کہانی۔

تیسرا حصہ ص۱۰۱ بچہ اور جگنو

ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں کو فن شعر کی باریکیاں سکھائی جائیں بلکہ صرف اتنا ہے کہ بچوں کے لیے جو نظمیں رکھی جائیں وہ اغلاط سے پاک ہوں اور معیارِ ادب پر پوری اُتریں۔ بچپن میں پڑھی ہوئی نظمیں بالعموم دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ لہذا بچوں میں ذوقِ ادب کے صحیح طور پر نشو ونما پانے کے لیے ضروری ہے کہ یہ نظمیں صحیح اور معیاری ہوں۔

نظموں کی ترتیب بھی حسب دل خواہ نہیں۔ لفظی اور معنوی حیثیت سے تدریج کا خیال کم رکھا گیا ہے۔

سیاسی پروپاگنڈہ

حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں میں علمی اور نفسیاتی ضرورت سے زیادہ خاص سیاسی خیالات کی نشر و اشاعت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ سب سے زیادہ زور وطن پرستی پر دیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے حصے میں "ہمارا دیس" (نظم)۔ دوسرے حصے میں "ہمارا دیس"، "سب سے اچھا دیس ہمارا" (نظم) "دیس کی سیوا"۔ تیسرے حصے میں "ہمارا وطن" (نظم)۔ چوتھے حصے میں "جاگو اور جگاؤ" (نظم)۔ "ہماری دعا" (نظم)۔ "حبِ وطن (نظم) تو سب کے سب مخصوص طور پر اسی مقصد کے

لیے ہیں۔ ان کے علاوہ ضمنی طور پر جا بجا دیس اور وطن کا ذکر آتا ہی رہتا ہے خاص طور پر نثر میں تو زیادہ تر دیس ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ نظموں میں کہیں کہیں وطن بھی آگیا ہے۔

وطن پرستی کے بعد آزادی کا جذبہ اُبھارنے کے لیے ذیل کے سبق خاص طور پر دئے گئے ہیں تیسرا حصّہ۔ آزادی کی لڑائی۔ موت کا ڈر۔ دیس کا سپاہی۔ چوتھا حصہ۔ ولیم ٹیل۔ بہادر جون۔ امریکہ کی آزادی۔ لیکن یہ نہیں کہ بہادری اور جنگ آزمائی کی رغبت دلائی گئی ہو۔ صرف دوسرے حصے میں ایک سبق "زر گل" کے سوا جس میں ایک سرحدی بہادر کا ذکر ہے باقی سب جگہ گاندھی جی کی "اہنسا" کی تبلیغ کی گئی ہے۔

متحدہ قومیت کے لیے زمین تیار کرنے کی بھی بہت کوشش کی گئی ہے۔ جا بجا اس کے اشارات کے علاوہ تیسرے حصّے میں "ہندو مسلمان بھائی بھائی" اور "آؤ مل کر گائیں گیت" نظم اس مقصد کے لئے مخصوص ہیں۔ متحدہ قومیت کی خاطر جن لطائف الحیل سے کام لیا گیا ہے اس کا ذکر ہم آگے ذرا تفصیل سے کریں گے

چرخے اور کھدّر (کھادی) کے پرچار کے لیے نہایت باضابطہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یعنے پہلی کتاب میں "کپاس" کے عنوان سے ایک باتصویر سبق دیا گیا ہے۔ اس کا آخری جملہ یہ ہے۔

"کھدّر ہمارے دیس کا اچھا کپڑا ہے کھدّر پہننے سے ہمارے دیس کی بھلائی ہوگی۔"

دوسرے حصے میں "کپاس کا کھیت" تیسرے حصے میں "روئی کا کارخانہ" اور چوتھے حصے میں "کھادی گھر" کا ایک سبق دے کر گویا ایک سلسلہ کی تمام کڑیاں مکمل کردی ہیں۔

تمدّن اور معاشرت

ہندو معاشرت اور تمدن کو فروغ دینے کی کوشش ان کتابوں کا خاص کارنامہ ہے۔ اسلام یا اسلامی معاشرت کی بابت جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ یونہی برائے بیت قسم کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کا انداز بیان ہی ظاہر کرتا ہے کہ کس قدر ڈر ڈر کر اور بیچ بیچ کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

ہندو معاشرت کی تبلیغ دو طریقوں سے کی گئی ہے ایک بالواسطہ اور دوسری براہ راست۔ بالواسطہ تو اس طرح کہ اُردو کے عام فہم لفظوں کی جگہ ہندی کے ایسے لفظ چن چن کر رکھے گئے ہیں جن سے خود بخود غیر محسوس طور پر ہندو معاشرت کا نقش دلوں پر بیٹھتا جائے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہندی کے الفاظ کے ضمن میں آچکی ہیں۔

دوسرا طریقہ براہ راست تبلیغ کا ہے اس میں وہ فقرے اور مضمون ہیں جن سے عمداً ہندو معاشرت کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ مثلاً چوتھے حصے میں "رد ٹیوں کا جلسہ" ایک ڈراما ہے جس کے ایک کیریکٹر کو "شری متی کچوری" کا نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصے میں کوّے کی کہانی میں اُسے جا بجا "کاگا مہاراج" کہا گیا ہے۔ سلطان ناصرالدین کو درویش بادشاہ کے بجائے سادھو بادشاہ کہہ کر بتایا گیا ہے کہ وہ "مرتے دم تک سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرتا رہا" تیسرے حصے میں "بیٹا اور ماں" کے عنوان سے ایک سبق ہے جس میں یہ فقرے قابل توجہ ہیں "جب تو نہا دھو کر بال کھولے اس پیڑ کے پاس مندر کو جاتی" "دوپہر کا کھانا کھا کر جب تو گیتا پڑھنے بیٹھتی" "سب عورتیں تالاب پر جا کر روز کپڑے دھوتی ہیں"۔

ہندو مسلمانوں کی متحدہ معاشرت کا پروپاگنڈہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ ۴۱ "ہندوستان اب ہم دونو کا وطن ہے۔ ہندوستان کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں... ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون مل گیا ہے...... دونوں کی صورتیں بدل کر ایک سی ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں"۔

واضح رہے کہ یہ ٹکڑا سرسید احمد خاں کی طرف سے پیش کر کے بظاہر بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے اسی طرح بعض اور مضمون اور نظمیں بھی مختلف اکابر کی تصنیفات سے لی گئی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ خود انتخاب ہی سے "دل کا معاملہ" کھل جاتا ہے۔ جو "رسوائی" کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

متحدہ قومیت کی عملی تعلیم کا غالباً سب سے دلچسپ نمونہ پہلے حصے کے سبق ۲۴ سے ۲۸ میں پایا

جاتا ہے۔ ان پانچوں سبقوں میں مضمون کا ایک ہی سلسلہ چلا گیا ہے۔ شروع میں بتا دیا گیا ہے کہ

"رشید اور ہم ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس کی بہن راشدہ بھی ہمارے ساتھ پڑھتی ہے...

.....کل کی چھٹی تھی تو اسد اور موہن اور سیتا سب رشید کے گھر کھیلنے گئے ....."

دو سبقوں میں ان بچوں کے مل کر کھیلنے کا ذکر ہے۔ ہندو مسلمان بچوں کا اس طرح مل کر کھیلنا تو ایک عام بات ہی لیکن سبق ۲۶ میں معاملہ یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ سب بچے کھانا بھی ایک ہی جگہ مل کر کھاتے ہیں۔ کھانے کا انداز ملاحظہ ہو :۔

"چلو بچّو کھانا آ گیا۔ اماں نے چوکی پر رکابیاں رکھ دی تھیں۔ کٹوروں پر پانی رکھ دیا تھا سب کے لیے الگ الگ ایک کٹورا تھا۔ ابا نے بتایا تھا کہ ایک ہی کٹورے میں سب کو پانی نہ پینا چاہیئے۔ اس سے کبھی کبھی بیماری پھیلتی ہے ....

اماں نے بڑی سی رکابی میں کھچڑی نکالی اور لا کر چوکی پر بیچ میں رکھ دی.... ایک پیالی میں گھی لا کر رکھدیا۔ ایک میں دہی۔ موہن نے کہا "گھی تو بہت اچھا ہے۔ کیسا پیلا پیلا صاف ہے".... سب نے دہی اور گھی ملا کر خوب کھچڑی کھائی۔ اسد نے کہا "چٹنی ہوتی تو بڑا مزا آتا" اماں نے کہا "جلدی میں لانا بھول گئی۔ ہرے پودینے کی چٹنی بنا رکھی ہے"

یقیناً ایک ہندو بچے کا مسلمان گھر میں اس طرح گھل مل کر کھانے میں شریک ہونا عام حالات کے مطابق نہیں ہے اور آرزو مندانہ اظہار خیال کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

اسی سبق میں کھانوں کی فہرست بھی قابل توجہ ہے۔ کھچڑی۔ دہی۔ چٹنی چپاتی اور خمیری روٹی کا تو صاف ذکر ہے البتہ گوشت کا نام بالکل نہیں لیا گیا۔ اس کے متعلق فقط اس اشارے سے کام لیا گیا ہے کہ ہڈی کتی کے آگے ڈال دی گئی اور اس نے چبانا شروع کر دی۔

ہندو تمدن کے سلسلے میں پہلے حصے کی نظم "گائے" اور تیسرے حصے کا سبق "تلسی" بھی قابل ذکر ہیں۔ تلسی کے بیان میں تو یہاں تک بھی لکھ دیا گیا ہے کہ :۔

"دیکھو کتنے فائدے کی چیز ہے۔ ہندو تو اس کی پوجا بھی کرتے ہیں"۔

ایک ہی فقرے میں کس خوبی کے ساتھ فلسفۂ عبادت کے اسرار کھول کر رکھ دئے ہیں۔
اکابر ہند۔ ان کتابوں میں بچّوں کے لیئے ہندوستان کے جن بڑے بڑے آدمیوں کا تذکرہ ضروری خیال کیا گیا ہے ان کا تفصیلی تذکرہ طوالتِ بے جا کا موجب ہوگا۔ صرف اس فہرست سے نقطۂ نظر کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں۔ گوکھلے مہاراج۔ بی آماں۔ دادا بھائی نوروجی۔ حکیم اجمل خاں۔ بال گنگا دھر تلک۔ گننے کو تو تین مسلمان اور تین غیر مسلم اکابر کے نام ہیں لیکن حُسنِ انتخاب سیاسی زاویۂ نگاہ کی صاف صاف غمازی کر رہا ہے۔

ایک اور جگہ ہندوستان کے ذکر میں یہاں کی تاریخی شخصیتوں کی فہرست یہ دی ہے:۔

"سری کرشن جی۔ رامچندر جی اور گوتم بدھ جیسے مہاتما۔ اشوک اور اکبر جیسے بادشاہ۔ سرسید۔ مہاتما گاندھی اور ٹیگور جیسے بڑے بڑے لوگ یہیں پیدا ہوئے۔"

تاریخ۔ تاریخ میں جن بادشاہوں کو خاص طور پر چنا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔ سلطان ناصر الدین۔ اکبر بادشاہ۔ سکندر۔ خلیفہ ہارون رشید۔ اشوک۔ ان میں سے صرف خلیفہ ہارون رشید کے سوا باقی سب کی حالت میں وہی تبلیغی انداز نمایاں ہے۔ خاص طور پر سلطان ناصر الدین کے تذکرے میں تو کمال کر دیا گیا ہے۔

مثلاً:۔ "سلطان ناصر الدین مرتے دم تک سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ سچے مسلمان کی طرح خدا کی عبادت میں لگا رہتا تھا مگر راج پاٹ کا کام بہت ہی جی لگا کر کرتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ خدا نے مجھے بادشاہ اس لیے نہیں بنایا کہ آرام کروں بلکہ اس لیے کہ اپنی پرجا کی سیوا کروں۔"

گویا ایک سچّا مسلمان تو محض خدا کی عبادت میں لگا رہتا ہے۔ لیکن سلطان ناصر الدین "راج پاٹ" کا کام بھی جی لگا کر کرتا تھا۔ غالباً اس کی یہ خصوصیت سادھو ہونے کے باعث ہوگی۔

بادشاہوں کے علاوہ دوسری شخصیتوں میں سوئٹزرلینڈ کے ولیم ٹیل اور فرانس کی جون آف آرک خاص طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن اسلامی تاریخ کو قریب قریب بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

مذہب

معاشرت۔ تمدن اور تاریخ کے بارے میں تو آپ نے ان کتابوں کا انداز دیکھ لیا۔ اب ذرا مذہبی تعلیم کے متعلق بھی دیکھ لیجئے۔ مذہبی پیشواؤں میں سے ان کا حال دیا گیا ہے۔ (۱) حضرت محمدؐ (۲) مہاتما گوتم بدھ (۳) حضرت زرتشت (۴) رامچندر جی۔ (۵) حضرت عیسٰےؑ (۶) سری کرشن جی۔

مہاتما گوتم بدھ کا حال بہت اچھے طریقے سے دیا گیا اور ان کی تعلیم کا خلاصہ مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ حضرت" زرتشت کے متعلق یہ چیز نمایاں کی گئی ہے کہ اُنہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو اچھا اور نیک بننا اور ایک خدا کی پوجا کرنا سکھایا" اور فرمایا کہ "بس ایک خدا کو مانو۔ محتاجوں کی مدد کرو اور جانوروں پر رحم کھاؤ"۔ ان کے پیروؤں کے متعلق لکھا ہے "کہ آگ اور سورج کی ان میں بہت عزت کی جاتی ہے"۔ رامچندر جی کا حال معروف عام کہانی کے طور پر ہے۔ حضرت عیسٰےؑ کے حال میں اگرچہ اُن کے نبی ہونے کا کوئی ذکر نہیں لیکن اتنا اشارہ ہے "کہ اُنہوں نے خدا کے حکم سے اچھی اچھی باتیں اپنی قوم کو سمجھانی شروع کیں"۔ انکی تعلیم میں سے صرف یہی چیز انتخاب کی گئی ہے کہ "جو تمہارے ساتھ بُرائی کرے اس کے ساتھ نیکی کرو۔ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو"۔ سری کرشن جی کے کارناموں کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کا حاصل زندگی یہ بتایا گیا ہے کہ اُن کی "ساری عمر ظالموں اور پاپیوں کو سزا دینے اور مظلوموں کی مدد کرتے بیتی تھی"۔

ان سب کے مقابلے میں رسول پاک صلعم کی سیرت مبارکہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ آنحضرت صلعم کا ذکر سب سے پہلے تو قاعدے کے اندر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"حضرت محمدؐ غار میں خدا کی عبادت کرتے تھے"۔

کہنے کو تو جھٹ کہا جا سکتا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ لیکن ظاہر ہے کہ بچوں کے دل میں آنحضرت کی قبل از نبوت زندگی کے صرف ایک واقعہ کا نقش بٹھانا جس سے ذہن راہبانہ زندگی کی طرف منتقل ہو اور یوں تعلیماتِ اسلامی کے بالکل منافی اثر قبول کرلے کہاں تک حق بہ جانب کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے حصے میں "حضرت محمدؐ" کے عنوان سے ایک سبق ہے تمام سبق میں کسی جگہ بھی

اُن کے رسول یا نبی ہونے کا مطلق ذکر نہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ "آپ نے چالیس برس کی عمر میں اپنا کام شروع کیا اور ترسیٹھ برس کی عمر میں اس دنیا سے سدھار گئے"۔ لیکن یہ نہیں ظاہر کیا کہ آخر وہ کام کیا تھا۔ آپ کی سب سے بڑی تعریف بس اس قدر کی گئی ہے کہ "مکّے میں مسلمانوں کے سب سے بڑے سردار پیدا ہوئے۔" ساتھ ہی آپ کی "اچھی باتوں" کے ضمن میں یہ لفظ بھی قابلِ غور ہیں "اس پر دشمن بہت گھبرائے۔ آپ کو روپے پیسے کا لالچ دیا اور کہا ہمارے سردار بن جاؤ پر یہ خیال چھوڑ دو لیکن آپ نے صاف جواب دے دیا۔"

آں حضرت صلعم کی تعلیمات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ "اپنی دھن میں لگ رہے کہ خدا کے بندے خدا کو ٹھیک ٹھیک پہچاننے لگیں"۔ تمام سبق میں لفظ "اسلام" سے پوری طرح اجتناب کیا گیا ہے اور اسلام کے پھیلنے کا ذکر ان دل چسپ لفظوں میں کیا گیا ہے۔

"مکّے والوں پر اس مہربانی کا بہت اثر ہوا۔ اُنھوں نے پرانی برائیوں سے توبہ کی۔ سب نیک ہوگئے اور ہوتے ہوتے عرب کے سب شہروں میں نیکی پھیل گئی۔"

مختصر یہ کہ اس سبق میں آں حضرتؐ کا تذکرہ عقیدت اور اثر سے بالکل خالی ہے اور بالکل اس طرح ہے جس طرح خاکم بدہن کسی عام انسان کا ہو۔

پُرانے نصابوں سے مقابلہ

ہم نے تمدن، معاشرت، تاریخ اور مذہب کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا ہے اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتابیں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے بچّوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اس لئے دونوں کا خیال رکھا گیا ہے بعض باتیں اسلامی معاشرت کے مطابق ہیں تو بعض ہندوؤں کے رسم و رواج کے مطابق تاکہ دونوں ان سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ لیکن یہ جواب بالکل غیر تسلّی بخش ہے۔ کیوں کہ اول تو اس اصول کے مطابق بھی دونوں کا تناسب برابر نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں غیر اسلامی معاشرت کو اسلامی معاشرت کے بہ نسبت بہت زیادہ حصّہ دیا گیا ہے۔ دوسرے آجکل ہندی کی طرف ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی توجّہ کو دیکھتے ہوئے اس میں بھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ اُردو رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابیں ہندوؤں میں رائج

بھی ہو سکیں گی۔ بالفرض ہندو بچے انہیں پڑھیں بھی سہی تو ان کی معاشرت اور تمدن کی ان میں بہت کافی رعایت رکھی گئی ہے اس کے برعکس مسلمان بچوں کے لئے ان میں بہت کچھ مضرت رساں مواد موجود ہے۔ اگر یہ کتابیں زیادہ تر صرف مسلمان بچوں ہی میں رائج رہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے ہماری آئندہ نسل کو کس قدر نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

اگر اردو نصاب صرف ہندو بچوں کے لئے مقصود ہے تو یہ مکتبۂ جامعہ کی کتابیں ذرا سی کمی بیشی کے بعد ان کے لئے بہت موزوں ہو سکتی ہیں۔ اگر صرف مسلمان بچوں کے لئے چاہیئے تو اس سے بالکل مختلف قسم کے خالص اسلامی سلسلۂ کتب کی ضرورت ہوگی لیکن اگر ایسا نصاب درکار ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے بچوں کے لئے موزون ومناسب ہو تو وہ خالص تعلیمی بنیادوں پر تیار ہونا چاہیئے۔ اس کی زبان بالکل لسانی اصولوں کے مطابق ہو اور ہندی اور اردو کو ملانے کی مصنوعی کوشش سے پوری طرح اجتناب کیا جائے اسی طرح مذہبی اور معاشرتی اختلافات کو خواہ مخواہ درمیان لانے کی بالکل ضرورت نہیں صرف مشترک اخلاقی باتیں اور معلومات عامہ کافی ہو سکتی ہیں چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد۔ اور ماسٹر پیارے لال کا تیار کیا ہوا سلسلۂ کتب اس کی بہترین مثال ہے۔ اس طرح کی مشترک درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں کے بچوں کے لئے الگ الگ مذہبی اور معاشرتی نصاب مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ جو ان کو اپنے اپنے طریق پر تعلیم بہم پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ سرے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت کے فرق سے انکار کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان دونوں معاشرتوں کے امتزاج سے ایک متحدہ "ہندی معاشرت" پیدا کرنے کو نصب العین بنا لیا گیا ہے۔

مولانا آزاد اور ماسٹر پیارے لال کے سلسلۂ کتب کا ذکر کرتے ہوئے یہ نکتہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت ان کی قومی روایات اور تاریخ کے سبق موجود ہیں۔ ایک طرف سلطان سبکتگین کا ذکر ہے تو دوسری

طرف رانا پرتاب کا حال۔ اِدھر سوامی صاحب کا گھوڑا ہے تو ادھر پنڈت جی کی بھلی قیمص

ہند میں جہاں **محمود غزنوی** اور **بابر** کے حالات دیئے گئے وہاں **مہابھارت** اور رامائن

کی کہانیاں بھی پوری تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہیں کہ نہ

اسلامی باتیں ہندؤں کو ناگوار گذر سکتی ہیں اور نہ ہندؤں کی چیزیں مسلمانوں کو بری معلوم

ہوتی ہیں۔ مسلمان انہیں پڑھکر مسلمان رہتا ہے اور ہندو۔ ہندو۔ اس کا سبب کیا ہے؟ فقط یہی کہ

وہاں یہ سب چیزیں رواداری نہ خلوص کے ساتھ محض علمی حیثیت سے پیش کی گئی ہیں نہ کہ متحدہ

قومیت اور وطن پرستی جیسے سیاسی مقاصد کو مدنظر رکھ کر۔

ماحصل کلام

اختصار کی کوشش کے باوجود یہ تبصرہ بہت طویل ہوگیا۔ اور پھر بھی صرف اہم پہلوؤں

پر بحث ہوسکی ہے۔ اگرچہ ابھی بہت سی باتیں تفصیل طلب ہیں۔ لیکن امید ہے کہ اتنی

تشریح اس سلسلۂ کتب کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ جن اصحاب کو علمی

اعتبار سے مزید تحقیق کرنا ہو وہ بذاتِ خود ان کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ انہیں یقیناً بہت

کچھ دلچسپ مسالہ مل جائیگا۔ بہرکیف اس مضمون سے کم ازکم ذیل کے نتائج بہ آسانی اخذ

کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) اس سلسلہ کتب میں مذہب کے متعلق بچوں کے ذہن میں وہ تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی

گئی ہے جس کی رُو سے اسلام میں کوئی امتیازی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ آنحضرت

صلعم کی حیاتِ طیبہ کو بھی نہایت عامیانہ انداز میں پیش کرکے آپ کی عظمت کو عام سطح پر لایا گیا ہے

(۲) گاندھی جی کے اہنسا کے اُصولوں کی مختلف طریقوں سے موثر انداز میں تبلیغ کی گئی ہے

(۳) عالمگیر اسلامی اخوت کو نظرانداز کرکے وطن پرستی کے جذبہ کو راسخ کرنے کی انتہائی

کوشش کی گئی ہے۔

(۴) اسلامی تہذیب ثقافت کے مقابلے میں ہندوؤں کے تمدن اور معاشرت کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ قومیت میں ڈھالنے کی بُنیاد رکھی گئی ہے +

(۵) زبان کے لحاظ سے یہ کتابیں نہ اُردو میں ہیں نہ ہندی میں۔ عام بول چال کی اُردو یا ہندوستانی میں ہندی کے غیر مانوس لفظ ٹھونس کر اُسے بگاڑا گیا ہے اور ایک مصنوعی ہندوستانی زبان پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے جو پیش خیمہ ہے اس زبان کا جسے اُردو کو مٹا کر ہندو یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں +

(۶) تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ سلسلۂ کتب بہت ناقص ہے اس میں جن جدّتوں کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں اصولی خامیاں ہیں۔ ابتدائی سبقوں میں بچوں کی نفسیات کا ضروری حد تک خیال نہیں رکھا گیا۔ اور بہ حیثیت مجموعی اس نصاب کا علمی اور تعلیمی معیار بہت پست ہے

حال ہی میں مختلف تنقیدوں کے جواب میں جامعہ ملیہ کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ :-

"ہم ان کتابوں میں بہ اجازت ٹکسٹ بُک کمیٹی بمبئی ترمیم کرنے کو تیار ہیں۔ یعنی ہندی کے غیر مانوس الفاظ بدل دیئے جائیں گے۔ غرضیکہ اگلا اڈیشن اس شکل میں پبلک کے ہاتھوں میں آئے گا کہ کوئی معقول اعتراض باقی نہ رہے گا۔"

مانا کہ چند الفاظ بدل دیے جائیں گے اور بعض مضامین میں کچھ ترمیم کر دی جائیگی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس نصاب کی سرے سے بنیاد ہی غلط ہو اُس کی اصلاح اس قدر آسانی سے کیونکر کی جاسکتی ہے اس میں تو ایسی اساسی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جن سے اس کی ہیئت ہی بدل جائے، اور یہ صورت ایک بالکل نئے نصاب تیار کرنے کی مترادف ہوگی۔ پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اربابِ جامعہ کو ان کتابوں کی تیاری کے وقت یہ قطعاً محسوس نہیں ہوا کہ اسلامی نقطۂ خیال سے یہ کس درجہ قابلِ اعتراض ہیں۔ اِس امر کا احساس انہیں صرف اسوقت ہوا۔ جب مُلک میں اِن

کتابوں کے خلاف اعتراضات کا طوفان اٹھا۔ یہ بھی درست سہی کہ لفظوں جملوں اور سبقوں پر الگ الگ اعتراضات کے جواب دینے کے لیے طرح طرح کی توجیہیں کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ان اعتراضات کی پیش بندی کرنے کے لیے پہلے بھی بہت کچھ گنجائشیں رکھ لی گئی ہیں۔ مثلاً جہاں "ہری بھجن گا" کا فقرہ لکھا گیا اس سے پہلے "مولا کو یاد کر" کا جملہ ضرور دیدیا گیا ہے۔ جہاں بکرم اور تلک جیسے نام استعمال کیے گئے وہاں ساتھ ہی نادر کا نام بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ لیکن بہر صورت مجموعی طور پر ان کتابوں کا جو اثر بچوں پر پڑ سکتا ہے وہ اس قدر نمایاں ہے کہ کسی قسم کا نفسیاتی فریب اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اگر مسلمان بچوں کی تعلیم کی ابتدا ان کتابوں سے کی گئی تو پھر ہندی مسلمانوں کی آیندہ نسل کا خدا ہی حافظ ہے۔

اس نصاب کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ کسی غیر مسلم ادارہ کی طرف سے نہیں بلکہ ایک ایسے ادارہ کی طرف سے پیش کیا گیا جس کو ملت اسلامیہ کے ساتھ نسبت ہے۔ یہ حیثیت اسے مسلمانوں کے لیے اور بھی خطرناک بنا دیتی ہے۔ کیونکہ اسکے سبب غیر مسلم حکومتوں کو اپنے مخصوص مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ایک معقول آڑ مل جاتی ہے۔ چنانچہ مفصلہ بالا تمام خامیوں کے باوجود اس نصاب کو مسلمانوں کے سر منڈھا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے رائج کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کیا جائیگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی غیرتِ دینی اپنے دانا دشمنوں اور نادان دوستوں کی اس متحدہ کوشش کا عملی جواب کیا دیتی ہے مغربی تعلیم کے اثرات کا تجربہ اچھی طرح کیا جا چکا ہے اسکے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اب اسی قسم کے ایک اور تجربہ میں قوم کے بچوں کی اثر پذیر طبیعت کو پہلے سے بھی زیادہ غیر اسلامی سانچے میں ڈھالنے پر رضامند ہو جانا یقیناً ملت کی ناقابل تلافی غلطی ہوگی اور ایک وقت ایسا آئیگا جب بصد پشیمانی اکبر مرحوم کا یہ شعر بار بار دُہرانا پڑے گا ؎

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے — دل بدل جائینگے تعلیم بدل جانے سے

مطبوعات ادارہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ واردھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے۔ گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہنچتا بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجئے قیمت ۸؎ محصول ڈاک ۱؎

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہورہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱؍

سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کر دیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لئے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲؎ محصول ۲؎

زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں قیمت ۱؍ علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ۔ جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ تمام اُمّتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اس کا

نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا، قرآن کریم کے حقائق و علوم کی اشاعت، سیاسیاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچی رہنمائی ہے۔

جو لوگ !

مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہو چکے ہیں اُن کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دُنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

بلند پایہ مضامین !

کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور و فکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ٥ر

نمونہ مفت طلب فرما کر خریداری کا فیصلہ کیجئے! (منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی)

Printed at the Jayyed Press, Delhi Published by Z A K from TulueIslam Office, Delhi

انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم
طلوع اسلام
بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب
محمد ظہیر الدین صدیقی - بی ایس سی

بدل اشتراک پانچ روپیہ سالانہ
ششماہی تین روپے

جلد ۲ شمارہ ۷ | رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ مطابق نومبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

ہلالِ عید

غرّۂ شوّال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار!
آ کہ تھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار

اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے!
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے!

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ

ہاں، تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے، ان کی خودداری بھی دیکھ

جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ، اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

اقبال

لمعات

ہمیں ایک مُدّت سے بتایا جا رہا ہے۔ اور گاندھی جی نے ایک تازہ ترین بیان (ہندوستان ٹائمز مؤرخہ ۲۶ اکتوبر) میں پھر اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ ہندوستان میں "ہندو مسلم" سوال بدیشی حکومت کا پیدا کردہ ہے، جب حکومت اپنی ہو جائیگی یہ مسئلہ خودبخود حل ہو جائیگا۔ اِسکے برعکس سوائے اِن چند مسلمانوں کے جو اپنوں سے کٹ کر دوسروں سے پیوند لگانے میں ہی تقاضائے مصلحت سمجھتے ہیں، ملت اسلامیہ کی طرف سے اِس حقیقت باہرہ کا باربار اعادہ کیا جا رہا ہے کہ شروع میں یہ مسئلہ خواہ بدیشی حکومت نے اپنے استحکام کی غرض سے پیدا کیا ہو لیکن آج یہ سوال اسقدر سنگین صورت محض اسلیئے اختیار کر گیا ہے کہ ہندو اپنی تنگ ظرفی کی بنا پر ہندوستان میں خالصًا ہندو راج قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ان کی مختلف جماعتوں کے طریقِ کار میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو منتہائے نگاہ ہر ایک کا یہی ہے، یہ خدشہ جیسا کہ کہا جاتا ہے مُسلمانوں کی بدظنی کا ہی نتیجہ نہیں بلکہ ہندو کی ذہنیت کے صحیح مطالعہ کا نتیجہ ہے جس پر گزشتہ دو تین برس کے واقعات نے مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ ہم نے اپنی سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ جس شوریدہ بخت مسلمان کو ہندوؤں سے سابقہ پڑنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہندو کی "بنیا بدھی" اور ہزارہا سال کی غلامی کی وجہ سے بھیچی ہوئی فطرت مسلمان کی نقصان رسانی میں اسے کس طرح جائز و ناجائز ہر حربہ استعمال کرنے پر بلا تامل آمادہ کر دیتی ہے۔ اس حقیقت کشائی کے سلسلہ میں ہمیں قارئین طلوع اسلام کی طرف سے بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں بیشتر حصہ اُن مسلمانوں کا ہے جنہیں بہ سلسلۂ ملازمت ہندوؤں کے پنجۂ استبداد کا تلخ تجربہ ہوتا ہے۔ ملک میں آئینی دستور کی تبدیلیوں کی وجہ سے سوائے چند اعلیٰ شعبہ ہائے حکومت کے ملازمتوں کا نظم و نسق قاطبۃً ہندوستانیوں کے اختیار میں آچکا ہے اور اس سلسلہ میں کہیں اِس ابلہ فریبی سے کام لینے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ مسلمانوں کے حقوق کی پامالی میں انگریز کا ہاتھ ہے یہ نیچے سے

اوپر تک تمام افسر ہندو ہوتے ہیں اور انگریز کا اِن معاملات میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اِس ہندو گردی میں جس بیداری سے مسلمانوں کو پیسا جاتا ہے، وہ صاف صاف اِس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ اگر تھوڑے سے اختیارات بھی ہندو کے ہاتھ میں آجائیں تو وہ مسلمان سے اِس طرح سلوک کرتا ہے۔ گویا وہ اسکا ایک دیرینہ دشمن ہے۔ اور یہ اس سے باپ داوا کے وقت کے بدلے لے رہا ہے، یہ چیزیں قوموں کی ذہنیت پر موقوف ہوتی ہیں۔ اور صدیوں کی غلام قومیں اس قابل نہیں ہوجایا کرتیں کہ ان میں وہ وسعتِ قلب پیدا ہوجائے، جو حاکم قوم کے لیئے ناگزیر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہندو کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آزادی کِسے کہتے ہیں، کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ گاندھی جی کی طرف سے بڑے سے بڑا مطالبہ جو حکومت برطانیہ کے حضور میں پیش کیا جا رہا ہے بیش ازیں نیست کہ "ہندوستان کی آزادی ایک ایسے منشور کے مطابق ہو جسے ہندوستان کے منتخب نمائندے مرتب کریں"۔ (ہندوستان ٹائمز مؤرخہ ۲۶ ۹/۳) ہندوستان کے منتخب نمائندے جن میں لامحالہ اکثریت ہندو کی ہوگی۔ ایک دستور مرتب کریں اور اس کی منظوری حکومتِ برطانیہ عطا کردے، یہ ہے سدرۃ المنتہیٰ مطالبۂ آزادی کا۔
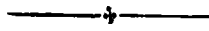
اِسی چیز کے پیشِ نظر مسٹر جناح نے اگلے دنوں کہا تھا کہ ہندوستان میں جمہوری نظامِ حکومت اطمینان بخش ثابت نہیں ہوسکتا اسلیئے کہ نظامِ جمہوری کا تقاضا ہے کہ اکثریت کی آراء کے مطابق قوانین مرتب ہوں۔ اور اکثریت یہاں اس قوم کی ہے جو صرف اتنا جانتی ہے ؎

کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

اسلیئے عالمگیر کے مفروضہ "مظالم" کا بدلہ موجودہ مسلمان سے لیا جائے۔ اسپر ہندو زعمائے قوم بہت نعل بر آتش ہوئے ہیں۔ اسلیئے کہ انکے ہندو راج کے منصوبے خاک میں ملجاتے ہیں، چنانچہ بڑے گرُد کے چیلے یعنی پنڈت جواہرلال اپنی بمبئی کی تقریر (شائع کردہ اسٹیس مین مورخہ ۲۶ ۹/۳) میں فرماتے ہیں کہ مسٹر جناح کے اِس اصول کے مطابق تو ہندوستان میں یا تو فاشزم یا بالشوزم کی طرز حکومت ہونی چاہیئے یا غلامی کا استمراری پٹہ۔ لیکن پنڈت جی چوتھی چیز کو بھول گئے ہیں۔

اور وہی چیز اس الجھی ہوئی گتھی کا حل ہے یعنی مسلم انڈیا کی مکمل علیحدگی جسے پاکستان کی اسکیم کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں علیٰ حالہٖ جمہوری نظامِ حکومت فی الواقعہ ناقابلِ عمل ہے لیکن اس تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں یہی نظام نہ صرف قابلِ عمل بلکہ اطمینان بخش بھی ثابت ہو جائے گا۔ بالخصوص پاکستان میں۔ جہاں کی حکومت کے پیشِ نظر وہ ضابطۂ خداوندی ہوگا جسنے دُنیا کو اخوت و مساوات اور جمہوریت کا سبق سکھایا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا واحد حل اور مسلمان اسکے بغیر کسی دستور و آئین پر رضامند نہیں ہوسکتے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے دُرست فرمایا ہے ''کہ موجودہ عالمگیر آشوب کا ایک فائدہ تو یقینی ہے، اور وہ یہ کہ اس نے مجبور کر دیا ہے کہ ہر شخص اور ہر جماعت بالکل بے نقاب سامنے آجائے''۔ (اسٹیٹسمین ۲۶؍۹؍۴۰) ہندوستان میں سب سے بڑی نقاب پوش جماعت کانگریس کی تھی اور سب سے بڑی نقاب پوش ہستی گاندھی جی۔ جنگ کے سلسلہ میں یہ دونوں اس طرح بے نقاب ہوئے ہیں کہ انکے اصل خدوخال کو اندھوں نے بھی دیکھ لیا سوائے ان نیشنلسٹ مسلمانوں کے جنکا نورِ بصیرت شاید ابدی طور پر سلب ہو چکا ہے۔ مثلاً ایک واقعہ کو لیجئے۔ گاندھی جی نے جنگ کے سلسلہ کے شروع میں امداد و تعاون کا غیر مشروط طور پر وعدہ کیا۔ کانگریس نے بھی یہی وعدہ چند شرائط کے ساتھ پیش کیا۔ مسلم لیگ نے بھی کچھ شرائط عائد کیں۔ جناب وائسرائے کا بیان کانگریس کی شرائط پر پورا نہیں اُترا۔ اسلئے کانگریس نے دستِ تعاون کھینچ لینے کی دھمکی دی۔ اور حکومت ہند کے بجائے حکومتِ برطانیہ کو اپنا قبلۂ مقصود قرار دے لیا۔ لیگ کے خیال میں وائسرائے کا بیان تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ موجودہ صورت میں کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہ ٹھہرا۔ اسلئے اسنے کانگریس کی قسم کی دھمکی ضروری خیال نہ کی۔

اب ظاہر ہے کہ جہاں تک امداد و تعاون کا تعلق ہے۔ کانگریس اور لیگ ایک ہی سطح پر ہیں فرق صرف ''قیمت'' ہے، کانگریس نے ابھی سودا چکایا نہیں بلکہ نرخ بڑھانے کی فکر ہو رہی ہے لیگ نے مزید ''تکرار'' مناسب نہیں سمجھی۔ لیکن ہمارے نیشنلسٹ مسلمانوں کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمایئے کہ ان میں سے

ہر ایک لیگ کو ٹوڈی، انگریز پرست ہمکارکی کاسہ لیس، آزادی کی دشمن اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہا ہے۔ اور کانگریس اسکے مقابلے میں ویسی کی ویسی جمعیت احرار۔ آزادی کی پرستار۔ انگریز کی دشمن، برطانیہ کی مخالف قرار دی جارہی ہے۔ لیگ کے فیصلہ کے متعلق ہمارے خیالات کچھ ہی ہوں لیکن کیا نیشنلزم کا یہی تقاضا ہے کہ اپنی جماعت کی برتری اور افضلیت کا وقت بے وقت ڈھول پیٹا جائے۔ انصاف بھی تو کوئی شئے ہے ؎
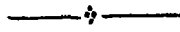
ضروری تھا کہ مسلمان اس دورابتلا میں اجتماع و ائتلاف پیدا کرکے ایک "بنیان مرصوص" ہوتے لیکن ملتِ اسلامیہ کی شوریدہ بختی کہ ہمارے بعض کج نہاد افراد۔ ملّت کے سواد اعظم سے کنارہ کشی کرکے اغیار کی نازبرداری کو اپنا منتہائے سعادت سمجھے بیٹھے ہیں۔ کانگریس کے بڑے بڑے زعما، تو مسلم لیگ کی اہمیت و برتری کا کھُلے الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں لیکن آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ موجودہ جدوجہد میں کانگرس کے جھنڈے تلے لڑینگے۔ اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن احرار لیڈر نے بیان کیا ہے کہ وہ کانگریس کے شانہ بشانہ رہیں گے۔ یہ وہی شیعہ و احرار ہیں کہ خاکِ لکھنؤ کا ذرہ ذرہ جنکے باہمی سرپھٹول کا شاہد ہے۔ ساری ملتِ اسلامیہ ان کی منتیں کرتی رہی کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم آؤ اس وحدتِ ایمان کی خاطر ہی باہم دگر ملجاؤ جو تمام روئے زمین کے مسلمانوں میں قدرِ مشترک ہے لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ بالآخر اب ملے تو کہاں جاکر۔ سچ فرمایا ہے حضرت علامہؒ نے ؎

برہمن گفت برخیز از درِ غیر
زیارانِ وطن ناید بجز خیر
بیک مسجد دو ملامی نگنجد
زافسونِ بتاں گنجد بیک دیر

یادش بخیر! مولانا حسرت موہانی صاحب نے حال ہی میں لندن میں اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا ہے کہ:-

"اگر ملک میں سیاسیات کی بنا پر پارٹیاں مرتب کی جائیں تو یہ چیز ملک کی فلاح و بہبود کے لیے مفید ہوگی"۔ (اسٹیٹس مین۔ مؤرخہ ۲۷ ۱/۳۹)

جیسا کہ ہم نے اپنی کسی سابقہ اشاعت میں لکھا تھا۔ ہمیں مولانا صاحب کے جوشِ عمل اور خلوص نیت کا ہمیشہ سے اعتراف رہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی شخص کے سیاسی مُدبّر ہونے کے لیے ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اصابت رائے کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جوشِ عمل کے ساتھ ایک شخص عمدہ سپاہی بن سکتا بشرطیکہ اس میں اطاعت کا جذبہ بھی ہو، "رہنمایانِ ملت" کی اپنے صحیح مقام سے ناواقفیت قوم کے لیے وبالِ جان ہوجاتی ہے۔
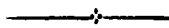
جب کسی شخص کے پاس استدلال کی کمی ہو تو وہ اپنے "انی الضمیر کو لفظی گورکھ دھندوں میں الجھاتا ہے۔ اور اس طرح بظاہر دوسروں کو لیکن درحقیقت اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اِس حقیقت کا اب بڑے بڑے کانگریسی بھی اعتراف کر چکے ہیں کہ کانگرس تمام اہلِ ہند کی نمائندہ نہیں ہے یہانتک کہ گاندھی جی کے الفاظ میں "ملک میں کانگرس کے مخالفین کی اکثریت ہے، اور اسکے موافقین اقلیت میں ہیں"۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۸ ۱/۳۹) ظاہر ہے کہ پنڈت جواہر لال بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہیں۔ لیکن، ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کانگریس کے دعوئے نمائندگی کو کن الفاظ میں پیش کرتے ہیں فرماتے ہیں

"کانگریس نے کبھی یہ دعوئے نہیں کیا کہ وہ تمام ملک کی نمائندہ ہے، وہ تو صرف قوم کی ترجمانی کا دعوئے کرتی ہے"۔ (اسٹیٹس مین ۲۸ ۱/۳۹)

حقیقت کا اعتراف ضمیر کی آواز ہے۔ اور مصلحت کوشی دماغ کا تقاضا۔ اِن دونوں کی کشمکش میں پنڈت جی کے "افکارِ عالیہ" جس بوکھلاہٹ کی غمازی کر رہے ہیں اسکے متعلق اسکے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

کانگریس اور انگریز کی موجودہ آویزش بڑی دلچسپ کروٹیں لے رہی ہے۔ انگریز خوب سمجھتا ہے کہ ہندو اپنی حریت پروری کے بلند آہنگ دعاوی کے باوجود ایک سیکنڈ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر چلا جائے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں گاندھی جی نے اس حقیقت کا کھلے کھلے الفاظ میں اقرار بھی کر لیا۔ جب انگریز کے سامنے یہ حقیقت یوں عریاں ہو گئی تو ظاہر ہے کہ وہ کانگریس کی دھمکی کو کیا وقعت دے سکتا ہے، چنانچہ سر سموئیل ہور نے دارالعوام میں کہا اور برملا کہا کہ کانگریس اس سے زیادہ اور کیا کرے گی کہ ہم سے عدم تعاون کرے۔ وہ ایسا کرنا چاہتی ہے تو ایک بار چھوڑ ہزار مرتبہ ایسا کرے۔

"حضور ملک معظم کی حکومت تو بہر حال چلے گی۔ اور قابلیت۔ انصاف اور طاقت کے زور سے چلے گی"۔ (اسٹیٹس مین ۲۷؍۱؍۳۹)

ظاہر ہے کہ کانگریس کی دھمکی کے جواب میں انگریز کا کھلا ہوا چیلنج ہے۔ اب گاندھی جی کے اوسان خطا ہوئے کہ ارے! یہ کیا ہو گیا؟ ہم نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا۔ لیکن گاندھی جی کو ایسے مواقع پر کچھ مشکل پیش نہیں آیا کرتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ:-

"میں نے سر سموئیل ہور کی تقریر کو پوری توجہ سے پڑھا جس کی وہ مستحق تھی۔ میں سر سموئیل ہور کے مصالحانہ انداز کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا"۔ (اسٹیٹس مین ۲۸؍۱؍۳۹)

واہ رے انگریز!

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب!
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔

ہندو اور انگریز کی اس کش مکش کا نتیجہ کیا ہو گا۔ یہ کسی ایسے شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو جانتا ہے کہ بنیوں کے جھگڑے کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ کچھ بھی ہو ایک چیز واضح ہے۔ بعد میں آنے والا مورخ جب اس تمام قضیہ پر غیر جانبدارانہ نگاہ ڈالے گا تو وہ یقیناً اس حقیقت کا اعتراف

کرے گا کہ مسٹر جناح نے باوجود بالکل بے دست و پا ہونے کے جس حسنِ تدبر، پامردی اور بلند نگہی کا ثبوت دیا ہے، وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔ اے کاش! آج حضرت علامہؒ زندہ ہوتے تو بتاتے کہ قرآن کی رو سے اس مسئلہ کا حل کیا ہو سکتا ہے، یا کم از کم پنجاب میں آج کوئی اور ہی کام کا آدمی ہوتا تو حالات آج بالکل مختلف ہوتے۔ بہرکیف اس دورِ قحط الرجال میں جناح کی ہستی فی الواقعہ مغتنمات میں سے ثابت ہوئی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان موت و حیات کی جس کش مکش میں آج گرفتار ہیں۔ اس سے بیشتر قوم پر ایسا وقت شاید ہی کبھی آیا ہو لیکن قوم کے "دماغ" جس قسم کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف کار ہیں اسکا اندازہ ان مضامین سے لگ سکتا ہے، جو ہمارے ملّی مجلات میں عام طور پر شائع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بہت بڑے اسلامی ماہنامہ کے اکتوبر کے پرچہ میں جو مضامین چھپے ہیں اُنکے عنوانات حسب ذیل ہیں:-

(۱) بغداد کی وجہ تسمیہ (قریب ۴۲ صفحے)

(۲) "فتوح السلاطین" قسط سوم (قریب ۲۰ صفحے)

(۳) حافظ امان اللہ بنارسی اور ان کی مسجد خانقاہ اور مزار کے کتبے

(۴) تلخیص و تبصرہ ———— سگمنڈ فرائڈ۔ خوف اور بچے۔

(۵) اخبار علمیہ ———— دمشق کے علمی ادارے — جیکب فرائڈ تھل کی صد سالہ سالگرہ
دنیا کا سب سے بڑا موتی

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

بیادِ شہدائے بلند شہر

سرِ مزارِ شہیداں یکے عناں درکش | کہ بے زبانیٔ ما حرفِ گفتنی دارد
نشانِ راہ زعقل ہزار حیلہ مپرس | بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

(اقبالؒ)

غلام آباد ہندوستان اپنے آقایانِ نعمت کے مقدرات کے ستاروں کی گردش میں کچھ اسدرجہ محو تماشہ ہے کہ اُسے خبر ہی نہیں کہ خود اُسکے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اِسی انہماکِ فکر و نظر کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ ایام خود اس سرزمین پر جو حادثاتِ ہائلہ اور واقعاتِ فاجعہ رونما ہوئے۔ بہت کم تڑپنے والے دل اسپر تڑپے اور بہت تھوڑی رونے والی آنکھوں نے اُسپر اشکِ خونیں بہائے۔ ورنہ اگر انکی توجہات کا نقطۂ ماسکہ سات سمندر پار کی تماشا گاہ نہ ہوتا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہندوستان کا مسلمان سرزمین **بلند شہر** کا قیامت خیز سانحۂ ہوش رُبا دیکھتا۔ اور محشر سے پہلے ایک محشر بپا نہ کر دیتا۔ اگر یہ سچ ہے۔ اور اسکے سچ ہونے میں کس کو مجالِ انکار ہے کہ تمام روئے زمین کے مسلمان ایک جسد واحد کی طرح ہیں کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ اور اگر یہ حقیقت ہے۔ اور اسکے حقیقت ہونے میں کس کو کلام ہے۔ کہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں کسی حبشی کی آنکھ میں درد ہو تو گلکدۂ ایران کے قصرِ بلند میں اطلس و حریر کے بستر پر استراحت فرمانے والے شاہنشاہ کی نیند حرام ہو جائے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آج ہندوستان کے نوکروڑ مسلمان۔ ہاں وہی مسلمان جو اشداء علی الکفار۔ رحماء بینھم کی خصوصیتِ ازلی کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ کس طرح آرام کی نیند سو سکتے ہیں۔ اور اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ حیرت ہے کہ جس باپ کے سامنے جوان بیٹے کی لاش تڑپ رہی ہو۔ جس سیاہ روز نوجوان کا بھائی

اسکے سامنے آغشتۂ خاک و خون ہو۔جس ماں کا لال آنکھوں کے سامنے خونچکاں کفن میں لپٹا ہوا ہو۔
جس بہن کی منتوں کا محور سہرے کی جگہ خون سے رنگین بدھیوں کو سر سے لپیٹے سپرد خاک ہو رہا ہو۔
اس باپ اور اس بھائی۔ اس ماں اور اس بہن کو کھانے کی بھی سوجھے۔ اور سونے کی بھی۔ جب
تک انسان کے سینے میں دل اور دل میں خون کا آخری قطرہ بھی رقصاں ہے ایسا ہونا ناممکن ہے
لیکن اس کا کیا جواب کہ بدنصیب ہندوستان کے شوریدہ بخت مسلمانوں نے اس ناممکن کو ممکن
بنا کر دکھا دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اسلئے کہ سمجھا یہ گیا کہ یہ موت صرف انہی کی موت ہے، جو مر گئے۔ یہ غم
صرف انہی کا غم ہے جنکے ساتھ اُنکے گوشت اور خون کا رشتہ تھا۔ ہاں! ایسا سمجھا گیا۔ اور اسکے بعد عملاً
دکھا دیا گیا کہ ہم ایسا ہی سمجھتے ہیں، جب حالت یہ ہو چکی ہو تو اے خاکِ عرب میں سونے والے۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

ہندوستان کا مسلمان اس غم میں گھل رہا ہے کہ نازی ازم اور فاشنزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب
بلا انگیز کو کس طرح روکا جائے۔ لیکن نہیں سوچتا کہ خود ہندوستان میں اسکا ملی وجود موت و حیات کی
جس کش مکش میں گرفتار ہے۔ اسکا کیا علاج ہے؟ یورپ کی قوتوں میں ایک باطل قوت دوسری
باطل قوت سے آمادۂ ستیز ہے۔ لیکن یہاں تو یہ حالت ہے کہ کفر و ضلالت کی متحدہ قوتیں۔ حق و
انصاف کے ضابطۂ خداوندی کی حامل اُمت کے خلاف اپنی پوری قہرمانی اور فتنہ سامانی کے
ساتھ محض اس جرم کی پاداش میں برسرپیکار ہیں کہ یہ اپنا رشتۂ ایمان دامنِ محمد عربی سے کیوں وابستہ
کیے ہوئے ہیں۔ اس سے پیشتر حق و باطل کی یہ جنگ آئین و دستور کی حدود میں مقیّد اور معاشی اور
اقتصادی گوشوں میں محصور تھی۔ لیکن وہ ہند جس کو ایک ہزار سال تک اسلام نے اپنی رحمت
تمام کے خزانوں سے مالا مال کیا۔ جسکو عزت و آبرو کی زندگی کا گُر سکھایا۔ جسے انسان کہلانے کا راز
بتایا۔ آج انتہائی خیرہ چشمی سے ان تمام احسانات کو بھولکر اپنی ہزار سالہ تیرہ بختیوں۔ ذلتوں۔ اور
ناکامیوں کا انتقام مسلمان اور صرف مسلمان سے لینے پر تُلا ہوا ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ جب تک
پہلو کا یہ کانٹا نہ نکلجائے۔ کسی عنوان کل نہیں پڑ سکتی۔ لہذا اُن کی نگاہ میں سب سے زیادہ کھٹکنے والی چیز

خاکساروں کی وہ تنظیم تھی جو اپنے پہلو میں عسکری نظام اور سپاہیانہ زندگی کا پروگرام لیے ہوئے ہے۔ اِس لیئے اِن نقاب پوش بھیڑیوں اور دشنہ در آستیں اُبلہ فریبوں کے مکر و دجل کے ترکش میں چھپے ہوئے تیروں اور فریب و حیل کے نیام میں لپٹی ہوئی شمشیروں کی احول چشمانہ نگاہیں رہ رہ کر اِس تنظیم کے علمبرداروں کی طرف اٹھتی تھیں۔ اور اِس تحریک کے استہلاک کی آرزوئیں انکے بجھے ہوئے سینے میں مچلتی تھیں۔ یہ مشئوم آرزوئیں کبھی حکومتِ سرحد اور سندھ کے حرم نما بنگلوں سے آئین و دستور کا قشقہ لگاکر انجمن آرا ہوئیں۔ اور کبھی زنار بدوش کلید برداران جنت و جہنم کی کفر ساز ٹکسالوں سے فتادیٰ تکفیر کے دراہم کاسدہ کی صورت میں بازارِ بیع و شریٰ میں جلوہ ریز ہوئیں۔ انہی ٹکسالوں سے جہاں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کی تحریک مقدس کے کچلنے کے فتادیٰ صادر ہوئے تھے لیکن اُنکے یہ ارادے ہر مقام پر خاسر و نامراد رہے۔ اور اِس تحریک کے وابستگان نے اپنے یقینِ محکم اور عمل پیہم سے ثابت کر دیا کہ :۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

چاروں طرف سے تھک تھکا کر ہر سمت سے زک اٹھا کر بالاخر وہ آخری حربہ استعمال کیا گیا جو ہر اس طاغوتی حکومت کا عروۃ الوثقیٰ ہوتا ہے جسکے دماغ کی نمرودیت کسی پشۂ ابراہیمی کی متلاشی اور جسکے قلب کی فرعونیت کسی ضربِ کلیمی کی دست نگر ہوتی ہے۔ یو۔ پی اسکا محاذ قرار دیا گیا۔ اور آمادۂ درندگی بھیڑیے اور ندی کے نچلے حصّے میں پانی پینے والے برغالہ" کے مشہور قصّے کے مطابق فرضی جرائم کی فہرست مرتب کر کے امن و سلامتی کے ان پیامبروں اور تشنۂ خدمت خلق کے اِن متوالوں کو اپنی وحشت انگیز سبعیت و خوفناک بربریت کا شکار بنانا شروع کر دیا۔ امتناعی احکامات۔ بات بات پر روک ٹوک مقام۔ لفظ لفظ پر گرفت و مواخذہ۔ افسانوی واقعات اور ڈرامائی مقدمات کی ننگِ انسانیت حرکات قید و بند کی عقوبات۔ فوج اور پولیس کے وحشی سپاہیوں کا شرمناک سلوک۔ لاٹھیوں کی بوچھاڑ۔ سنگینوں کی بھرمار۔ غرضیکہ کوئی نازیبا سلوک نہ تھا جو اُنکے ساتھ روا نہ رکھا گیا ہو اور کوئی بدترین عذاب نہ تھا جو ان پر مسلط نہ کیا گیا ہو اُن بے گناہ مظلوموں کی الم انگیز حالت پر زمین تھرتھراتی تھی

آسمان کانپتا تھا۔ ملاءِ اعلےٰ کے فرشتے ان کی مظلومیت پر مقدس آنسو بہاتے تھے۔ اور دوسری طرف ابلیس اُن پیکرانِ ظلم و استبداد کی اس بیدادگری کو اپنی فتح و کامرانی سمجھ کر مسرت کے قہقہے لگاتا تھا لیکن بایں‌ہمہ ابھی جور و تظلم کی انتہا نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ظالم کی کشتی اس حد تک بھرپور نہیں ہوتی تھی جہاں پہونچکر وہ ڈوبا کرتی ہے۔ اسکے لئے کچھ بے گناہوں کے خونِ ناحق کی ضرورت تھی۔ طاغوتی قوتوں کے ترکش کا یہ آخری تیر ۸ راکتوبر کو بلند شہر میں استبداد کے چلّہ پر چڑھایا گیا۔ حق و انصاف کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں۔ شرم و غیرت کے کانوں میں تکبّر و رعونت کی روئی ٹھونسی گئی۔ ملامت کرنے والی ضمیر کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اور یوں انسانیت کی تمام خصوصیات سے عاری ہو کر۔ نہتے بے گناہ قیدیوں کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اور یو۔پی کی کانگرسی حکومت نے آگ اور خون کی اس ہولی سے دونوں عالم میں اپنی روسیاہی کا سامان فراہم کر لیا۔

یہ سب کچھ اس سرزمین میں ہوا جہاں ۹ کروڑ فرزندانِ توحید بستے ہیں مُسلمانو! سوچو کہ تمہاری غیرت و حمیت کہاں ڈوب گئی؟ تمہارے سینے کا تلاطم کس کی بھینٹ چڑھ گیا؟ تمہاری رگوں میں دوڑنے والے خون کو کس کی نظر کھا گئی؟ یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوا اور تم تماشا دیکھتے رہے۔ چھوڑو دردِ اسلام کو کہ اُسے کن اُجڑے ہوئے کاشانوں میں تلاش کیا جائے۔ لیکن انسانیت کا تقاضا بھی تو کوئی شے ہے! تمہاری آنکھوں کے سامنے اِن بے گناہ انسانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر دیا گیا۔ اور تمہاری سرِ مژگاں ایک قطرۂ اشک تک نہ چھپکا۔ یاد رکھو! یہ محض یو۔پی گورنمنٹ کی ملعون حرکت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک گوشہ ہے اِس منظم سازش کا جو ہندوستان سے ملتِ اسلامیہ کے استیصال و استہلاک کے لئے ہر ہندو کے دماغ میں پرورش پا رہی ہے۔ تمہارا فرض تھا کہ تم اس کی لم تک پہونچتے اور اپنے تمام اختلافات مٹا کر سوچتے کہ تمہیں اپنی زندگی کے تحفظ و بقا کے لئے کیا کرنا ہے! لیکن تمہیں اپنے جھگڑوں سے فرصت کہاں کہ ان باتوں کی طرف توجہ دے سکو۔

خاکسار شہیدو!

تمنے اپنے مقدس خون کے گراں بہا قطرات سے دینِ محمدؐ عربی کی آبرو رکھ لی

اس دین کا خدا دونوں عالم میں روشنی کے درخشندہ میناروں کی طرح تمہاری آبرو قائم رکھے گا۔

فخرِ ملّت جانبازو!

تم نے اپنے ایمان و عمل کی استواری سے اِس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ اگرچہ مسلمانوں کی قوم ہٹ چکی ہے۔ لُٹ چکی ہے، اس کی عظمت و شوکت کے خزانے تاخت و تاراج ہو چکے ہیں۔ اسکے اقبال و ظفر مندی کی شمع گُل ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی خاکستر میں ابھی وہ چنگاریاں سو رہی ہیں۔ جو غیرتِ ایمان کے ایک ہی جھونکے سے شعلۂ جوّالہ بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ تم نے اپنی بے پناہ قربانی سے نشیمن استبداد کے تنکے تنکے پر واضح کر دیا کہ اس برسے ہوئے بادل میں ابھی ہزاروں بجلیاں بے قرار ہیں۔

قوم کے سرفروش سپاہیو!

باطل کی قوتیں بزعم خویش سمجھتی ہیں کہ انھوں نے تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ لیکن حقیقت بیں نگاہیں دیکھتی ہیں کہ تم نے جامِ شہادت سے سرفراز ہو کر ابدی زندگی حاصل کر لی اور باطل کی ان طاغوتی قوتوں کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کرنے کا سامان پیدا کر دیا ان کی بقایا زندگی موت سے بدتر اور ان کی موت ذلتوں اور رُسوائیوں کا پیش خیمہ ہوگی یہ فطرت کا اٹل قانون ہے جسے تم نے اپنے خون کی رنگینی سے صفحۂ عالم پر ثبت کر دیا ہے کہ

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اے پس ماندگانِ شہدائے بلند شہر!

تم یہ مت سمجھو کہ یہ غم۔ اگر اسے تم غم کہنا چاہتے ہو۔ تنہا تمہارا غم ہے۔ اِس غم میں ملتِ اسلامیہ کا ہر وہ فرد تمہارا شریکِ حال ہے۔ جس کے دل میں ایمان کی ذرا سی بھی تپش موجود ہے۔ سچ پوچھو تو یہ مقامِ غم و الم نہیں۔ جائے مسرت و شادمانی ہے۔ مرنا اوّل و آخر ہر

ایک کو ہے۔ لیکن خوش نصیب وہ سعادتمند جس کی موت پر ہزاروں زندگیاں رشک کریں
قابل صد مبارکباد ہیں وہ مائیں جنہوں نے ایسے نونہالانِ اُمت کو پالا پوسا۔ اور در خور
ہزار تحسین و تبریک ہیں وہ باپ جنہوں نے ملت بیضا کے اِن مجاہدین کو پروان چڑھایا۔
اللہ کی رحمتیں کروٹ کروٹ مجاہدین کے ساتھ ہوں۔ اور دونوں جہانوں کی برکات
ان کے متعلقین کے ہمرکاب۔

ہمیں اِس حادثۂ کبریٰ میں کوئی چیز وجۂ حزن و ملال نظر نہیں آئی۔ شجرِ اسلام ہمیشہ خون سے سینچا گیا ہے اور اس کی صحیح آبیاری ہمیشہ خون ہی سے ہوگی۔ ہمیں خوشی ہے کہ بلندبخت مجاہدین کا یہ گروہ اپنے عزم و ارادہ اور شوق جاں سپاری میں پورا اُترا۔ اور یوں اِس ویرانۂ ہند میں جہاں اسلام فی الواقعہ کچھ غریب الدیار سا ہو رہا تھا۔ اس کی شوکت و عظمت کی نشاۃِ ثانیہ کی بنیادیں رکھ دی گئیں۔ البتہ اِس تمام واقعہ میں وجۂ تاسف ہے تو یہ امر کہ جب میدانِ قیامت میں شہیدان بلند شہر کا یہ قافلہ خونچکاں کفن میں ملبوس۔ داورِ داور کے حضور اپنے خونبہا کا مطالبہ کرے گا تو مجرموں کے کٹھرے میں ایک ایسا شخص کھڑا ہوگا جسکے گلے میں آویزاں تختی پر مسلمانوں کا سا نام لکھا ہوگا اور اس کی جھکی ہوئی نگاہیں کہہ رہی ہوں گی کہ یالیتنی کنت ترابا۔ اگرچہ وہ معذرت خواہی میں کہے گا کہ میرا تو کوئی قصور نہیں میں تو ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنے آقاؤں کے اشارہ پر رقص کر رہا تھا۔ لیکن یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ سمجھا جائے گا۔ کیا ہمارے اس مسلمان بھائی کے دل میں۔ اور اسکے ساتھیوں کے دلوں میں۔ ابھی تک اِس امر کا احساس نہیں پیدا ہوا کہ اس جرم عظیم کے کفارہ میں وہ کم ازکم اس مشینری کے کل پرزے بننے سے ہی تائب ہو جائیں، جس مشینری نے انکے بے گناہ بھائیوں پر یہ ظلم ڈھایا ہے؟

خاکسار سپاہیو!
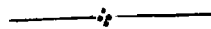
تمہارے بھائی اپنا فریضۂ خداوندی نہایت حسن و خوبی سے ادا کر گئے اور جو عہد انھوں نے

اپنے اللہ سے باندھا تھا اسے خوب نبایا۔ وہ چلے گئے لیکن تمہارے ذمہ فرائض باقی ہیں۔ یاد رکھو:۔

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی !
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی ٭

اِس چیز کو اپنے دل میں پختہ کرلو کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل تمہارے اور صرف تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ تمہاری قربانیوں میں قوم کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ تمہاری راہ بڑی پرخطر اور منزل کٹھن ہے۔ لیکن جس سفر کا محرک جذبۂ عشق ہو اس سفر میں ہر تکلیف راحت ہوا کرتی ہے۔ یاد رکھو۔ ہر تحریک کی کامیابی کے لیے ٹکراؤ نہایت ضروری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی !

خوب سمجھ لو کہ جہانِ نامساعد میں زندگی بسر کرنا مردِ مومن کا کام نہیں اسے ایسی دُنیا کو اُلٹ کر اپنے مقاصد کے مطابق ایک جہانِ نو کی تعمیر کرنا ہوگی۔ وہ

برکند بنیادِ موجودات را ٭ — می دہد ترکیب نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار ٭ — روزگارِ نو کہ باشد سازگار

لیکن اِس تمام تخریب و تعمیر میں ایک اصل الاصول ہمیشہ پیشِ نظر رہے اور وہ یہ کہ تمہارا قدم کسی وقت بھی قرآن کریم کے جادۂ مستقیم سے لغزش نہ کھانے پائے۔ اسکے بعد۔

بانشۂ درویشی درساز و دما دم زن — چو پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

بعض حلقوں میں تمہاری تحریک کے متعلق بہت سے شکوک پیدا کئے جا رہے ہیں ان سے مت گھبراؤ۔ ہم سے بھی دریافت کیا جا رہا ہے کہ ہم اِس تحریک کی کیوں حمایت کر رہے ہیں۔ اگرچہ اربابِ نظر خوب جانتے ہیں کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں لیکن ہم کسی دوسری اشاعت میں تفصیلاً تمہیں بتائینگے کہ ہم تمہاری تحریک کو کیا سمجھتے ہیں۔
اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو !

اُردو

اسد ملتانی

اُردو ہی تو ہے ہند کی مقبول زباں بھی — اور شیخ و برہمن کی محبت کا نشاں بھی

وسعت کا یہ عالم ہے کہ پہنچی ہے وہاں بھی — جن دُور کے دیسوں کا نہ تھا وہم و گماں بھی

کیا ملک میں ایسی ہے کوئی اور زباں بھی؟ — اتنی ہی جو دلکش بھی ہو شیریں بھی رواں بھی

بنیاد اٹھی اس کی اگر سنسکرت سے — موجود ہے اس میں عربی لطف بیاں بھی

گُفتار کی رُو سے جو کریں جانچ تو اُردو — ہندو کی زباں بھی ہے مسلماں کی زباں بھی

قرآں کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے لیکن — اس واسطے ہے بعض دلوں پر یہ گراں بھی

اس خط کو بدلنے کے لیے اہلِ وطن میں — جاری ہیں بہت کوششیں پنہاں بھی عیاں بھی

ملّت ہی پہ موقوف ہے اس خط کی حفاظت — اور خط کی حفاظت سے ہے وابستہ زباں بھی

اُردو ہے "زباں" جس کی وہ اک "جسم" ہے ملت — کیا اس میں ہے کچھ جان بھی و [illegible] بے تواں بھی؟

ملّت ہے اگر زندہ تو مٹتی نہیں اُردو
گر جسم سلامت ہے تو باقی ہے زباں بھی

سلیم کے نام ....

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویزؔ

سلیم! میرے مضامین ؔسلسلہ" خدا کی بادشاہت" وغیرہ) پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جو خدائے حکیم و خبیر نے اس عدیم النظیر کتاب مبین میں بے نقاب کر کے رکھدئے ہیں اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور نجات و فلاح کیلئے غیر متبدل اور اٹل قوانین فطرت ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کریم کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کی جملہ مشکلات کا واحد حل اور تمام مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں۔ اور میرا یہ اعتقاد محض خوش عقیدگی پر ہی مبنی نہیں۔ بلکہ میں علی وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں ایسا یقین جو وجہ طمانیت قلب اور باعث تسکین روح ہوا کرتا ہے۔

تم پوچھتے ہو۔ اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے۔ روزے بھی رکھتی ہے۔ زکوٰۃ بھی دیتی ہے۔ حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں اُلجھنے کے عادی نہیں ہو۔ اور تم جانتے ہو کہ میں بھی ان چیزوں کو عملی مسائل حیات کے لیے بے کار سمجھتا ہوں۔ اس لیے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ" اعمال حسنہ" کیوں بے نتیجہ ہو رہے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب جب کہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی۔ رحمت کی بیوی اپنے خورد سال بچّوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھری میں آبیٹھی ہے۔ رحمت کی بیوی کو تم جانتے ہو تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا

تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و شادابی ہوتی لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسا افسردگی اور پژمردگی سے بدل دیا تھا کہ وہ ایک اُجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِ عصمت کے جو ہر ایسی پاکدامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہیئے۔ رونق اور زندگی، تازگی اور بشاشت کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ ہاں وہ اپنے بچوں کو لے کر چولھے کے قریب آبیٹھی۔ خشک ٹہنیاں سوکھے ہوئے پتے، خس و خاشاک، دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔ اسے سلگا دیا تا کہ بچے تاپتے رہیں۔ لیکن سردی سے زیادہ تو بچوں کو بھوک ستا رہی تھی۔ ان کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا اور یوں ان ننھے بچوں کو۔ نہیں! خود اپنے دل کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جھٹپٹا ہو گیا کہ گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں۔ پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئیں۔ گھٹنوں تک کا پُرانا تہمد۔ پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات۔ چہرہ پر زردی چھائی ہوئی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں۔ گھر کی طرف قدم اُٹھاتا لیکن قدم بہ مشکل اُٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو وفا شعار غریب بیوی نے منہ میں بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدوری نہیں مل سکی۔ دن بھر اِدھر اُدھر پھرتا۔ لوگوں کی منتیں کرتا رہا لیکن کچھ کام نہ مل سکا۔

عین اسی وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا۔ اور نمازی اسلام کی شوکت و عظمت پر ایک دوسرے کو مبارک باد اور خواجہ صاحب کو علوِ مرتبت و اقبال کی دعائیں دے رہے تھے۔

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! جو تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیا شریف بچہ تھا لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی

پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچّہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ لیکن دل کڑا کر کے بیٹے کو تسلّی دی کہ مدرسے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں دن میں ضرور پکا رکھوں گی۔ جاؤ میرا بیٹا! اللہ حافظ۔

سلیم! اگر ہمت ہو تو اس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قدر قیامت خیز جذباتِ غم و حزن کا طوفان برپا ہوگا۔ وہ عزّت و فلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے گی؟ عنایت اللہ نے اندر آکر سب سے پہلے دسترخوان کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا متنوع پھل۔ قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چُنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دونوں وقت کا بھوکا، یتیم، انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چالی پر سے گر کر مر گیا تھا عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچّہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا ہے۔ وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلّہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے وہاں سے غریب بیوہ نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنّی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلّے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں لیکن کسی نے نہ دئے۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا

یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن جناب کمشنر بہادر نے "میر اشرف میموریل ہسپتال" کا سنگِ بنیاد رکھا ہے۔

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس ضروری کپڑے تک نہیں کہ ستر ڈھانپ کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑوں تک مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِ راہ کیا ہوگا۔ اس نے گاؤں کے میراثی اور نائی کو کہلا بھیجا کہ کوئی اس کے ساتھ جائے لیکن جب انہیں علم تھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اجرت کیسے ساتھ ہو لیتے۔ گاؤں میں دور و نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسی کو فرصت کہاں کہ اس کی مصیبت میں حصّہ بٹائے۔ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں تھا۔ غریب اکیلی چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہوگئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے وہی رضیہ جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں (جو "شمس العلماء" تھے) دو حج کئے تھے۔ اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان دین کے معاملات میں اپنے کٹر پن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ "دین کے معاملات" کیا ہیں؛ وہابی اور حنفی کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود حنفیوں کے ہاں بھی دو جماعتیں (پارٹیاں) بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ میں نے فریقین کے نمائندوں کو بلا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک "عظیم الشان" مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے۔ بہت "بھاری" مولوی صاحب تھے۔ تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی۔ اُنہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسول اللہؐ کی شان سے بڑی ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا وہ رسول اللہؐ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے۔ پھر کیا تھا۔ دو فریق پیدا ہوئے۔ باہمی جھگڑے ہوئے، لڑائیاں ہوئیں۔ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ قریب سال بھر ہوگیا۔ یہ آگ آگے ہی آگے بڑھتی جارہی ہے

اور ہر فریق اس جدّ وجہد اور مساعی حسنہ کو " جہادِ عظیم " قرار دے رہا ہے ۔ اسی باہمی تشتت و انتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہو رہے ہیں فصلیں تباہ ہو چکی ہیں ۔ زمین کا بیشتر حصہ جاٹوں کے قبضے میں چلا گیا ہے ۔ بقایا رہن رکھا ہوا ہے کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ جاٹ تمام گاؤں کے واحد مالک بن جائینگے اور یہ دین دار مسلمان ان کے مزارعہ ہو جائیں گے ۔ اور مولوی صاحب انہیں مبارک باد دیں گے کہ اُنہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت کی زمین خرید لی ۔ اس لیے یہ سودا خسارے کا نہیں ۔

تم کہو گے کہ یہ تو جہلاء کی باتیں ہیں لیکن تمہیں وہ خطبہ جمعہ بھی تو یاد ہو گا جو شہر کی جامعہ مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینہ کی تقریب پر تم نے سنا تھا ۔ جناب خطیب نے ۔ جو خدا کے فضل سے ایک فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے یہی فرمایا تھا کہ " شبِ بارات ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کر کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں ۔ میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا ۔ لہذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ خود ذمہ دار ہے " اس کے بعد تمہیں یاد ہو گا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور اُنہوں نے فرمایا تھا کہ رحمت خداوندی کے اس بحرِ ذخار میں ہر ایک کا حصّہ برابر ہو گا ۔ لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ جائے گا ۔ لوگوں کی آنکھیں اوپر کو اُٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہو گا جو ابرِ رحمت کی ایسی گہر باری سے فیض یاب ہو سکے گا مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا ۔ یعنے وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچا ہو گا ۔ یہ تو جہلاء کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب یہ کچھ اپنی طرف سے بیان کر رہے تھے ۔ انہیں یہ سب کچھ " عین اسلام " کہہ کر پڑھایا گیا تھا کتابوں میں یہ کچھ لکھا ہوا ہے اور وہی کچھ " عین اسلام " سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے ! ہاں ! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بپتا کی داستان سنا رہا تھا ۔ اور ایک رضیہ بچاری پر کیا موقوف ہے ۔ ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے سے گزر جاتے ہیں ۔ سو عزیزم ! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے ۔ ان کی زکوٰۃ اور ان کے حج ۔ غرضیکہ

ان کے "اعمال حسنہ" وہ نتائج کیوں پیدا نہیں کرتے جو فطری طور پر ہونے چاہیئے تھے۔ کچھ تعجب انگیز نہیں۔ سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم غور سے اس نکتے کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے۔ باقی ادیان جن میں انسانی تصرفات ہو چکے ہیں۔ دین کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ "عبادات" سے ان کا مفہوم ایک فرد واحد کا تزکیہ نفس ہوتا ہے اور بس۔ لیکن اسلام تزکیہ نفس اس لیے ضروری سمجھتا ہے کہ ان مزکی نفوس کے اجتماع سے جو تمثیلی (آئیڈیل) سوسائٹی مرتب ہوگی وہ دنیا میں ایک ایسے نظام زندگی کا وجود قائم کرے گی جو مسجود ملائک آدم کی تخلیق کا منشا تھی۔ نہ ایسی زندگی جو یفسد فی الارض و یسفک الدما (فساد انگیزی اور خوں ریزی) کا مظہر ہوگی۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اسلام ہر عبد مومن کو اس کارگہ حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو مشینری بے کار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بے کار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت افلاس و نکبت کا چھا جانا۔ اور پھر اس قوم کا اس حالت میں مطمئن ہو جانا۔ خدا کا غضب ہے۔ اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت تمکن و استخلاف نہیں۔ یا کم از کم وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ لیے نہیں جا رہے۔ وہ ایمان۔ ایمان۔ اور وہ عمل۔ عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ کیوں کہ اللہ کے وعدے تو بہر حال سچے ہیں۔ اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کی معراج کبریٰ۔ یعنی دور رسالت کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کونسا خاص پروگرام تھا جس کا نفوس

اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی تو تھا کہ جس نے چند سال کے عرصہ میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی۔ اور کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ خشیت الٰہی اور تقوےٰ پیدا کر دیا جو ایک مردِ مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے وہ مردِ مومن کہ جسے اس کائنات کو مسخر کرنے والا بنایا تھا کیا تم باور کر سکتے ہو کہ وہ دنیا میں ذلت و خواری نکبت و پستی۔ عاجزی و مظلومی۔ بے کسی و بے بسی۔ درماندگی و افسردگی۔ محتاجی و گداگری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے گا؟ کیا ہر باطل کی قوت کے سامنے جھک جانے والے نمازی اور روٹی کی خاطر غیرت و حمیت بیچ دینے والے روزہ داراسی خشیت و تقویٰ کی پیداوار ہو سکتے ہیں! حاشا وکلا۔ سبحان اللہ تعالےٰ عما تصفون۔

سلیم! ایک مرتبہ اس چیز کو پھر سن لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمال اسلامی کا ماحصل **محض** اس دنیا کی فلاح و کامیابی۔ غلبہ و تسلّط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور شیطان کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمالِ اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت۔ شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے۔ اور اگر آج ہمارے اعمال کا یہ نتیجہ نہیں ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے اعمال اسلام کے میزان میں پورے نہیں اُترتے۔

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہوگئی! حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی سمجھ نہ سکے۔ اس سے تو تم متفق ہو گئے کہ اسلام کا مقصد وحید انسانوں کو دنیا میں تمام انسانی سلاسل و اغلال سے آزاد کر کے انہیں صرف اللہ کی حکومت کے ماتحت رکھنا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا مسلمانوں کی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں

قائم ہوا۔ اور جو طوق یکسر غیر اسلامی تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا۔ امم گزشتہ کو جن جرائم کی پاداش میں عذاب الٰہی میں گرفتار کیا گیا تھا کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے؟ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی سختی سے عذاب آنا چاہیے تھا کہ ان کے پاس قانون خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لیے موجود تھا لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا (نبذ وکتاب اللّٰہ وراء ظھورھم) اور اپنے خیالات و خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہیئے تھی؟ ان کو وراثت کتاب کے لیے منتخب کیا۔ انہیں نوع انسانی کے لیے بہترین امت قرار دیا۔ لیکن سب ایمان و عمل کے بدلے میں نہ صرف نام رکھانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا۔ سلیم! اخوت، مساوات، خشیت، وحدتِ انسانی۔ خدا اور بندے کا براہ راست تعلق جماعتی زندگی، مرکزیت، اطاعت۔ فرد کا ملت میں جذب ہو جانا۔ یہ تھیں نظام حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاء الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دور ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو۔ اور اسکے بعد قرآن کریم کی خوردبین سے پرکھتے جاؤ امتِ مسلمہ کے ایک ایک عمل کو حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ عزیزم! یہ عذاب پھر بھی ادنیٰ عذاب ہے اس عذابِ اکبر سے ورے، جو اس کے بعد آنے والا ہے۔ گرفت اس لیے ہے کہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج نہیں پیدا کرتے جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنی ہے ولو ان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض۔

اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآن کریم سے ملے گی بشرطیکہ تم اسے انسانی کتب ہوتے سے بلند و برتر خدائے حیّ و قیّوم کا مکمل ضابطۂ حیات سمجھو اور مسلمان کی زندگی کا نصب العین قرار دو۔ زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام۔ والسلام۔

پرویز

مسئلۂ مسلمانانِ ہند اور اسکا حل

از
پروفیسر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب ایم اے (علیگ)، ڈی فل (آکسن)، ڈاکٹر فل (ارلانگن)
ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری - ایم ایس سی - پی ایچ ڈی (علیگ)، پی ایچ ڈی (گٹنب)

[طلوعِ اسلام کے صفحات میں ہندوستان کے آئینی مستقبل کے متعلق متعدد اسکیموں کا ذکر آچکا ہے - جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا تھا اِن مختلف اسکیموں کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ قارئین اِس باب میں اسلامی ہندوستان کے سیاسی مفکّرین کے زاویۂ نگاہ سے روشناس ہو سکیں اور اس طرح اِس اہم مسئلہ کے مختلف گوشے بے نقاب ہو جائیں - یوں تو یہ مسئلہ پہلے بھی کچھ کم اہم نہ تھا لیکن اِس چیز کے پیشِ نظر اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ مجوزہ فیڈریشن کا نفاذ کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو گیا ہے - اور یوں مسلمانانِ ہند کو کچھ اور وقت مل گیا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق غور و فکر سے کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکیں - قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہم اِن اسکیموں پر سرِ دست کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے - بالخصوص اسلئے کہ یہ اسکیمیں مسلم لیگ کے زیرِ غور ہیں اور اُنپر کوئی تبصرہ پیش از وقت متصور ہوگا - اِسی سلسلہ میں اِسکیم زیرِ نظر (بلا تبصرہ) شائع کیجاتی ہے - یہ اسکیم اِس لحاظ سے بھی درخور توجہ ہے کہ اسکا سرچشمہ مسلمانانِ ہند کا علمی مرکز (علی گڑھ) ہے +]

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور اُس ایکٹ کے ماتحت مجوزہ آل انڈیا فیڈریشن نیز صوبائی حکومت خود اختیاری کی شکل میں فیڈریشن پر جزوی عملدرآمد نے مسلمانانِ ہند کو نہایت اہم خطرے سے دوچار کر دیا ہے - یعنی اُنکے مخصوص قومی تشخّص کا استہلاک :-

اِس ایکٹ کے معانی کو بہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں - یہ ایکٹ مرکز میں ہندو اکثریت کے زیرِ تسلّط نو کروڑ مسلمانانِ ہند کو دوامی تغلب کا شکار بنا دیتا ہے اور اس ایکٹ کی رو سے

مسلم اکثریت کے صوبوں کی حیثیت محض باجگزارانہ رہ جاتی ہے اور مسلمان اقلیت کے صوبے ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اسکا سب سے بڑا بنیادی نقص یہ ہے کہ یہ دستور اس ناقابل انکار حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کہ مسلمانانِ ہند ہندوؤں سے بالکل علیحدہ قوم ہیں۔ یہ قوم بہ اعتبار مسلک و مطمح نظر ہندو سے بالکل مختلف واقع ہوئی ہے اور اسکا کسی ہندو یا غیر ہندو نام نہاد قومیت میں انجذاب ناممکنات میں سے ہے۔

لنڈن ٹائمز اپنی یکم اپریل ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر رائے زنی کرتے ہوئے رقمطراز ہے:-

"بلا شک مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین صرف مذہب ہی کا فرق نہیں بلکہ ثقافت وقانون کا بھی اختلاف ہے کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقیناً دو بقایت متمیز مختلف تہذیبوں کے حامل ہیں۔ بہرکیف مرور ایام سے "توہمات" فنا ہو جائینگے اور ہندوستان میں ایک واحد قوم کی تشکیل صورت پذیر ہوگی"۔

ہم لنڈن ٹائمز کے اس ناصحانہ وعظ و پند پر اعتراض کیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ "توہمات" جنہیں لنڈن ٹائمز کی رائے میں فنا ہو جانا ہے، درحقیقت ثقافتِ اسلامی کے مخصوص عناصر اور ہندوستان پر اسلام کے احسانات ہیں۔ بلا کسی شائبۂ وہم وگمان آپ دیکھیں گے ابھی ایک پشت بھی نہ گزرنے پائے گی کہ آل انڈیا فیڈریشن مخصوص اسلامی نقطۂ نظر، تمدن اور زبان کو کلیتہً فنا کر دے گی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے منشاء کے مطابق بدل دے گی۔

انجام کا علم آغاز سے معلوم کرنا ہو، تو ان عنوانات کو دیکھیئے جو ابھی سے کانگرس کی مختلف تحاریک کی پیشانیوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً مسلم روابط عوام کا پروگرام، ودیا مندر اور واردھا اسکیم کے پیچھے ہوئے نشتر ہندی کی ترویج کی نظر فریب تحریک یا اسی قسم کی اور اسکیمیں جنہیں قومیت پرستی کے حسین نقاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پس ہم مسلمانوں کا یہ نہایت اہم فرض ہے کہ ہندوستان میں اپنے قومی تشخص کے استقرار اور اپنے حقوق کے استحفاظ کے لیئے پوری پوری کوشش کریں۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم مسلمانوں کی آزادی کامل اور مساویانہ حیثیت کے حصول میں کوشاں ہوں اور کسی صورت میں بھی مسلمانوں کی محکومی پر رضامند نہ ہوں خواہ اس کی سعی ہندوؤں کی طرف سے ہو یا انگریزوں کی جانب سے +

اس سے قبل کہ ہم مسلمانانِ ہند کے مذکورۂ بالا مسئلہ کے حل میں اپنی تجاویز پیش کریں ضروری ہے کہ اِن چند اہم اسکیموں پر مختصر تبصرہ کریں جو مسلمانوں کے پیشِ نظر ہیں +

اِن میں سے ایک اسکیم وہ ہے جو پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔ جسکا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں کا ایک فیڈریشن بنوایا جائے۔ جس میں پنجاب۔ سندھ۔ بلوچستان۔ صوبۂ سرحد اور کشمیر داخل ہوں۔ یہ تحریک پاکستان ہندوستان کے اخبارات میں شدید غلط بیانی کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔ اور اُسی کے متعلق خود مسلمانوں میں بھی غلط فہمی پیدا کی جاچکی ہے۔ بہر کیف یہ امر نہایت ضروری ہے۔ کہ مذکورہ اسکیم کو "غیر پاکستانی" مسلمانوں کے مسائل حیات کے پہلو بہ پہلو جانچا جائے +

دوسری اسکیم وہ ہے جو حیدرآباد دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے پیش کی ہے جسکا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کو تہذیبی منطقوں میں تقسیم کیا جائے۔ اور اِس اسکیم نے ہندوستان کی پبلک اور پریس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کروا لیا ہے مختصراً اس اسکیم کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلم تہذیب کے منطقوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ پوری اسلامی آبادی اسلامی منطقوں اور ہندو آبادی۔ ہندو منطقوں میں منتقل کر دی جائے، جو کہ کم و بیش متجانس گروہوں میں منتج ہوگی۔ یہ تہذیبی وحدتیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر لطیف صاحب کی اسکیم سے ظاہر ہے۔ قریباً اِسی طرز کی آل انڈیا فیڈریشن بنائیں گے۔ جیسے سوٹزرلینڈ میں۔ مزید برآں ہندوستان کے تہذیبی منطقوں کی تشکیل کے لیئے ڈاکٹر لطیف صاحب کی اسکیم کی رُو سے ایک دَورِ عبوری درکار ہوگا جسکے لیئے انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں تھوڑی بہت دستوری ترمیم کی جاسکتی ہے +

ہمیں اندیشہ ہے کہ ڈاکٹر لطیف صاحب کی اسکیم کے متعلق یہ شبہات پیدا ہونگے کہ یہ عملاً

ممکن بھی ہے۔ یا نہیں! نیز یہ کہ اس میں ہندو مسلم مسئلہ کا تسلّی بخش حل بھی موجود ہے۔ یا نہیں! کڑوروں کی تعداد میں ہندو مُسلم آبادی کا بڑے پیمانے پر اِدھر سے اُدھر منتقل ہونا عملی سیاست کی گیرائیوں سے بعید ہے۔ علاوہ ازیں یہ خیال کہ کچھ عرصے میں مکمل انتقال آبادی کے ذریعہ ہندوستان کو اِسلامی اثرات سے بالکل خالی کر دیا جائیگا اِسلام جیسے عالمگیر مذہب کے مشن اور اس کی رُوح اشاعت کے خلاف ہوگا +

ثانیاً یہ کہ ہمیں اسکا یقین کامل ہے کہ آل انڈیا فیڈریشن چاہے وہ موجودہ صوبوں کا ہو یا تہذیبی منطقوں کا یا ان حلقوں پر مشتمل ہو جو سر سکندر حیات خاں وزیرِاعظم پنجاب نے تجویز کیے ہیں مسلمانوں کی تقدیر اور سیاسی حالت کو منقلب نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کی غالب اکثریت کے ماتحت ایک محکوم قوم بنکر رہینگے۔ آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمان کبھی آزاد نہیں رہ سکتے اور انکا کما حقّہٗ تحفظ ناممکن ہے۔ اور نہ ہی اِس بات کا امکان ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو اپنی مرضی کے مطابق صورت دے سکیں +.

آخراً ڈاکٹر لطیف صاحب نے جو دَورِ عبوری تجویز کیا ہے، وہ اسقدر طویل ہے اور اس طرح متعین ہوتا ہے کہ ہم سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی جدّ وجہد میں کلیتہً ناکام رہینگے +

پس اپنے اجتماعی اور سیاسی مسائل کی حقیقت کے صحیح تصور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر یقین کامل اور عزم بالجزم کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل سکیم مُسلمانانِ ہند اور تمام دُنیا کے سامنے غور و تفکر کے لیے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اسکے بیان کرنے سے پہلے ان اساسات کا ذکر کرنا ضروری ہے جن پر یہ اسکیم مبنی ہے ہمیں یقین ہے کہ اسلامیانِ ہند کو ان اُصولوں پر نہایت شدّت و سرگرمی سے مصر ہونا چاہیئے۔

(۱) مسلمانانِ ہند بجائے خود ایک مستقل قوم ہیں۔ اور اُنکا ممتاز وجود ملی ہندوؤں اور دوسرے غیر مُسلم گروہوں سے بالکل مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مُسلمان اس سے کہیں زیادہ مختلف ہیں جتنے سوڈمین جرمن چیکوں سے۔

۲۔ مسلمانوں کا قومی مستقبل اور دُنیا کی فلاح و بہبود کے لیے اُنکا اسلوب جدوجہد ساری دنیا سے جُداگانہ نوعیت کا ہے +

۳۔ مسلمانانِ ہند کا مستقبل برطانیہ۔ ہندو یا کسی اور گروہ کے تسلّط سے آزاد ہونے میں مضمر ہے +

۴۔ اسے ہرگز ہرگز گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ واحد آل انڈیا فیڈریشن میں جہاں مرکز میں اکثریت ہندو ہوگی۔ مسلمان اکثریت کے صوبوں کو غلام بنایا جائے +

۵۔ یہ ناممکن ہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اُن کی جُداگانہ مذہبی، تمدنی اور سیاسی تشخص سے محروم کر دیا جائے۔ نیز یہ کہ مسلم اکثریت کے صوبے ہر ممکن اور مؤثر طریقہ سے ان کی معاونت اور امداد کرینگے +

پس ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کو بچانے کے لیے ہم صرف ایک ہی صحیح اور اساسی اصول قومیت پر ہندوستان کو از سرِ نو تقسیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں جس کی رُو سے ہندوستان کو اسلامی اور ہندو ہندوستان میں تقسیم کر دیا جائے۔ نیز یہ کہ ہم ہندوانڈیا کے مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے اپنی امکانی کوشش کریں۔ اِسی اُصول کی بنا پر برطانوی ہندوستان کا تین آزاد اور خود مختار ریاستوں میں منقسم ہونا ازبس ضروری ہے +

(۱) **شمال مغربی ہند** پنجاب۔ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو +

(۲) **بنگال** ۔ بنگال اور منصلہ ضلع پورینہ (بہار) کمشنری سلہٹ (آسام) پر مشتمل ہو مگر ہاوڑہ اور میدنا پور اور شمال مغربی ضلع واجلینگ کو بنگال سے خارج کر دیا جائے +

(۳) **ہندوستان** بقیہ برطانوی ہند پر مشتمل ہو۔ اور اس میں دو خود مختار صوبے بنائے جائیں۔

الف ۔ صوبہ دہلی۔ دہلی۔ میرٹھ اور روہیلکھنڈ کی کمشنریاں اور ضلع علی گڑھ (قسمت آگرہ) سے کہ اس میں شامل ہونا چاہیئے۔

ب:۔ صوبہ مالابار۔ مالابار اور ملحقہ ساحل مالابار کا علاقہ اس میں شامل ہو +

مزید برآں ہندوستان کے اِن قصبوں اور شہروں کو جن کی آبادی پچاس ہزار سے زاید ہو

(Free Cities) آزاد شہروں کی حیثیت دینی چاہیئے۔

نیز ہندوستان کے دیہاتوں میں مسلمانوں کو معقول تعداد میں یکجا رہنا ہوگا۔

ہندوستانی یا دیسی ریاستیں جو مجوزہ تین ریاستوں میں سے کسی کی حدود کے اندر

یا اس کی سرحد پر واقع ہیں وہ اس ریاست کا جزو ہوں گی۔

جو ایک سے زیادہ ریاستوں کی سرحد پر واقع ہوں اُنہیں اختیار ہوگا کہ جس ریاست سے چاہیں

متعلق رہیں +

حیدرآباد اپنے قدیم مستعمرات برار اور کرناٹک سمیت ایک آزاد سلطنت شمار ہوگی۔ منسلکہ نقشہ

میں مجوزہ ہندوستان کو متعین کیا گیا ہے اور چند توضیحی نوٹ درج کیے جاتے ہیں۔

شمال مغربی ہند میں کئی ریاستیں شامل ہوں گی یعنی قلات، جموں، کشمیر، بھاولپور، خیرپور

پٹیالہ، جیند، نابھ، کپورتھلہ، مالیرکوٹلہ، فریدکوٹ اور شملہ کی پہاڑی ریاستیں، بشمول کشمیر اسے پاکستان

کہا جاسکتا ہے۔ جیساکہ چند سال بیشتر، پاکستان کی فیڈریشن ایک اسلامی ریاست ہوگی اور اس میں

ڈھائی کروڑ مسلمان شامل ہونگے یعنی مجموعی آبادی کا زاید از ٦٠ فیصدی۔ جغرافیائی، اقتصادی اور

سیاسی لحاظ سے یہ بجائے خود ایک مکمل وحدت ہوگی۔ اِس فیڈریشن کے حصول سے مسلمانانِ ہند

پر ایک نئے اور زندگی بخش مستقبل کی راہ کھل جائے گی۔ پاکستان اسلامی ہند کا شمال مغربی بازو

ہوگا +

پاکستان میں ہندو اور سکھ دو غیر مسلم اقلیتیں ہیں۔ اُنہیں وہی ثقافتی، سیاسی اور مذہبی تحفظات

حاصل ہونگے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو۔ سکھوں کا اس ریاست میں شمول بمقابلہ آل انڈیا

فیڈریشن مجوزہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ زیادہ مفید ہوگا کیونکہ اس طرح وہ بلحاظ تناسب، صوبوں اور

مرکز میں اس سے بدرجہا زیادہ تعداد میں ہونگے۔

پاکستان کے جُداگانہ وفاق کے مطالبہ کی کوئی معقول مخالفت نہیں کی جاسکتی، اگر یہ

مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو اِن صوبوں کے مسلمان حصولِ مقصد کے لیئے ہر ممکن سعی اور پوری پوری جدّ وجہد کرینگے +

جدید بنگال ایک اسلامی ریاست ہوگی۔ اِس میں تین کروڑ سے زیادہ مسلمان ہونگے جو باعتبار تناسب آبادی، ۵ فیصدی ہونگے۔ جدید بنگال اپنی طبعی زرعی دولت کی وجہ سے پوری طرح اپنی ضروریات کا کفیل ہوگا۔ اُسکا رقبہ اور آبادی فرانس کے برابر ہوگی۔ مناسب صوبوں کے نقدان کی وجہ سے اس کی حکومت وفاقی نہ ہوگی بلکہ یہ خودمختار مملکت ہوگی۔ اس کی حیثیت برما سے متشابہ اور یہ اسلامی ہند کا مشرقی بازو شمار ہوگا +

ہندوستان ایک ہندو ریاست ہوگا جس کی آبادی ساڑھے چوبیس کروڑ کے قریب ہوگی اس میں دو کروڑ ۳۰ لاکھ مسلمان بھی شامل ہونگے جو وہاں دس فیصدی کی اقلیت ہونگے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم انکے مفاد کا اس حد تک سیاسی تحفظ کریں جتنا سردست ممکن ہے۔ ہمیں اس امر پر اصرار کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کے اندر دو نئے صوبے بنائے جائیں۔ ایک شمال میں۔ دوسرا جنوب میں۔ یعنی دہلی اور مالابار۔

نئے بنے ہوئے صوبۂ دہلی میں مسلمان ۵۳ لاکھ ہونگے یعنی مجموعی آبادی کا ۲۸ فیصدی۔ دراصل جب بھی وہ اقلیت ہی میں رہینگے لیکن بہرکیف وہ ایسی اہم اقلیت ہونگے جنہیں ہندو اکثریت آسانی سے نظرانداز نہیں کرسکے گی +

اِن حصوں کے مہذب اور تعلیم یافتہ مسلمان جن کی سرحد پاکستان کے مُسلم فیڈریشن سے متصل ہوگی امقابلتہً اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیئے بدرجہا زیادہ بہتر حیثیت میں ہونگے علی گڑھ جو مسلمانوں کا تعلیمی مرکز ہے۔ اس صوبے میں شامل ہونا چاہیئے کیونکہ ہم اسے بقیہ صوبۂ یو۔پی کے غیرمحفوظ حصے میں جہاں ہندو اکثریت ہوگی چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔

صوبۂ مالابار احاطۂ مدراس کے جنوبی حصے پر مشتمل ہوگا۔ علی الخصوص اس حصے پر جو ساحل مالابار سے متصل ہے۔ اِس حصے میں مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں۔ اس میں ان کی تعداد چودہ لاکھ ہے۔

مسلمان جو مجموعی آبادی کا ۲۰ فیصدی ہونگے انکا اِس صوبے سے بہت بڑا تجارتی مفاد وابستہ ہے۔ اور انہیں بلحاظ تہذیب نہایت اہم حیثیت حاصل ہے۔ مزید براں وہ ایک بہادر نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسی اہم اقلیت خود اپنے مفاد کی حفاظت موجودہ حالت سے بدرجہا بہتر طریق پر کرسکتی ہے +

ہندوستان میں مُسلمان زیادہ شہروں میں آباد ہیں اور ان کی تعداد معقول ہے۔ ہم اُنہیں ہندو حکومت کے رسم وکرم پر چھوڑنا گوارا نہیں کرسکتے۔ بدیں وجہ اُنکے مفاد کی حفاظت ازبس ضروری ہے اگر انکو اُنکے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی راہ خود پیدا کرلینگے۔ سردست انکے لیۓ جو کچھ کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ صوبجاتی اور مرکزی ہندو حکومتوں کی ناجائز مداخلت کو روکدیا جائے۔ یہ طریق احسن اِس طرح انجام پاسکتا ہے کہ جن شہروں کی آبادی پچاس ہزار یا اِس سے زیادہ ہو انکو آزاد شہروں کی حیثیت دے دی جائے۔ ان کی اپنی پولیس اور مجسٹریسی ہوگی۔ اور قانون سازی اور انتظامی معاملات میں وہ بڑی حد تک خود مختار ہونگے۔ اِس طرح ساڑھے بارہ لاکھ مسلمانانِ ہند کا تحفظ کیا جاسکتا ہے +

ہندوستان کے مواضعات میں جو مسلمان آباد ہیں انہیں اِس امر کی ترغیب دینی چاہیئے کہ وہ موجودہ ناقابلِ اعتنا اقلیت کی صورت میں منتشر نہ رہیں۔ اُنہیں مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ مُسلم دیہات میں مجتمع ہوکر کثیر تعداد میں رہائش اختیار کریں۔ صرف اِسی صورت میں اُنکے ثقافتی اور اقتصادی مفاد کا تحفظ ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اجتماعی، تعلیمی اور اقتصادی منفعت کے لیۓ مفید تعمیری پروگرام مسلم مواضعات میں فوراً شروع کردینے چاہئیں۔ اور ان سے محولہ بالا غایت کے حصول میں مدد ملیگی۔ نیز یہ کہ وہاں کے مُسلمانوں کی حالت میں فوری بہتری کی صُورت پیدا ہوگی +

متذکرہ صدر تین ریاستیں یعنی پاکستان، بنگال اور ہندوستان ایک باہمی دفاعی اور جارحانہ میثاق کریں گی جو مندرجۂ ذیل اساس پر مبنی ہوگا۔

۱۔ ایک دوسرے کی حیثیت کو تسلیم کرنا اور مساویانہ سلوک۔

۲۔ یہ کہ پاکستان اور بنگال مسلمانوں کے ملّی وطن تسلیم کیۓ جائیں اور ہندوستان ہندوؤں کا

وطن شمار ہو۔ جہاں وہ بہ ترتیب مذکورہ حسب منشاء انتقال رہائش کر سکیں +
۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تسلیم کیا جائے جسکا قلیل حصہ ہندوستان میں اور بڑا جزو پاکستان اور بنگال میں ہے۔
۴۔ ہندوستان کی مسلم اقلیت اور پاکستان اور بنگال کی غیر مسلم اقلیتوں کو حسب ذیل حقوق دیئے جائیں۔
(۱) نمائندگی بلحاظ آبادی۔
(۲) ہر حالت میں جداگانہ انتخاب نمائندگی نیز تینوں ریاستوں کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی تحفظات۔
نوٹ۔ جداگانہ نمائندگی باعتبار آبادی ہر قابل اعتنار اقلیت کو تینوں ریاستوں یعنی پاکستان، بنگال اور ہندوستان میں دی جا سکتی ہے مثلاً سکھ، عیسائی، اچھوت وغیرہ۔
۵۔ ایک ذمہ دار مسلم سیاسی ادارہ ہندوستان کے مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کیا جائے +
پاکستان، بنگال اور ہندوستان کی ہر ایک ریاست برطانیہ کے ساتھ جداگانہ معاہدہ کریگی۔ اور بشرط ضرورت جدا جدا برطانوی نمائندے تینوں کے لیے مقرر ہونگے ایک مشترکہ مجلس صلح بنائی جائیگی۔ جو تینوں حکومتوں کے باہمی اور حکومت برطانیہ کے مابین قضیوں کو فیصل کریگی۔ ریاست حیدرآباد ہندوستانی ریاستوں میں ایک مخصوص مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ سلطنت برطانیہ کی حلیف و مددگار قرار دی جاتی ہے۔ اور اس کا فرماں روا ہز اگزالٹیڈ ہائنس کا مخصوص خطاب رکھتا ہے۔ فی الحقیقت معاہدوں کی رُو سے یہ خود مختار حکومت ہے، برار اور کرناٹک برطانیہ نے حیدرآباد سے انتظامی اُمور کی بنا پر لیے تھے۔ اب جبکہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو اسکے حقیقی مالکوں کے سپرد کر رہی ہے۔ حیدرآباد کو اُس کی مستعمرات واپس ملنا چاہئیں اور حیدرآباد کی خود مختارانہ حیثیت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ کم از کم اِس درجے تک جو نیپال کا ہے۔ کرناٹک کی واپسی سے حیدرآباد کو ساحل سمندر بھی ملجائیگا۔ اور حیدرآباد قدرتی طور پر اسلامی ہند کا جنوبی بازو بنجائے گا +

نقشہ آبادی مجوزہ تقسیم ہند

نام	حدود	کل آبادی	مسلمان
پاکستان	پنجاب صوبہ سرحد سندھ بلوچستان ریاستیں کشمیر و جموں ۔ منڈی ۔ چمبا ۔ سوکیت ۔ سرمور ۔ فرید کوٹ ۔ نابھہ ۔ جھند ۔ پٹیالہ ۔ کپورتھلہ ۔ مالیر کوٹلہ ۔ چترال ، دیر ۔ قلات ۔ لوہارو ۔ بلاس پور ۔ شملہ کی پہاڑی ریاستیں ۔ بھاول پور وغیرہ ۔	۳۹,۲۷۳,۲۳۳	۲۳,۱۹۷,۵۳۸
بنگال	بنگال (جس میں سے ہوڑہ اور مدناپور کے ضلع خارج کر دیے گئے ہوں) ضلع پورنیہ (بہار) سلہٹ کمشنری (آسام)	۵۲,۰۷۹,۲۳۲	۳۰,۱۱۸,۱۸۴
ہندوستان	برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستیں (جس میں سے حیدرآباد ، پاکستان بنگال اور ان کی مشمولہ ریاستیں خارج کر دی گئی ہوں)	۲۱۹,۰۰۰,۰۰۰	۳۰,۹۶۰,۰۰۰
دھلی	دہلی میرٹھ کمشنری روہیلکھنڈ کمشنری ۔ ضلع علی گڑھ ۔	۱۲,۶۶۰,۰۰۰	۳,۵۲۰,۰۰۰
مالابار	مالابار ۔ جنوبی کنارہ (مدراس)	۴,۹۰۰,۰۰۰	۱,۴۴۰,۰۰۰
شہر		—	۱,۲۸۸,۴۹۸
حیدرآباد		۲۹,۰۴۹,۰۹۸	۲,۰۴۳,۰۱۰

مردم شماری سنہ ۱۹۳۱ء

تشریح	فیصدی مسلمان
اس کی ایک آزاد سلطنت اور جداگانہ فیڈریشن ہوگی۔ جس کا معاہدہ بنگال۔ حیدرآباد اور ہندوستان سے اور براہ راست معاہدہ برطانیہ سے ہوگا۔ پاکستان کے تمام حصوں میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔	۶۰٫۳
برما کی طرح ایک آزاد سلطنت ہوگا۔ جس کا پاکستان۔ حیدرآباد اور ہندوستان سے اور براہ راست برطانیہ سے معاہدہ ہوگا۔ اس میں ضلع پورینہ (بہار) اور کمشنری سلہٹ (آسام) شامل ہوں گے کیونکہ ان میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ اور اس میں سے ہورہ اور مدناپور کے ہندو اکثریت کے اضلاع خارج کر دیئے جائینگے۔	۵۷٫۰۰
یہ ایک آزاد سلطنت اور ایک جداگانہ فیڈریشن ہوگی جس کا معاہدہ پاکستان۔ بنگال اور حیدرآباد سے اور نیز براہِ راست معاہدہ برطانیہ سے ہوگا۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی سلطنت ہوگی۔	۹٫۰۷
دہلی ایک نیا اور خود مختار صوبہ ہندوستان کے اندر بنے گا۔ میرٹھ اور روہیلکھنڈ کی کمشنریاں۔ موثر مسلم اقلیتیں رکھتی ہیں۔ اس صوبہ میں علی گڑھ شامل ہونا چاہیئے کیونکہ یہاں مسلم یونیورسٹی ہے	۲۸٫۰۰
مالابار کا ایک نیا خود مختار صوبہ بنے گا جو ہندوستان میں ہوگا۔ اس میں ایک موثر مسلم اقلیت ہوگی۔	۲۷٫۰۰
ہندوستان۔ پاکستان اور بنگال کے وہ شہر جن میں پچاس ہزار یا اس سے زاید آبادی ہے۔ ان کو آزاد شہر یا (Borough) کا مرتبہ دیا جائے۔ جس میں بڑی حد تک آزادی ہو۔	—
حیدرآباد بشمول ممالک محروسہ برار اور کرناٹک ایک آزاد سلطنت ہو جس کا معاہدہ پاکستان بنگال اور ہندوستان سے اور براہ راست معاہدہ برطانیہ سے ہو۔ کرناٹک سے حیدرآباد کو سمندر کو راستہ ملجائیگا۔	۷٫۰۳

دارالاسلام کے تاثرات

شروع اکتوبر میں دارالاسلام کو بچشم خویش دیکھنے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ دامنِ کوہ ایک بہت بڑی نہر کا کنارہ۔ ہر طرف سبزہ زار، فضا بہت پاکیزہ، ہوا صاف، ماحول میں تسکین بخش خاموشی۔ ایسے جنت نگاہ مقام میں ایک وسیع مسجد۔ کتب خانہ، دارالمطالعہ، طلباء کے لیے دارالاقامہ۔ اساتذہ کے لیے رہائشی مکانات، وسیع میدان۔ طویل وعریض خوشنما باغ۔ یہ ہے دارالاسلام کی مادی تصویر مختر می چودہری نیاز علی صاحب کے متعلق میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا کہ وہ ذاتی تعلقات پر محمول کیا جاسکتا ہے، سردست مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب بھرائچ سے تشریف لاکر دارالاسلام میں اقامت پذیر ہیں اپنے ساتھ چند ایک طلباء بھی لائے ہیں چھ سات طلباء مضافات کے بھی آگئے ہیں۔ بارہ تیرہ کے قریب طالب العلم پانچ چھ کھڈیوں پر پارچہ بافی کا کام سیکھتے ہیں۔ دو ایک بوٹ سازی کا کام کرتے ہیں۔ اور تمام کے تمام اس نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جس کی رُو سے۔ مولوی صاحب کے اندازہ کے مطابق دو سال کی مدت میں یہ طالب العلم مساجد کی امامت کے اہل بن جائیں گے۔ اور ساتھ ہی دستکاری اس قدر سیکھ جائیں گے کہ معاش کے معاملہ میں کسی کے دست نگر نہ ہوں۔ یہ سب کچھ ایک شخص کی ہمت کا نتیجہ ہے۔ اور اگرچہ اس نصب العین کے مقابلہ میں جو وابستگانِ تحریکِ دارالاسلام کے پیشِ نظر ہے۔ یہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن جب اِس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ یہ نتیجہ ہے ایک مردِ مسلمان کے جذبۂ ایثار و اخلاص کا۔ تو اس کی قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ضرورت ہے ایسے دردمند مسلمانوں کی جو اس تحریک کے دست و بازو بنیں۔ اور سب سے بڑی تلاش ہے اس مردِ مومن کی جو اس کے قلب کی حیثیت اختیار کرسکے ٥

ازدام ودد ملولم وانسانم آرزوست !

پرویز

——— ❖ ———

تنقید و تبصرہ

برگ سبز | کسی کو خواجہ احمدالدین مرحوم کے بعض خیالات سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو کوئی خادم
قرآن کریم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ قرآن کریم کے بعض مقامات میں ان کی تحقیق اجتہاد کا مرتبہ
رکھتی ہے۔ ان مقامات میں سب سے اہم گوشہ مسئلہ وراثت ہے اور خواجہ صاحب نے اس باب میں
فی الواقعہ قابل ستائش محققانہ نگاہ سے کام لیا ہے مروجہ فقہ کی رو سے یتیم پوتا دادا کی جائداد سے کوئی حصہ
نہیں پاتا۔ خواجہ صاحب نے قرآنی دلائل سے اس مسئلہ کی تردید نہایت حسن وخوبی سے کی اور اس موضوع پر
متعدد رسائل شائع کئے۔ زیرنظر رسالہ ان کے ایک غیرمطبوعہ مسودہ پر مشتمل ہے جو رسالہ البیان (امت مسلمہ
امرتسر) کے ستمبر نمبر کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ جسکا مطالعہ ہمارے خیال میں ہر اس مسلمان کے لیے فائدہ مند
ہوگا جو قرآن کریم کے احکام وراثت کا جاننا ضروری سمجھتا ہو۔ اس باب میں ہم امت مسلمہ کی خدمت میں
ایک مخلصانہ مشورہ ضروری سمجھتے ہیں۔ خواجہ صاحب کو بے شک قرآن کریم سے خاص ذوق تھا لیکن وہ
صاحب قلم نہیں تھے۔ اس لیے ان کی تحریر میں الجھاؤ اور اسلوب نگارش میں پریشانی ہوتی ہے جو بعض اوقات
اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ انکا مافی الضمیر ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ بالخصوص ایسے موضوعات میں جو اصطلاحی
اور فنی ہوں۔ چنانچہ رسالہ زیرنظر میں تحریر کی یہی پریشانی اس کی افادی حیثیت کو بڑی حد تک زائل کر رہی
ہے۔ چاہیئے یہ کہ خواجہ صاحب کے خیالات کو سلجھی ہوئی عبارت میں از سرنو تحریر کرکے شائع کیا جایا کرے۔
اس سے مقاصد پیش نظر بڑی آسانی سے حل ہو جائیں گے۔ مطلب تو خواجہ صاحب کی قرآنی تحقیقات کے
نتائج کی نشر و اشاعت ہے نہ کہ ان کی تحریرات کی حفاظت۔ امید ہے کہ ارباب امت مسلمہ اس عرضداشت پر غور فرمائینگے

رسید کتب موصولہ | (۱) علم بدن۔ تشریح الابدان اور حفظان صحت کے متعلق ۲۰۸ صفحہ کا رسالہ مصنفہ ڈاکٹر
ایم یاسین صدیقی۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ صدیق بکڈپو اندرون پاک دروازہ ملتان شہر۔

(۲) **انبیاء کے دو دشمن**۔ یعنی حکام وقت اور سرمایہ دار۔ مرتبہ غلام نبی صاحب مسلم بی اے۔
مکتبہ اسلامیہ۔ اندرون۔ موچی دروازہ لاہور۔ قیمت ۴ر

(۳) **مسلمان اور سائنس** از خان بہادر ابوعبداللہ محمد ذکاء اللہ خاں صاحب ایم اے۔ دہلی۔ ۲۴ صفحات
قیمت ۴ر

(۴) **الشحات القرآن** یعنی ملخص مفید من القرآن المجید۔ از خان بہادر صاحب موصوف۔ ۱۷ صفحات قیمت ۳ر

(۵) **البدائع المفیدۃ فی حکم الصنائع الجدیدۃ** } مؤلفہ مولوی مفتی محمد شفیع صاحب۔ مدرس دارالعلوم دیوبند۔ قیمت آٹھ آنہ
مکبرالصوت (لاؤڈسپیکر) ریڈیو۔ گراموفون وغیرہ کے متعلق ٹھیٹھ
مولویانہ فتاویٰ کا مجموعہ۔

دارالعلوم دیوبند اور مولانا حسین احمد صاحب

جناب مکرم مدیر صاحب "طلوع اسلام" دامت مکارمہم

بعد سلام مسنون آنکہ شعبان المعظم کے "طلوع اسلام" میں میرا ایک مکتوب "عصر جدید" سے نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی شرکت کانگریس کی نسبت سوال کیا گیا ہے جو بالکل قدرتی طور پر کیا جانا چاہئے تھا۔ لیکن پہلے اس کا اعلان یہاں سے متعدد بار کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا ممدوح کی ذات کی استثناء ان شروط کی بنا پر ہے جو اب سے تیرہ چودہ سال پہلے وہ اپنے تقرر کے وقت دارالعلوم کے ارباب اقتدار سے طے کر چکے تھے۔ وہ زمانہ جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمن صاحب کے اہتمام اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی کا تھا۔ پھر مہتممین مرحومین کی وفات کے بعد ان شروط کی تجدید مولانا محمد طیب صاحب کے عہد اہتمام میں ہوئی۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم کی صدارت تدریس سے علیحدگی کے بعد غالباً دارالعلوم کے ارباب اہتمام کے نزدیک کوئی ہستی مولانا حسین احمد صاحب سے زیادہ اس عظیم الشان علمی مسند کو زینت دینے کیلئے موجود نہ تھی۔ یا ہاتھ نہ آسکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے مولانا ممدوح کی ممتاز و کارآمد شخصیت اور انکے کمالات و محاسن کے مقابلہ میں دارالعلوم کے عام معمول اور مسلمہ پالیسی کی طرف سے قدرے اغماض برتنے کو جائز سمجھا اور ایک کلی منفعت کی خاطر جزئی مضرت کی پروا نہیں کی۔ اسی نظریہ کے ماتحت آج اُن کا یہ استثنا قائم ہے۔

فی الحقیقت کسی خاص شخص کو خصوصی حالات کی بناء پر کس حد تک عام قواعد و ضوابط سے مستثنیٰ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف مجلس اعلیٰ شوراءیہ دارالعلوم کو حاصل ہے اور وہی اس سلسلہ میں مخاطب بن سکتی ہے۔

والسلام　　　　　(دستخط) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از دیوبند ضلع سہارنپور ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ

استدراک

پہلے شعبان المعظم کے پرچہ میں مولانا شبیر احمدؒ صاحب عثمانی کے مکتوب گرامی پر جو نوٹ لکھا تھا اس میں روئے سخن دار العلوم دیوبند کی مجلس عاملہ ہی کی طرف تھا۔ بایں ہمہ ہم حضرت مولانائے عثمانی کے ننگ گذار رہیں کہ انہوں نے طلوع اسلام کو درخورِ نظرِ التفات تصور فرمایا۔ مولانا حسین احمدؒ صاحب کے تقرر کے وقت کونسی شروط طے ہوئیں۔ اس سے ہمیں بحث نہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ آج سے تیرہ چودہ برس بیشتر کے حالات اور ملک کے موجودہ سیاسی رجحانات وکوائف میں بیّن فرق ہے۔ آج مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ نظریہ قومیت پرستی ہے جو خود مولانائے عثمانی صاحب کے الفاظ میں۔ ملت اسلامیہ کے لئے "خودکشی کے مرادف" ہے۔ یہ نظریہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے سامنے کبھی اس شد و مد سے پیش نہیں کیا گیا۔ جیسا آج کل پیش کیا جارہا ہے قومیت پرستی کا یہ عجمی تصور حال ہی کی پیداوار ہے اور مولانا حسین احمد صاحب کا سب سے بڑا قومی جرم یہ ہے کہ انہوں نے اس غیر اسلامی نظریہ کو شرعی حیثیت دیکر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اب اس کے بعد دیکھئے کہ وہ حضرت جسے مولانا انورشاہ صاحب مرحوم نے اس زمانے کے حالات کے پیش نظر محض "جزئی" تصور فرمایا تھا آج محض جزئی ہے یا کلی بن چکی ہے۔ دار العلوم دیوبند مسلمانانِ ہند کی مذہبی تعلیم کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے۔ وہاں کے فارغ التحصیل طالبعلم ملک کے اطراف و اکناف میں مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ بوجہ ائمہ مساجد اور منجملہ زمرۂ علمائے کرام ہونے کے عوام کے نزدیک ان کا ہر قول و فعل شرعی سند رکھتا ہے یہ طالب علم دوران قیام دیوبند میں جو کچھ کتابوں میں پڑھتے ہیں انکے قلوب و اذہان اس سے کہیں زیادہ ان کے اساتذہ کے مسلک اور عملی زندگی سے متاثر ہوتے ہیں فی الفور ہیں لائیے اس حقیقت کو کہ مولانائے مدنی صاحب بہ حیثیت شیخ الحدیث دار العلوم میں قیام پذیر ہیں سینکڑوں طالبعلم انکے مسلک و عمل سے پھر ملک کے گوشے گوشے میں عام مسلمانوں میں اثر پذیر ہوتے ہیں اور یہ مسلک اور عمل وہ ہے جو حضرت مولانائے عثمانی کے الفاظ میں امت مسلمہ کے لئے "خودکشی کے مرادف" ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے یہ مضرت پہلے وقتوں میں جزئی ہو تو ہو۔ اس وقت تو یہ کلی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے۔

صاحب نے اپنے لئے ذاتی اور اپنی منزہ زندگی میں گاندھی کے لئے مخصوص قرار دے رکھا ہے۔ ان سطور کے مسلک و عمل

اور اس کے مقابلہ میں وہ منفعت جو مولانا حسین احمد صاحب کے سلسلۂ درس وتدریس سے حاصل ہوتی ہے
بالکل جزئی رہ گئی ہے اگر ہمیں دار العلوم دیوبند کے ارباب اقتدار اس صاف گوئی سے معاف فرمائیں تو ہم عرض کرنے
کی جرأت کریں کہ آج ملک میں وطنیت ۔ قومیت پرستی اور متحدہ قومیت کا جو فتنہ جوالا مکھی طرح پھوٹ کر بہ رہا ہے
اس کی بہت بڑی ذمہ داری بالواسطہ دار العلوم پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ ان نظریوں کو شرعی سند عطا فرمانے کا
سہرا مولانا حسین احمد صاحب ہی کے سر ہے اور اس سند کی وقعت ان کی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ شیخ الحدیث
ہونے کی جہت سے ہوتی ہے آج ہندو کے پاس مسلمانوں کو فریب دینے کا سب سے بڑا حربہ یہ دلیل ہے کہ دیکھو تمہارے
مذہب کے علماء مسلکِ متحدہ قومیت کے عملی موید ہیں ۔ عوام کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہیں ہوتا اور یوں ہندو
اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہا ہے ۔ ملک میں جہاں کہیں آپ کو نیشلسٹ مولوی ملیں گے وہ بالعموم دیوبند کی پیداوار
ہوں گے اور یہی وہ حضرات ہیں جو مسلمانوں میں متحدہ قومیت کا اسلام سوز نظریہ پھیلانے اور قوم میں تشتت و
افتراق کا بیج بونے کے موجب بن رہے ہیں ۔ افسوس کہ دار العلوم دیوبند کے ارباب اقتدار نے اس خطرناک
مضرت کا احساس نہ کیا ورنہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت آج سے بالکل مختلف ہوتی ۔ ان
حضرات کو یہ بھی شکایت ہے کہ دار العلوم کی طرف مسلمانوں کی وہ پہلی سی توجہ نہیں رہی اور عوام کے دلوں
سے رفتہ رفتہ علمائے کرام کی عزت اٹھ رہی ہے ۔ لیکن انہوں نے کبھی اس پر غور کرنے کی تکلیف
گوارا نہیں فرمائی کہ اس کے لئے خود یہ حضرات کس حد تک ذمہ دار ہیں ۔ مسلمان اپنے تعلیمی اداروں
کو آج بھی اسی ارادت و عقیدت کی نظر سے دیکھنے کے متمنی ہیں اور علمائے اسلام کی عزت و تعظیم
کے لئے ان کے قلوب اسی تڑپ سے رقصاں ہیں ۔ لیکن ان کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ یہ ادارے اور
ان کے فارغ التحصیل علماء ان کے لئے ملی خودکشی کے سامان توفراہم نہ کریں ۔ خدا کرے کہ
ارباب دار العلوم ہماری ان معروضات پر جن کا محرک خالصتاً جذبۂ اخلاص و درد ہے ۔ ٹھنڈے
دل سے غور فرمانے کی کوشش کریں ۔

پیامِ مشرق

از علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جے راج پوری

ڈاکٹر اقبال کا یہ تازہ[1] دیوان میں نے پڑھا۔ مجھے اس سے جو حظ اور لطف حاصل ہوا وہ بیان سے باہر ہے لیکن بعض احباب کا اصرار ہے کہ میں اس کو تحریر میں لاؤں۔ اس لیے سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کو نہ تنقید سمجھنا چاہیے نہ تقریظ۔

یہ دیوان جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جرمن زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے چوں کہ میں گوئٹے سے آشنا نہیں ہوں اس لیے مقابلے کی جلوہ آرائی کا لطف نہیں اٹھا سکا۔ لیکن مشرقی شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس نے مغرب کو مخاطب کیا، اور ایشیا کے سینے کی برقی حرارت یورپ کے برفستان میں پہونچانے کی کوشش کی۔

دیباچہ | شروع میں ایک چھوٹا سا دیباچہ ہے۔ جس میں گوئٹے کی شاعری میں جو مشرقی رنگ ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی ذیل میں جرمن ادبیات پر عجمی شاعری کا جو اثر پڑا ہے اس کی نہایت مختصر تاریخ لکھی ہے۔ یہ مضمون مفید اور پُر از معلومات ہے۔ اگر جداگانہ بسط کے ساتھ لکھا جائے تو نہایت کارآمد ہو۔ چوں کہ دیوان فارسی میں ہے اس لیے اگر دیباچہ بھی بجائے اردو کے فارسی میں ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

زبان | ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعر گوئی اختیار کی تو شروع شروع میں ان کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کیے۔ لیکن اب اُنھوں نے اپنے ذہن وقاد اور طبع نقاد سے زبان میں ایسی لطافت اور شستگی پیدا کر لی ہے کہ صائب اور نظیری کے رنگ میں آ گئے۔ اس تمام مجموعے میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر مشکل سے کہیں انگلی رکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں رہ کر فارسی زبان کو جو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا ہے حقیقت میں

---

[1] یہ مضمون آج سے پندرہ سال پہلے لکھا گیا تھا جب کہ پیام مشرق پہلی بار شائع ہوا تھا۔

انھوں نے کوہکنی کی زحمت گوارا کرکے ایشائی اقوام مسلمہ کے لیے جو بالعموم فارسی سمجھتی ہیں اپنی فائدہ رساں تعلیمات کی ایک جوئے شیر نکالی ہے ورنہ آج یہ نہ کہہ سکتے ؎

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت　　　عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اٹالین اور انگریزی وغیرہ مغربی زبانوں میں کلام اقبال کے ترجمے ہورہے ہیں تو اہل مصر جو اس معاملے میں یورپ کے کسی ملک سے پیچھے نہیں ہیں اور جنھوں نے ٹیگور تک کا ترجمہ عربی میں کرلیا ہے اس اپنی بضاعت ملیہ کو عربی میں منتقل کیے بغیر نہیں رہیں گے۔

شاعری | بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شاعری وہی اچھی ہوتی ہے جو زمانہ جاہلیت میں ہوتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک ؏

دکانِ عاشقی را بسیار مایہ باید

بے شک جاہلی شاعری کی زبان میں سادگی اور طرزِ ادا میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ لیکن شعر کی خوبی انھیں چیزوں پر محدود نہیں ہے بلکہ ان کے سوا اس میں معنوی خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو زیادہ قدر کے قابل ہیں۔ اور یہ بلا علم کے پیدا نہیں ہوسکتیں۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

با فہم و عقل و دانش داد سخن تواں داد　　　چوں جمع شد معانی گوئے بیاں تواں زد

ذوقِ صحیح جذبات عالیہ کی ان لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہے جن سے دل کے تار کھنچتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اہل فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذت کے لیے ایک میوۂ پُر مایہ ہوگئی ہے کیوں کہ وہ علوم دینی و دنیوی اور مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں۔ ذوق صحیح۔ دل درد مند اور طلاقتِ لسانی رکھتے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچی ہوئی ہے اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے سے زمین سے آسمان تک کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں۔ وہ عرش کے پایوں میں جھولتے ہیں۔ مرغانِ اُولی اجنحہ کے ساتھ اُڑتے ہیں۔ ساکنان حرم قدس سے ملتے ہیں۔ بزم انجم و کواکب کی رموز سنتے ہیں۔ شبنم اور آفتاب کے باہمی راز۔ گل و بلبل کے راز و نیاز اور شمع و پروانہ کے سوز و ساز سے آشنا ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں برق کی موجیں۔ سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں۔ قطرۂ

اشک ہیں سوزش دل کا تب وتاب اور دانۂ گوہر میں حیات معنوی کی آب دیکھتے ہیں۔
غرض عالمستان معنی ہے جس کے چپے چپے اور گوشے گوشے سے جواہر پارے چنتے ہیں اور جذبات ملیہ و دینیہ کا پیکرستاں تیار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس قدر تیز بیں ہے کہ ایک ہی چیز پر نہیں رکتی بلکہ نتائج سے اسباب اور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہے۔
تہدیہ کتاب کو کسی کے نام سے معنون کر دینا ایک عام رسم ہوگئی ہے۔ حالاں کہ اس کا موقع صرف وہ ہے جب کہ کتاب کے مقصد کو اس سے مدد مل سکے۔ ورنہ اہل نظر اس کو کتاب کی خواری اور مصنف کی سبکساری کی دلیل سمجھتے ہیں۔
اس سے بیشتر ڈاکٹر صاحب کی ایک مثنوی کا تہدیہ میری نظر سے گزرا تھا جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوگئی تھی کہ اللہ اکبر۔ اسرار خودی کی تعلیم۔ اور اس پر یہ بے خودی ؎

چو روئے خویش در آئینہ می توانی دید چرا نظر بہ جمال کسے دگر داری

شکر ہے کہ اس دیوان کے بارے میں مجھے یہ شکایت نہیں ہے کیوں کہ اس میں انھوں نے کسی شخص کو نہیں بلکہ درحقیقت ایک قوت کو خطاب کیا ہے۔ جو اُن تعلیمات کی جو اس کتاب میں دی گئی ہیں صحیح مخاطب ہے یعنی امیر امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان۔
کتاب کا مضمون اور انداز نہایت دلکش اور بلیغ ہے۔ عالم اسلامی کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ صرف چند شعروں میں کھینچ دیا ہے۔

دیدمؔ اے خسروِ کیواں جناب آفتاب ما توارت بالحجاب
ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت از دم او سوز الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گرداب نیل سست رگ تورانیان ژندہ پیل
آلِ عثماں در شکنجِ روزگار مشرق و مغرب زخونش لالہ زار

عشق راآئینِ سلمانی نماند | خاکِ ایران ماند وایرانی نماند
سوز وسازِ زندگی رفت از گلش | آں کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلم ہندی شکم را بندۂ | خود فروشے دل ز دیں برکندۂ
در مسلماں شانِ محبوبی نماند | خالد وفاروق وایوبی نماند

درخواست یہ ہے:

اے ترا فطرت ضمیرِ پاک داد | از غم دیں سینۂ صد چاک داد
جانِ تو بر محنتِ پیہم صبور | کوش در تہذیبِ افغانِ غیور
تاز صدیقان ایں امت شوی | بہرِ دیں سرمایۂ قوت شوی

لالۂ طور دیوان کا پہلا جز ہے اس میں ۱۵۵ قطعات ہیں جو ایک ہی وزن پر ہیں۔ یہ فلسفۂ زندگی کے اسرار اور معدن حکمت کے گوہر ہائے آبدار ہیں۔ دو چار درج کرتا ہوں۔

دلِ من روشن از سوزِ درون است | جہاں بیں چشم من از اشک خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد | کسے کو عشق را گوید جنون است

دمادم نقشہائے تازہ ریزد | بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است | بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

مگو کارِ جہاں نااستوار است | ہر آنِ ما ابد را پردہ دار است
بگیر امروز را محکم کہ فردا | ہنوز اندر ضمیرِ روزگار است

رمیدی از خداوندانِ افرنگ | ولے برگور وگنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی چناں عادت گرفتی | ز سنگ راہ مولائے تراشی

افکار | دیوان کا دوسرا جز، کم و بیش ۴۰ صفحے ہے۔ اس میں مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔ ہلالِ عید کے متعلق کہتے ہیں :۔

نتواں ز چشم شوق رمید ای ہلالِ عید — از صد نگہ براہِ تو دامے نہادہ اند
بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج — در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند

تسخیر فطرت کے عنوان سے ابلیس و آدم کا جو قصہ لکھا ہے اس کا پرداز نہایت شاندار ہے۔ سجدے سے انکار کے وقت ابلیس کا متکبرانہ لہجہ اس کی تعلّی کی کیسی عجیب تصویر ہے۔

نوری نادان نیم سجدہ بآدم برم — او بہ نہاد ست خاک من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوزِ من۔ خونِ رگِ کائنات — من بہ دوِ صرصرم۔ من بہ غوِ تندرم
من ز تنک مایگاں گدیہ نکردم سجود — قاہر بے دوزخم۔ داور بے محشرم

آدم ایک نافرمان لڑکے کی طرح جو باپ کے گھر سے نکلنے پر آزادی کا سانس لیتا ہے جنت سے خارج ہو کر خوشی کا راگ گاتا ہے یہ راگ نہایت دل فریب ہے۔ خاص کر یہ شعر ؎

بگداز ہائے پنہاں۔ بہ نیاز ہائے پیدا — نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن

لیکن صبح قیامت کو جناب باری میں اس کا یہ جواب

تا شود از آہِ گرم ایں بُتِ سنگیں گداز — بستنِ زُنّارِ او بود مرا ناگزیر
عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

مبہم ہے۔ اس کے سمجھنے سے میں قاصر رہا۔ کیوں کہ ابلیس کی فطرتِ چالاک کے ساتھ کسی طرح قرآن سے مطابقت نہیں کھاتی۔

بوئے گُل کی حقیقت پر شاعرانہ تخیل کی لطافت قابلِ دید ہے۔

حورے بکنج گلشنِ جنت تپید و گفت — ما را کسے ازاں سوئے گردوں خبر نداد
ناید بفہمِ من سحر و شام و روز و شب — عقلم ربود اینکہ بگویند مرد و زاد

گردید موجِ نکہت و از شاخ گل مید | یا ایچنیں بعالم فرداو دے نہفتا
واکرد چشم و غنچہ شد و خندہ زدے | گل گشت و برگ برگ شد و بر زمیں فتاد

زاں نازنیں کہ بند ز پائش کشادہ اند
آہے است یادگار کہ بونام دادہ اند

شاہین وماہی کی گفتگو کس قدر ترانہ انگیز لہجہ میں لکھی ہے۔

ماہی بچۂ شوخ بشاہیں بچہ گفت | ایں سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست
باسیل گراں سنگ زمیں گیر و سبک خیز | با گوہرِ تابندہ و با لولوئے لالاست
بیروں نتواں رفت ز سیل ہمہ گیرش | بالائے سر ماست تہِ پاست ہمہ جاست
ہر لحظہ جوان است و روان است و دوان است | از گردشِ ایام نہ افزوں شد و نے کاست
ماہی بچہ را سوزِ سخن چہرہ برافروخت | شاہیں بچہ خندید و ز ساحل بہوا خاست
زد بانگ کہ شاہینم و کارم بزمیں چیست | صحراست کہ دریاست تہِ بال و پرِ ماست

مئے باقی | یہ تیسرا جز بھی کم وبیش چالیس صفحوں کا ہے۔ اس میں غزلیں ہیں جن کی زبان کی سلاست ترنم ریز اور معنوی لطافت وجد انگیز ہے دو ایک نمونتاً درج کرتا ہوں۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر | رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر
بر سر بام آ نقاب از چہرہ بے باکانہ کش | نیست در کوئے تو چوں من آرزومندے دگر
بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش | از نگہ بافم برخسارِ تو روبندے دگر
یک نگہ. یک خندۂ دزدیدہ. یک تابندہ اشک | بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر
عشق را نازم کہ از بے تابیِ روزِ فراق | جانِ ما را بست با دردِ تو پیوندے دگر
تا شوی بے باک تر در نالہ اے مرغِ بہار | آتشے گیر از حریمِ سینہ ام چندے دگر

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے — کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دلگدازے
بمتاعِ خود چہ نازی کہ بشہرِ دردمنداں — دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسّمِ ایازے
ہمہ نازِ بے نیازی ہمہ سازِ بے نوائی — دلِ شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بی نیازے
ز مقامِ من چہ پرسی بہ طلسمِ دل اسیرم — نہ نشیبِ من نشیبے نہ فرازِ من فرازے
رہِ عاقلی رہا کن کہ بہ او تواں رسیدن — بدلِ نیازمندے بہ نگاہِ پاکبازے
بہ رہِ تو ناتمامم ز تغافلِ تو خامم — من و جانِ نیم سوزے تو و چشمِ نیم بازے
رہِ دیر تختۂ گل ز جبینِ سجدہ ریزم — کہ نیازِ من نگنجد بہ دو رکعتِ نمازے

ز ستیزِ آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد
دلکے بہانہ سوزے نگہے بہانہ سازے

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست — تجلّیِ دگرے درخورِ تقاضا نیست
اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت — تو دلگرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناس نئی و ز مقام بیخبری — چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست
نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست — جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست
بیا کہ غلغلہ در شہرِ دلبراں فگنیم — جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گردِ صحرا نیست
ز قید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور — مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
مریدِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت — بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و صحرا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش — حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ایک غزل میں ایک شعر کیا بلند حوصلگی کا کہا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

مولانا رومؒ نے بھی فرمایا ہے

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند	فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن شاعرانہ خیالات کا تضاد احسن تقویم اور اسفل سافلین کا کیسا صحیح منظر پیش کرتا ہے کہ کہاں آدم خاکی کا یہ جوش و خروش اور کہاں وہ نگاہ میں اس قدر حقیر کہ اللہ تعالٰے سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ

نقش دگر طراز دہ آدم پختہ تر بیار	لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

نقش فرنگ | یہ چوتھا جز ۴۰ صفحے سے کچھ کم ہے۔ اس میں اہل مغرب کے خیالات اور ان کے متعلق رائیں ہیں۔ ان مضامین سے ایشیائی شاعری اب تک قطعاً روشناس نہ تھی آغاز اس پیام سے ہوتا ہے۔

ازمن اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ	عقل تا بال کشود است گرفتار تراست
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند	عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تراست
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ	انچہ در پردۂ رنگست پدیدار تراست
عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری	عجب آنست کہ بیمارِ تو بیمار تراست
علم و حکمت اگرش خوئی سگی باز دہد	آدمی زادۂ دانا ز دَداں خوار تراست
خواجہ را قیمت عیش است اگر مزد غلام	بندہ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر است

رفتگانِ عالم بالا کی صحبت بھی نہایت دل چسپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی حکمائے نے وہاں جا کر سیاسی مذاکرے شروع کر دئے ہیں۔

روس کا مشہور حکیم ٹالسٹائے کہتا ہے

بارکش اہرمن لشکرئے شہر یار	از پئے نانِ جویں تیغ ستم بر کشید
زشت بچشمش نکوست مغز نداند ز پوست	مردک بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
داروئے بیہوشی ہست تاج کلیسا۔ وطن	جان خدا داد را خواجہ بجامے خرید

مزدک ایران کے اباحیہ مذہب کا پیشوا اپنی تعلیم کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہے

دانۂ ایراں ز کشت زار و قیصر بر دمید — مرگِ نو بیں قصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل — تا تہی گردد حرمش از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز — نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

"کشتۂ پرویز" ناکام گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب کوہکن بھی اس مجلس میں شامل ہے
وہ کہتا ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است — ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم — زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد — ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ایک نظم میخانۂ فرنگ کی یاد میں ہے۔ اس میں کہتے ہیں۔

چشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار — بادہ خواران را نگاہِ ساقیش پیغمبر است

یہی وہ جرم ہے جس پر ملا شیدا غریب شاہجہانی علما کے فتووں کی بنیاد پر دہلی سے نکالا گیا
تھا۔ اس نے کہا تھا۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے — حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا نظامی گنجوی کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور اکثر ایرانی استادوں نے اس کے
جوابات لکھے ہیں۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود — می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نبُد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار — یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم در نکشود
پاسے بگذشت ز شب بیشترک یا کمتر — رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است دریں وقت کرا میخواہی — بے محل آمدنت بر درِ ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوے — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود

این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشانید | کہ تو دیر آئی واندر صف پیشیں استی زود
این خراباتِ مغانست درو رندانند | شاہد و شمع و شراب و شکر و نائی و سرود
ہرچہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر | مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبتِ ایشاں بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

ڈاکٹر صاحب، خرابات فرنگ کے عنوان سے اسی نہج پر ایک قطعہ لکھتے ہیں۔

دوش رفتم بتماشائے خرابات فرنگ | شوخ گفتاری رندے دلم از دست ربود
گفت این نیست کلیسا کہ بیابی در وے | صحبتِ دخترکِ زہرہ وش و نائے و سرود
این خرابات فرنگست و ز تاثیر مئش | آنچہ مذموم شمارند نماید محمود
نیک و بد را بترازوئے دگر سنجیدیم | چشمۂ داشت ترازوئے نصاریٰ و یہود
خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست | زشت، خوب است اگر تاب و توانِ تو فزود
تو اگر در نگری جز بہ ریا نیست حیات | ہر کہ اندر گرِدِ صدق و صفا بود نبود
دعویٔ صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست | پیر ما گفت مس از سیم بباید اندود
فاش گفتم بتو اسرار نہانخانۂ زیست
بکسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

دولِ مغربیہ نے جو جمعیت اقوام قائم کی ہے وہ شاعر کو اس شکل میں نظر آتی ہے۔

بر فتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن | دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند | بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

دردمندانِ جہاں کا لفظ خاص توجہ کے قابل ہے۔

مولانا وحشی کا یہ قطعہ "برادر و تقسیم نابرابر" مشہور ہے۔

زیبا ترا نچہ ماندم زبابا از آنِ تو | بدائے برادر از منِ و اعلیٰ از آنِ تو

ایں طاس خالی از من وآں کوزہ کہ بود — پارینہ پر ز شہد مصفا از آنِ تو
یا بوئے ریسماں گسل و میخ کن زمن — مہمیز کلہ تیز مطلا از آن تو
ایں دیگ لب شکستہ صابون پزی زمن — وآں چمچۂ حریرہ و حلوا از آنِ تو
ایں اشترِ خموش لکد زن از آنِ من — واں گربۂ مصاحب بابا از آن تو

از صحنِ خانہ تا لبِ بام از آنِ من
وز بام تا بہ سقفِ ثریا از آن تو

اسی لطیف طرز پر ڈاکٹر صاحب نے قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور لکھا ہے۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد زمن — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد از آنِ من — صہبائے پاکِ آدم و حوا از آنِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من — ظل ہما و شہپرِ عنقا از آن تو

ایں خاک و آنچہ در شکم او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلیٰ از آنِ تو

پیغام | عجمی شاعری نے اوّل اوّل حسن و عشق کے گہوارہ اور سلاطین و امراء کی مداحی کے آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانہ کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پر تصوّف کا رنگ چڑھایا۔ خاص کر مولانائے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پالیا۔ یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں پر سے ان کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اب زمانے نے دوسری کروٹ بدلی اور اُمّتِ اسلامیہ غیروں کے پنجہ تسلط میں پڑ کر مصائب آلام میں مبتلا ہو گئی۔ اس وجہ سے شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا اور اس کے ساز پر قومی اور وطنی راگ گائے جانے لگے۔ مصر، ایران، ہندوستان نیز افغانستان ہر جگہ شاعری سے یہ کام لیا جانے لگا ہم ان تمام نغموں کو سنتے ہیں لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کی لَے ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے

وہ دو باتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز نظر آتی ہے۔

(۱) ان قومی شعراء کی نگاہیں اپنی قومی اور ملکی حدود سے باہر کم پہنچتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر کل اُمت اسلامیہ ہے یعنی ان کا خطاب صرف جذبۂ اسلامی سے ہے نہ کہ ایرانی یا تورانی سے۔ اس لیے اوروں کے کلام کو ہم صرف "قومیات" یا "وطنیات" کہہ سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظمیں "ملیات" کے لقب کی مستحق ہیں۔

(۲) دوسرے شعراء جذبات عام کو لے کر نظم کا لباس پہناتے ہیں۔ بخلاف اس کے ڈاکٹر صاحب کی طبع خداداد حیات ملیہ کے اسرار خود اخذ کرکے ان کو شاعری کے قالب میں ڈھالتی ہے۔

کسی کا قول ہے

اگرچہ شاعران نغز گفتار ‌ ‌ ‌ ‌ زیک جام اند در بزم سخن مست

ولے با بادۂ بعضے حریفاں ‌ ‌ ‌ ‌ خمار چشم ساقی نیز پیوست

مبیں یکساں کہ در اشعار ایں قوم ‌ ‌ ‌ ‌ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

"چیزے دگر" وہی رموز لطیفہ ہیں جن کو پیغامی شاعر کے سوا کوئی دوسرا نہیں پا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب امت اسلامیہ کے لیے ایک پیغام رکھتے ہیں ان کا یہ دعوے ہے۔

بخامہ کہ خط زندگی رقم زدہ است ‌ ‌ ‌ ‌ نوشتہ اند پیامے بہ برگ رنگینم

وہ اپنا پیغام بھی صاف ظاہر کرتے ہیں۔

زشاخ آرزو برخوردہ ام من ‌ ‌ ‌ ‌ بہ رازِ زندگی پے بردہ ام من

مترس از باغباں اے ناوک انداز ‌ ‌ ‌ ‌ کہ پیغام بہار آوردہ ام من

ان کے پیغامی شاعر ہونے کے متعلق غالباً آئندہ آنے والے لوگ ہم سے بہتر لکھ سکیں گے

عجمی شاعری جس نے تصوف کی خدمت گزاری کی اس میں اور ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں بھی بڑا فرق ہے وہ فنا اور نفس کشی کی تلقین کرتی ہے اور یہ خودی اور زندگی کی۔ وہ تند مزاجوں کو برف بناتی ہے اور یہ افسردہ دلوں کو برق۔

تعلیمات | ڈاکٹر صاحب حسن وعشق کے شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے دل کو اللہ تعالےٰ نے حیات ملیہ کے اسرار سے بھر دیا ہے۔ فرماتے ہیں

تامرا رمزِ حیات آموختند | آتشے در سینہ ام افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام | عشق را عہد شباب آوردہ ام
آشنائے من زمن بیگانہ رفت | از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی اورا دہم | تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن | رنگ وآبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید | آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرتِ من عشق را در بر گرفت | صحبتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق رموزِ ملک و دیں برمن کشود | نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

ان کی ساری شاعری انہیں رموز کی تعلیمات سے لبریز ہے۔ یہاں تک کہ قطعات اور غزلیات بھی۔ اس جگہ اجمالاً چند عنوانات لکھتا ہوں۔

خودی | یہ ڈاکٹر صاحب کا خاص مضمون ہے جس پر ان کی مستقل مثنوی موجود ہے۔ خودی سے مراد خود پسندی نہیں بلکہ خود شناسی ہے یہ مجموعہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں۔

چہ پرسی از کجا یم چیستم من | بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بے قرارم | اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

شبنم

گفتند فرود آے ز اوجِ مہ و پرویز | بر خود زن و با بحرِ پر آشوب بیامیز

با موج در آویز
نقش دگر انگیز
تابندہ گہر خیز

من عیش ہم آغوشیِ دریا نخریدم   آں بادہ کہ ازخویش ربایدنچشیدم

ازخود نرمیدم

زآفاق بریدم

برلالہ چکیدم

زندگی | اس عالم کائنات کا ذرّہ ذرّہ سرگرم پیکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہی پیکار اصل زندگی ہے۔ اخلاقیات کے نامور معلم شیخ سعدی نے کہا تھا کہ

اگر خواہی سلامت برکنار است

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و باموجش درآویز   حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

غالباً مولانا بیدل نے کسی غزل میں کہا ہے "شکند رنگم حبابے چوں بدریا شکند"

اس پر کہتے ہیں۔

ازنزاکتہائے طبع موشگافِ او مپرس   کزدم بادے زجاجِ شاعرما بشکند

کے تواند گفت شرحِ کارزارِ زندگی   می پرد رنگش، حبابے چوں بدریا بشکند

وہ اس عالم ہی کو پسند نہیں کرتے جس میں یزداں کے مقابلے میں اہرمن نہ ہو۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے   کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

عمل | ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام درحقیقت درس عمل ہے اور یہی نوائے وقت ہے ستاروں کی زباں سے فرماتے ہیں

خنک انساں کہ جانش بے قرار است   سوارِ راہوارِ روزگار است

قبائے زندگی بر قامتش راست   کہ او نو آفرین و تازہ کار است

ہائنا کے جواب میں کہا ہے

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد۔ آہ کہ من چیستم

موج زخود رفتۂ۔ تیز خرامید و گفت — ہستم اگر میروم۔ گر نروم نیستم

اسلام | ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا اصلی سرچشمہ قرآن عظیم ہے۔ اسی کے رموز کو لے کر وہ اس ساز پر نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ دین اسلام ہر قسم کی انسانی صلاح و فلاح پر حاوی اور دینی و دنیوی ترقیات کا کفیل ہے۔

ایک غزل میں کہتے ہیں۔

تو رہ شناس نۂ وز مقام بے خبری — چہ نغمۂ ایست کہ در بربط سُلیمیٰ نیست

ایک دوسری غزل میں کہا ہے

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست — اے زخود رفتہ تہی شوز نوائے دگراں

مغربی تہذیب جو بدبختی سے مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے ان کے نزدیک نہایت ناأستوار بنیاد پر قائم ہے۔ اور وہ ایک ملمع کاری ہے جس کی تہ میں انسانیت اور ہمدردی کا نام و نشان نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید — حذر کہ شیوۂ او رنگ جوزنی دارد

در ہوایش گرمیِ یک آہ بے تابانہ نیست — رند ایں میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

مسلمانوں پر مدتہائے دراز سے عجمی ادبیات نے اثر ڈال کر ان میں جو افسردگی پیدا کر رکھی ہے اس سے بھی سخت بے زار ہیں۔ اور پھر ان کو اصل عربی اسلامی رنگ میں لانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

دگر بدشت عرب خیمہ زن کہ بزم عجم — مے گذشتہ و جامے شکستنی دارد

اخوۃ اسلامی | مسلمانوں نے جہالت کی وجہ سے جو نسلی اور ملکی امتیازات پیدا کر کے باہمی تفرقے ڈال رکھے ہیں ان کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن نے کل مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ اور یہی اخوت اسلامی ملت کی اصلی طاقت ہے۔ فرماتے ہیں۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

محنت | دنیا میں ہر شخص فطرتاً اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کی محنت کا کل ثمرہ اس کو ملے۔ لیکن دول مغربیہ کی سرمایہ پرستی کی وجہ سے عالم کی اقتصادی حالت اس قدر پرپیچ ہو گئی ہے کہ مزدور اپنا پورا حق نہیں پا سکتا۔ بلکہ سرمایہ دار بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یورپین ممالک میں سرمایہ اور محنت کی جنگ نہایت اہمیت پکڑ گئی ہے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ روس کی طرح دیگر مغربی سلطنتیں بھی اس کی رو میں بہہ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے خلاف جہادِ عظیم میں مصروف ہیں۔
موسیو لینن صدر جمہوریۂ روس کی زبان سے کہتے ہیں۔

بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن مثالِ دانہ تہِ سنگِ آسیا بود است
فریبِ زاری و افسونِ قیصری خورد است اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسیا بود است
غلام گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر قمیصِ خواجہ کہ رنگیں ز خونِ ما بود است

کارل مارکس کی زبان سے جو رفتگانِ عالمِ بالا میں سے ہے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

رازدانِ جزو کل از خویش نامحرم شد است آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدہ است

ٹالسٹائی کہتا ہے۔

عقلِ دورد آفرید فلسفۂ خود پرست درسِ رضامندی بندۂ مزدور را؟

یہ درد ان کے دل میں اس قدر ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے دل فریب مناظر میں بھی اس کو نہیں بھولتے

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

تبلیغ اسلام اسلام کی تبلیغ اہم ترین فریضۂ امت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں جو بعض ہندوستانی مغربی ممالک میں تبلیغ کے لیے جاتے ہیں یہ کہاں تک بجا ہے جب کہ خود ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں لاکھوں کروڑوں مسلمان جاہل اور گمراہ پڑے ہوئے ہیں۔ غیروں کو مسلمان بنانے کی بہ نسبت ان کی تعلیم اور ہدایت مقدم ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب فرنگستان کے دنیا پرستوں میں تبلیغ کی اس وقت ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور ایسے مبلغوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

زمانہ باز برافروخت آتش نمرود — کہ آشکار شود جوہر مسلمانی

بیا کہ پردہ زداغ جگر بر اندازیم — کہ آفتاب جہانگیر شد زعریانی

ہزار نکتہ زدی پیش دلبران فرنگ — گداختی صنما نرا بعلم برہانی

خبر ز شہر سلیمیٰ بدہ حجازی را — شرار شوق فشاں در ضمیر تورانی

رہ عراق و خراساں زن اے مقام شناس — بہ بزم اعجمیاں تازہ کن غزل خوانی

بسے گذشت کہ در انتظار زخمہ ور یست — چہ نغمہا کہ نخوشد بہ سازِ افغانی

حدیث عشق باہل ہوس چہ میگوئی — بچشم مور مکش سرمۂ سلیمانی

جمہوریت ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام دیکھنے سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کا آب و گلِ حریت اور مساوات اور خمیر جمہوریت کا ہے لیکن ان کا یہ قول

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکر انسانے نمی آید

نہایت تعجب انگیز ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ "پختہ کار" صاحب بھی "خر ناشخص" نکلے تو پھر کیا ہوگا۔ کیوں کہ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملائکہ کا جو اُستاد ہے وہی راندۂ درگاہ اور ملعون بارگاہ ہوگا وہ غریب خود اس سے بے خبر تھا چنانچہ کہتا ہے

بر لوح ثبت بود کہ ملعوں شود یکے — بردم گماں ہر کس و بر خود گماں نبود

اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملہ میں صرف ایک ہی ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے۔ مشورے میں دو فائدے ہیں۔

(۱) نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں شبہ نہیں تھا "وشاورہم فی الامر" کا حکم دیا گیا۔

(۲) بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلب مذاق صحیح موجود ہوتا ہے اس لئے عام مسلمانوں کیلئے "امرہم شوریٰ بینہم" نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کر لوں[1]۔

خاتمہ ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے۔ لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز یعنی فصاحتِ لفظی اور بلاغتِ معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔ جو مضمون ہے وہ نہایت صاف، برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرتِ خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے۔ انداز بیان اور طرز ادا انوکھا اور دلکش ہے۔ ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ صنائع بدائع اور تشبیہات و استعارات کے پیچھے وہ نہیں پڑتے لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

ان کا قدم کسی کے جادہ تقلید سے قطعاً بری ہے۔ ممکن ہے کہ کہیں مغز سخن انہوں نے مولانائے روم سے اخذ کیا ہو لیکن اپنا راستہ جو بالکل اچھوتا اور نیا ہے خود ہی نکالا ہے۔

ان کا جام شاعری اس سوگواری کی تلخی سے بھی پاک ہے جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ ماضی کے ماتمی نہیں ہیں بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں ان کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری سے ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں +

---

[1] غالباً ڈاکٹر صاحب کا مقصد ڈکٹیٹر شپ ہے۔

متحدہ قومیت اور اسلام

از شمس العلما جناب مولانا عبد الرحمن صاحب پروفیسر دہلی یونیورسٹی

[قارئین طلوع اسلام کو یاد ہوگا کہ مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی نے حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو ارشادات گرامی کے جواب میں اُن کی وفات سے قریب چھ ماہ بعد ایک رسالہ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کیا تھا۔ اس رسالہ کا مسکت جواب طلوع اسلام میں بعنوان "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" اُسی زمانہ میں شائع ہو گیا تھا اور علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں بھی موجود ہے۔ مولانا صاحب یا اُن کے ہم مسلک حضرات میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ اس مضمون کا جواب لکھ سکیں۔ اُن کے رسالہ کا تمامتر مدار نبی اکرم کے ایک نامہ مبارک پر تھا۔ حال ہی میں شمس العلما مولانا عبد الرحمن صاحب نے رسالہ برہان میں ایک مضمون شائع فرمایا ہے جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب نے اس نامہ مبارک کے اقتباسات نقل کرنے میں کس قدر علمی "دیانت" سے کام لیا ہے۔ ذیل میں یہ مضمون بمسرت شائع کیا جاتا ہے]

("طلوع اسلام")

میں انڈین نیشن کا لفظ سالہا سال سے کانگریس کے حامیوں سے سنتا چلا آیا ہوں مگر اکثر ہندوؤں اور خال خال مسلمانوں سے۔ اور وہ بھی سیاسی اور عقلی دلائل کے انداز پر۔ اب کچھ دنوں سے متحدہ قومیت کی دعوت مسلمانوں کو کانگریس کے پلیٹ فارم بلکہ خود مسلمانوں کے علما کی زبان سے شروع ہوئی ہے جس میں مذہبی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اتفاق سے میں اخبارات بہت کم دیکھتا ہوں۔ سیاسی مجالس میں تو جاتا ہی نہیں۔ اسلئے

تفصیلی علم مجھے ان دلائل کا تھا، نہ ہے۔ جو علماء کرام کی ایک جماعت متحدہ قومیت کی حمایت میں پیش کرتی رہی ہے۔ اتفاق کی بات ایکدن ایک دوست سے ملنے گیا۔ وہاں "متحدہ قومیت اور اسلام" نامی رسالہ پر نظر پڑی۔ ذکر اس کا پہلے سُن چکا تھا۔ چلتے ہوئے وہ رسالہ اُٹھا لایا اور گھر آکر اُسے پڑھا اور مکرر سہ کرر پڑھا اور جہاں تک سمجھا گیا سمجھا مگر ابتدائی ۳۵-۳۶ صفحے خاطر خواہ سمجھ میں نہ آئے۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ جن حالات اور مباحث کے سلسلہ میں رسالہ لکھا گیا میں اُن سے بے خبر تھا اور ہوں۔ باقی رسالہ اپنی بساط کے موافق سمجھا اور خیال ہے کہ سمجھتا ہوں۔

اس رسالہ میں جہاں بہت سی عقلی دلیلیں متحدہ قومیت قایم کرنے اور اسکے وجوب یا جواز کی پیش کی گئی ہیں وہاں نقلی دلائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامۂ مبارک بھی ہے جس کو اگر میں رسالہ کی مذہبی بحث کا محور کہوں تو شاید بیجا نہ ہو، نامۂ مبارک کے بعض فقرے استناد میں دیکھکر جی چاہا کہ نامۂ مبارک بتمام وکمال دیکھوں۔ سیرت ابن ہشام اور کتاب الاموال ابوعبید قاسم بن سلام کی میری دسترس میں تھیں اُن کو نکلوایا اور نامۂ مبارک کو پڑھا۔ اس کے پڑھنے سے جو خیال دل میں آیا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ نے کوئی متحدہ قوم ایسی نہیں بنائی جیسی آپ کی طرف اس رسالہ میں منسوب کی گئی ہے اور بالفرض بنائی بھی گئی اور یہ نامۂ مبارک اس کے قیام و اثبات کے لئے حجت بھی ہو سکتا ہے تو رسالہ کے بعض فقروں کو نقل کرنا اور اکثر کو نظر انداز کرنا کم از کم علمی دیانتداری کے خلاف ہے جو ہونا چاہیئے تھا۔ اسلئے میں یہاں اس نامۂ مبارک کو مع اُس کے ترجمہ کے اور اُن باتوں کے جو مطالعہ کتب سے مجھے معلوم ہوئیں اہل علم و فہم کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مدعا احقاق حق ہے اور بس۔

نامۂ مبارک میں سیرت ابن ہشام سے نقل کروں گا کہ اس میں چند فقرے کتاب الاموال کی نسبت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ میرا فہم ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے وہ بیان کرونگا اور جہاں تک ہو سکے گا۔ سیاست اور سیاسی تطبیق سے احتراز کروں گا کہ عام مصلحت اسی میں ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

هذا كتاب من محمد
النبی صلی الله علیه وسلم
بين المؤمنين والمسلمين
من قريش ويثرب ومن
تبعهم فلحق بهم وجاهد
معهم۔

(۱) انهم امة واحدة
من دون الناس، المهاجرون
من قريش على ربعتهم
يتعاقلون بينهم وهم
يفدون عانيهم بالمعروف
والقسط بين المؤمنين۔
وبنو عوف على ربعتهم
يتعاقلون معاقلهم الاولى
وكل طائفة تفدى عانيها
بالمعروف والقسط بين المؤمنين

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ تحریر ہے محمد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی قریش اور یثرب کے مؤمنوں
اور اُن لوگوں کے باب میں جو اُن
کے پیرو (ساتھ ہو کر اُن میں شامل
ہیں۔ اور اُن کے ساتھ ہو کر جہاد
کریں باین مضمون کہ:۔

(۱) یہ تینوں سب کو چھوڑ ایک
اُمت (ایک فریق، ایک جماعت) ہیں
قریش کے مہاجر اپنے حال (دستور)
پر اپنے لوگوں کی خون بہائیں لینگے
اور وہی بھلائی (امداد باہمی) اور
انصاف بین المومنین کی پابندی
کے ساتھ فدیہ دیکر اپنے قیدی کو قید سے چھڑائینگے
اور بنو عوف اپنے قدیم دستور کے موافق
اپنی سابقہ واجب شدہ خونبہاؤں کا لین دین خود
کریں گے اور ان کا ہر گروہ باہمی امداد اور انصاف
بین المومنین کا پابند رہکر اپنے قیدی کا فدیہ
خود سرانجام دے گا اور مومنین کی جماعت
یا ان میں سے کسی فرد واحد پر ناروا اور
نامنصفانہ بار نہیں ڈالے گا۔

وبنو ساعدة على ربعتهم يتعاقلون معاقلهم
الاولى وكل طائفة منهم تفدى عانيها
بالمعروف والقسط بين المؤمنين۔

اور بنو ساعدہ

وبنو الحرث على ربعتهم يتعاقلون معاقلهم
الاولى وكل طائفة تفدى عانيها بالمعروف
والقسط بين المؤمنين۔

اور بنو الحرث

وبنو جشم على ربعتهم يتعاقلون معاقلهم
الاولى وكل طائفة منهم تفدى عانيها بالمعروف
والقسط بين المؤمنين۔

اور بنو جشم

وبنو النّجار على ربعتهم يتعاقلون معاقلهم
الاولى وكل طائفة منهم تفدى عانيها بالمعروف
والقسط بين المؤمنين۔

اور بنو النجار

وبنو عمرو بن عوف على ربعتهم يتعاقلون
معاقلهم الاولى وكلّ طائفة تفدى عانيها
بالمعروف والقسط بين المؤمنين۔

اور بنو عمرو بن عوف

وبنو النبيت على ربعتهم يتعاقلون
معاقلهم الاولى وكل طائفة تفدى عانيها
بالمعروف والقسط بين المؤمنين۔

اور بنو النبيت

وبنو الاوس على ربعتهم يتعاقلون
معاقلهم الاولى وكل طائفة
منهم تفدى عانيها بالمعروف
٦٢

اور بنو الاوس اپنے اپنے قدیم دستور کے م
اپنی اپنی سابقہ واجب شدہ خونبہا فد
لین دین خود کریں گے اور انہی کی جما

والقسط بین المؤمنین	اپنے اپنے قیدی کو باہمی امداد واعانت اور بھلائی کے ساتھ
	اور انصاف بین المؤمنین کے طریق پر فدیہ دے کر قید سے
	چھڑائیں گی۔
(۲) وان المؤمنین لا یترکون مفرحا	(۲) اسی طرح مؤمنین بھی اپنے درمیان کسی کو خونبہا اور فدیہ کے بوجھ
بینهم ان یعطوه بالمعروف فی فداء	سے دبا ہوا چھوڑ کر الگ نہیں ہوں گے بلکہ خونبہا اور فدیہ کے ادا کرنے
او عقل	کے لئے کھلے دل سے مدد کریں گے۔
ولا یحالف مومن مولی مومن دونه	اور نہ کوئی مومن کسی مومن کے آزاد غلام کو اسکے بغیر (اسکے علم وحاضری کے
وان المؤمنین المتقین علی من بغی	بغیر) اپنا حلیف بنائیگا۔ اور سارے مومن متقی خلاف رہیں گے اس شخص کے جو
منهم او ابتغی دسیعة ظلم او اثم او عدوان	ان میں سے ہو اور ان کے خلاف علانیہ باغی ہو جائے یا ظلم بدی وتعدی یا فساد کا حامل
او فساد بین المؤمنین وان ایدیهم علیه	ان میں پھیلاتا پھرے اور بالیقین وہ سب کے سب ایسے شخص کے درپے رہیں گے اگرچہ
جمیعا ولو کان ولد احدهم ولا یقتل	وہ انہیں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اور کوئی مومن مومن کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں
مؤمن مؤمنا فی کافر ولا ینصر کافرا علی مؤمن	کرے گا اور نہ مومن کے خلاف کسی کافر کی حمایت کیجائے گی۔
(۴) وان ذمة الله واحدة یجیر	(۴) اور اللہ کی پناہ ایک ہے (جب دیدی گئی دیدی گئی) ایک ادنیٰ
علیهم ادناهم	مومن بھی سب مسلمانوں کے ہاتھ سے پناہ دے سکتا ہے۔
(۵) وان المؤمنین بعضهم موالی	(۵) اور سارے مومن ایک دوسرے کے بھائی اور مددگار رہیں
بعض دون الناس (۶) وانه من	اوروں کے مقابلہ میں۔
تبعنا من یهود فان له النصر والاسوة	(۶) جو یہودی ہمارا ساتھ دیں وہ امداد ومروت کے حقدار ہوں گے اس طرح
غیر مظلومین ولا متناصرین علیهم	کہ نہ ان پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف مومن باہم ایکدوسرے کی مدد کریں گے
(۷) وان سلم المؤمنین واحدة لا یسالم	(۷) اور صلح سارے مومنوں کی ایک ہے۔ کوئی مومن راہ خدا کی لڑائی
مؤمن دون مؤمن فی قتال فی سبیل	میں ایک مومن کو چھوڑ کر (نظر انداز کر کے) کسی سے صلح نہیں کرے گا مگر
الله الا علی سواء وعدل بینهم	یہ کہ اس صلح میں سب ہمسر و برابر ٹھہریں۔

(۸) وان کل غازیۃ غزت معنا تعقب بعضہا بعضاً۔ (۸) اور غازیوں کی ہر جماعت جو ہمارے ساتھ جہاد کو نکلے وہ یکے بعد دیگرے میدان جنگ میں جائیگی۔ (کسی ایک جماعت ہی کو مرنے کھپنے کیلئے نہیں چھوڑ دیا جائے گا)

(۹) وان المؤمنین یبئ بعضہم علی بعض بما نال دماؤھم فی سبیل اللہ (۹) اور سارے مؤمن اس کلفت کی وجہ سے جوان کو خون کی راہ خدا میں اُٹھانی ہے ایک دوسرے سے برابر ہیں۔

(۱۰) وان المؤمنین المتقین علی احسن ھدی واقومہ (۱۰) اور متقی مومن ہی بہترین اور سیدھی سے سیدھی راہ پر ہیں (اوروں کو بھی انہیں کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے)

(۱۱) وانہ لا یجیر مشرک مالاً لقریش ولا نفساً ولا یحول دونہ علی مؤمن [له] (۱۱) یثرب کا کوئی مشرک کسی قریشی مشرک کے مال اور اسکی جان کو پناہ دے گا اور نہ اسکو بچانے کے لئے مؤمن کے آڑے آئیگا۔

(۱۲) وانہ من اعتبط مؤمناً قتلاً عن بینۃ فانہ قود بہ الا ان یرضی ولی المقتول وان المؤمنین علیہ کافۃ ولا یحل لھم الا قیام علیہ (۱۲) اور اگر کوئی کسی مؤمن کو بے گناہ قتل کردے اور قتل کرنا شہادت سے ثابت ہو تو قاتل قصاص میں مارا جائے گا۔ سوائے اس صورت کے کہ مقتول کا ولی راضی ہو جائے معاف کردے یا فدیہ لے۔ اور سارے مؤمنین کو قاتل کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا ناگزیر ہے

[له] اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مدینہ بھی اس نامۂ مبارک کے احکام کے ماتحت تھے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ کے پہونچنے کے کچھ عرصہ بعد تک مشرکین سے موادعۃ جائز تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد تک جائز رہی۔ اس بحث کو ہم نے یہاں ارادۃً چھوڑ دیا ہے۔

(۱۳) وانہ لا یحل لمومن اقر بما فی هذہ الصحیفۃ وآمن باللہ والیوم الاٰخر ان ینصر محدثا ولا یؤویہ وانہ من نصرہ وآواہ فان علیہ لعنۃ اللہ وغضبہ یوم القیامۃ ولا یؤخذ منہ صرف ولا عدل۔

(۱۳) اور جس مومن نے اقرار کر لیا ان باتوں کا جو اس صحیفہ میں ہیں اور یوم آخرت پر ایمان لایا۔ اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ کسی مجرم کی حمایت کرے اور اُسے پناہ دے، جو حمایت کرے اور پناہ دے قیامت کے دن اس پر اللہ کی لعنت ہوگی اور غضب آئیگا نہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور نہ فدیہ۔

(۱۴) وانکم مهما اختلفتم فیہ من شیٔ فان مردہ الی اللہ عز وجل والی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۱۴) اور جب اے ایمان والو تم میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو اس بات کو اللہ عزوجل اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرو۔

(۱۵) وان الیهود ینفقون مع المومنین ما داموا محاربین

(۱۵) اور یہود جب تک ایمان والوں کے ساتھ مل کر لڑتے رہیں وہ ایمان والوں کے ساتھ خود بھی لڑائی کا خرچ اٹھائینگے۔

(۱۶) وان یهود بنی عوف امۃ مع المؤمنین للیهود دینهم وللمسلمین دینهم موالیهم وانفسهم الا من ظلم واثم فانہ لا یوتغ الا نفسہ واهل بیتہ۔

(۱۶) اور بنی عوف میں جو یہودی ہیں وہ ایک جماعت ہیں مومنین کے ساتھ کہ یہود کے لیے اُن کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے اُن کا۔ انکے موالی بھی ویسے ہی جیسے وہ خود (اس دین کے بارہ میں کوئی روک ٹوک نہیں) مگر کوئی ظلم اور بدی کر بیٹھے تو وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑیگا بلکہ اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو خود ہلاک کریگا۔

عربی	اردو
(۱۷) وان لیھود بنی النجار مثل ما لیھود بنی عوف	(۱۷) اور بنی نجار
وان لیھود بنی الحرث مثل ما لیھود بنی عوف	بنی الحرث
وان لیھود بنی ساعدۃ مثل ما لیھود بنی عوف	بنی ساعدہ
وان لیھود بنی جشم مثل ما لیھود بنی عوف	بنی جشم
وان لیھود بنی الاوس مثل ما لیھود بنی عوف	بنی الاوس
وان لیھود بنی ثعلبۃ مثل ما لیھود بنی عوف الا من ظلم واثم فانہ لا یوتغ الا نفسہ و اھل بیتہ ۔	اور بنی ثعلبہ میں جو یہودی ہیں اُن سب کے حقوق ایسے ہی ہیں جیسے ان یہودیوں کے جو بنی عوف میں ہیں سوائے اُن کے جو ظلم اور بدی کے مرتکب ہوں۔ وہ ایسی باتوں سے اپنے اور اپنے گھروالوں ہی کو ہلاک کرتے ہیں (اور کسی کا کیا بگاڑتے ہیں)
(۱۸) وان جفنۃ بطن من ثعلبۃ کانفسھم وان لبنی الشطیبۃ مثل ما لیھود بنی عوف	(۱۸) اور جفنہ ثعلبہ ہی کی ایک شاخ ہے اور بنی شطیبۃ[1] کے وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے۔
(۱۹) وان البر دون الاثم	(۱۹) اور بھلائی اور بُرائی صاف الگ الگ ہیں۔
(۲۰) وان موالی ثعلبۃ کانفسھم	(۲۰) اور ثعلبہ کے موالی بھی ایسے ہی سمجھے جائینگے جیسے خود بنی ثعلبہ
(۲۱) وان بطانۃ یھود کانفسھم	(۲۱) اور یہودیوں کے غلام، نوکر چاکر، حوالی موالی سب انہی کے حکم میں ہونگے ۔
(۲۲) وانہ لا یخرج منھم احد الا باذن	(۲۲) جن لوگوں کا اوپر ذکر ہوا اُن میں سے کوئی یثرب سے

---

[1] ضبط اس اسم کا معلوم نہ ہو سکا ۔ ابن ہشام میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کچھ لکھا ہے کہیں کچھ. کتاب الاموال میں یہ فقرہ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)	باہر نہیں جائیگا مگر باجازت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
(۲۳) وانہ لا یحجز علی ثار جرح	(۲۳) اور نہ کوئی زخم کے قصاص سے مانع آئیگا۔
(۲۴) وانہ من فتک بنفسہ فتک و اھل بیتہ۔ الا من ظلم وان اللہ علی ابر ھذا۔	(۲۴) اور اگر کوئی کسی کو موقع پا کر جان سے مار دھرے تو وہ درحقیقت اپنے آپ کو اور اپنے کنبہ والوں کو مارتا ہے، مگر یہ کہ جو مارا گیا ہو پہلے اس نے ظلم کیا ہو اور خدا خود شاہد ہے کہ کون ان باتوں کو اچھی طرح پورا کرنے والا ہے
(۲۵) وان علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم۔	(۲۵) اور بالیقین یہودی اپنے مصارف کے ذمہ دار ہونگے اور مسلم اپنے خرچ کے۔
(۲۶) وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھذہ الصحیفۃ۔	(۲۶) اور جو اس صحیفہ کے ماننے والوں سے لڑنے لگے تو یہ ایک دوسرے کی مدد کرینگے۔
(۲۷) وان بینھم النصح والنصیحۃ و البر دون الاثم	(۲۷) اور یہ لوگ باہم ایک دوسرے کے خیر اندیش و خیر خواہ رہینگے اور بھلائی برائی صاف الگ الگ ہیں
(۲۸) وانہ لم یأثم امرؤ بحلیفہ وان النصر للمظلوم۔	(۲۸) اور یہ کہ کوئی آدمی اپنے حلیف کی خطا پر خطاوار نہیں بنایا جائیگا، اور مستحق حمایت مظلوم ہے۔
(۲۹) وان الیھود ینفقون مع المومنین ما داموا محاربین	(۲۹) اور یہود مومنین کے ساتھ ساتھ خود بھی خرچ کرینگے جب تک کہ جنگ میں رہینگے۔
(۳۰) وان یثرب حرام جوفھا لاھل ھذہ الصحیفۃ۔	(۳۰) اور یثرب کا اندرون اس صحیفہ والوں کے لیے حرم ہے (پناہ ہے)
(۳۱) وان الجار کالنفس غیر مضار	(۳۱) اور پڑوسی کے حقوق ایسی ہی ہیں جیسے خود اپنے جب

ولا اثم۔

تک کہ وہ خود ضرر نہ پہنچائے اور بدی کرنے پر نہ اتر آئے یا یہ کہ ہر شخص اپنے پڑوسی کو اپنے ہی جیسا سمجھو نہ اسے نقصان پہنچائے نہ کوئی برائی کرے۔

(۳۲) وانہ لا تجار حرمۃ الا باذن اهلها۔

(۳۲) کسی کی بیوی کو پناہ نہ دیجائے مگر اس کے مرد کی اجازت سے۔

(۳۳) وانہ ما کان بین اهل هذه الصحیفۃ من حدث او اشتجار یخاف فسادہ فان مردہ الی اللہ عزوجل والی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۳۳) اس صحیفہ کے ماننے والوں میں اگر کوئی جھگڑا ٹنٹا ہو جائے جس سے فساد پھیلنے کا اندیشہ ہو تو اُس میں اللہ اور محمد رسول اللہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

(۳۴) وان اللہ علی اتقی ما فی هذه الصحیفۃ وابرہ۔

(۳۴) اور اللہ شاہد ہے اس کا جو اس صحیفہ کی باتوں کو اچھی طرح پورا کرتا ہے۔

(۳۵) وانہ لا تجار قریش ولا من نصرها وان بینهم النصر علی من دهم یثرب واذا دعوا الی صلح یصالحونہ ویلبسونہ فانهم یصالحونہ وانهم اذا دعوا الی مثل ذلک فانہ لهم علی المومنین الا من حارب فی الدین۔

(۳۵) اور قریش اور اس کے مددگار کو پناہ نہیں دی جائیگی اور یہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کرینگے اس کے خلاف جو یثرب پر چڑھ کر آئے اور جب یہ لوگ (غیر مسلم) صلح کی طرف بلائے جائیں تو یہ صلح کریں اور اُس کے پابند رہیں، اس لیے کہ مسلم صلح کر رہے ہیں اور جب وہ خود اسی قسم کی دعوت دیں تو اس کا ماننا ایمان والوں پر واجب ہوگا، البتہ وہ لوگ جو دین کے باب میں لڑیں اس کلیہ سے خارج ہونگے۔

(٣٦) علی کل اناس حصتهم من جانبهم الذی قبلهم

(٣٦) سارے آدمیوں پر ان کا اپنا حصہ ہو (کام کا) اُسی طرف جدھر کہ وہ ہیں (یعنی لڑائی کے وقت جو لوگ جدھر مقرر کر دیے گئے ہیں اس طرف کے کام کا سر انجام ان کا کام ہے)

(٣٧) وان یهود الاوس موالیهم وانفسهم علی مثل ما لاهل هذه الصحیفة مع البر المحسن من اهل هذه الصحیفة

(٣٧) اور قبیلہ اوس کے یہود کے متعلق یہ کہ اُن کے موالی اور خود اُنکے لیے اس صحیفہ والوں کے سے حقوق ہیں مع اچھے سلوک کے اس صحیفہ والوں کی طرف سے (یعنی اس صحیفے کے ماننے والے اُنکے ساتھ وہی اچھا سلوک کرینگے جو خود اُنکے لیے مقرر ہو چکا ہے)

(٣٧) وان البر دون الاثم لا یکسب کاسب الا علی نفسه

(٣٧) اور بھلائی بُرائی صاف الگ الگ ہیں اور کمانے والا جو کچھ کماتا ہے اپنے نفس کے لیے کماتا ہے (اچھا ہو یا بُرا)

(٣٨) وان الله علی اصدق ما فی هذه الصحیفة وابره

(٣٨) اور اللہ راضی ہے اس سے کہ جو کچھ اس صحیفہ میں ہے وہ اسکو زیادہ پورا اور سچا کر دکھائے۔

(٣٩) وانه لا یحول هذا الکتاب دون ظالم واثم

(٣٩) یہ تحریر کسی ظالم و گنہگار کے لیے بچاؤ کا پٹہ نہیں ہے۔

(٤٠) وانه من خرج امن ومن قعد امن بالمدینة الا من ظلم واثم

(٤٠) اور جو نکل جائے اور مدینہ میں بیٹھ رہے وہ امان میں ہے سوائے اس کے جس نے ظلم کیا اور بُرائی کی۔

(٤١) وان الله جار لمن بر واتقی

(٤١) اور جو نیک اور متقی ہیں وہ اللہ اور اللہ کے

وھلاً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جوار (پناہ) میں ہیں۔

یہ ہے وہ نامہ جس سے "متحدہ قومیت اور اسلام" میں متحدہ قومیت کے اثبات وقیام پر مذہبی حیثیت سے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ استدلال کہاں تک قابل تسلیم ہے۔ اس باب میں دو باتیں تحقیق طلب ہیں، اول یہ کہ اصول روایت کی رو سے یہ نامہ قابل احتجاج ہے یا نہیں دوسرے یہ کہ نامہ زیر بحث کے بعض حصص سے استشہاد کر کے بعض بلکہ اکثر کو نظرانداز کر دینا کہاں تک درست ہے۔

یہ روایت "متحدہ قومیت اور اسلام" میں سیرت ابن ہشام اور ابوعبید کی کتاب "کتاب الاموال" سے لی گئی ہے لیکن ابن ہشام نے اپنی کتاب میں سرے سے روایت کی اسناد گویا لکھی ہی نہیں۔ قال ابن اسحٰق پر اکتفا کیا ہے۔ ممکن ہے ابن اسحٰق نے روایت کی اسناد لکھی ہو لیکن یہاں بہرحال وہ مجہول ہے، اور کتب سیر کی روایات کا مرتبہ معلوم۔ جب تک ان کی تصدیق کسی صحیح طریق سے نہ ہو جائے وہ عموماً ناقابل تسلیم ہیں۔ ابوعبید نے البتہ اپنے شیوخ تا بہ ابن شہاب الزہری گنوائے ہیں لیکن سلسلہ رواۃ کا اس میں بھی ناتمام ہے۔ ابن الشہاب نے بلغنی کہہ کر روایت شروع کر دی ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ کس سے پہنچی۔ زہری کا مرتبہ حدیث میں مسلّم لیکن اس کو کیا کیجیے کہ روایت کی اسناد منقطع ہے۔ اس لیے اصول روایت کی رو سے نہ ابن ہشام کی روایت مقبول ہو سکتی ہے نہ ابن عبید کی۔ اس پر مزید یہ ہے کہ یہ روایت خواہ اسناد و متن کے لحاظ سے صحیح ہی کیوں نہ ہو عمل رسول اللہ اور کتاب اللہ دونوں سے منسوخ ہو چکی۔ اور لا کلام منسوخ ہو چکی ہے خود ابوعبید

لے ابن ہشام اور ابوعبید کی روایات کا متن باہم بہت کچھ مختلف ہے یہ اختلاف نہ صرف لفظی ہے بلکہ کم و بیش بھی جو فقرے ابوعبید کے ہاں نہیں اور ابن ہشام کے ہاں آئے ہیں، ہم نے اُن کے اوپر خط کھینچ دیے ہیں، ابن ہشام کے ہاں بعض فقرے مکرر بھی ہیں اور بظاہر بے ضرورت مکرر ہیں۔ ترتیب بھی کہیں کہیں مختلف ہے بلکہ نامہ نامی کا آخری حصہ میرے نزدیک مضطرب بھی ہے۔ ان باتوں کی تفصیلی بحث کو ہم نے غیر ضروری اور مضمون سے غیر متعلق سمجھ کر عمداً چھوڑ دیا ہے۔

لکھتا ہے :-

وانما كان هذا الكتاب - فيما نُرى - حدثان مقدم رسول الله (صلى الله عليه وسلم) قبل ان يظهر الاسلام ويقوى وقبل ان يومر بأخذ الجزية من اهل الكتاب وكانوا ثلاث فرق: بنو القينقاع والنضير وقريظة فاوّل فرقة غدرت ونقضت الموادعة بنو القينقاع وكانوا حلفاء عبد الله بن أُبيّ فأجلاهم رسول الله (صلى الله عليه وسلم) عن المدينة ثم بني النضير ثم القريظة فكان من اجلائه اولئك وقتل هؤلاء ما قد ذكرناه فى كتابنا هذا.

یعنی یہ تحریر (ہمیں ایسا خیال ہوتا ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تشریف لانے کے زمانہ میں لکھوائی ہوگی، اس سے پہلے کہ اسلام طاقت و شوکت حاصل کرے اور اہل کتاب سے جزیہ لیے جانے کا حکم آئے اور وہ یعنی اہل کتاب تین فرقے تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر، اور قریظہ۔ ان میں سے جس فرقہ نے سب سے پہلے غداری کی اور صلح فیما بین کو توڑا وہ بنو قینقاع تھے، جو عبد اللہ ابن ابی بن سلول کے حلیف تھے۔ رسول اللہ نے پہلے انہی کو مدینہ سے جلا وطن کیا، اس کے بعد بنو نضیر اور قریظہ کے قتل و شامت کی باری آئی، ان کے جلا وطن اور ان کے قتل کا حال ہم نے اپنی اسی کتاب میں کسی جگہ لکھا ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو عبید کے نزدیک یہ نامہ رسول اللہ کے مدینہ تشریف لانے کے قریب ترین زمانہ میں لکھا گیا، ابن ہشام نے اس تحریر کا واقعہ "عقد مواخاۃ" سے بھی پہلے لکھا ہے اس سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ شاید اسی لیے ابو عبید نے نُرٰی لکھا ہو۔ وجہ صحیح معلوم نہ ہونے کی یہ ہے کہ خود اس نامہ میں مسلم و یہود کو زمانۂ جنگ میں اپنا اپنا خرچ اٹھانے کی ہدایت موجود ہے۔

اور غزوت اور غازیۃ کا لفظ بھی نامہ میں آیا ہوا ہے۔ اب معاملہ دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ نامہ غزوات کی تیاری کے زمانہ میں لکھوایا گیا، یا اُس زمانہ میں جبکہ غزوات شروع ہو گئے تھے، اور یہ معلوم ہے کہ غزوات رسول اللہ کے مدینہ پہنچنے سے کوئی برس دن کے بعد شروع ہوئے۔ اگر ہم اس نامہ کو زیادہ سے زیادہ دیر سے لکھا ہوا بھی مانیں تب بھی یہ ماننا ہی پڑیگا۔ کہ وہ آیۂ قتال کے نزول سے قبل لکھوایا گیا۔ اور جونہی آیۂ قتال نازل ہوئی یہ نامہ منسوخ اور ہمیشہ کے لیے منسوخ ہو گیا[1]۔ اس لیے اب اس کی سند پر مختلف مذہب والوں سے امت واحدہ کے قیام اور اثبات پر استدلال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

عام مسلمہ اصول کی بنا پر امۃ واحدہ کے قیام و اثبات کی بحث یہیں ختم ہو جاتی ہے اور ہو جانی چاہیے۔ لیکن اگر کوئی کہنے لگے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ آیۂ قتال قیام امۃ واحدہ کی ناسخ ہوئی۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس صلح کی ناسخ تھی جو مسلم و یہود کے مابین قائم تھی اور بس۔ یا ہم تنزلاً تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آیۂ قتال اس وقت امت واحدہ کے قیام کی ناسخ ہو گئی تھی، کہ اُس وقت کے حالات اس کے متقاضی تھے لیکن یہ کہاں سے لازم آیا کہ یہ نسخ دائمی تھا۔ اور یہ کہ اس وقت اگر وہی حالات پیدا ہو جائیں جن میں رسول اللہ نے امۃ واحدہ ترتیب دی تھی تو اب اس سنت پر عمل ہی نہ کیا جائے۔ یہ قول عام اصول مسلمہ کے سامنے جیسا کچھ ہے ظاہر ہے مگر میں کہتا ہوں اچھا یونہی سہی۔۔

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ آیۂ قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہی بنو قینقاع، بنو نضیر، اور قریظہ کا رسول اللہ استیصال فرما چکے تھے، جو کچھ اُن میں سے بچ رہے تھے وہ مستامن و مستاجر تھے۔ آیۂ قتال کے نزول کے بعد وہ ذمیوں کے حکم میں آ گئے۔ اگر یہ قبائل اُمۃ واحدہ میں شامل تھے، جیسا کہ ابن ہشام اور ابو عبید کے بیان سے مستفاد ہوتا ہے (حالانکہ یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کرینگے) تو رسول اللہ نے قیام اُمۃ واحدہ کو خود اپنے عمل سے منسوخ فرما دیا۔ اور قرآن نے اس نسخ کو دائمی ٹھہرایا۔ اور اگر یہ تینوں قبائل اس نامۂ نبوی کے مطابق بنی ہوئی اُمۃ واحدہ میں شامل نہ تھے (جو امر واقعی ہے اور میں سمجھتا ہوں) تو یہ آیۂ قتال کے نازل ہونے تک وہ یہود جن کا نامہ نامی میں ذکر آیا ہے عموماً ایمان لا چکے یا قتل ہو چکے تھے۔ اگر بعض کچھ باقی تھے تو آیۂ قتال کے نزول پر وہ خود بخود امۃ واحدہ کے بندھن سے ٹوٹ کر گر پڑے۔ اور اب وہ اُمۃ واحدہ رہی نہ وہ سُنت۔

حقائق و عبر

ہندی اور ہندو

مسلمانوں نے جب کبھی ہندی کی بیجا ترویج و اشاعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو اُسے ہمیشہ فرقہ پرستی پر محمول کیا گیا اور کانگرسی ذمہ دار حلقوں میں بڑی بلند آہنگی سے اس کی تردید ہوئی۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اضطراب کے پیشِ نظر مولانا آزاد نے بھی اپنا گوشۂ چشم التفات ادھر مبذول کیا۔ اور نہایت متانت سے فرمایا کہ کانگریس پر بے جا عصبیت اور پاسداری کا الزام صریحاً بے بنیاد ہے۔ کانگریس کے نزدیک تو ملک کی زبان وہ ہے جو عموماً شمالی ہند میں بولی جاتی ہے لیکن مولانا آزاد کے اس اعلان کے باوجود کانگرسی اکابر کی "اُردو کُش" سرگرمیاں پوری شدومد سے جاری رہیں اور ہندی کی حمایت کے نشہ میں گاندھی جی تو یہاں تک لکھ گئے کہ "اُردو قرآن کی زبان میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے پھیلایا۔ مسلمان چاہیں اس کو رکھیں یا نہ رکھیں"۔ برادرانِ وطن کے قول و فعل کے تضاد نے مسلمانوں کے شبہات کو اور تقویت پہنچائی، لیکن حقیقت بہت دیر تک چھپی نہیں رہتی۔ حال ہی میں جو ہندی کانفرنس بنارس میں انعقاد پذیر ہوئی ہے۔ اس کی روئداد کو سرسری طور پر دیکھنے سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ "ہندی کے جنم داتا" پنڈت مدن موہن مالویہ صدر استقبالیہ کمیٹی کی تقریر کے جستہ جستہ اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :-

> بنارس کا شہر علوم متعدد ہندی ادبا و شعراء کا مسکن ہے۔ ہندی کے سہرا دب کے تابناک ستارے مثلاً تلسی، کبیر، پرشاد اور پریم چند اسی سرزمین کی خاک سے اٹھے، ساہتیہ سمیلن اپنی تمامتر ذہنی اور اخلاقی قوتیں ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کے تحفظ میں صرف کردیگی۔

ہندی زبان ہماری مذہبی وراثت ہے، جب سے ہم نے اپنی جنم بھومی کو آزاد کرانے کی جدوجہد کا آغاز کیا ہے ہمارے اکابر ایک متحدہ زبان کی تشکیل میں کوشاں ہیں انھوں نے ہندی کا انتخاب کیا ہے جو اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے ممتاز لنگوا فرینکا ہے میرے خیال میں یہ سعی قابل ستائش ہے"۔ نیشنل ہیرلڈ ۲۰)

یہ تو ہیں مدن موہن مالویہ جنکی کانگرس نوازی کا بہت شہرہ ہے!! اور پھر مسز وجیالکشمی وزیر یو۔پی کا پیغام ملاحظہ فرمایئے جو کانفرنس کو ارسال کیا گیا۔

"میں مؤتمر کی کامیابی کی متمنی ہوں، ہماری قومی ترقی کے لیئے ہماری اپنی زبان اور ادبی قانونی اور علمی مقاصد کے لیئے اپنی مصطلحات نہایت ضروری ہیں۔ آپ کی مساعی کامیاب ہوں"

ہندی کے لیئے "ہماری اپنی زبان" کے الفاظ۔ ایک کانگرسی وزیر کی زبان سے قابل غور ہیں۔

اجلاس میں راجن بابو صدر کانگرس، پرشوتم داس ٹنڈن سپیکر یو۔پی، مدن موہن مالویہ سابق صدر کانگرس نے شمولیت کی اور جنہوں نے مؤتمر کو اپنی دعایئں بھیجیں اُن میں گاندھی جی، جواہرلال، پنت وزیراعظم یو۔پی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اسی ضمن میں ایک صحافتی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حقیقی قومیت پرستی کی ترویج اور حقیقی آزادی کی بنیادوں پر ایک نئے ہندوستان کی تشکیل پر زور دیا گیا۔ اجلاس کی مفصل کارروائی انگریزی اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ چند ایک قراردادوں کا ترجمہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ تانبے اور چاندی کے سکوں پر ناگری حروف کندہ کیئے جایئں۔

۲۔ عدالتی زبان ہندی ہونی چاہیئے تاکہ لوگ عربی اور فارسی نما اردو کی تفہیم میں دقت محسوس نہ کریں۔

۳۔ نرندر دیو کمیٹی کی رپورٹ جس میں ہر ایک بچے کے لیئے اردو و ہندی دونوں رسم الخطوں میں جبری تعلیم دینے کی سفارش کی گئی ہے معرض عمل میں نہ لائی جائے۔

۴۔ ہندوستانی کی اشاعت کو روکا جائے۔

اب مولانا آزاد اور دیگر مسلم نشنلسٹ حضرات بتائیں کہ کانگریسی ارباب بست وکشاد کی ہندی زبان سے اتنی والہانہ شیفتگی کا نام ہی غیر جانبداری ہے۔

اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بُت سے خدا سمجھے

اہمسا بنوک شمشیر

جس طرح گاندھی جی نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ پورنہ سوراج کے کیا معنی ہیں۔ اسی طرح اہمسا کا نظریہ بھی ایک عقدہ لاینحل بنا ہوا ہے اور اس کی ٹھیک تعریف ابھی تک نہیں ہو سکی۔ کسی کو خبر نہیں کہ یہ کیا بلا ہے لیکن گاندھی جی کی چابک دستی اور صناعی ملاحظہ ہو کہ ہر مقام و محل پر اسکے نئے معنے وضع کر لئے جاتے ہیں۔ سرحد کے غیور پٹھان کے لئے اہمسا یہ ہے کہ چپہ آپکے چانٹا بھی پتھر سے توڑ دیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر موبخے کے لئے اہمسا کی بنیاد و اساس پونا کا ملٹری کالج ہے۔ جرمنی کے یہودی اگر اپنے دشمن کے خلاف بددعا کریں تو یہ صاف اہمسا کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے لیکن جب ایک "شریمتی جی" گاندھی جی سے دریافت کرتی ہیں کہ پولینڈ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے تو جواب ملتا ہے "پولینڈ نے جس جرأت وجسارت اور خود فراموشی سے کام لیا ہے اسکے پیش نظر تاریخ اس بات کو فراموش کر دے گی کہ اسنے اپنے دفاع میں ہمسا آشنا کا استعمال کیا یہ تشدد بھی عدم تشدد کے زمرے میں شمار ہوگا۔" (ہری جن مورخہ ۹/۹/۳۹)

شمشیر وسنان کے آزادانہ استعمال پر بھی اہمسا ہمسا نہیں ہوتا۔ کس قدر مضحکہ خیز طرز استدلال ہے کیا تشدد بھی عدم تشدد شمار کیا جا سکتا ہے ؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے !

جنگ سے پہلے بہت سی شخصیتیں نہایت حسین وجمیل پردوں میں لپٹی ہوئی تھیں لیکن محاربۂ یورپ کے آغاز پر ان نقابوں میں چھپے ہوئے چہرے ایک ایک کرکے اپنے اصلی رنگ و روپ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگئے اور دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ ان کے جلال جہانتاب کی گیرائیاں کہاں تک تھیں۔ ملک کی سب سے بڑی نقاب پوش شخصیت گاندہی جی تو اس طرح عریاں ہوئی کہ چشم انظار حیرت میں گم ہوکر رہ گئی، جہاں یورپ میں تیغ و تفنگ کا مشغلہ جاری تھا وہاں ہندوستان کی بساطِ سیاست پر شاطرانہ چالیں چلی جانے لگیں۔ والسرائے بہادر نے گاندہی جی کو شرف باریابی بخشا۔ درون خانہ ملاقات ہوئی، پردگیان رازمیں باتیں ہوئیں۔ اور دیر تک محفل ناز و نیاز گرم رہی، مہاتما نے والسرائے بہادر کو بڑی بلند آہنگی سے اپنے غیر مشروط تعاون کا یقین دلایا۔ لندن کی تباہی کا ذکر سنکر رگِ مہاتمائیت پھڑک اٹھی اور آپ پر فرطِ غم کے باعث بیہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جب "یہ دام ہمرنگ زمین" بچھاکر آپ والسرئگل لاج سے نکلے تو باہر کی دُنیا سے یہ کہا کہ بنی نوعِ انسان کی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ہم انگریز کی غیر مشروط امداد کریں کیونکہ وہ اسوقت استبداد و جبر کے خلاف برسرپیکار ہے۔ اور چونکہ ہم بھی آزادی خواہ ٹھہرے اسلیے ہم کو بھی چاہیے کہ آمریت کے مقابلے میں جمہوریت پرست محاذ کی حمایت کریں۔ ازاں بعد کانگرس کی مجلس عاملہ کی قرارداد جنگ پر اظہار رائے کرتے ہوئے اس غیر مشروط امداد کی شانِ یکتائی کو یوں قائم رکھا کہ :۔

"میں یہ دیکھ کر ازحد متاسف ہوا کہ مجلس عاملہ میں صرف میں ہی ایک ایسا شخص تھا جسکا یہ خیال تھا کہ برطانیہ کو جس نوعیت کی بھی امداد دی جائے وہ غیر مشروط ہو"۔ (ہریجن ۹ جون ۴۳)

اسکے بعد حالات نے کروٹ لی۔ جناب والسرائے کا اعلان ہوا۔ دُنیا کیا دیکھتی ہے کہ وہی مہاتما جی جنھیں والسرائے بہادر کی بارگاہِ ناز میں لندن کی تباہی کے تصور سے غش آگیا تھا طوطے کی طرح آنکھیں بدل کے بیان شائع کر رہے ہیں کہ ارے یہ کیا؟ گاندہی جی نے جو بیان سپرد قلم کیا اس میں انتہائی کرب و اضطراب کی حالت میں لکھتے ہیں کہ :۔

"والسرائے کا اعلان غیر معمولی طور پر یاس انگیز ہے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ گورنمنٹ سرے

سے کوئی بیان شائع نہیں کرتی۔ افسوس گورنمنٹ نے (Divide & Rule) پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا۔ میرے خیال میں کانگریس ہٹلر کے خلاف جنگ میں حصہ نہ لے گی۔ جمہوریت کا مستقبل ہندوستان میں امیدافزا نہیں۔" (اسٹیٹس مین ۲۹؍...)

اسقدر تبدیلی قلب" کس امر کی آئینہ دار ہے۔ ابھی ابھی غیر مشروط موالات کی پیش کش جاری تھی اور جمہوریت کے تحفظ کے بلند بانگ دعاوی پیش نظر تھے۔ لیکن یک لخت حالات پلٹے اور جمہوریت کی ناکامی کا ماتم شروع ہوگیا۔ اور صاف صاف اظہار کیا گیا کہ اگر انگریز غیر مشروط طور پر اقلیتوں کے مفاد کو ہمارے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تو اسے ہماری امداد کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ گاندھی جی کو نہ سمجھنے والے شاید حیران ہوں کہ یہ کیا اضدادِ بیان ہے لیکن رازِ درون پردہ کے محرم جانتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ گاندھی جی کی ساری زندگی پر نظر ڈالیئے قلب و زبان کی ہم آہنگی اس سچائی کے اوتار میں آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔

حُبِّ علی نہیں بُغضِ معاویہ

مسلمان تو پہلے دن سے یہ کہتے ہیں کہ ہندو کو نہ تو آزادی کامل کا حصول منظور ہے نہ ہی وہ جذباتِ حریت کا شائبہ بھی اپنے قلب کی گہرائیوں میں رکھتا ہے۔ وہ تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ انگریز کی سنگینوں کی حفاظت میں اقلیتوں پر حکومت کرے۔ چنانچہ ہم نے شروع ہی سے بھانپ لیا تھا اور طلوعِ اسلام کے پہلے پرچہ میں کانگریسیوں کی بوالعجبیوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے یہ تحریر کیا تھا کہ

"ہندی سیاست کی لغت میں عدم تشدد کی تعریف یہ لکھی ہے کہ گائے کے سینگ تو انگریز پکڑے اور اسکا دودھ ہندو دوہتے رہیں تاکہ پاپ کے ذمہ دار دوسرے لوگ ٹھہریں اور اسکا منافع یہ حضرات اٹھاتے رہیں۔ جس طرح گئو ہتیا کے مجرم تو بیچارے چھپا رہتے ہیں اور چمڑے کی تجارت کے مالک بھلے اور بالوںجے کہ جن کے آسرے گئوونکٹ بھی بن جاتیں چلتی ہیں۔" (طلوعِ اسلام مئی ۱۹۳۸ء)

حقیقت بہت دیر تک چھپی نہیں رہتی۔ آخر ایک دن یہ بات بے نقاب ہو کر رہی اور سب کچھ عریاں ہو کر سامنے آگیا۔ جنگ عمومی کے آغاز پر کانگرس نے شور مچایا کہ وہ جمہوریت کی علمبردار ہے اسلیئے وہ صرف جمہوری حکومتوں کا ساتھ دے گی لیکن بھائی پرمانند نے صاف صاف کہہ دیا کہ بھائی! انگریز کی حمایت نہ جمہوریت کے لیئے ضروری ہے نہ آزادی کی خاطر اس سے مقصد کچھ اور ہے فرماتے ہیں:۔

"صرف ایک سمت جس سے ہندوستان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ شمال مغربی سرحد ہے۔ اس طرف سے حملہ کی صورت میں ہندو خطرناک صورت حالات سے دوچار ہو جائینگے، خواہ ملک میں کتنے ہی نظریئے ہوں۔ بہر حال ہندوؤں کو ملک کے دفاع کے لیئے ہمہ تن تیار ہو جانا چاہیئے۔" (اسٹیٹس مین ۹/۱۰ ۳۰)

بھائی جی کی فطرت کی روباہی کو جانے دیجئے، مہاسبھا کا یہ ناقوس مہاتمائیت کا چولہ زیب تن کرنا پسند نہیں کرتا۔ سمجھنے والوں نے سمجھا کہ بھائی جی نے ۲۴ کروڑ ہندوؤں کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے لیکن کانگرس یہی کہتی رہی کہ نا صاحب! ہم تو جمہوریت نواز ہیں، انگریز کی مدد محض "دہرم کا کام" سمجھ کر کر رہے ہیں۔ لیکن دجل و فریب کے ملمع کے لیئے صرف ایک تاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اصلیت بہت دیر تک چھپ نہیں سکتی، وائسرائے کا بیان شائع ہوا جس میں مسلم لیگ کی طاقت کا اعتراف اور اسکے نمائندگی کے دعوے کی تائید کی گئی تھی۔ گاندہی جی نے یہ بیان پڑھ کر از حد پیچ و تاب کھایا اور انتہائی غم و غصّہ کی حالت میں اظہار فکر و بیان پر قابو نہ رہا۔ بہت سی نہ کہنے والی باتیں بھی کہہ گئے جو ان کے اندرونی جذبات و حسیات کی غمازی کر رہی ہیں اور انکے بیان میں حقیقت حال کی جھلکیاں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"تھوڑی دیر کے لیئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا۔ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لیئے کوئی بیرونی غاصب موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار مشکل ہے کہ پنجابی خواہ وہ مسلمان ہو یا سکھ ہندوستان کو اپنی جولانگاہ بنائے گا۔ یہ ایک فیشن سا

ہو گیا ہے کہ ہندوؤں کو اکثریتی قوم کہا جائے۔ لیکن ہندومت ایک غیر معین اور جامد چیز ہے۔ اور نہ ہی ہندو کسی متجانس کل سے متعلق ہیں۔ جیسے مسلمان اور عیسائی۔ ہم نے ملک میں جمہوریت کا ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی کو ضرورت ہے کہ انگریز ملک میں طاقتور عنصر کی دستبرد سے بچانے کے لیے رہیں تو وہ کانگرسی ہندو اور دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگریس کو دعویٰ ہے۔"

(اسٹیٹس مین ۱۰/۹۳ ۲۲)

لیجئے! جمہوریت اور آزادی کی خاطر انگریز کی مدد کرنے کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ وائسرائے کے حضور آنسوؤں کی جھڑی کیوں بندھی تھی اور غش کس لئے آیا تھا۔ وہی بات جو بھائی پرمانند نے شروع میں کہہ دی گاندھی جی کو اخیر میں کہنی پڑی ہے دونوں میں ذرا بھی فرق!
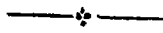
اِس بیان میں دو باتیں اور بھی قابل غور ہیں۔ کہا گیا ہے کہ انگریز کے مُلک سے چلے جانے پر ایک تو خطرہ ہندوؤں کو ہے اور دوسرے ان غیر ہندوؤں کو جن کی نمائندگی کانگرس کرتی ہے' آپ نے غور فرمایا کہ یہ دوسرے لوگ کون سے ہیں جن کی نمائندگی کانگرس کرتی ہے اور جنہیں انگریز کے بعد مُسلمانوں کی طرف سے خطرہ ہے! یہ ہیں آپ کے مُسلم نیشلسٹ حضرات!! وہ لوگ جنکے متعلق خود گاندھی جی کو بھی اعتراف ہے۔ کہ مسلمان انہیں اپنے میں سے نہیں سمجھتے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ جو جن سے دوستی رکھے گا۔ قرآن کریم کے فیصلہ کے مطابق وہ انہی میں سے ہو جائے گا۔ پوچھئے مولانا آزاد سے کہ یہ فیصلہ اُس قرآن کریم میں ہے یا نہیں جو دورِ قومیت پرستی سے پیشتر انکا خضرِ راہ ہوا کرتا تھا۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ گاندھی جی نے خود اعتراف کیا ہے: کہ ہندو کسی متجانس (Homogeneous) جماعت کا نام نہیں' اسکے برعکس مسلمان رشتۂ مذہب میں منسلک ہونے کی بناء پر ایک متجانس جماعت ہیں۔ اب اُن سے پُوچھئے کہ "قوم" کہلانے کا حق ہندوؤں کو ہے' یا مُسلمانوں کو۔ گاندھی جی نے اس حقیقت کا آج اعتراف کیا' لیکن وہ مردِ مومن جسے اللہ نے فراستِ قرآنی کے نور سے نوازا تھا۔ بہت پہلے اعلان

کر چکا تھا کہ "قوم کہلانے کا حق صرف مسلمانوں کو ہے۔ یہی ایک متجانس جماعت ہے۔ ہندو متجانس جماعت نہیں اسلئے قوم نہیں کہلا سکتی"۔ (حضرت علامہ اقبال)

ہندو کی ملی بھگت

کانگریس کو بزعم خویش یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمام ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے اسکے برعکس مسلم لیگ نے ہمیشہ اِس حقیقت کا اعلان کیا کہ مسلمان بجائے خویش ایک قوم ہیں۔ اِسلئے اُن کی نمائندگی کا حق مسلمانوں کی خالص غیر مخلوط جماعت ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر کانگریس اپنی قوت کے نشہ میں بدمست مسلم لیگ کے مطالبات کو ٹھکراتے ہوئے اپنی واحد اجارہ داری کا ڈھول پیٹتی رہی۔ چنانچہ حال ہی میں گاندھی جی نے ایک بیان پریس میں شائع کرایا جسکے دوران میں کہا کہ :-

"کانگریس ایک ہمہ گیر جماعت ہے اور اسکے متعلق بلا کسی شک و شبہ کے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بغیر کسی تمیز مذہب وملت ہندوستان کے عوام کی نمائندگی کر رہی ہے"۔ (ہری جن ۹/۳۹)

اسکے تھوڑے ہی دنوں کے بعد والسرائے صاحب نے گاندھی جی کو ہندوؤں کے کرتا دھرتا کی حیثیت سے بہر مذاکرہ طلب کیا۔ اور اسکے ساتھ ہی مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کو دعوت نامہ ارسال کیا گیا۔ نمائندہ لیگ نے مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ کو پوری جسارت اور ہوشمندی سے پیش کیا اور ہر ایک کو اعتراف کرتے ہی بنی کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، اینگلو انڈین پریس کے رویہ میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ چنانچہ اسٹیٹس مین نے ایک لیڈر سپرد قلم کیا جس میں اسنے لکھا :-

"کانگرس تو انگریزوں کی آغوش حفظ وصیانت میں طاقتور ہے۔ مسلم لیگ بجائے خود ایک مضبوط آرگنائزیشن ہے کیونکہ آج کل مؤثر جماعتیں صرف وہ ہیں جو فوجی اقوام سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ملک کی حفاظت کے لیئے سر بکف ہیں"۔ (۱/۹/۳۹ ۲۰)

والسرائے صاحب کے اِس طرز عمل اور انگریزوں کے قلوب کی ترجمانی کرنے والے اخبارات کے رجحانات سے گاندھی جی نے خود محسوس کیا کہ اب کدھر کی ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جھٹ ایک

شمع رنگ کا چولا بدلا اور نہایت ناصحانہ اور مشفقانہ انداز میں فرمانے لگے کہ بعض نا عاقبت اندیش کانگریسیوں کے رویے سے ازحد قلبی اذیت پہنچی ہے اور میرے ہردے کو بڑا رنج ہوا ہے مسٹر جناح دیش سیوک اور پوجیہ یاد ہیں جہاں وہ ملیں ان کو پرنام کرو عقل و فہم ورطۂ حیرت میں گم ہیں کہ خدایا یہ کون سی شانِ مہاتمائیت ہے کہ کل تک جو شخص غیر ذمہ دار فرقہ پرست ٹوڈی اور کاسہ لیسان ازلی میں سے تھا۔ آج رئیس الاحرار بنگیا گاندھی جی کے نہاں خانۂ دماغ کے شعلہ فکر کی تابندگی ملاحظہ فرمایئے :۔

"مسلم لیگ ایک عظیم المرتبت آرگنائزیشن ہے اسکا صدر ایک وقت میں کانگرس کا پرجوش حامی تھا۔ اور جس سے ہماری بہترین امیدیں وابستہ تھیں اس کی لارڈ ولنگڈن سے معرکہ آرائیاں کبھی نظرانداز نہیں ہوسکتیں کانگرسی افراد اور اخبارات کو مستلزم ہے کہ وہ لیگ کے خلاف ناشایستہ اور ناخوشگوار تنقید نہ کریں میری زندگی کا مطمح نظر یہ ہے کہ میں ہندو اور مسلم کو عدم تشدد سکھاؤں۔ یہاں تک کہ میں ہندوؤں و مسلمانوں کو ایام خلافت کے...... علی برادران کیطرح رشتۂ اخوت میں منسلک کردوں جنہوں نے یہ کہا تھا "ہمارے ہندو بھائی ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ ہم پھر بھی ان سے محبت کریں گے کیونکہ وہ ہمارے ہموطن ہیں"۔

(ہری جن $\frac{11}{39}$ ء)

آپ سمجھے کہ اب لیگ بہت بڑی منظم جماعت اور جناب جناح کیوں اسقدر واجب التعظیم ہیں ایں چہ بوالعجبی ست

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

الکفر ملۃ واحدۃ

گاندھی جی اور مسٹر بوس کے سیاسی مسلک میں جو بعد المشرقین ہے وہ ہمارے تبصرہ کا محتاج نہیں ہے لیکن ہم نے آغاز ہی میں اس بات پر صراحت سے روشنی ڈالی تھی کہ خواہ ہندو میں باہمی کتنے

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

اختلاف۔ سر پھٹول اور جھگڑا ہو لیکن زادۂ توحید کے مفاد و مصالح کے خلاف ایک ہی صف میں سرگرم پیکار نظر آئینگے۔ گاندھی جی نے حال ہی میں جب لارڈ لوتھین وزیر ہند کی تقریر کے جواب میں کہا کہ کانگریس ملک کی ہمہ گیر جماعت ہے۔ اور جملہ اقوام و جماعات کی صحیح نمائندگی کا دعویٰ وہی کر سکتی ہے" تو مسٹر بوس نے گاندھی جی سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود اس بیان کی تائید میں پوری ہم آہنگی کا اظہار کیا وہ اس قابل ہے کہ اسے فکر و نظر کا موضوع بنایا جائے، لکھتے ہیں :-

"ہم مسلم لیگ کے دعوے کی پرزور تائید کرتے ہیں کہ وہ تمام مسلم قوم کی واحد نمائندہ ہے ہمیں گاندھی جی سے کامل اتفاق ہے کہ کانگریس ایک ہمہ گیر جماعت ہے جو بغیر کسی تمیز مذہب و ملت ہندوستانی عوام کی نمائندگی کر رہی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ مسلم عوام قلب سلیم رکھتے ہیں وہ فرقہ پرست لیڈروں کے علیحدگی کے رجحانات سے متاثر نہیں ہونگے"

(فارورڈ بلاک ۳۰ 9/۳۹)

ایک طرف ہندوؤں کی یہ روش ملاحظہ کیجیے کہ گھر میں لاکھ اختلاف ہوں۔ مسلمانوں کی مخالفت میں سب ایک ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف مسلمان قومیت پرست حضرات کا طرز عمل دیکھیے کہ خود مسلمانوں کی مخالفت میں وہ سب سے پیش پیش ہوتے ہیں ۔

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ !
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم
طلوعِ اسلام
بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایھا الذین اٰمنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا	استجیبوا للہ و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم
اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو	بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں ایسی بات کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لئے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا	جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !
علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار	لا اسلام الا بالجماعۃ
(فرمان رسولؐ)	(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت ای کہ گوئی لا الٰہ　　با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مُرتّب

محمد ظہیرالدین صدیقی۔ بی ایس سی

بدل اشتراک

پانچ روپیہ سالانہ — فی پرچہ ۸ر

ششماہی — تین روپے

جلد ۲ — شمارہ ۸ — شوال ۱۳۵۸ھ ۔ مطابق دسمبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

وطنیت

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبالؔ

لمعات

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے مزار کی تعمیر کے سلسلہ میں تمام ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں اور مجلس انتظامیہ نے عمارت کا عملی کام ہاتھ میں لے لیا ہے۔ عمارت کے بیس پچیس ہزار روپیہ کے قریب کا تخمینہ ہے اور یہ رقم کچھ ایسی نہیں ہے جسے عام چندہ سے فراہم کر لینا مشکل ہوتا۔ لیکن ہمیں مجلس انتظامیہ کے اس فیصلہ سے بڑی مسرت ہوئی کہ انہوں نے اس پیامبرِ خودی و خودداری کے مزار کے لئے ہر کھلے دروازے پر جھولی پھیلانا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ تجویز یہ ہے کہ صرف وہی حضرات جنہیں حضرت علامہ سے قلبی عقیدت ہے اور جنہیں ایک جہت سے انکا "حلقۂ احباب" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شرکت کریں۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات کے ارادتمندانِ اقبالؔ کی توجہ انفرادی طور پر بھی منعطف کرائی گئی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حلقۂ طلوعِ اسلام اپنے آپ کو اس زمرہ میں شامل ہونے کا بجا طور پر مدعی سمجھ سکتا ہے۔ اور اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ بنا بریں ہم جملہ قارئین طلوعِ اسلام کی توجہ اسطرف مبذول کراتے ہوئے متوقع ہیں کہ اس سعادت کے حاصل کرنے والی جماعت میں یہ سب سے پیش پیش ہونگے۔ انشاء اللہ العزیز۔

ہمارے محترم جناب خواجہ عبدالرحیم صاحب آئی سی ایس۔ ۲۔ ساندہ روڈ۔ لاہور اس مجلسِ انتظامیہ کے معتمد ہیں۔ زر ترسیل زر انہی کے نام کیجائے۔

اس حقیقت کے دُہرانے کی اب زیادہ ضرورت نہیں کہ موجودہ "تحریکِ آزادی" سے ہندوؤں کا مفہوم جمہوریت کے ڈھونگ میں ہندو راج کا قیام ہے۔ ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی بھی سیاسی بصیرت عطا کی ہے وہ اس حقیقتِ نفس الامری کے لئے کسی دلیل کا طالب نہیں ہو سکتا۔ یہ اختیارات انگریز کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اور اسکی دوسری

قسط فیڈریشن کی اسکیم تھی۔ ہندو میدانِ سیاست میں تو آگیا ہے لیکن قرنہا قرن کا بنیاپن اس طرح اس کی فطرت میں سرایت کر چکا ہے کہ وہ کسی مقام پر اپنا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتا۔ فیڈریشن خالص ہندو حکومت کا نام تھا۔ لیکن اس میں چونکہ کچھ شعبہ جات انگریز کے ہاتھوں میں رہتے تھے۔ اسلئے ہندوؤں کی نقالی نے کچھ بھاؤ چڑھانا شروع کیا۔ کہ انگریز سے کچھ اور بھی وصول کیا جائے ان کی بدبختی کہ عین اسیوقت مسلمانوں نے بھی یہ خطرہ محسوس کر لیا کہ مجوزہ فیڈریشن کے نفاذ سے اُن کی ملی ہستی کس طرح تباہ ہو جائیگی۔ اسلئے انھوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اُدھر یورپ کے سیاسی مطلع پر جنگ کے بادل چھا گئے۔ ان تمام اسباب و علل کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیڈریشن ایک عرصہ کے لئے معرضِ التواء میں پڑ گئی۔ ہندوؤں کو اپنی اس غلطی کا کتنا شدید احساس ہے اسکا اندازہ ڈاکٹر مونجے کی اس تقریر سے لگائیے جس میں وہ فرماتے ہیں :۔

"کانگرس فیڈرل اسکیم (مجوزہ گورنمنٹ آف انڈیا) کے قبول نہ کرنے سے ایک شدید غلطی کی مرتکب ہوئی ہے اسلئے کہ اس سے ہندوؤں کے ہاتھ سے یہ موقع نکل گیا کہ وہ اپنی زبردست اکثریت کی بنا پر مرکزی اسمبلی کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لے آتے۔" ہندوستان ٹائمز $\frac{11}{3}$ ۲۳

یہ احساس کچھ ڈاکٹر مونجے ہی کو نعل در آتش نہیں کر رہا بلکہ کانگرس کے ارباب حل و عقد کو بھی جلے پاؤں کی بلی بنا رہا ہے۔ چنانچہ جن حضرات کی نگاہیں رفتار زمانہ اور اُنگلیاں نبضِ کانگرس پر ہیں ہونے محسوس کیا ہوگا کہ پچھلے دنوں سے کانگرسی حلقوں میں جو خلجان و انتشار پیدا ہو رہا ہے وہ اُن کی قلبی تشویش اور ذہنی کاوش کا آئینہ دار ہے۔ غلطی پر غلطی یہ کہ کانگرسی وزراء سے استعفے بھی دلوا دیئے گئے۔ اب حالت یہ ہے کہ :۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

آئے دن ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے ہیں، بیانات شائع کیے جاتے ہیں۔ گھنٹوں نہیں دنوں ارباب بست و کشاد بیٹھ کر سر جوڑتے ہیں۔ ہر ایک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے کہ کہیں سے گاندھی جی کی "اندرونی روشنی" کی کوئی کرن نظر آجائے۔ لیکن اس دیئے میں تیل چھوڑ شاید بتی بھی باقی نہیں رہی

انھیں اب سوجھی ہے تو یہ رٹ لگی ہے کہ بھیا چرخہ کاتو اور کھدر پہنو۔ رام بھلی کریگا۔ کبھی کھسیانے ہوکر اس ساری ناکامی کا الزام مسلمانوں کے سر دھرا جاتا ہے۔ وہی مسلمان جنکے متعلق بار بار کہا گیا ہے کہ یہ تو شخص مالِ غنیمت میں حصہ بٹانے والے ہیں میدانِ جنگ میں آنیوالے نہیں۔ انہی کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جب تک ان کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ سول نافرمانی نہیں کی جاسکتی۔ اسلئے کہ گاندھی جی خوب جانتے ہیں کہ جنگ کے زمانے کی سول نافرمانی۔ نمک سازی کی سول نافرمانی نہ ہوگی۔ یہاں تو سر سے کفن باندھ کر میدان میں آنا ہوگا۔ اور کفن بدوش صرف مسلمان رضا کار ہی ہوسکتا ہے۔ ہندوؤں کو کیا معلوم کہ جان دینا کسے کہتے ہیں۔ اُنکے تو لغت میں "شہید" کے لیے کوئی لفظ ہی نہیں۔ باور نہ ہو تو دہلی سے شائع ہونے والے اخبار "تیج" کی پیشانی دیکھیے۔ ہاں تو ہندوؤں کو معلوم ہے کہ مسلمان اب ان کے بھرتے میں نہیں آسکتا۔ اسلیئے شرط یہ لگائی گئی ہے کہ جب تک مسلمان کی حمایت حاصل نہ ہوگی کوئی قدم آگے نہیں بڑھایا جائے گا کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خطرہ ہے کہ اگر ہم نے سول نافرمانی کی تو مسلمان فساد کرینگے۔ ان سے پوچھیے کہ نافرمانی تو آپ کرینگے حکومت کے قوانین کی مسلمانوں کا کیا بگڑے گا جو وہ آپ سے فساد کرینگے۔ سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ کچھ ایسے جال سے اکھڑے ہیں کہ اب پاؤں کہیں ٹکتا ہی نہیں۔

یہ حشر ہوتا ہے اس قوم کا جس کی سیاست کی اساس حقائق ابدی پر نہ ہو اور جو انسانوں کو معصوم عن الخطا، بونا بناکر ان کی پرستش شروع کردے۔

فیڈریشن تو گاؤ خورد ہوگئی۔ لیکن اب ہندوؤں کی طرف سے اسی چیز کو ایک اور اسکیم کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اور اسکا نام ہے (Constituent Assembly) اس کی تفسیر آپ کو اس ریزولیوشن میں ملے گی جو اواخر نومبر میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں پاس کیا ہے۔ انگریز سے مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے تناسب سے ایک **مجلس** مرتب کی جائے۔ اور جس قسم کا آئین یہ مجلس وضع کرے وہی ملک میں نافذ

کردیا جائے۔ کیسی صاف اور سیدھی بات کہی ہے! اب اس پر بھی مسلمان رضامند نہ ہوں تو اس کی "ضد" کا کیا علاج! مجوزہ اسمبلی میں تناسب بلحاظ آبادی ہوگا۔ بیس کروڑ میں سے پچیس کروڑ ہندو اور نو کروڑ مسلمان اور بقایا دیگر جماعتیں۔ فیصلہ آئین جمہوریت یعنی اکثریت کی رُو سے ہوگا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ریزولیوشن میں یہ بھی موجود ہے کہ فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق فیصلے اقلیتوں کی رضامندی سے ہوں گے۔ یہ حصّہ واقعی بظاہر اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ کون سے معاملات فرقہ وارانہ مسائل کی حدود میں آئیں گے۔ یہ تو وہی بات ہے جو اس سے قبل ہزار مرتبہ دُہرائی جا چکی ہے۔ یعنی ہندوؤں کی طرف سے ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ "مذہبی معاملات" میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو جائے گا۔ اور مذہبی معاملات کی تفصیل پوچھی جاتی ہے تو وہ نماز اور روزہ بتا جاتا اور گائے سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایسی ہی تشریح "فرقہ وارانہ معاملات" کی ہو سکتی ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ اس ریزولیوشن سے دو ہی روز پہلے اخبارات میں مولانا آزاد کے اس فارمولا کا ذکر آ چکا ہے جو اُن پر فرقہ وارانہ قضیہ کے حل کے لیے سماروار دھا سے نازل ہوا ہے۔ اس فارمولا کی رُو سے کانگریسی ارکان کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کو سمجھائیں کہ وہ ذبیحہ گاؤ کے معاملہ میں ہندوؤں کے جذبات کا احترام کریں۔ اور ہندوؤں سے کہا جائے گا کہ وہ مساجد کے سامنے باجہ بجانے میں رواداری سے کام لیں۔ یعنی مولانا آزاد کے نزدیک جنکے متعلق گاندھی جی نے حال ہی میں کہا ہے کہ مسلمانوں سے متعلقہ مسائل کے بارے میں کانگریسی حلقوں میں اُن کی رائے قول فیصل سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے تمام مذہبی حقوق کا تحفظ ہو جائیگا اگر ہندو مساجد کے سامنے باجا بجانے سے احتراز کریں۔ اللہ اکبر! یہ ہیں وہ مولانا آزاد جو کبھی حکومتِ خداوندی کے قیام کا وعظ فرمایا کرتے تھے ہندو تو اس بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کے کیا حدود ہیں۔ ان میں کا سب سے بڑا دماغ ہے جسے انہوں نے دیوتا کا رتبہ دے رکھا ہے۔

گاندھی جی ہیں۔ اسلام کے متعلق ان کی معلومات جس جہالت کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ ان کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہوتی ہے جو وہ پچھلے دنوں سے قرآن وسنت سے متعلق شائع کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو ان کے گرد و پیش رہتے ہیں اور انہیں نہیں بتاتے کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا دائرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر مسئلہ سود کو لیجئے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ ایک خالص معاشی مسئلہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک عین مذہبی۔ سو جب تک ہندو ارباب سیاست مسلمانوں کے اس نکتۂ نظر کو سمجھ نہیں لیتے مسئلہ ہند کی گتھی سلجھ نہیں سکتی۔ گاندھی جی اور ان کی کانگریس نے بڑا تیر مارا کہ کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی کی تشکیل کے لئے "بعد از خرابیٔ بسیار" مسلمانوں کے مطالبۂ جداگانہ انتخابات کو تسلیم کر لیا۔ لیکن ہندو مسلم سوال کا حل صرف طریقہ انتخاب میں ہی نہیں۔ یہ تو ایک فرعی چیز ہے۔ اصل چیز تو مسلمانوں کے صحیح نقطۂ نظر کا سمجھنا ہے۔

پھر آپ نے دیکھا کہ کانگریس کے مذکورہ صدر ریزولیوشن کی رو سے اقلیتیں کون کونسی ہیں مسلمان اور سکھ۔ بیچارے اچھوت چلا رہے ہیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں ہماری نیابت الگ ہو ہمارے انتخابات جداگانہ ہوں۔ لیکن چونکہ ان کی آواز میں کوئی زور نہیں اس لئے ان کی کوئی نہیں سنتا۔ اور ہندو سنیں بھی کیوں۔ سن لیں تو پھر ان کی اکثریت کہاں رہے! ان کی اکثریت کا تو راز ہی ایسی مختلف اقوام کو خواہ مخواہ ہندوؤں کی صف میں گھسیٹنے میں ہے۔ کتنے ایسے فرقے ہیں جنہیں ہندویت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ ویدوں کو نہیں مانتے۔ حتیٰ کہ خدا کو بھی نہیں مانتے با ایں ہمہ انہیں زبردستی ہندوؤں کے کل کا جز قرار دیا جا رہا ہے ہندوؤں کی تو حالت یہ ہے کہ۔

آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو سوامی دیانند کی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش کا گیارہواں

سمولاس دیکھئے۔ ہاں یہ سب فرقے ہندو ہیں۔ لیکن اس ریزولیوشن کی رو سے سکھ اقلیتوں میں شامل ہیں۔ اس لئے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کمزور ہی اس شکل میں ہوسکتی ہے کہ سکھوں کو جداگانہ اقلیت قرار دے کر مخصوص مراعات دیجائیں۔ حالانکہ اچھوتوں اور ہندؤں کی باہم شادیاں ہوتی ہیں نہ خورونوش اکٹھا ہے۔ اور سکھوں اور ہندؤں کی باہم شادیاں بھی ہوتی ہیں اور خورونوش میں بھی کوئی تمیز نہیں بایں ہمہ سکھ ہندؤوں میں شامل نہیں یہ ہے مختصراً کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی کی تفصیل جس کی تشکیل کے لئے کانگریس کے ارباب حل وعقد کوشاں ہیں اور جو گاندھی جی کے تازہ ارشادات کے مطابق ہندوستان کی مصیبتوں کا واحد حل ہے یہ اسکیم ہندؤں کے حق میں کیسی ہے۔ یہ بھی انہی ڈاکٹر مونجے صاحب کے الفاظ میں سنئے جو اس وقت تک کفِ افسوس مل رہے ہیں کہ کانگریس نے فیڈریشن کو کیوں قبول نہ کرلیا وہ فرماتے ہیں۔

> "حکومت برطانیہ کانگریس کی طرف سے کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی کا مطالبہ کبھی تسلیم نہ کریگی۔ اس لئے کہ حکومتِ برطانیہ کو تولنا ہوگا کہ پنجاب کی طرف سے سپاہی اور گاندھی جی کی طرف سے صرف اخلاقی ہمدردی میں سے کونسی پیش کش زیادہ وزنی ہے۔" (ہندوستان ٹائمز) $\frac{11}{39}$ ۲۲

اس کے بعد مسلمان نیشنلسٹ حضرات سے پوچھئے کہ کیا یہی ہے وہ اسکیم جس کے متعلق آپ قرآن اٹھا اٹھا کر مسلمانوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ بالکل آبِ حیات ہے آنکھیں بند کرکے پی جاؤ۔
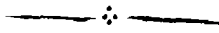
مسلمانوں کا اپنا پریس نہ ہونے کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے اس کے متعلق لمبے چوڑے مضامین لکھنے اور دھواں دھار تقاریر کرنے کی ضرورت نہیں یہ وہ کمی ہے جسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ اور جوں جوں زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا جارہا ہے اس احساس کی شدت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ کہا جاتا ہے اور اس میں کسے کلام

ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے عملی اقدام کی ابتدا احساس سے ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے طرزِ عمل سے جہاں اور بیسیوں
مسلّمات کی تغلیط کر رکھی ہے۔ ان میں یہ مسئلہ بھی شامل ہے ایک مدت دراز سے مسلمانوں
کے در و دیوار سے اس احساس کی آواز آ رہی ہے۔ لیکن اس کے لئے عملی قدم آج تک کوئی
نہیں اٹھا۔ ان کا احساس ایک مفلوج کا احساس معلوم ہوتا ہے۔ کہ

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

اسی صحیح شدت احساس کا مظاہرہ ہے وہ اپیل جو پچھلوں دنوں آنریبل سر فضل الحق صاحب
وزیر اعظم بنگال کی طرف سے اخبارات میں شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ
وہ اپنی تمام توجہات و مساعی ہندوستان میں اسلامی پریس کی تشکیل و ترتیب میں صرف
فرمائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان امرا کی کمی نہیں۔ ہماری نظر میں تو ایک پنجاب میں
ایسے ایسے مسلمان رؤسا موجود ہیں جن میں سے ایک ایک اگر چاہے تو نہایت شاندار روزانہ
اخبارات اپنے صرف سے جاری کر سکتا ہے لیکن مصیبتیں دو قسم کی ہیں بعض تو ایسے ہیں کہ جنہیں
اس امر کا احساس ہی نہیں۔ وہ صرف بارِ دولت کے حمّال ہیں۔ اور جنہیں کچھ احساس ہے وہ
پریس کو اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اس لئے وہ اس شرط
پر روپیہ دینے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں کہ پالیسی ان کے اپنے ہاتھ میں رہے اور نہیں سمجھتے کہ
بہت کم ایسے مقامات ہیں جہاں فطرت ایسی فیاض ہو کہ دولت کے ساتھ دماغ کی متاع
گراں بہا بھی ایک ہی جگہ جمع کر دے۔ صحیح طریق کار یہ ہے کہ روپے والے اپنا روپیہ دیں دماغ
والے اپنا دماغ اور صاحبِ قلم اپنی خدمات ان پرزوں کی ہم آہنگی سے مشین چل سکیگی۔ ورنہ
تمام کوششیں عبث اور تمام اپیلیں بیکار ہیں۔ مسلمانوں کو جناب فضل الحق صاحب کی ذاتِ
گرامی پر پورا اعتماد ہے۔ ان کے پاس جس قدر سرمایہ جمع ہوگا یقیناً محفوظ رہیگا۔ ہم جناب

فضل الحق صاحب کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ اپنی اپیل کو صدا الصحرا نہ بننے دیں بلکہ پوری سرگرمی سے اس کام کے پیچھے لگ جائیں۔ اگر وہ اس باب میں کامیاب ہوگئے تو یہ ملتِ اسلامیہ کی اتنی گرانبہا خدمت ہوگی جس کی نظیر مشکل سے ملیگی۔ واللہ المستعان

اشاعت زیر نظر کے "حقائق وعبر" کے عنوان کے ماتحت یہ واضح کیا گیا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ برہمو سماجی تفسیر کہ تمام مذاہب عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے بالکل یکساں ہیں۔ کتنی بڑی سیاسی "سازش" کی تمہید تھی حقائق وعبر کا حصہ پریس میں چلا گیا تو ۲۰ رنومبر کا ہریجن موصول ہوا اس میں گاندھی جی کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی مسٹر جناح کے عید کے براڈ کاسٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ مسٹر جناح نے باہمی محبت اور رواداری کا جو سبق دیا ہے

"اسے اگر ایک قدم اور آگے لیجایا جائے تو تمام مذاہب کے لئے یکساں عزت کی ضرورت بھی بطور بنیادی اصول کے ماننی ضروری ہے"

بالکل بجا اور درست۔ لیکن اگلا فقرہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک جداگانہ قوم ہونے کا تخیل پیدا ہی اس خیال سے ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے جونہی ہم تمام مذاہب کی یکساں عزت کی عادت پیدا کریں ہم محسوس کرنے لگجاتے ہیں کہ ہم ایک ہی نسل اور ایک ہی انسانی برادری ہیں"

آپنے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہن سے یہ چیز محو کرانے کے لئے کہ وہ ایک الگ قوم ہیں۔ کونسا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے؟ یہ کہ تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں اسلام کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں! خیال فرمایئے کہ مسلمانوں کے خلاف کن کن راستوں سے حملے کئے جارہے ہیں اور یہ تیر کیسی کیسی مقدس ہستیوں کی کمانوں پر چڑھ کر چلائے جاتے ہیں

جریدۂ اسٹیٹسمین نے اپنی ۲۶ رنومبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں یہ تجویز پیش کی ہے

کہ ہندوستان میں رسم الخط کا جھگڑا مٹانے کے لئے "رومن رسم الخط" اختیار کر لینا چاہیئے۔ ہم جریدۂ مذکور کو بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان اگر دیوناگری رسم الخط کی مخالفت کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں اس رسم الخط سے کوئی خاص بیر ہے یا جس طرح گاندھی جی کو اردو زبان سے اس لئے نفرت ہے کہ وہ قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو دیوناگری سے اس کے ویدوں کے رسم الخط ہونے کی وجہ سے مخاصمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا رسم الخط وہی ہے جس میں عربی لکھی جاتی ہے اور مسلمان کبھی اس رسم الخط کو اختیار نہیں کر سکتے جو انہیں عربی رسم الخط سے دور لیجائے۔ ہندوؤں کو اگر اس رسم الخط سے نفرت ہے تو وہ اپنے لئے جو نسا رسم الخط چاہیں تجویز کرلیں ان پر کسی کا جبر تھوڑا ہی ہے لیکن مسلمان کو کیوں مجبور کیا جائے کہ وہ کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کرے۔ ایک قوم کی زندگی کے لئے رسم الخط کا مسئلہ کس قدر اہم ہے یہ ہم سے نہیں بلکہ پنڈت جواہرلال نہرو کی زبان سے سنئے وہ اپنی مشہور سوانح عمری کی جلد اول ص ۲۹۵ پر رقمطراز ہیں۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدلجاتی ہیں آوازیں بدلجاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بنکر رہجاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو"

باقی رہا یہ کہ ترکوں نے لاطینی رسم الخط اختیار کر رکھا ہے۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی رومن (یا دیوناگری) رسم الخط اختیار کر لینا چاہئے سو واضح رہے کہ ترکوں کا کوئی فیصلہ مسلمانانِ عالم کے لئے واجب الاتباع نہیں۔ ہم اپنے احوال و ظروف اور امیال و عواطف سے خود واقف ہیں اور ملت اسلامیہ کے مصالح و منافع سے آشنا۔ اس لئے ہم پر کسی کے فیصلے کی پابندی لازم نہیں۔

ہمارا جبادلہ در دکار مساکر وہ ہے

دو تین ماہ سے کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ ادارہ کی طرف سے کوئی نیا پمفلٹ شائع نہیں

ہو سکا۔ بارے اس ماہ "اشتراکیت اور اسلام"، "کانگریس بے نقاب" اور "مسلمان کی زندگی" کے تین جدید پمفلٹ شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان پمفلٹوں کے لئے فرمائشیں پہلے ہی سے جمع ہو چکی ہیں، اس لئے ان کی تعمیل کے بعد بہت تھوڑے پرچے سٹاک میں رہ جائیں گے لہٰذا جو حضرات یہ پمفلٹ اپنے لئے خریدنا چاہیں یا تقسیم کرنا چاہیں بہت جلد اطلاع فرمائیں۔ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ اب اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ ان میں حالات حاضرہ سے متعلق موضوعات پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے سیر حاصل بحث ہو گئی ہے اس لئے جو لوگ ان موضوعات سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے مکمل سٹ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے جو مسائل اس کے بعد پیدا ہوں گے ان سے متعلق ساتھ کے ساتھ اور پمفلٹ شائع ہوتے رہیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

ہم نے نومبر کی اشاعت کے لمعات میں لکھا تھا کہ لکھنو کے تصفیہ حزبیہ کے سلسلہ میں تمام ملت اسلامیہ نے شیعہ حضرات اور احرار کی منتیں کیں کہ وہ باہمی سرپھٹول کو چھوڑ کر کسی ایک اسلامی نقطہ پر جمع ہو جائیں۔ لیکن وہ نہ مانے اور اب جمع ہوئے تو اس بات پر کہ دونوں کانگریس کے جھنڈے تلے لڑینگے۔ اس باب میں ہمنے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے فیصلہ کا حوالہ دیا تھا۔ ہمیں اس کانفرنس کے معتمد اعزازی جناب سید کلب عباس صاحب کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ فیصلہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا نہیں تھا۔ غالباً آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کا ہوگا۔ واقعہ یہی ہے جیسا کہ سید صاحب نے لکھا ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ "پولٹیکل" کا لفظ سہواً رہجانے سے آل انڈیا شیعہ کانفرنس سے متعلقہ حضرات کو روحانی کاوش ہوئی۔ اس فروگذاشت کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

بایں ہمہ جس انداز سے یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی اس سے مترشح تھا کہ یہ فیصلہ تمام شیعہ حضرات کا ہے۔

ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۶ ۱۰/۴۹ میں لکھا تھا۔

"آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے آرگنائزنگ سکریٹری صاحب ایک بیان کے ضمن میں انڈین نیشنل کانگریس کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلم لیگ ہندوستان کی شیعہ جماعت کی نمائندہ نہیں اور شیعہ حضرات یوپی میں کانگریسی حکومت کے رویہّ کے باوجود ہمیشہ کانگرس کے وفادار رہی ہیں انہوں نے پھر یقین دلایا کہ شیعہ قومی جنگ میں ضرور شریک ہونگے" اِس سے ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ شیعہ حضرات کا من حیث الجماعت بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو جو اس نازک دَور میں ملتِ اسلامیہ سے کٹ کر دوسروں کے ساتھ اپنا پیوند لگا رہے ہیں "کج نہاد" کہا تھا۔ اسپر سید صاحب بہت برافروختہ ہوئے ہیں۔ ہم اُن کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ میں تشتت و افتراق از روئے قرآن کریم اتنا بڑا جرم ہے کہ اسکے لیے کج نہاد کچھ ایسا سنگین خطاب نہیں ہے۔ بایں ہمہ سید صاحب ذرا اتنا سوچیں کہ انھیں اتنی سی بات پر جب اسقدر غصہّ آیا ہے تو جب شیعہ حضرات اہلِ تسنن کے واجب الاحترام بزرگوں کی شان میں درشت اور نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں تو انھیں کس قدر رنج ہوتا ہوگا۔

سید صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ کیا طلوع اسلام کی یہ روش "اجتماعِ ملّی اور ائتلافِ قلبی" کی داعی کہی جاسکتی ہے؟ قارئینِ طلوعِ اسلام خوب جانتے ہیں کہ شیعہ سُنی تنازع کے متعلق ہماری روش کس قسم کی رہی ہے لیکن ہم سید صاحب سے با دب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا انھوں نے کبھی اسپر غور فرمانے کی بھی تکلیف گوارا فرمائی ہے کہ شیعہ حضرات کا طرزِ عمل کس درجہ "ائتلافِ قلبی اور اجتماعِ ملّی" پیدا کرنے والا ہے؟ لکھنؤ کی کش مکش کے دوران میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ہندو اگر شیعہ حضرات کے مطالبات مان لیں تو انھیں اجازت ہوگی کہ مساجد کے سامنے باجہ بجائیں۔ اور ذبیحہ گاؤ کو قانوناً روک دیں۔ شیعہ حضرات کو ہدایت کی گئی کہ "ہندوؤں سے خرید و فروخت کریں اور مسلمانوں کا بائیکاٹ کر دیں۔ کئی بار شیعوں کے لیے مسلمانوں سے الگ جُداگانہ انتخاب اور مخصوص نشستوں کی آوازیں اٹھیں۔ ابھی حال میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ شیعہ ایک جُداگانہ اقلیت ہیں! کیا سید صاحب یا اُن کی "آل انڈیا شیعہ کانفرنس" نے کبھی ان افتراق انگیز داعیات کے خلاف بھی

لب کشائی فرمائی ہے! دوسروں کو ائتلاف واتحاد کی نصیحت کرنے سے پہلے خود اپنوں کی حالت پر نگاہ ڈالنی ضروری ہوتی ہے۔ طلوعِ اسلام تو از روئے قرآن کریم افتراق فی الدین کو شرک سمجھتا ہے لیئے اسے اجتماع وائتلاف کی نصیحت تحصیل حاصل ہے۔

آخر میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اسکے ساتھ یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہو کہ اگر طلوعِ اسلام کو شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے سیاسی رویہ سے اس قسم کا مغالطہ ہوا ہے تو وہ بھی باقی نہ رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۹ء کے جلسہ میں شیعہ پولیٹیکل کانفرنس نے بھی ۱۹۳۷ء والی تعاون بہ کانگرس کی تجویز پر عملدرآمد کرنے کو فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔"

ہم حیران ہیں کہ اس دعوے کے ساتھ جب ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۶ کی یہ خبر پڑھیں تو کس نتیجہ پر پہنچیں۔

"شیعہ پولیٹیکل کانفرنس (ضلع لکھنو) کی سنٹرل سٹینڈنگ کمیٹی نے اس امر کا ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے کہ کانفرنس اس مکمل آزادی کی حامی ہے جس میں تمام اقلیتوں۔ بالخصوص شیعہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ ہو۔ اس اجلاس کے خیال میں یہ ضروری ہے کہ تمام ایسی تحریکوں کے ساتھ عملی تعاون کیا جائے جو تو بت پرستی پر مبنی ہوں۔ خواہ وہ کسی پارٹی کی طرف سے وجود میں آئیں۔" اسکے بعد مسلم لیگ سے بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے۔

کانگریس سے تعاون والی تجویز پر عملدرآمد کرنے کا التوا ایک طرف اور کانگریس کے ساتھ عملی تعاون (Active Support) کا ریزولیوشن دوسری طرف۔ شاید سید صاحب ان دونوں میں تطابق پیدا کر سکیں۔ یہ چیز ہماری سمجھ سے تو بالا ہے۔

طلوعِ اسلام

(اسد ملتانی)

شبِ تمدّنِ مغرب قریبِ انجام است
کشائے چشم کہ وقتِ طلوعِ اسلام است

اساسِ بامِ فلک بوس اینقدر خام است
کہ ضعفِ بام بقدرِ بلندیٔ بام است

"ہر آنکہ محرمِ بادِ صباست می داند"
کدام سمت روانیٔ دورِ ایّام است

مباش منتظرِ عشوہ و کرشمۂ خاص
نگاہ کن بہ جمالے کہ جلوہ اش عام است

دلِ زبونِ تو گر درخورِ نگاہش نیست
مگو کہ عشق بہ مقصودِ خویش ناکام است

کجا بود دگراں را امیدِ آزادی
اگر کبوترِ بامِ حرم تہِ دام است

شرابِ ناب بخواہی؟ زِ شاخِ تاک بگیر
مخور فریبِ مئے لالہ گوں کہ در جام است

سلیم کے نام..... دوسرا خط

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی اے)

سلیم! تم درست کہتے ہو کہ جمعۃ الوداع کے دن جامع مسجد میں قریب پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور تم نے یہ بھی ٹھیک کہا کہ اس عظیم الشان گروہ کے ایک آواز پر جھکنے اور اٹھنے کی ہم آہنگی کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ اس کی دلکشی تو اس سے بھی ظاہر ہے۔ کہ بڑے بڑے سیاح آپکے اس "تماشے" کی تصویریں لینے دور دور سے آتے ہیں اور انکے لیے مسجد کے سب سے بلند مقام پر ان حضرات کی طرف سے سہولتوں کے سامان بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ جنسے اگر تصویر کشی کے متعلق فتوے طلب کیا جائے تو کبھی تکفیر سے ورے بات نہ کریں۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ لیکن سلیم! میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اسقدر ہجوم میں کتنے انسان تھے کہ جسمانی حرکات کی ہم آہنگی کے ساتھ انکے قلوب بھی ہم آہنگ ہوں۔ اسلام وحدتِ خیالی کے بعد۔ کہ جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ وحدت فی العمل کا سبق سکھانے آیا تھا۔ اور اس اتحادِ عمل بلکہ ائتلافِ خیال و عمل کے بہترین مظاہرے اسی قسم کے اجتماعات تھے لیکن ذرا غور کرکے بتاؤ تو سہی کہ اس ظاہری اتحادِ عمل میں حقیقی اتحاد خیال و اعمال کا جذبہ کس حد تک کارفرما تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مولوی صاحبان صف بہ صف۔ اِدھر اُدھر لوگوں کو نماز باجماعت کے مسئلے بتاتے پھرتے تھے۔ وہ سمجھاتے تھے کہ صفیں کس طرح سیدھی رکھنی چاہئیں۔ دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کسقدر رہنا چاہیئے۔ کندھے کے ساتھ کندھا نہ ملنے سے کتنا عذاب ہوگا۔ پہلی صف میں بیٹھنے سے کسقدر ثواب ہوگا۔ لیکن سلیم! ان میں سے کسی ایک نے یہ بھی بتایا کہ مسلمانو! تم یہاں جمع کس غرض کے لیے ہوئے ہو؟ تمہیں نماز کیا پیغام دیتی ہے؟ جماعت کے ساتھ ملنا کیوں ضروری ہے؟ یہ اٹھنا۔ بیٹھنا کیسا ہے! صفیں کیوں سیدھی ہونی چاہئیں! امام صرف ایک ہی کیوں ہوتا ہے! اور اسکی ایک آواز پر بلا چون و چرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں کرنی

پڑتی ہے ! وہ غلطی کرتا ہے تو اس کی غلط متابعت اسوقت کیوں ضروری ہوتی ہے ! ایک وقت میں ایک ہی جماعت کیوں ہوتی ہے۔ متعدد جماعتیں کیوں نہیں ہوسکتیں ؟ تماشا دیکھنے والے سیاح جب اس نظارہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو مسلمانوں کے ضبط وانضباط۔ اس وحدتِ فی الخیال والعمل۔ اس یک جہتی اور ہم آہنگی۔ اِس اطاعت۔ وتمسک بالجماعت کی بے حد تعریف کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اِس حقیقت سے وہ بھی آشنا ہوچکے ہیں کہ یہ سب مظاہرہ اب صرف جسموں تک ہی محدود ہوچکا ہے قلوب پر اسکا کچھ اثر نہیں۔ یہ ایک رسم بنکے رہ گیا ہے۔ اس کی روح بالکل بھلائی جاچکی ہے۔ آج دُنیا کی ہر قوم اپنی تمام قوت اس بات کے لیے صرف کر رہی ہے کہ انکے افراد میں اتحاد خیال و وحدتِ عمل پیدا ہو۔ اُنکے قلب ونگاہ میں یک جہتی اور ان کی حرکات وسکنات میں یگانگت پیدا ہو جائے۔ وہ ایک "امام متفق علیہ" کی آواز پر سب کے سب جُھک جائیں۔ اور سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوں اب اندازہ لگاؤ کہ جس قوم میں یہ سب چیزیں بلا محنت وکاوش خود بخود موجود ہوں۔ اور اس سے نتیجہ کچھ برآمد نہ ہو۔ تو اُسے تم بے روح مظاہرہ نہ کہو گے تو اور کیا کہو گے۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ یہ دُنیا ضبط و انضباط تلاش کر رہی ہے محض اسلیئے کہ اِس انداز سے اپنے اندر قوت پیدا کرکے اپنی ستم کوشیوں کی تشنگی کمزوروں کے خونِ ناحق سے بجھائے۔ لیکن ملّتِ اسلامیہ میں یہ سب کچھ اسلیئے پیدا کیا جاتا ہے کہ انکے قلوب مزکّی ہوں۔ اُن کی رُوح میں بالیدگی آئے وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو سامنے رکھیں۔ انکا جھکنا ہو تو اُسکے لیئے، اٹھنا ہو تو اسکے لیئے۔ اُن کی قوت ناتوانوں کی حفاظت کے لیئے ہو۔ انکی طاقت ضعیفوں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ وہ اپنے ایمان واعمال صالح سے ایسی قوت پیدا کریں کہ استخلاف فی الارض کی نعمتِ کبریٰ سے نوازے جائیں۔ اور اس استخلاف سے مقصود ملوکیت نہ ہو۔ بلکہ اِس دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام ہو۔ ضابطۂ خداوندی کی تنفیذ وترویج ہو۔ سلیم! اندازہ لگاؤ کہ رمضان کا آخری جمعہ۔ اِن مقاصدِ عالیہ کے حصول کے لیئے کس قدر عظیم المرتبت نفسیاتی کیفیتیں اپنے اندر رکھتا ہے مہینہ بھر سے خدا کے بندوں میں جسمانی اور روحانی انقلاب پیدا کیا جارہا تھا۔ انہیں ٹھیٹھ سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا جارہا تھا۔ انکے دلوں کو تمام خباثتوں سے پاک اور انکی

نگاہوں کو تمام خباثتوں سے مزکی بنایا جا رہا تھا۔ ان سے حلال وطیب چیزیں بھی چھڑائی گئی تھیں کہ انکا ذہن کبھی حرام و خبیث چیزوں کی طرف توجہ بھی نہ کرے۔ اِسکے بعد انھیں ایک جگہ جمع کیا گیا کہ وہ جائزہ لیں اپنے تمام اعمال کا۔ اور محاسبہ کریں اس انقلاب کا جو اُنکے اندر پیدا ہوا ہے۔ اپنی انفرادی خودی جبکا یوں استحکام کرایا گیا ہے، اسے آگر ایک اجتماعی کُل میں جذب کردیں۔ اور یوں اطاعتِ امیر۔ مرکزیت۔ ایثار۔ تمسک بالجماعت۔ اتحادِ عمل۔ ائتلاف خیالات کے جیتے جاگتے مظاہرے سے تجدیدِ عہدِ وفا کریں۔ اور اُٹھتے اور جھکتے بار بار اس آقائے حقیقی کے سامنے اِس بات کی عملی شہادت پیش کریں کہ :۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ۔ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ۔ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝

میری نماز اور میری قربانیاں۔ میرا جینا میرا مرنا۔ سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے

سلیم اِتم سمجھتے ہو کہ مزکّی و مقدس نفوس کی یہ جماعت دُنیا میں کیا کچھ نہ کرسکتی ہوگی۔ لیکن ذرا ایکمرتبہ اِس ہجوم مومنین کی نماز پر پھر ایک نگاہ ڈالو۔ ساری نماز پر نہیں۔ نماز کے صرف ایک ٹکڑے پر۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ پچاس ساٹھ ہزار انسانوں کا گروہ۔ اپنے اللہ کے سامنے رُو بہ قبلہ مسجد میں کھڑے۔ یہ اقرار کر رہا ہو کہ :۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

اے اللہ! ہم صرف تیری محکومیت کو جائز سمجھتے ہیں۔ اِسکے علاوہ ہر قسم کی غلامی کا طوق ہم پر حرام ہے لیکن زبان سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہو اور دماغ سینکڑوں خداؤں کا بتکدہ بن رہا ہو۔ تو اِس دعوے کو تم خدا فریبی۔ اور خود فریبی نہ کہوگے تو اور کیا سمجھوگے ؟ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ان لوگوں نے نماز نہیں پڑھی اپنے آپ سے غدّاری اور خدا سے دہوکہ کیا ہے تو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کے "حاملانِ دینِ متین" لٹھ لیکر اسکے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور اسمیں یہ بیچارے بھی معذور ہیں۔ اسلیئے کہ انہیں بتایا ہی یہ گیا ہے کہ اگر ہاتھ فلاں مقام پر باندھ لیئے جائیں۔ پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا جائے۔ انگلیوں کا رُخ فلاں سمت کو ہو۔ سجدے میں فلاں فلاں حصّے پہلے زمیں بوس ہوں۔

الفاظ اپنے صحیح مخرج سے نکلیں، تو نماز ہو جاتی ہے۔ اور جب پوچھو کہ اس بات کی کیا سند کہ اس سے نماز واقعی ہو جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ اِسکا علم تو قیامت ہی کو ہوگا کہ دُنیا دار العمل ہے۔ جزا یہاں نہیں مل سکتی۔ اِسلیئے پتہ بھی یہاں نہیں لگ سکتا۔ اور جب اُن سے کہو کہ بھائی اللہ تعالیٰ تو ایمان و عمل کی جزا استخلاف فی الارض اور وراثتِ زمین فرماتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اِس ارض سے مُراد جنت کی زمین ہے۔ لیکن سلیمؔ! ان باتوں کو تم کسی سے نہ پوچھو۔ قرآن کریم تمہارے سامنے ہے۔ السابقون کے معراجِ کبریٰ کے دورِ ہمایوں کی تاریخ تمہارے پاس ہے ان چیزوں کو دیکھو اور پھر

ببیں تفاوتِ رَاہ از کجاست تا بکجا

تمہیں معلوم ہے کہ ۲ سنہ ھ میں روزے فرض ہوئے۔ اور اِسی رمضان کی سترہ تاریخ کو ان روزہ داروں کی قوتوں کا امتحان بھی لے لیا گیا۔ یوُرپین مؤرخ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یوُرپ کی تاریخ کا نقشہ بدل دیا۔ لیکن اُن کی تنگ نگاہیں ذرا اور آگے بڑھتیں تو دیکھتیں کہ ۲ سنہ ھ کے رمضان میں بدر کے میدان میں جو لڑائی ہوئی اُسنے دُنیا کی ہسٹری کو بدل دیا۔ باطل و ظلمت کی تمام قوتیں اپنے ساز و سامان سے آراستہ اِس ارادے سے میدان میں نکل آئیں کہ (معاذ اللہ) اللہ کے نور کو دُنیا سے مٹا دیا جائے۔ مسلمانوں کی کل کائنات، قریب تین نفوس، جو ابھی ابھی اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسروں کے ہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ بے سر و سامان۔ بظاہر بے کس و بے بس۔ اُنکے لیئے اب زندگی اور موت کا سوال تھا۔ نہیں! حق و باطل کے غلبہ کا سوال تھا۔ ان روزہ داروں نے کیا کیا؟ اپنے بچوں تک کو لے کر، کھجوروں کی ٹہنیوں اور اونٹوں کی پسلیوں سے مسلح۔ میدانِ جہاد میں آگئے۔ سلیمؔ! ذرا اس موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاؤ اور اسکا احساس اِس سے کرو کہ خود نبی اکرمؐ نے اِس لق و دق صحرا میں نہایت خشوع و خضوع سے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے اللہ! تیرے بندوں کی یہ مٹھی بھر جماعت محض تیرے نام کی بلندی اور تیرے پیام کی حفاظت کو لیئے سربکف اِس میدان میں جمع ہو گئی ہے اگر آج یہ سب شہید ہوگئے تو دُنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ مانگنے والے نے ابھی اپنی دُعا بھی ختم نہیں کی تھی کہ دینے والے نے اسے اپنی رحمتوں سے یوں نوازا کہ:۔

انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین ۝
میں تمہاری مدد کے لیے ہزار فرشتے لگاتار بھیجونگا فرشتے تمہاری مدد کے لیے آئینگے اور
وہ آکر کیا کرینگے ؟

فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ

مُسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھو میں کُفار کے دِلوں میں تمہاری دہشت طاری کردونگا

فی الحقیقت وہ ملائکہ جنہوں نے خلیفۃ فی الارض کو جُھک کر سلام کیا تھا۔ اُنھیں یونہی مدد کرنی چاہیئے تھی لیکن سلیم! اللہ تعالےٰ نے یہی نہیں کہہ دیا کہ تم مزے سے بیٹھے رہو۔ سب کچھ ہمارے فرشتے ہی کر دینگے۔ بلکہ اس وقت ایک مکمل ضابطہ سامنے رکھ دیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے، ذرا غور سے سُنو کہ وہ ضابطہ کیا ہے، وہ ہدایات کس قسم کی ہیں۔ فرمایا:۔

"اے ایمان والو! جب تم میدانِ جنگ میں کفار کے سامنے جاؤ تو اُنکو پیٹھ مت دکھاؤ۔ یاد رکھو۔ جو آج کے دن پیٹھ دکھائیگا۔ اِلّا اِس بات کے وہ پینترا بدلتا ہوٴا یا اپنی فوج میں آنے کے لیے ایسا کرتا ہو ۔ اسپر اللہ کا غضب ہوگا۔ اور اُسکا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

سلیم! سُنتے ہو کہ مخاطب کون سے مسلمان ہیں اور غور کرتے ہو کہ اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دینا دُشمن کے مقابلہ میں پیٹھ دکھا دینا کسقدر جُرمِ عظیم ہے۔

پھر فرمایا:۔

"اے ایمان والو! اللہ کی اور اسکے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس سے مت پھرو۔ درانحالیکہ تم سُن رہے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا۔ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سُن لیا۔ حالانکہ وہ صحیح معنوں میں سُنتے نہ تھے۔ اے مُسلمانو! اللہ اور اسکے رسول کی آواز پر لبیک کہو۔ جسوقت وہ تمہیں اِس چیز کی طرف بُلائے جو زندگی بخشنے والی ہے +

سمجھتے ہو کہ خدا کی راہ میں "مَرجانے" کا نام زندگی کیوں رکھا جاتا ہے؟ اِس عظیم الشان حقیقت پر غور کرو۔

موت اور حیات کے سربستہ راز تم پر منکشف ہو جائینگے۔ اور پھر اس اطاعت پر بھی غور کیا جس میں سُننا شرط ہے یہ بالمشافہ اطاعت زندہ مرکز کی اطاعت نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر فرمایا:۔

"اے مسلمانو! جب تم کسی جماعت کے مقابلہ میں جاؤ تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کو شدّت سے یاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اللہ کی اور اُسکے رسول کی اطاعت کرو۔ اور آپس میں مت جھگڑو۔ ورنہ تمہارے حوصلے پست ہو جائینگے۔ تمہاری ہوا اُکھڑ جائیگی۔ ثابت قدم رہو۔ اللہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے"۔

سلیم! سُنتے ہو کہ یہ ہدایات کیا ہیں! یہ زندگی کا پیغام ہیں۔ یہ اسلام کی رُوح ہیں۔ یہ ایک عبدِ مومن کے اظہارِ عبودیت کا حقیقی مفہوم ہیں۔ یہ صرف ۲ ؁ھ کے بدر موقع کے وقتی احکام نہیں۔ بلکہ قیامت تک۔ جب تک حق و باطل میں آویزش کا امکان ہے۔ جب تک خیر و شر کا مقابلہ ہے۔ جب تک شرارِ بولہبی چراغِ مصطفوی سے ستیزہ کار ہے۔ اسوقت تک کے لیئے۔ تمام مسلمانانِ عالم کے واسطے ایک دستورِ اساسی ہر ایک لائحہ عمل ہے۔ یہی ہدایات ہیں جنکے لیئے رمضان کے روزے اور اُن روزوں کا جمعۃ الوداع ہے سلیم! اب تم خود فیصلہ کرو کہ صحیح نتائج پیدا کرنے والے اِن تین سو مسلمانوں کے روزے اور نمازیں تھیں۔ یا اِس ساٹھ ستر ہزار کا رسمی اجتماع کہ جس میں مقصدِ روح کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو سو بھائی! نادان کیوں بنتے ہو! کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ سحری اور افطاری کے گولے قلعہ کی دیواریں نہیں ڈھا سکتے ہر چند اُنکا دھما کا اور دُھواں اصلی گولوں ہی کا سا ہوتا ہے۔
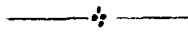
عید کے متعلق میں نے تمہیں پچھلے سال بتایا تھا کہ یہ نزولِ قرآن کریم کی یاد میں اسلامی جشن ہے تم دُنیا بھر کی قوموں کے مختلف جشن و مُسرت کے تیوہاروں کو دیکھو۔ اُن میں یا تو کسی انسان کی یادگار کا جذبہ پنہاں ہوگا۔ یا مظاہرِ فطرت کی نیرنگیوں کی تقریب۔ یا نئے موسم کا استقبال لیکن تم سمجھتے ہو کہ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں۔ دُنیا وہی واقعات بھلائے جا سکتے ہیں، تاریخ کے

صفحات گم ہوسکتے ہیں۔ بڑی بڑی چٹانوں پر گاڑی ہوئی لاٹھیں اور ان لاٹھوں پر کندہ کی ہوئی داستانیں۔ زمانے کے ہاتھوں تباہ ہوسکتی ہیں لیکن خدا کے آخری رسولؐ کا وہ ازلی و ابدی پیغام جو قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اُس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اُسنے لی ہے جو زندہ ہے کبھی مر نہیں سکتا جو قائم ہے کبھی فنا نہیں ہوسکتا۔ وہ باقی ہے وہ زندہ ہے اسکا کلام بھی زندہ ہے یہ جشنِ عید اسی خدائے حی و قیوم کے زندہ قرآن کے نزول کی یادگار ہیں ہے۔ اور جب تک دُنیا رہے گی۔ یہ یادگاریں باقی رہیں گی۔ اللہ اکبر۔ لَا اِلٰہ اِلاَّ اللہ۔ وَاللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ و للہ الحمد۔

پھر جس طرح یہ کتاب دُنیا کی کتابوں سے عجیب تر ہے۔ اس کی یاد بھی دُنیا کی تمام یادگاروں سے نرالی ہے۔ دُنیا کے جشن کھیل تماشے، رنگ راگ عیش ونشاط سے منائے جاتے ہیں لیکن شعائرِ الٰہی کی یادگاروں کے جشن منانے کے لیئے ایک بالکل الگ پروگرام تجویز کیا گیاہے اسکے لیئے مہینہ بھر سے لوگ تیار کئے جا رہے تھے۔ اُنہیں سکھایا جا رہا تھا۔ کہ دُنیا کی تمام جھوٹی طاقتوں سے منہ موڑ کر اس ایک خدا کے غلام بن جاؤ۔ مانگو تو اسی سے مانگو جھکو تو اسی کے سامنے جھکو بھوکے اور پیاسے رہ کر اپنے فرائض سرانجام دو۔ یہ ایک ٹرینگ تھی جو سپاہی کو میدان میں لانے سے پیشتر دی جاتی ہے۔ پُورے ایک مہینے کی ریاضت ومحنت سے قلوب میں تقویٰ پیدا کر و تو اُنہیں ایک جگہ جمع ہونے کا حُکم دیا کہ نیک دِل اور پاکیزہ دماغ لے کر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور سوچیں کہ ہمیں اِس امتیازی زندگی کے حصول واستبقاء کے لیئے کیا کچھ کرنا ہے، جو مومنین کی خصوصیت ہے اور جسکا وعدہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

سلیمؔ! اسلام رہبانیت کا مذہب نہیں۔ دنیا تیاگ دینا۔ زیب وزینت سے نفرت کرنا ہنسی خوشی سے بیزار ہو کر عبوساً قمطریراً بن جانا۔ یہ اسلام نہیں سکھاتا۔ اِس فیشن میں عمدہ کپڑے پہننے سے، اچھے اچھے کھانے پکانے سے۔ دوستوں کو تحائف دینے سے۔ بچوں کے لیئے خوشی اور مُسرت کے سامان بہم پہنچانے سے۔ اسنے نہیں روکا لیکن اسلام جس طرح دُنیا کی ہر مصیبت کے وقت خدا کی یاد کو سامنے لے آتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر آسائش اور مُسرت کی تقریب پر خدا کے محتاج و مفلس بندوں کو

بھی نہیں بھلاتا۔ اسلئے اُسنے کہاہے کہ جب تم اپنے اور اپنے بچّوں کے لیئے سامانِ آسائش و مسرت بہم پہنچانے لگو تو سب سے پہلے یہ دیکھو کہ غریب اور نادار لوگوں کی مسرت کا کیا انتظام ہے۔ پہلے اُنکی خوشی کا سامان کرو پھر جشن یادگار میں آؤ۔ کہ جب تک قوم کے تمام افراد جشن میں شریک نہ ہونگے جشن مکمل نہ ہوگا۔ تمہاری خوشی اسی میں ہے کہ ساری قوم خوش ہو، تمہاری بڑائی اسی میں ہے کہ ساری قوم بڑی ہو۔

سلیم! انہیں کیا معلوم کہ قوم کی حالت کیا ہے؟ اِسکا اندازہ اس سے مت لگاؤ کہ تمہارے سامنے نئے نئے کپڑے پہننے والے مسلمانوں کا اجتماع ہے! قوم کی حالت کا اندازہ لگانا ہو تو جاؤ ان گھروں کے اندر جہاں سے یہ نئے نئے کپڑوں والے مسلمان باہر آئے ہیں۔ اور دیکھو کہ کتنے گھر ہیں کہ جن میں مٹکے اور پتیلیاں اوندھی پڑی ہیں۔ کہ کئی دنوں سے ان میں آٹا نہیں پڑا۔ دیکھو کہ کتنے چولہے ہیں جن میں مکڑی نے جالا تن رکھا ہے کہ کئی وقت سے ان میں آگ نہیں جلی۔ دیکھو کہ کتنی شریف عورتیں ضرورت کے لیئے گھروں سے باہر نہیں آسکتیں کہ اُنکے سر پر چادر نہیں ہے۔ دیکھو کہ کتنے بچے اور بوڑھے رات بھر الاؤ کے گرد بیٹھے رہتے ہیں کہ اس سردی میں اُنکے پاس اوڑھنے کو لحاف نہیں۔ دیکھو کہ کتنے جوان مریض موت کے منہ میں کھنچے چلے جارہے ہیں کہ ان کی دوائی کے لیئے گھر میں پیسہ نہیں۔ سردی۔ بھوک۔ محتاجی اور بربادی کے اِن ہولناک مناظر کو دیکھو اور پھر اندازہ لگاؤ کہ قوم کی کیا حالت ہے؟ اور اگر تمہارے سینے میں دِل اور دل میں احساس کی کوئی رمق باقی ہے، تو پھر سوچو کہ آج یہ تمہارا جشن مسرت کا جشن ہے یا بربادی کا ماتم! سلیم! میں جانتا ہوں کہ خوشی کے موقع پر مصیبتوں اور تکلیفوں کی یاد بدشگونی خیال کی جاتی ہے۔ آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس میں خوشی کو خوشی سمجھنا۔ خود اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ قوم کی حالت یہ ہے لیکن سلیم! جانتے ہو کہ قوم کے راہ نما شریعتِ مقدسہ کے علمبرداران۔ کون سے اہم مسائل کے حل دریافت کرنے میں مصروف جہاد ہیں؟ اگر تم یہ جاننا چاہو تو دہلی سے شائع ہونے والے اخبار "محمدی" اور امرتسر سے شائع ہونے اخبار "اہلحدیث" کے اکتوبر۔ نومبر کے پرچے اُٹھاکر دیکھو، ان میں اس مسئلہ جلیلہ پر گرما گرم بحث چل رہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے ختنے کی دعوت قبول کرنا جائز ہے یا نہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اور یہ دونوں اخبار

اس جماعت کے ترجمان ہیں جسکے اسلاف میں ہمیں سیّد احمدؒ بریلوی، اور شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے درخشندہ اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہے۔ اور انکی فوجیں شہر کی چار دیواری تک آپہنچی ہیں تو شہر کے اندر پادریوں کی سب سے بڑی مجلس چالیس دن سے اِس مسئلہ پر بحث کر رہی تھی کہ حضرت علیہ پر جو مائدہ نازل ہوا تھا اس میں روٹی خمیری تھی یا فطیری۔ مسلمان ان واقعات کو پڑھتے ہیں اور تحقیر کی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ لیکن نہیں سوچتے کہ خود انکے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے ٭

سلیم! اب تمہاری آخری بات کا جواب رہ گیا کہ جب ہمارے اِن اجتماعات میں آج وہ رُوح اور مقصد نہیں رہا تو میں پھر اُن کی پابندی اور ان کو قائم رکھنے کی کیوں اسقدر شدّت سے تاکید کرتا رہتا ہوں۔ عزیزم! یہ اسلیئے کہ جیسا کہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں، ہماری فلاح و سعادت انہی مناسک و شعائر کی راہ سے آئے گی۔ اور اِس سعادت کے بعد ہماری شوکت و عظمت کے قیام کے ضامن بھی یہی مناسک و اجتماعات ہونگے، سو آج اگر ہماری قرآنِ کریم سے دُوری کے باعث ان میں وہ رُوح باقی نہیں رہی جو زندہ نتائج کا موجب تھی تو ان کی صورت ضرور باقی رکھنی چاہیئے کہ جب اللہ تعالیٰ ہم پر سے یہ عذاب اٹھالیگا جس میں ہم ایک مُدّت سے مبتلا ہیں۔ تو اسی قالب میں روح آ جائیگی۔ اور پھر یہ چلتا پھرتا جیتا جاگتا انسان بنجائیگا۔ اگر روح پہلے مِٹ چکی تھی۔ اور صورت کو ہم اب مٹا دیں تو پھر ہماری نشاۃ ثانیہ کی کوئی اُمید باقی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ عید کی نماز کے بعد میں نے تمہیں خاموش بیٹھنے کی تاکید کی تھی۔ اگرچہ خطیب کا ایک لفظ بھی تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور اگر پہنچتا بھی تو اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہ تھا کہ وہ عربی میں تھا اور تم عربی جانتے نہ تھے۔ اور اگر جانتے بھی ہوتے تو بھی اس میں تمہیں مسائل حاضرہ کے متعلق کوئی چیز نہ مل سکتی، کہ اِنکے نزدیک تو خطبہ ایک رسمِ شرعی ہے جس کی ادائیگی سے "ثواب" ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ لوگوں نے اسقدر بھاگم دوڑ کیوں شروع کر رکھی تھی۔ سو اسکا جواب مجھ سے نہیں ان مولوی صاحبان سے پوچھو جو اپنی ذاتی آواز کو دُور تک پہنچانے کے لیئے ٹیلیفون کا استعمال بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن بہ حیثیت خطیب و امام اپنی آواز کو دُور تک پہنچانے کے لیئے آلہ مکبر الصوت کا استعمال حرام قرار دیتے

ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہمارے اِن "مفتیانِ کرام" کے پاس ذرائع کیا ہیں۔
مکبر الصوت (loud speaker) کی حلت و حرمت کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے یہ ضروری
تھا کہ معلوم کیا جاتا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور جو آواز سامعین تک پہنچتی ہے، وہ واقعی متکلم کی آواز
ہوتی ہے یا کوئی اور۔ اب سنیئے کہ یہ تحقیق کن ذرائع سے ہوئی ہے۔ ہمارے دینی مرکز یعنی دار العلوم
دیوبند کے مفتی۔ جناب مولانا محمد شفیع صاحب نے ان فتاویٰ کا ایک مجموعہ شائع فرمایا ہے جن
میں "عباداتِ مقصودہ" کے لیے اس آلہ کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس رسالہ (البلائغ المفیدۃ[1]
فی حکم الصنائع الجدیدۃ) کے صفحہ ۲ پر درج ہے کہ الگزنڈر ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر
جناب برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا گیا اور وہ فرماتے ہیں کہ "برقی قوت کی وجہ سے میں تو
کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اسکا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ تبوت مشکل ہے"
یہ ہے منجملہ ذرائع تحقیق ہمارے ان مفتیانِ کرام کے جن کی بنا پر حلت و حرمت کے فیصلے صادر ہوتے
ہیں۔ اور یہ حضرات ان اسلاف کے جانشین ہونے کے مدعی ہیں۔ جنکے متعلق قرآن کریم نے فرمایا
وسخر لکم مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (زمین و آسمان میں جو کچھ ہے۔ سب تمہارے تابع
فرمان ہے) اب سلیم! تم خود سمجھ جاؤ گے کہ ہم کہاں ہیں اور قرآن کریم ہمیں کہاں لے جانا چاہتا تھا۔

والسّلام! پرویز

---

[1] نام سے نہ گھبرایئے رسالہ اُردو میں ہے

ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپیاں

(جناب محمد اکرم خاں صاحب مدیر روزنامہ شمس ملتان)

اگر کسی ملک میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہوں تو خوشگوار تعلقات قائم رکھنے اور صلح و امن کی زندگی بسر کرنے کے لیئے باہمی میل جول اور بہت سے معاملات میں تعاون اور اشتراک عمل نہایت ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو انتظامی۔ سیاسی۔ کاروباری اور معاشرتی امور میں مل جلکر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی اکثر ضروریات تو ایسی ہوتی ہیں جنمیں اشتراکِ عمل ناگزیر ہوتا ہے، جیسے مُلازمت میں، تجارتی کاروبار میں کمیٹیوں اور کونسلوں میں لیکن اس لازمی اشتراک کے علاوہ آپس کے میل جول سے خود بخود بہت سی ایسی مشترکہ دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن میں دونوں اپنی خوشی سے برابر حصّہ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجبوری کے اشتراک کے بہ نسبت یہ رضا مندانہ تعاون زیادہ قابلقدر ہے۔

ان مشترکہ دلچسپیوں میں غالبًا سب سے دیرینہ وہ "رُوحانی" مشاغل ہیں جو ہندوؤں میں یوگ اور مسلمانوں میں تصوف کے نام سے رواج پا چکے ہیں، جہاں تک اسلامی تصوف شریعت کی حدود کے اندر رہ کر صلح کل مسلک کی تلقین کرتا ہے۔ اُس سے قطع نظر بعض باتوں میں مسلمان صوفی ان حدوُد سے نکلکر ہندو یوگیوں کے ساتھ دستِ تعاون بڑھاتے ہیں۔ اور مذاہب کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر بزعم خود وحدتِ انسانی کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ اس فلسفہ کے عملی نتیجے ہماری معاشرت میں مختلف صورتوں سے نمایاں ہیں۔ ہندو یوگیوں کے مسلمان چیلے اور مسلمان پیروں کے ہندو مُرید۔ عُرسوں اور قوالی کی مجالس میں ہندوؤں کی شرکت اور مسلمان فقراء کا ہندوانہ لباس وغیرہ اس کی عام مثالیں ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض اکابر جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کو نصب العین بنا چکے ہیں۔

تصوف کے اندر کامیابی کی ایک جھلک محسوس کرتے ہیں۔

اِن روحانی مشاغل کے بعد دوسرے درجے پر وہ میلے آتے ہیں۔ جن میں دونوں قوموں کے افراد بلا امتیاز شریک ہوتے رہتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اِن مشترکہ دلچسپیوں کی فہرست میں سیاسی پارٹیوں اور ادبی مجلسوں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ مُشاعروں جیسی ادبی مجالس پہلے زمانہ میں بھی مختلف قوموں کو یکجا کردیا کرتی تھیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے یہ میل جول محض معاشرتی اور خالص ادبی ہوتا تھا۔ لیکن آج کل اس کی تہ میں سیاسی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ بالخصوص جب سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں متحدّہ قومیت کا تصوّر پھیلایا گیا ہے، اِن مشترکہ دلچسپیوں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ہمارے بہت سے سیاسی رہنماؤں کا یہ ایک عام مشغلہ ہوگیا ہے۔ کہ اِس امر پر غور کیے بغیر کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی "وحدتِ قومی" فی الحقیقت کیا مفہوم رکھتی ہے۔ اور یہ کس حد تک قابلِ عمل ہے، جا و بیجا ہر موقع پر اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ جس معاملہ میں بھی ہندو اور مسلمان کسی قسم کا اشتراکِ عمل کریں۔ یہ سیاسی رہنما اُسے اتحاد قرار دیکر اظہارِ مسرت کیے بغیر نہیں رہتے۔

میدانِ سیاسیات میں ایسے اتحاد کی تبلیغ ذرا ہمّت طلب ہوتی ہے اور بعض اوقات اِس دعوت کے عملی نتائج مشکلات اور خطرات کا موجب بھی ہوجاتے ہیں۔ اسلیئے ایسے محتاط حضرات جو اس خارزار میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ اس دعوت و تبلیغ کے لیئے دوسرے میدان تلاش کرتے ہیں چنانچہ اس مقصد کے لیے سب سے بہتر زبان اور ادب کا میدان ملتا ہے۔ بہت سے اکابر کا معمول ہے۔ کہ جہاں کہیں کسی مُشاعرے یا ادبی مجلس کی صدارت میسر آئی۔ اسی بات کو سب سے زیادہ نمایاں کیا کہ یہ مُشاعرے اور مجلسیں نہایت مبارک اجتماعات ہیں۔ کیونکہ انکے ذریعے مختلف مذاہب کے افراد کو مل بیٹھنے کا موقع ملجاتا ہے۔ اور انکے اس مِل بیٹھنے سے قومی اتحاد میں ترقی ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں وہ تحریک بھی دلچسپی سے خالی نہیں جو پنجاب کی اتحاد پارٹی کے ایک رُکن نے کچھ عرصے سے شروع کر رکھی ہے۔ یعنی مذہبی تہواروں سے الگ ایک قومی تہوار منایا جائے، جس میں سب قوموں کے لوگ شرکت کرسکیں۔ بڑے غور و خوض کے بعد اس مقصد کے لیئے "بسنت" کو منتخب

کیا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور میں ہر سال اس موقع پر "اعلیٰ سوسائٹی" کی ایک مشترکہ ضیافت ہوتی ہے ہندو مسلم سکھ عیسائی اکابر سب اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور قومی اتحاد کے اِس مظاہرے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے کر کچھ دیر کے لیے دل خوش کر لیتے ہیں۔ یوں تو بسنت پہلے بھی کچھ ہندو مسلمان ملکر منایا کرتے تھے۔ لیکن وہ زیادہ تر "جاہل عوام" ہوتے تھے۔ اب "تعلیمیافتہ خواص" اِس تقریب کو نئے زمانہ کے معیار پر مناکر متحدہ قومیت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

اگر معاملہ ادبی مجالس تک رہتا تو خیر ایک بات بھی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب یہ سلسلہ اُنسے بھی آگے بڑھنے لگا ہے۔ گزشتہ اکتوبر کے مہینے پنجاب لٹریری لیگ نے لاہور میں دسہرے کا تہوار منانے کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مہمانِ خاص ایک مشہور ہندو رقاص تھا، جنے صوبہ جاتِ متحدہ کے ایک پہاڑی مقام پر "ہندوستانی کلچر" کا ایک مرکز کھول رکھا ہے۔ جہاں ہندوستان کے فنِ رقص کو اس کی قدیمی شان کے ساتھ دوبارہ زندہ کرنے کے مقصد کے ساتھ رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی ہے، اس "معزز" مہمان کے استقبال کے لیئے ہندو، مسلمان اور عیسائی اکابر جمع ہوئے اور تینوں قوموں کے نمائندوں نے دل کھول کر اسکی قدرافزائی فرمائی۔ ایک عیسائی رہنما نے تو اس امر پر اظہارِ مسرت کیا کہ رقاص موصوف نے "فنِ رقص میں دُنیا کے نقشے پر ہندوستان کو نمایاں کیا ہے"۔ ایک ہندو بزرگ نے فرمایا کہ "فنونِ لطیفہ دُنیا میں مستقل امن قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں ہمیں امن کے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ سپاہی ماہرینِ فنونِ لطیفہ ہیں"۔ اسی مجلس میں ملتِ اسلامیہ کے ایک معزز فرد نے بھی اپنے مخزنِ علم و ادب سے تحسین و آفریں کے چند موتی نچھاور کیئے۔ اور حسبِ معمول ارشاد فرمایا کہ "اگر تمام قومیں اہم تقریبات پر باہم مل سکیں تو اُنکے درمیان اچھے تعلقات کا قیام بہت آسان ہو جائے"۔

جہاں تک دوسری قوموں کے اکابر کا تعلق ہے، ہمیں اُنکے نظریات اور طرزِ عمل پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ ادبی مجالس کے پردے میں اپنے مذہبی تہواروں کی شان بڑھانا چاہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ اگر وہ اپنے قدیم فنِ رقص کو زندہ کرنے میں اپنی قومی ترقی محسوس کرتے ہیں

تو ہمیں اِس سے کچھ بحث نہیں لیکن ہم خود اپنی ملّت کے اکابر سے پُوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر یہ قومی اتحاد و اتفاق کا نصب العین کوئی حد و بھی رکھتا ہے یا نہیں ؟ عُرسوں میلوں۔ مشاعروں اور کانفرنسوں سے نکلکر قومی تہواروں تک پہنچے۔ اور اب مذہبی تہواروں کے ساتھ ساتھ رقص و سرود کی مجالس تک بھی بڑھنے لگے۔ کیا یہ قومی اتحاد ایسا مقصد ہے، جسے بغیر کسی شرط کے ہر قیمت پر حاصل کرنا ضروری ہے۔ یا یہ بھی دیکھنا ہے کہ کسی اور مقصد سے تو تصادم نہیں ہوتا ؟

اگر یہ اتحاد بغیر کسی شرط کے مقصود ہے، تو پھر محض فنونِ لطیفہ تک معاملہ کو کیوں محدود کر دیا جائے بہت سی اور صورتیں بھی ہیں جنکے ذریعے مختلف قوموں کے درمیان اشتراکِ عمل کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے مثلاً شراب نوشی ایک ایسی چیز ہے۔ جو تمام اختلافات مٹا کر مختلف مذاہب و اقوام کے افراد کو ہم مشرب و ہم خیال بنا سکتی ہے۔ لہٰذا شیخ و برہمن کے جھگڑوں اور مسجد و بت خانہ کے بکھیڑوں کو غرقِ مے ناب ہی کیوں نہ کر دیا جائے ؟ میخانے کے علاوہ ناچ گھروں تھیٹروں سینماؤں، قمار خانوں بھنگڑوں کی ٹولیوں، اور ڈاکوؤں کے جتھوں بلکہ اُن سب سے بڑھ کر عصمت فروشی کے بازاروں میں اتحادِ قومی کے بہترین نمونے مل سکتے ہیں۔ جہاں چند مشترکہ اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر کسی مذہب۔ ملّت اور قومیت کی تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔ اگر محض ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپیاں ہی وحدتِ قومی کے مقصدِ بلند کے حصول کا ذریعہ ہیں تو پھر ایسے تمام مشاغل کو یکساں طور پر کیوں نہ سراہا جائے۔ جن میں سب قوموں کے لوگ ملکر حصّہ لیتے ہیں ؟

لیکن اگر یہ قومی اتفاق مقصود بالذات نہیں ہے اور اسکے حصول پر کچھ پابندیاں عائد کرنا ضروری ہے، تو اس امر پر ضرور غور کرنا پڑیگا کہ خطِ فاصل کس جگہ کھینچا جائے۔ آپ کہینگے کہ صرف بھلائی کی باتوں میں اشتراکِ عمل کیا جائے، بُرائی کی باتوں میں نہیں بالکل دُرست۔ قرآن پاک بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے، کہ نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرو بُرائی اور گناہ میں نہ کرو لیکن یاد رہے کہ جب تک آپ اسلام کی پابندی کا دعوے کرتے ہیں۔ آپ کو اچھائی یا بُرائی کا معیار بھی اسلامی تعلیم ہی کو رکھنا پڑے گا۔ یہ نہ ہو سکے گا کہ جو بات آپکے دل کو پسند ہو وہ اچھی اور جو آپ کو ناپسند ہو وہ بُری ٹھہرے۔

ملّت کے معززاکابر سے نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپیوں میں ضرور حصّہ لیں۔ اور اس طرح دونوں قوموں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں لیکن اس امر کو کبھی نظر انداز نہ کریں کہ اسلام اُن کو اشتراکِ عمل میں کس حد تک قدم بڑھانے کی اجازت دیتا ہے۔ اس حد کے اندر رہ کر تو اُن کی ہر کوشش مبارک و مسعود ہوگی لیکن جونہی پاؤں اس حد سے باہر پڑے گا۔ دُنیوی اور اُخروی خُسران کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

فیصلہ کیا گیا ہے!

کہ طلوعِ اسلام میں مہذب اور شائستہ اشتہارات بھی شائع کئے جایا کریں۔ اشاعت کے اعتبار سے یہ رسالہ بفضلِ ایزدی۔ اس پایہ کے رسالوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ اور ملک کے گوشہ گوشہ میں نہایت بلند طبقہ حضرات کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے اسلیے اگر آپ اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو:۔

طلوعِ اسلام

میں ایمانداراانہ انداز کا اشتہار دیجیے!

نرخنامہ و قواعد اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عہ ۱۰	صہ ۲۵	للعہ ۴۵	لہ ۸۰
نصف صفحہ	سے	صہ ۱۵	صہ ۳۵	للعہ ۴۵
رُبع صفحہ	للعہ	عہ	معہ ۱۷	صہ ۲۵

(۱) اشتہارات کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول کی جائیگی۔

(۲) صرف وہی چربے قبول کیے جاوینگے جو اس رسالہ کے طرز کے مطابق ہوں

(۳) نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائیگی۔

(۴) ٹائٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام بلی ماران دہلی

تبصرہ

افسانۂ پدمنی - چتوڑ کی رانی پدمنی سے سلطان علاءالدین خلجی کے عشق کی داستان ملک محمد جائسی نے اپنی مثنوی "پدماوت" میں لکھ کر اس مسلمان بادشاہ کے اوپر اعتراض کا ایک سبب پیدا کر دیا۔ اور دشمنوں کے ہاتھوں میں مسلمانوں کے خلاف ایک ہتھیار رہ گیا۔ مولوی احتشام الدین صاحب ایم اے علیگ دہلوی نے تاریخی روشنی میں نہایت بیّن شہادتوں اور واضح دلیلوں سے اپنی اس کتاب میں یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ اس داستان کی حیثیت واقعہ کی نہیں ہے بلکہ یہ صرف افسانہ ہے۔ یہ دلیلیں اس قدر قوی ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے وجوہات کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے، جنکے باعث یہ افسانہ تراشا جا سکا۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص اسکو پڑھے گا وہ بالکل مطمئن ہو جائیگا۔ زبان اور طرز بیان نہایت دلکش ہے اور طباعت و کتابت نہایت عمدہ۔ قیمت فی نسخہ عمر ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

کربلا کے بعد - سید عزیز حسن بقائی اڈیٹر رسالہ پیشوا دہلی نے اس کتاب میں کربلا کے واقعہ کے بعد سے خلفائے بنی اُمیّہ اور پھر بنی عباس کی تاریخ اُنکے خاتمہ تک لکھی ہے۔ آخر میں ان حکومتوں کے بھی حالات دیئے ہیں جو بنی فاطمہ نے خود اپنی کوششوں سے قائم کیں۔ اور جنکے قیام میں شیعیان علیؑ کی جماعتوں نے بہت کم حصہ لیا۔ نیز مصر کی خلافت فاطمی کی بھی مختصر تاریخ دی ہے۔ کتاب بحیثیت مجموعی تاریخی معلومات کے لحاظ سے عمدہ ہے۔ اور چھپائی لکھائی صاف ہے۔ قیمت فی نسخہ ایک روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پستا:- مینجر صاحب رسالہ پیشوا - جامع مسجد - اُردو بازار دہلی

متحدہ قومیت اور اسلام

(از شمس العلماء جناب مولانا عبد الرحمٰن صاحب پروفیسر دہلی یونیورسٹی)

جب ہم اس نامۂ نبوی کو دیکھتے ہیں وہ صاف دو حصوں میں منقسم معلوم ہوتا ہے پہلے حصہ میں جو چودہ دفعات تک چلا گیا ہے رسول اللہ کی بیشتر تعلیمات اور ہدایتیں ایسی ہیں جن کا تعلق عملاً مسلمانوں سے ہے۔ اس حصہ میں یوں تو ساری ہی باتیں اہم ہیں لیکن میرے خیال میں حال کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیسری، چوتھی اور ساتویں دفعہ بہت ہی اہم ہیں۔ تیسری دفعہ جو اُمت واحدہ کے استحکام کے لیے ہے مطلب اس کا یہ ہے (اصل دفعہ یا اس کے ترجمہ کو ایک دفعہ پھر پڑھ لیجیے) کہ مسلمانو تمہارے اتحاد میں فساد ڈالنے والا خواہ وہ تم سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو تم سب کا دشمن ہے۔ تم سب مجموعی حیثیت سے اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہو، اسے اپنا سب کا دشمن جانو، مومن کے مقابلہ میں غیر مومن کی کسی حال میں مدد نہ کرو۔ چوتھی دفعہ یہ ہے کہ تم سب برابر ہو اللہ کا ذمہ ایک ہے جس نے دے دیا دے دیا۔ تم میں سے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی سارے مسلمانوں کی طرف سے جسے چاہے (بشرطیکہ اُمۃ واحدہ کے فائدہ کے لیے ہو) پناہ اور ذمہ دے سکتا ہے جو سب کو ماننا چاہیے۔ ساتویں دفعہ کا ماحصل یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک اور صرف ایک ہے یہی اللہ کی صلح ہے۔ خبردار یہ نہ ہو تمہارا ایک آدمی یا ایک گروہ ایک طرف صلح کرے، اور دوسرا یا دوسرا گروہ لڑائی۔ جب صلح کرو، سب مل کر ایک صلح کرو، کوئی صلح کرے تو اس طرح کہ صلح میں سارے مسلمانوں کا مفاد برابر رہے۔

نامہ کا دوسرا حصہ زیادہ ترغیروں سے متعلق ہے، اس کو پڑھنے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بالادست دفاعی اغراض کے لیے غیر مذہب والوں کو اپنی جماعت میں شریک کر رہا ہے، لیکن

نہایت خودداری کی شان کے ساتھ، انھیں شریک کرتا اور شریک کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اتنا کہتا ہے ومن تبعنا من الیہود جو یہود ہمارے ساتھ ہونا چاہیں۔ پھر اس شرکت و وفاق کی شرطیں خود پیش کرتا ہے۔ ان شرطوں میں انسانیت، انصاف، مروت سب کچھ برتتا ہے لیکن اپنی اور اپنی جماعت کی فوقیت کو بہرحال نمایاں رکھتا اور صاف صاف کہدیتا ہے کہ جو لوگ ہمارے ساتھ ہونا چاہیں وہ ہماری اجازت کے بغیر مدینہ سے باہر نہ جاسکینگے ہاں وہ باجازت باہر جائیں، یا مدینہ کے اندر اندر رہیں تو وہ ہماری طرف سے ماموں رہینگے۔ اور یہ وفاق چونکہ دفاعی وفاق ہے کہ اس میں ان کا بھی فائدہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں اُن کو اپنا خرچ آپ اُٹھانا ہوگا، جیسے مسلمان اپنا خرچ آپ اُٹھائینگے۔ اور اگر احیاناً اس اُمۃ واحدہ میں کوئی جھگڑا ایسا اُٹھ کھڑا ہو جس سے عام فساد پھیلنے کا اندیشہ ہو تو اس کا فیصلہ ہم خود کرینگے۔ (دفعات ۲۲-۲۳-۴۰)

یہ اور اسی قسم کی ہدایتیں اور شروط مصلحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) غیر مذہب والوں کے سامنے جبکہ ان کو اپنے ساتھ ملانا بھی چاہتے ہیں ایسے وقت میں پیش کرتے ہیں کہ مدینہ میں کوئی اعلیٰ قوت آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ ساز و سامان کی الگ کمی ہے اور سامنا قریش جیسے دشمن سے ہے جو شوکت و قوت بھی رکھتا ہے اور ساز و سامان بھی۔

رسول اللہ نے اُمت واحدہ مرتب کی تو ایسی ایسی اہم قیود اور شروط کے ساتھ۔ لیکن متحدہ قومیت و اسلام کے اسّی صفحات میں ان میں سے جگہ ملی تو صرف ذیل کی شروط کو۔

(۱) لڑائی میں یہود اپنا خرچ کریں اور مسلمان اپنا (۲) بنی عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک اُمت ہیں (۳) یہود کے لیے اُن کا دین اور مسلمانوں کے لیے اُن کا (۴) مسلمان باہم ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہونگے (۵) جو یہودی ہمارا اتباع کریگا ہماری طرف سے اس کے لیے بھلائی ہوگی ظلم ہرگز نہ ہونے پائیگا[1]

[1] نوٹ صفحہ ۱۰۷ پر ملاحظہ ہو۔

نامہ نامی کی باقی دفعات کیوں نظر انداز کی گئیں اس کو نظر انداز کرنے والے جانیں یا خدا ہم بہر حال اس کو پسند نہیں کرتے کہ اپنے مطلب کی دفعات سے لی جائیں اور باقی خصوصاً ایسی دفعات کو جو اپنے مدعا کے خلاف جاتی ہوں قطعاً نظر انداز کر دیا جائے۔

اب آئیے اُمتہ واحدہ کی طرف کہ اسی ایک دو لفظی مرکب نے تفریق و تقسیم کا ایک ہنگامہ بپا کر رکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ واحدہ اور متحدہ میں فرق ہے۔ پہلا لفظ فردانیت کو چاہتا ہے اور دوسرا ترکیب کو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ یہاں واحدہ سے متحدہ ہی مراد ہے اور معنی اس کے متفقہ ہیں رہا لفظ امت وہ بھی قوم کے معنی میں آیا اور آتا ہے لیکن خود لفظ قوم دو معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اوّل مطلق جماعت، دوسرے جماعت بصفات مخصوصہ۔ مثلاً اتحاد نسل و مذہب، اتحادِ وطن، اتحادِ زبان، اخلاق واطوار، تمدن وتہذیب کی یک رنگی، رسوم کی مماثلت، موت زندگی، شادی غمی، ملنے جلنے، رہنے سہنے میں افراد قوم کی باہمی ہم آہنگی، وغیرہ "رسالہ متحدہ قومیت" میں میں سمجھتا ہوں قوم کے معنی نہ یہ مراد ہیں نہ وہ۔ وہ یعنی قوم کے پہلے معنی سرے سے اس رسالہ کے کام ہی کے نہیں اور دوسرے معنی قوم کے نہ ہندوستان میں پائے جاتے ہیں نہ زیر تجویز متحدہ قومیت سے ان کی توقع کی جاتی ہے۔ یہاں صرف رشتۂ وطنیت پر متحدہ قومیت کی بنیاد رکھی جاتی تاکہ اہل وطن کی مشترکہ اغراض حاصل ہو سکیں لیکن رسول اللہ نے مدینہ منورہ میں اگر کوئی متحدہ قومیت بنائی تھی تو اس میں باستثنائے مذہب مذکورہ بالا ساری صفات موجود تھیں کیونکہ وہ یہودی جن کا ذکر نامۂ نبوی میں آیا ہے اور جو مسلمانوں کے ساتھ امت واحدہ یا متحدہ قوم کا جز تھے، سب کے سب عرب تھے، ایک ملک کے رہنے والے تھے، ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے۔ ماں کی طرف سے خود رسول اللہ کے

(نوٹ صفحہ ۲۷،۴) لہ ہم سابقاً ایک جگہ لکھ چکے ہیں کہ ابو عبید کی روایت کا متن بہ نسبت ابن ہشام کی روایت کے کم ہے۔ اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ متحدہ قومیت و اسلام میں جو دفعات اختیار کی گئی ہیں وہ ابو عبید کی روایت کا متن ہوگا یہ انتخاب در انتخاب ہیں۔ اصل سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے۔

قرابت دارتھے، ایک زبان بولتے تھے، اخلاق واطوار تہذیب وتمدن ان کا ایک تھا، یکساں معاشرت تھی۔ اوضاع واطوار رسم ورواج میں باہم غیریت نہ تھی۔ غرض قوم واُمت کے اوصافِ کثیرہ اُن میں موجود تھے۔ مذہب نے اُن کو اُمتِ عربیہ اور قومیت عربیہ سے خارج نہیں کیا تھا، اس لیے وہ ابھی اپنی اصل پر اُمۃ واحدہ تھے۔ رسول نے صرف اتنا کیا کہ دو مذہب والوں کی دفاعی غرامن کے لیے ایک پارٹی بنا دی اور بس اور وہ بھی ایک وقتی مصلحت تھی، وقت آیا تو آپ نے اپنے عمل سے اور اللہ نے اپنے حکم سے اس پارٹی کا خاتمہ کردیا۔ اور جب تک بھی یہ پارٹی رہی اس کا اصل اصول رہا۔ ناسلم کا تابع ہونا اور مسلم کا متبوع ہونا۔ آئیے اب دیکھیے کہ جن یہود کا نامۂ نبوی میں ذکر آیا ہے وہ واقعی ایسے تھے بھی جیسا کہ ہم نے انہیں بتایا ہے یا نہیں۔

مدینہ میں جس کا قدیم نام یثرب تھا دو نسلاً متمائز قومیں آباد تھیں۔ ایک قحطانی عرب۔ دوسرے اسرائیلی یہود۔ یہ عرب دو قبیلوں میں منقسم تھے، خزرج اور اوس۔ اور اسرائیلی تین قبیلوں میں۔ بنو القینقاع، بنو النضیر اور قریظہ۔ سارے یثرب میں یہی تینوں قبیلے نسلاً یہودی تھے۔ لیکن وہ اوروں کو بھی اپنے مذہب میں شامل کرلیتے اور کرسکتے تھے، اس لیے بہت سے عرب بھی یہودی ہو گئے تھے۔ خاص کر اوس اور خزرج میں۔ کہ عرب میں وہی اُن کا مرکز تھا

اوس وخزرج والے اہل کتاب سمجھ کر یہود کا بڑا احترام کرتے تھے یہاں تک کہ ان قبیلوں میں اگر کسی عورت کے اولاد خاص کر نرینہ اولاد نہ ہوتی تو وہ منت مانتی کہ خدا مجھے بیٹا دیگا تو میں اس کو یہودی بناؤنگی اور جب بیٹا ہوتا تو منت کے موافق اسے یہودی بنا دیتی۔ ممکن ہے کچھ لوگ خود بھی یہ مذہب اختیار کرلیتے ہوں۔ ان وجوہ سے اوس وخزرج کے بطون میں یہودیوں کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی تھی، بلکہ مذہب کے ایسے ایسے عالم بھی ان میں پیدا ہو گئے تھے کہ احبار یہود سے بھی بڑھ چڑھ کر ملانے جاتے تھے۔ اسرائیلی یہود بھی ہم مذہبی کی بنا پر ان کی عزت کرتے اور ان کی قوم قبیلہ کے لوگ بھی

کہ آخر انہی میں سے تھے۔ بنو ساعدہ، بنو الحرث، بنو جشم، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو النبیت، بنو الاوس وغیرہ جن کا نام نامۂ نبوی میں آیا ہے سب کی سب اوس وخزرج ہی کی شاخیں تھیں[۱]، اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ کچھ یہودی مذہب کے لوگ موجود تھے، جن میں عالم بھی تھے اور عامی بھی مگر کثرت ان میں مشرکین کی تھی، جو قریش مکہ کی طرح بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہود بنی اسرائیل سرزمین عرب میں اجنبی تھے خواہ مدتوں سے مدینہ رہتے چلے آئے ہوں۔ برخلاف اس کے اوس خزرج دونوں خاک عرب سے ہی اُٹھے تھے۔ اس لیے کبھی کبھی ان عربوں اور اسرائیلیوں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ کبھی یہ غالب آتے اور کبھی وہ کہتے ہیں کہ آخری لڑائی ان میں وہ ہوئی جو یوم بعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس لڑائی میں کہیں بنی اسرائیل عربوں سے کہہ بیٹھے کہ تمہاری شامت قریب آلگی ہے۔ آنیوالا نبی جس کی توریت میں خبر دی گئی ہے آیا ہی چاہتا ہے ہم اُس کے ساتھ ہو کر تمہاری اچھی طرح خبر لینگے۔ اوس وخزرج ابھی اس بات کو نہ بھولے تھے کہ حج کے لیے مکہ پہنچے، وہاں دعوت اسلام شروع ہو چکی تھی۔ رسول اللہ نے ان لوگوں کو بھی اللہ کا پیغام پہنچایا۔ اگر یہود کی دھمکی واقعی تھی تو اس کی یاد اس پر کلمۃ الحق کا اثر۔ وہ مسلمان ہوگئے اور مدینہ پہنچ کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ اور دوسرے سال مکہ آکر نصرت و حمایت کے وعدہ پر رسول اللہ کو مدینہ بلالیا۔ رسول اللہ نے مدینہ پہنچ کر اوس وخزرج دونوں کو انصار کا خطاب دیا۔ جو لوگ اب تک ان میں سے ایمان لائے تھے سچے دل سے ایمان لائے تھے۔ انہوں نے نشر و تبلیغ اسلام میں ایسی کوشش کی کہ اوس وخزرج میں تھوڑے ہی دنوں میں گھر گھر مسلمان دکھائی دینے لگے۔

رسول اللہ کو یثرب کے یہودیوں سے توقع تھی کہ وہ دعوت اسلام کو جلدی اور بآسانی

---

[۱] دیکھیے۔ جریدہ من حضر بدرا من المسلمین من قریش و من معھم۔ سیرت

قبول کرلینگے لیکن وہی آپ کے زیادہ سے زیادہ دشمن اور مخالف اسلام ثابت ہوئے وجہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو خاصانِ خدا شمار کرتے تھے اور سمجھے بیٹھے تھے کہ توریت کی پیشین گوئی کے مطابق جو نبی آنے والا ہے وہ انہی میں پیدا ہوگا۔ جب دیکھا کہ وہ بنی اسماعیل میں آیا تو جل مرے اور اپنا دیرینہ وقار جاتا دیکھ کر حق کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے اور مشرکین مکہ سے بھی سبقت لے گئے۔

جب یہودی بنی اسرائیل کی طرف سے اسلام کی مخالفت شروع ہوئی تو دو عملی میں جان آئی ان مذہبی یہودیوں کی جو اُن عرب قبیلوں میں تھے جن کے نام ہم لکھ آئے ہیں اور بتا آئے ہیں کہ وہ اوس وخزرج کی شاخیں ہیں مذہب اُن کو بنی اسرائیل کی طرف کھینچتا تھا، اور خون کا تعلق اپنے اُن رشتہ داروں کی طرف جو مسلمان ہو چکے تھے۔ آخر جو دلیر تھے وہ ایک طرف ہو کر یا یہودیت پر اڑ گئے یا سچے دل سے مسلمان ہو گئے لیکن ایسے دلیر کم ہمیشہ کم ہی ہوا کرتے ہیں کثرت ہمیشہ ہوتی ہے دل کے بودوں کی، خاص کر جہاں اس قسم کی کشمکش ہو۔ ناچار اوس و خزرج میں جو لوگ اس قسم کے تھے اُنھوں نے عموماً منافقت اختیار کی۔ ظاہر میں مسلمان تھے اور باطن میں یہودی یا یہودیوں کے طرفدار تھے مگر انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یونہی گومگو مریز میں گزارتے تھے، نہ ابھی یہودیت کو چھوڑتے تھے نہ قوم وقبیلہ ہی سے جو بیشتر مسلمان ہو چکے تھے، بگاڑ کرنا پسند کرتے تھے۔ یہودی تھے مگر اکثر معاملات میں قبیلہ کا ساتھ دیتے تھے۔ اس لیے ان کے باب میں مصلحت یہی ہوئی ہوگی کہ رسول اللہ ان کو اپنے اور اپنی جماعت کے ساتھ رکھیں اسی لیے مسلمانوں اور ان یہود کی ایک اتحادی جماعت بنا دی۔

مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی سال بھر تک محض دعوت اسلام اور اس کی تبلیغ میں مشغول رہے تھے کہ غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ کیوں ؟ اس کے بیان کا یہ موقع نہیں مگر یہاں اتنا بتانا ہی چاہیے کہ ابتدائی غزوات وسرایات میں صرف مہاجرین ہی قریش کے خلاف

جلتے رہے۔ بدر القتال پہلا غزوہ تھا جس میں انصار ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ اوّل اوّل رسول اللہ کو خیال رہا کہ دیکھیے انصار غزوہ میں شریک ہوتے ہیں یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے مدینہ میں حمایت و نصرت کا وعدہ کیا ہے نہ مدینہ سے باہر جا کر لڑنے مرنے کا۔ لیکن جب آپ نے انصار سے اس کا ذکر کیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کی رسالت پر ایمان لائے ہیں آپ کے ساتھ سمندر میں کود نے کو تیار ہیں تو آپ کو اطمینان ہوا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ کے آس پاس یہ نامہ جو میرے نزدیک ایک دستور العمل ہے، آپ نے مومنین قریش، انصار اور انصار ہی کے رشتہ دار یہودیوں کے باب میں لکھوایا۔ کہ ان یہودیوں سے (اس لیے کہ وہ ایمان نہ لانے کے باوجود اپنے مسلمان رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ تھے) عصبیت قومی کی بنا پر یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ شریک غزوات ہو جائیں، اسی لیے سرنامہ میں یہ الفاظ لکھوائے۔ ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم اور پھر ومن تبعنا من الیھود کے بعد صرف وہی قبائل نام بنام ذکر کیے، جن میں اسلام عام ہو چکا تھا اور یہودی کم رہ گئے تھے، اور وہ بھی کچھ ایسی حالت میں تھے کہ ظن غالب یہ تھا کہ وہ اپنے ہم قبیلہ مسلمانوں کا ساتھ دینگے۔ اسی لیے جن یہود سے یہ توقع نہ تھی یعنی بنی قینقاع، بنی نضیر اور قریظہ ان کا نام بھی اس نامہ میں نہیں ہے، نہ کبھی آپ نے ان کو جہاد میں شریک کرنا پسند کیا۔

رسول اللہ احد کو قریش کے مقابلہ کے لیے جا رہے تھے کہ عبداللہ ابن اُبی بن سلول جو راس المنافقین تھا رسول اللہ کے تہائی ہمراہیوں کو ساتھ لے کر آپ سے جدا ہوا اور مدینہ واپس چلا آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کیسا نازک وقت ہوگا۔ زہری سے روایت ہے کہ بعض انصار نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اپنے حلیف یہود (بنی النضیر اور قریظہ) کو نہ بلا لیں وہ آکر ہماری مدد کرینگے آپ نے فرمایا "لاحاجۃ لنا فیھم" نہیں ہیں ان کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہود بنی اسرائیل

کو کبھی آپ نے شریک جہاد نہیں کیا۔ اس لیے زیر بحث نامۂ نبوی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس میں
عام یہود مدینہ کے ساتھ معاہدہ پایا جاتا ہے یا ومن تبعنا من الیھود عام ہے اور یہود بنی اسرائیل
یہودی (نامسلم) رہ کر بھی اس نامہ کے تحت میں تھے یا آسکتے تھے، کسی طرح صحیح نہیں۔ مگر "متحد
قومیت اور اسلام" میں جو کچھ اس نامہ کے متعلق لکھا ہے اُس سے مفہوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے عام
اور تمام یہودی اس معاہدہ میں شریک تھے۔ اور رسول اللہ نے مومنین قریش، مدینہ کے انصا
اور مدینہ کے عام یہود سے ایک متحدہ قوم بنائی تھی۔ اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ اوس وخزرج کے
ان بطون کو جنہیں رسول اللہ انصار کا خطاب دیتے ہیں یہودیوں کے قبائل مختلفہ قرار دے د
ہے۔ چنانچہ صفحہ ۷۴ لکھا ہے

"یہ عہدنامہ بہت طویل ہے، جس میں مسلمانوں کے قبائل مہاجرین اور انصار کا تفصیلاً ذکر
کیا گیا ہے اور اسی طرح یہودیوں کے قبائل مختلفہ کا تذکرہ ہے"

حالانکہ اس نامہ میں نہ قبائل مہاجرین کا ذکر ہے نہ یہودیوں کے قبائل مختلفہ کا۔ بلکہ انصار کے قبائل اور
قبائل میں جو یہودی تھے اُن کا ذکر ہے۔ اگر کہا جاتا کہ قبائل مختلفہ کے یہودیوں کا تذکرہ ہے ت
یہ البتہ صحیح ہوتا۔ رہے یہود بنی اسرائیل ان کا نامہ میں کہیں نام ہی نہیں ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جن بطون وعشائر کا نام نامہ میں آیا ہے۔ جیسے وہ انصار اور مسلمانوں
کے قبیلے تھے ویسے ہی وہ یہود کے بھی قبائل تھے، اس مناظرانہ نکتہ آفرینی سے بس کیا کوئی بھی انک
کر سکیگا، لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کے پڑھنے والے بھی اس سے یہی سمجھتے ہیں یا نہیں
میں نے جس سے پوچھا مجھے کسی نے یہ مفہوم نہیں بتایا۔ یہ خدا جانے یا لکھنے والے کہ لکھنے کے وقت

---

[1] یہاں بحث اس نامہ سے اور اس امر سے ہے کہ مفروضہ متحدہ قومیت میں یہود بنی اسرائیل بھی شامل تھے یا نہیں
اس سے بحث نہیں ہو کہ یہود بنی اسرائیل کسی طرح بھی رسول اللہ اور مسلمانوں کے حلیف تھے یا نہیں وہ حلیف تھے مگر اس حیثیت
کہ اوس خزرج کے حلیف تھے نہ اس حیثیت سے کہ اس نامہ کے ماتحت تھے۔ اور فرضی متحدہ قوم میں شامل۔

دل میں کیا خیال کیا تھا۔ کتاب میں مجھے یہ مفہوم کہیں نہیں ملا۔ کتاب کی عبارت سے وہی مطلب نکلتا ہے جو ہم نے بیان کیا اور پڑھنے والوں نے بھی عموماً یہی سمجھا۔

ابھی مفروضاتِ خیالی میں ہمارے سامنے ایک فرض اور باقی ہے کہ ہم یہ بھی فرض کریں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہ صرف ایک متحدہ قومیت بنائی اور ضرور بنائی بلکہ صرف رشتۂ ہموطنیت کی بنا پر بنائی۔ لیجئے ہم نے یہ بھی فرض کر لیا۔ جس عالم، علماء کی جماعت، جس مسلمان، مسلمانوں کی جماعت میں طاقت ہے، ہندوستان میں مسلم و غیر مسلم کے ارتباط سے متحدہ قوم بنائے اور محض رشتۂ ہموطنیت کی بنا پر بنائے۔ مگر ایسی تو بنائے کہ اس میں غیر مسلم تابع ہوں اور مسلم متبوع، اور اس کو اُمَّۃً مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ بھی اگر کوئی چاہے تو کہہ دے اور پھر اس پر کوئی یہ کہنے والا نہ ہو کہ یہ کیا کہا۔ جیسے رسول اللہ نے زبان ہی سے نہیں کہا بلکہ لکھوا دیا تھا کہ وان یہود بنی عوف اُمَّۃً من المؤمنین۔ لیکن متحدہ قومیت اور اسلام میں تو ہم یہ لکھا ہوا پاتے ہیں "مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے مل کر ایک قوم بننا یا بنانا نہ تو ان کے نفسِ دین میں خلل انداز ہے اور نہ یہ امر فی نفسہٖ اسلامی قوانینِ اجتماعیہ کے خلاف ہے، نامۂ مبارک اور اس کی نصی دلالت کی بنا پر غیروں کو اپنے میں ملا کر متحدہ قومیت بنانا مسلّم، لیکن مل کر متحدہ قوم بن جانا، مغلوبانہ نہ سہی مرتبۂ مساویانہ سہی اِس نامہ کی کون سی دفعہ کون سے فقرہ اور کون سے الفاظ سے ثابت ہوا۔ اور وہ کون سے زمانہائے سابقہ تھے جس میں مسلم باختیارِ خود ایسی قوم بن کر رہے اور اس امر کو اس نامۂ نبوی یا کسی اور حکم مذہبی کے مطابق بھی مانا۔ کاش یہ باتیں بھی رسالہ میں کہیں موجود ہوتیں کہ ہمیں اس سوال کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

اگر غیر مسلموں میں مل کر قوم بننا اجتہاد پر مبنی ہے تو ایسے اجتہاد کی خواہ وہ کسی کا ہو نصِ صریح کے مقابلہ میں قدر و قیمت معلوم، رسول اللہ سرنامہ نامۂ مبارک میں فرمائیں وَمَنْ تَبِعَھُمْ فَلَحِقَ بِھِمْ وَ جَاھَدَ مَعَھُمْ۔ اور یہی بات سارے نامہ میں ظاہر نظر آئے مگر متحدہ قومیت کے داعی و حامی اس کے برعکس کا دعویٰ کریں اور پھر اسی نامہ سے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کریں ھٰذا واللّٰہِ لَشَیْءٌ عُجَابٌ۔

تبرکات

(۱) علم و عشق

حضرت علامہؒ کے کلام میں علم و عشق یا فکر و نظر کے الفاظ بڑی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ سطح بین نگاہیں بعض مقامات پر ان کے صحیح مفہوم کا کماحقہٗ ادراک نہیں کر سکتیں جو بعض اوقات غلط فہمی کا موجب بن جاتا ہے۔ حضرت علامہؒ نے اپنے ایک مکتوب گرامی (بنام خواجہ غلام السیدین صاحب) میں ان الفاظ کا مفہوم واضح کیا ہے جسے بصد فخر درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے:۔

علم حق اول حواس آخر حضور   آخر او می نگنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامے میں کئی اشعار ہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں   علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کو لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا ... مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے۔ "بولہب را حیدر کرار کن"۔ اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہئے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے سراسر رحمت ہے۔

(۲) فنون لطیفہ

ہمایوں بابت مئی ۱۹۳۸ء میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے حضرت علامہ سے اپنی ایک ملاقات کی روئداد شائع کی تھی۔ اس میں سے فنون لطیفہ سے متعلق اقتباس بہ مسرت درج کیا جاتا ہے۔ قارئین اس امر کو ملحوظ رکھیں۔ کہ اس روئداد کی حقیقت روایت بالمعنی کی سی ہے۔ اس میں مندرجہ صدر

مکتوب گراں کی طرح الفاظ حضرت علامہؒ کے نہیں ہیں۔

سوال:۔ آجکل ہندوستان کے "نیشنل انتھم"[1] کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے آپ کی اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے۔

ڈاکٹر صاحب: "نیشنل انتھم" تو اس صورت میں ہو کہ کوئی "نیشن"[2] ہو۔ جب سرے سے نیشن ہی کا کوئی وجود نہیں ہے تو "نیشنل انتھم" کہاں ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی "نیشنل انتھم" کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سوال:۔ بندے ماترم پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی ہے۔ دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب (ذرا گرمی سے) آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں؟ ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالیے کہیں گرمی نظر نہیں آئیگی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثنار ہے۔ رامائن۔ اور وہ بھی بعض بعض حصوں میں۔

سوال:۔ مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاص ہیجان انگیز ہے۔ قوالی میں ایسی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح کسی قسم کے نشے سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کر لے۔

سوال:۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہو کا میلہ ہوتا ہے۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ ایکدم حال میں آجاتے ہیں کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک Cult (دستور) بنا لیا ہے۔ یہ حالت واقعی اُن پر طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے جوشِ جذبات کو اس طرح سے فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا۔ اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور اُن کو باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے۔ اور حال انھیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت عام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے مسلمان جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انھوں نے قبول کر لی۔ اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ

---

[1] قومی ترانہ   [2] قوم

فن تعمیر کے سوا فنون لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا۔ اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بت بھی تھے جن میں قوت و ہیبت کی ایک ایسی شان تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہوا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہرا دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیوؤں کا۔ مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا!

پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔ میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا۔ مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر "ھُوَ الْغَالِبُ" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا۔ تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔ مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آ گیا ہے۔ اور در اصل یہ قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لئے توازن قائم کرتا ہے۔

سوال:۔ دلی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ وہ تو ایک بیگم ہے۔

ہم اس فقرے پر ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پر اسلامی تعمیرات کے متعلق یہ دلکشا بحث ختم ہوئی۔ ......"

عورت کی حیثیت

(از جناب شیخ سراج الحق صاحب بی اے)

کہتے ہیں کہ شاہجہاں کو جب بیٹے نے قلعہ میں نظر بند کر دیا تو اس نے کہلا بھیجا کہ چند لڑکے میرے پاس بھیجدیئے جائیں جن کو میں پڑھاتا رہوں۔ آپ اس واقعہ کو سُنکر مسکرا دیجئے۔ معزول بڈھے کے اس جذبہ کو طفلانہ پن کہکر اس کی ہنسی اُڑائیے۔ لیکن یقین مانئے کہ آپ خود اپنی نفسیاتی کیفیت کا جب تجزیہ کرینگے تو معلوم ہو جائے گا کہ شاہجہاں نے محض اپنے جذبات ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ نوع انسانی کے قلوب کی ترجمانی کی ہے۔ حکومت کا جذبہ انسان میں فطری معلوم ہوتا ہے ہر شخص کسی نہ کسی دائرے میں حکمران ہونا چاہتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر شخص حکمران ہو کیسے؟ لہٰذا عام انسانوں نے اس جذبہ کی تسکین کے لئے امیال وعواطف سے کام لیا۔ احتیاج۔ محکومیت و زیر دستی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے انسانی زندگی میں جہاں جہاں اور جس جس گوشہ میں احتیاج تھی وہیں زبردستی کے آثار اُبھرنے شروع ہو گئے۔ بیٹا باپ کا محتاج ہے اِس لئے اس کا مطیع و فرمانبردار۔ لیکن وہی باپ جب بیٹے کا دست نگر ہو جاتا ہے تو بیٹے کا تابع فرمان ہو جاتا ہے۔ غریب دولتمند کا محتاج ہے۔ اس لئے خدمتگذار بھی ہے۔ شاگرد اُستاد کا محتاج ہے۔ لہٰذا استاد کا ہر قسم کا استبداد جائز ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن یہ تمام حالتیں ایسی ہیں جن میں گردش دولابی جاری ہے۔ کوئی شکل مستقل نہیں ہے۔ ہر ایک کیفیت تغیر پذیر ہے اور انسان چاہتا ہے حکومت مستقل تاکہ وہ اپنے جذبہ کی تسکین میں کبھی زیادہ دقت محسوس نہ کرے۔ انسان کی نوعی اور عمرانی زندگی میں ایک گوشہ ایسا ہے جہاں احتیاج کا یہ سلسلہ ناقابل تغیر ہے۔ یعنی مرد و عورت کے وظائف زندگی کی جو تقسیم فطرت کی طرف سے ہوتی ہے اس میں عورت اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں مرد کی حفاظت و کفالت کی محتاج رہتی ہے۔

حکومت طلب انسان کو یہ گنجائش خدا دے۔ اس نے عورت کے اس نازک پہلو سے ایسا فائدہ اُٹھایا کہ فطرت بھی اپنی ہنسی نہ تھام سکی ہوگی۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ ایک ایسا مرد جو باہر کی دُنیا میں ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کا زیر فرمان ہو جب گھر کی چار دیواری میں قدم رکھے گا تو جذبہ حکومت کی تمام اُمنگیں ایک ایک کر کے اُبھرتی چلی آئیں گی۔ حتیٰ کہ وہ ایک مطلق العنان حاکم کی صورت اختیار کرے گا کہ جس کے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں۔ اور جس کے حکم کی کوئی تاویل نہیں۔ جب یہ جذبہ آپ انفرادی طور پر محسوس کرتے ہیں تو اندازہ لگائیے کہ انسان نے بہ ہیئیت اجتماعی اپنے عہد طفولیت سے آج تک اس جذبہ کی تسکین کی خاطر عورت کو محکوم رکھنے کے لئے کیا کچھ تدابیر نہ کی ہونگی۔ تمدن۔ معاشرت۔ عمرانیت۔ اقتصادیات۔ مذہب۔ رسوم۔ قانون۔ غرضیکہ ہر پہلو اور ہر گوشے سے مختلف زنجیریں پیدا کی گئیں جو مختلف ناموں سے عورت کو پہنائی گئیں۔ معتقدات کا غیر محسوس اثر سب سے گہرا نقش پیدا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ سوسائٹی میں عورت کا وجود نہایت گھناؤنا اور پست قرار پاگیا۔ ادنیٰ ترین مخلوق۔ بے روح انسان۔ منحوس ہستی۔ نوع انسانی کے تمام مصائب کی علت العلل۔ ہر ایک فتنہ وفساد کا بنیادی سبب۔ ناقص العقل۔ اشر المکائد غرضیکہ دنیا کا ہر معیوب خطاب اس کی طرف منسوب کیا گیا۔ نہ سوسائٹی میں اس کی پوزیشن ہے نہ کسی ملکیت میں اسکا حق ہے نہ کسی معاملہ میں اس کی کوئی رائے ہے۔ نہ کسی فیصلے میں اس کی بات کی کوئی وقعت ہے۔ یہ تھی وہ حالت جو انسانی استبداد نے اپنی ہی ہم جنس نوع کے ساتھ روا رکھ چھوڑی تھی لیکن فطرت کو یہ غیر فطری تقسیم کس طرح مرغوب ہوتی۔ وہ اس ظلم ناروا کو کب تک برداشت ہونے دیتی۔ چنانچہ خالق فطرت نے اپنا آخری پیغام انسانوں کی طرف بھیجا۔ اور اس میں کھلے کھلے الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ تم نے نوع انسانی کی نصف آبادی کو غلامی کی جن بوجھل زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے یہ سرتاسر غیر فطری ہیں۔ ناروا ہیں۔ تمہارے جور و ستم کی زندہ مثالیں ہیں۔ تمہارے تسلط و تغلب کے ناخوش آئند جذبہ کی پائندہ داستانیں ہیں۔ یاد رکھو تمہاری تخلیق ایک نفس واحد سے ہوئی ہے۔ فرائض زندگی کا فرق صرف فطرت کے تقسیمِ عمل کا فرق ہے۔ اس سے آگے اور تمام امتیازات تمہارے اپنے پیدا کردہ ہیں جن کی تمہارے پاس کوئی سند نہیں۔ کوئی سلطان نہیں۔ کوئی دلیل نہیں۔ کوئی برہان

نہیں۔لڑکی پیدائش کی گھڑی سے منحوس خیال کی جاتی تھی۔قرآن کریم نے بالتصریح فرمادیا کر یاد رکھو بیٹے اور بیٹیاں سب خدا کی دین ہیں جسے چاہے بیٹے دے۔جسے چاہے بیٹیاں دے۔اس میں سعد ونحس کا کیا واسطہ۔پھر باپ کے ہاں لڑکی کی پوزیشن خاندان کے مردوں کے رحم پر ہوتی تھی! انگلستان کے قانون وراثت میں لڑکی کا ذکر ہی نہ تھا۔ ہمارے ہندوستان میں جو کچھ لڑکی کو دیا جاتا تھا وہ دان ہوتا تھا بطور استحقاق کے وہ کچھ نہیں لے سکتی تھی۔قرآن کریم نے باپ کی وراثت میں لڑکی کا حصہ لازمی رکھا۔اور وہ اسے بطور استحقاق وصول کرسکتی ہے۔نکاح کے معاملہ میں تو لڑکی اپنی زبان تک نہ ہلا سکتی تھی۔ جیون بندھن اس کی پیدائش سے بھی پہلے کا مقدر ہوتا تھا اور مرنے کے بعد تک رہتا تھا۔قرآن کریم نے نکاح کے بارے میں عورت کو پورا پورا اختیار دیا ہے۔پھر نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے ناقابل انفکاک "سیکرے منٹ" Sacrement نہیں کہا۔جب تک باہمی تعلقات کی خوشگواری سے گھر جنت ارضی کا نمونہ بنا رہے۔معاہدہ استوار ہے۔لیکن اگر بعض حالات کے ماتحت اختلافات ایسے شدید و وسیع ہو جائیں کہ بنائے نہ بنے۔تو بجائے اس کے کہ باقی عمر جہنم کی آگ میں بسر کی جائے مخصوص شرائط و قیود کے ماتحت اس معاہدہ کو توڑ دینے کی بھی اجازت دی گئی۔گھر میں بیوی کی حیثیت ایک غلام کی سی نہیں۔ بلکہ رفیق حیات کی سی ہے۔مشیر کار کی سی۔کچھ حقوق مرد کے عورت کے ذمے ہیں۔کچھ عورت کے مرد کے ذمہ ہیں۔ان کی ادائگی۔فرائض متعینہ کی بجا آوری۔ دونوں پر لازم ہے۔دونوں میں سے جو بھی ان میں کوتاہی کرے۔تساہل برتے۔تغافل پر اُتر آئے۔قابل مواخذہ ہے۔پھر شوہر کے ترکہ میں بیوی کا حصہ ہے۔اس کے بعد بہ حیثیت ماں۔اس سے حسن سلوک کا ارشاد ہے۔احسان و مروت کا حکم ہے اور حکم بھی بڑا تاکیدی۔پھر اولاد کے ترکہ میں بھی اس کا حصہ ہے۔سوسائٹی میں اس کی شخصیت بجائے خویش مستقل ہے۔ انگلستان کے قانون و رواج کے مطابق شادی کے بعد عورت اپنا ذاتی تشخص بالکل کھو دیتی ہے۔اس کی اپنی حیثیت خاوند کی حیثیت میں مدغم ہو جاتی ہے۔حتیٰ کہ اس کا اپنا نام بھی باقی نہیں رہتا۔اس کا تعارف اس کے خاوند کی وساطت سے ہوتا ہے۔برعکس اس کے اسلامی سوسائٹی میں عورت اپنا مستقل تشخص رکھتی

ہے جو اس سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں ہوتا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اسلام سے پیشتر عورت کی حیثیت کیا تھی۔ اور اسلامی شریعت نے اُسے کہاں سے کہاں . . پہونچا دیا۔ اور پھر خوبی یہ ہے کہ عورت کی حیثیت کو اتنا بلند کر دینے کے باوجود تقسیم عمل کے لحاظ سے جو فطری اختلاف عورت و مردِ کے وظائف زندگی میں رکھا گیا ہے۔ اسے کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یورپ وعمل میں ہمیشہ متشدد رہا ہے۔ وہاں کی عورتوں نے اگر آج مردوں سے انتقام لینا چاہا ہے تو وہ "مساوات نوعی" کی دُھن میں یہ بھی بھول گئی ہیں کہ فطرت نے انکی تخلیق کا ایک مقصد رکھا ہے اور اس مقصد کی برآوری کے لئے انھیں نازک جذبات کا حامل بنایا ہے۔ عورت اس وقت تک عورت ہے جب تک وہ ان نازک حسیات کی مالک ہے ورنہ جس طرح ایک مرد زنانہ صفات و جذبات کی نقالی سے مرد نہیں رہتا۔ اسی طرح ایک عورت بھی مرد بننے کی ناکام کوشش میں اپنی مخصوص صفات کھو بیٹھتی ہے۔ عورت ہونا اور عورت ہی رہنا۔ کوئی ذلّت کی بات نہیں۔ اس خصوصیت کو مٹانے کی ہوس فطرت کی تضحیک ہے۔ اگر اُسے ایک زمانہ سے مرد کے استبداد نے ٹھکرا رکھا ہے تو وہ آئے اور دیکھے کہ اسلام کی تعلیم فطرت میں اسے کتنا بلند درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا مرد و عورت کی تمیز اُٹھا دینے کے یہ تمام وقتی ہنگامے بیکار ہیں۔ حیا، رافت، محبت، نرم دلی، پرورشِ اولاد، عصمت، رفاقت وغیرہ عورت کی خصوصیات میں سے ہیں۔ یہ اس کے فطرت کی طرف سے عطیات ہیں۔ یاد رکھیے! جس نے فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کی وہ کوئی نوع ہو۔ کوئی قوم ہو۔ کسی ملک میں ہو۔ کسی زمانے میں ہو۔ فطرت اسے سزا دے کر رہے گی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اسلام اور جمہوریت (ایک مسلمان)

یوں تو جس دن سے اسلام نے اپنے اوّلین گہوارہ سے قدم باہر نکالا اُسے قسم قسم کی طاغوتی مخالفتوں سے سابقہ پڑنا شروع ہوگیا۔ اسلیئے کہ "آدم" اور "ابلیس" کی تخلیق ساتھ ہی ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جس قوت اور شدّت سے ابلیسانہ سازشیں اِس دَور میں اسلام کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں۔ اِس سے پیشتر شاید ہی ایسا محاذ دیکھنے میں آیا ہوگا۔ بالخصوص اسلیئے کہ آج مخالفانہ قوتیں کچھ اس قسم کے دلکش اور حسین نقابوں میں رُوپوش اور ایسے مشفقانہ اور ناصحانہ خرقوں اور لبادوں میں ملبوس سامنے آتی ہیں کہ حق و باطل میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ "اسلام آزادی کا مذہب ہے"۔ بجا اور درست! لیکن اِس سے مفہوم کیا لیا جاتا ہے۔ یہ کہ انسان خدا کا منکر ہو۔ پکّا ملحد اور دہریہ بنجائے۔ یورپ کی مادّہ پرستی کو منتہائے نگاہ سمجھے۔ مذہب کی تضحیک اسکا شیوہ ہو۔ شعائرِ الٰہی کا استہزا، اسکا شعار ہو۔ یہ سب کچھ کرے۔ لیکن بایںہمہ مسلمان کہلائے، اور مُصر ہو کہ اُسے بہترین مُسلمان سمجھا جائے۔ اسلیئے کہ اسلام "آزادی" کا مذہب ہے۔ آواز اٹھتی ہے کہ "اسلام مساوات کا مذہب ہے"۔ اس میں کسے کلام ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ پیش کیا جاتا ہے کہ روس کی بالشوزم عین اسلام ہے۔ قرآن کریم میں عفو اور درگذری کو بھی صفات محمودہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اس سے جھٹ اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ اسلام اہنسا کی تعلیم دیتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہودیوں سے معاہدہ کیا۔ اِس سے فوراً "متحدہ قومیّت" کے جواز کا فتویٰ لے آئے۔ حضورؐ نے ہجرت کے وقت ایک غیر مُسلم کو مدینہ کا راستہ دکھانے کے لیے متعین فرمایا۔ اِس سے گاندھی جی کی سیاسی امامت کی دلیل مل گئی۔ عربی کا ایک مقولہ "حب الوطن من الایمان" سن پایا۔ اس سے علی الاعلان یہ نظریہ پیش کر دیا کہ قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا کہ

ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف اقوامِ عالم کے اندر اپنے رسول بھیجے۔ اس سے فوراً یہ کلّیہ قائم ہو گیا۔ کہ عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب (جس حالت میں وہ آج ہیں) بالکل برابر ہیں غرضیکہ ایک ایک غیر اسلامی نظریہ کو قرآن و حدیث کے الفاظ کا نقاب اُڑھا کر یکسر اسلامی اصول ومبانی کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور یوں کفر و باطل کی ان اسلام سوز آرزوؤں کو ایک ایک کرکے پورا کیا جاتا ہے۔ جو ایک عرصے سے خدا اور اُسکے دین کے دشمنوں کے سینوں میں مچل رہی تھیں۔ "شرارِ بولہبی" کو حجازی فانوس میں رکھ کر اُسے "چراغِ مصطفوی" نام دیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ اِس فانوسِ خیالی کو توڑ کر حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے تو کافرگری کے ترکشوں کے بتر چلّوں پر چڑھا لیے جاتے ہیں۔ اور مُرتد سازی کی نیاموں سے تلواریں سونت لی جاتی ہیں۔ توبہ! توبہ!!

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد که جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا پرستارِ مومن و کافر تراشد

یہ دَور ہماری سیاسی تحریکات کا پیدا کردہ ہے اور انہیں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا جا رہا ہے، اسی کا شاخسانہ ہے۔ وہ بحث جو آجکل ہمارے قومیت پرست "جاں نثارانِ ملت" کے قلوب و اذہان کے لیے وجۂ صد پریشانی اور باعثِ ہزار کاوش بن رہی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں مسٹر جناح نے کہیں یہ کہہ دیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر جمہوری نظامِ حکومت مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ چونکہ مسٹر جناح کے اِس نظریہ کو تسلیم کر لینے سے ہندوؤں کے تمام مقاصد و عزائم جو "رام راج" کی تشکیل و تمکین کے لیے اُنکے تصوّرات کو مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ خاک میں ملجاتے ہیں۔ اسلیے سب سے پہلے گاندھی جی۔ مہاتمایت کا چولہ پہنے۔ رام نام کی مالا جپتے۔ واردھا کی کٹیا سے باہر نکلے۔ اور اپنی پوری شان "شیخ الاسلامی" کے ساتھ فرمایا کہ میں قرآن و سیرت کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرت اِس حقیقت کبریٰ کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح کا یہ نظریہ یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ وہ اتنا کہہ کر پھر کٹیا میں تشریف لے گئے۔ اور اپنے

چیلوں کو اشارہ کر گئے کہ ہاں! ذرا زور سے۔ بس پھر کیا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ علمار کبار کا مقدس طائفہ ایک طرف سے یلغار کر کے آگیا۔ "شریعت" قسم کے مسلمان دوسری طرف سے اُمنڈ آئے۔ اور ملک میں ایک شور برپا کر دیا گیا کہ:-

اسلام جمہوریت کا مذہب ہے

جناح کا یہ نظریہ سرتاپا اسلام کے خلاف ہے!

ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے کہ یا اللہ تو اپنے دین کا آپ ہی رکھوالا ہے اگر ان لوگوں کے بس میں ہو تو نہ معلوم کیا سے کیا کر دیں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ مسٹر جناح کا ہر قول قرآنی نظریہ کی سند نہیں ہو سکتا۔ اور انھوں نے خود بھی کبھی اس امر کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اسلامیات کے ماہر اور کتاب و سنت کے عالم ہیں۔ لیکن یہ اللہ کی دین ہے کہ اُسنے اس خلفشار کے زمانہ میں ملتِ اسلامیہ کے اِس حقیقی دردمند کی نگاہوں کو وہ بصیرت عطا فرمادی ہے کہ وہ اپنی فطرتِ صالحہ کی مدد سے احوال وظروف کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، وہ بالعموم قرآن کی تعلیم کے مطابق ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کی سند میں قرآن کی کوئی آیت یا رسول اللہؐ کی کوئی حدیث نہ بھی پیش کر سکتے ہوں لہذا یہ دعوےٰ کہ چونکہ یہ خیال ایک "مسٹر" کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ حجت اور سند صرف وہی نظریہ ہو سکتا ہے جو کسی "مولانا" کی مہرِ تصدیق سے منصۂ شہود پر آئے۔ خالص برہمنیت ہے۔ مجرّد قول نہ کسی مسٹر کا حجت ہو سکتا ہے نہ کسی مولانا کا بلکہ صرف وہ جس کو خدا اور اسکے رسولؐ کی بارگاہ عالیہ سے سند عطا ہو جائے۔ آیئے، ہم دیکھیں کہ مسٹر جناح نے کیا کہا اور اسلام کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ وہ اہم مسئلہ تھا جس کی توضیح کے لیے آنکھیں رہ رہ کر اس مردِ حق آگاہ کو ڈھونڈھتی ہیں جو شاہی مسجد لاہور کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہے۔ لیکن ....

---

* "اسلام جمہوریت کا مذہب ہے"۔ لاریب فیہ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس جمہوریت کے معنے کیا۔

ہیں جسکا علمبردار اسلام ہے۔ کیا وہ یہی جمہوریت ہے جو مغرب کی ٹکسالوں سے نکلکر دُنیا کے بازاروں میں دراہم کاسدہ کی طرح ماری ماری پھرتی ہے۔ یا اس سے کچھ الگ۔ جب تک یہ بنیادی مسئلہ طے نہیں ہو جاتا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کہ مسٹر جناح نے کیا کہا ہے۔ اور اُنکے اعلان کی مخالفت کرنے والے قوم کو کدھر لیئے جا رہے ہیں۔

مروجہ جمہوری نظام حکومت کے معنیٰ یہ ہیں کہ عوام اپنے نمائندے منتخب کریں۔ اور ان نمائندگان کی کثرتِ آراء سے تمام اُمور کا فیصلہ ہوا کرے۔ اور یہ فیصلے ملک میں قانون کی حیثیت سے نافذ کیئے جائیں۔ اِس نظامِ حکومت میں پہلا مرحلہ "انتخاب" کا ہے۔ چونکہ اُمیدواران اور رائے دہندگان دونوں کے پیشِ نظر معیارِ فضیلت جوہر ذاتی نہیں۔ بلکہ مختلف قسم کے دیگر رجحانات ہوتے ہیں۔ اِس لیئے معرکۂ انتخاب میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس قسم کے نمائندے انتخاب میں کامیاب ہو کر آتے ہیں۔ اس کی حقیقت ہر اُس شخص کے سامنے ہے۔ جس کی نگاہ ہماری مختلف مجالس اور انکے عناصر ترکیبی پر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ طریق انتخاب میں اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور ایسی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ جن سے بہترین نمائندے ہی منتخب ہوا کریں۔ ہم اِسوقت اِس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتے۔ کہ جس قسم کا ماحول مغربی نظامِ زندگی نے پیدا کر دیا ہے۔ اس میں اس قسم کی اصلاح کی کس قدر گنجائش ہے ہم تو صرف ان نتائج سے بحث کر رہے ہیں۔ جو اِس نظامِ زندگی سے آج کل پیدا ہو رہے ہیں جب مغربی نظامِ انسانیت کو اتنی بلندی پر لے جائیگا۔ کہ عوام اپنے قلبی اور ذہنی رجحانات اور مادّی مفاد پر حقائق کو ترجیح دینے لگ جائیں۔ یہ اسوقت دیکھا جائیگا۔ اِسوقت نظامِ جمہوریت کی دوسری شق کو لیجئے۔ یعنے کثرتِ آراء۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیئے کہ اگر کسی مجلسِ قانون سازمیں یہ مسئلہ پیش ہو کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ اور (۵۱) اراکین کی رائے نفی کی طرف ہو تو (۴۹) اراکین کو ماننا پڑے گا کہ (نعوذ باللہ) خدا کا وجود نہیں ہے۔ ہر چند خدا کی ہستی پر انکا ایمان ہو۔ اگر وہ ملک کے اس فیصلہ کے خلاف جو قانونی حیثیت اختیار کر چکا ہوگا اپنے ایمان پر قائم رہیں تو وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہونگے

اور مستوجب سزا۔ یہ ہے مغرب کا وضع کردہ نظامِ جمہوریت۔ کہئے کہ اس نظام کی روسے اقلیت یہ دعوےٰ کرسکتی ہے کہ اُسے آزادی حاصل ہے اس نظام میں اقلیت کی کیا حالت ہوگی۔ یہ ہم سے نہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنٰی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (میری کہانی جلد دوم ص۵۵۴)

سنئے کہ گاندھی جی لکھتے ہیں کہ "نظام جمہوری میں اقلیتوں کو کسی نہ کسی حد تک غیر مطمئن رہنا ہی پڑے گا۔" (اسٹیٹس مین ۴۸/۱۱) اور گاندھی جی کے یہ الفاظ ان دنوں کہے جا رہے ہیں۔ جب کہ انہیں ضرورت ہے کہ اقلیتوں کو یقین دلائیں کہ "آزاد" ہندوستان میں ان پر کسی قسم کا جور و استبداد نہیں ہوگا۔ اسی لیئے ذرا دبی زبان سے اس امر کا اقرار ہو رہا ہے۔ کہ نظامِ جمہوریت میں اقلیت کو کس حد تک آزادی ملتی ہے۔ یہ ہے مغرب کا جمہوری نظام!

اب ذرا اس نظامِ حکومت کو ہندوستان کے موجودہ احوال وظروف پر منطبق کرکے دیکھئے کہ نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ طریقِ انتخاب کا ہے۔ اگرچہ آج کل یہ طریق جُداگانہ انتخاب (Separate electorates) کا ہے لیکن ظاہر ہے کہ آزاد ہندوستان میں سب سے پہلا قانون یہی پاس ہوگا کہ طریقِ انتخاب مخلوط (Joint electorates) ہونا چاہیئے۔ اسلیئے کہ جُداگانہ انتخاب۔ متحدہ قومیت کی تشکیل میں سدِّراہ ہے۔ بہر حال طریقِ انتخاب کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ مجالسِ قوانین ساز اور حکومت کے دوسرے شعبوں میں مسلمان بہر کیف اقلیت میں ہونگے۔ اور چونکہ اس نظام کی رُو سے فیصلے اکثریت کی آرا کے مطابق ہونگے۔ اسلیئے ہوگا وہی جو ہندوؤں کی اکثریت چاہے گی۔ یہ ایک ایسی کُھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جسے اللہ نے تھوڑی سی بصیرت عطا کی ہے۔ اسے بے نقاب دیکھ سکتا ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں گاندھی جی اور ان کی پُوری جماعت سے۔ جن میں ہمارے نیشنلسٹ علما حضرات بھی شامل ہیں۔ کہ کیا نظامِ حکومت ایسا ہے، جسے اسلام کے ساتھ کہیں دُور کا بھی

تعلق ہو۔ ہم چیلنج دیتے ہیں قومیت پرست علماء کے پورے گروہ کو کہ کتاب وسنت وآثار سے کوئی ایک سند ایسی پیش کریں۔ جس کی رو سے اسلام اپنے متبعین کے لیے اس قسم کے نظامِ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام آزادی قرار دیتا ہو۔ حیرت ہے کہ ان حضرات کی بصیرت وفراست کو کیا ہوگیا؟ انکے نزدیک کوئی شخص اکیلا ڈاکہ ڈالے تو وہ مجرم ہے۔ انسانیت کا دشمن ہے لیکن اگر ڈاکوؤں کی جماعت ملکر کثرت رائے سے کہیں ڈاکہ ڈالیں۔ تو یہ ڈاکہ (نعوذ باللہ) عین اسلام کے مطابق ہے۔ اس لیئے کہ یہ ڈاکہ جمہوری نظام کے ماتحت واقع ہوا ہے۔ انکا خیال ہے کہ اگر دو آدمیوں کے مقابلہ میں ایک آدمی، دو اور دو پانچ کہے تو یہ غلط ہوگا۔ لیکن اگر پانچ آدمی یہی کہہ دیں تو پھر یہ بالکل صحیح ہوجائیگا۔ اسلیئے کہ اب اُسے جمہوریت کی سند حاصل ہوجائے گی۔ اگر کسی مسئلہ کی صحت کے لیئے یہی سند کافی ہے کہ اکثریت اُسکے حق میں ہے تو آپ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا خود خدا ماننے والوں کے مسلک کی تردید کیوں کرتے ہیں حالانکہ وہ اکثریت میں ہیں۔ دُور کیوں جایئے۔ خود ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ہندو اکثریت میں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حق وہی ہے۔ جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو تو پھر ہندوؤں کو حق پر ماننا پڑیگا۔ ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ یہ تو مذہب کے معاملات ہیں نظامِ حکومت سے اُنہیں کیا واسطہ! لیکن سوال یہاں مذہب اور حکومت کے شعبوں کا نہیں بلکہ اس بنیاد کا ہے جسپر جمہوری نظام کا نظریہ قائم ہے۔ اور وہ بنیاد یہ ہے کہ اکثریت اقلیت کے مقابلہ میں برسرِ حق ہوتی ہے، یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ اور جب بنیاد ہی غلط ہے تو جسقدر عمارت اسپر تعمیر ہوگی سب غلط ہوگی۔ خواہ اس میں حکومت کا کمرہ الگ ہو۔ اور مذہب کا الگ
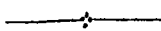
اب اسلام کیطرف آیئے۔ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام میں نظامِ حکومت۔ جمہوریت ہے، یا آمریت؟ اور سوال کرتے وقت جمہوریت اور آمریت سے ذہن میں وہ نظام ہوتا ہے جو یورپ کی پیداوار ہے۔ لہٰذا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت نہ وہ جمہوریت ہے جو آج کل مروّج ہے نہ وہ آمریت۔ اسلام ان نظام ہائے حکومت سے جو ذہنِ انسانی نے وضع کیئے ہیں۔ بالکل الگ

جُداگانہ اور مخصوص نظامِ حکومت کا پیامبر ہے اور یہی وہ فرق ہے جسے نظرانداز کردینے سے اسلام کے متعلق غلط تصورات ذہن میں قائم کرلیے جاتے ہیں۔ جمہوریت سے مُراد یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اکثریت کو حاصل ہوتا ہے۔ اور آمریت سے مفہوم یہ ہے کہ یہ اختیار ایک فردِ واحد کی ذات میں مرکوز ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں حکومت کا اختیار نہ اکثریت کو حاصل ہے نہ ایک فرد کو، وہاں حکومت کا اختیار انسانوں سے بلند وبالا ایک ذات کو حاصل ہے، جسے خدا کہتے ہیں ان الحکم الا للّٰہ (حکومت کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے) اسلام کا بنیادی اُصولِ حکومت ہے۔ خدا کے سوا کسی اور میں حکومت کے اختیار کا عقیدہ اُسکے نزدیک شرک ہے اُسکے نزدیک ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اک وہی۔ باقی بتانِ آزری

حکومت، قوانین کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اور ان قوانین کے اُصول وضوابط اللہ تعالیٰ نے خود مرتب فرماکر اپنی زندہ جاوید کتاب میں محفوظ کردیے ہیں۔ اسلیۓ تمام اُمور کے فیصلے اِس ضابطۂ خداوندی کے ماتحت ہونگے جو ایسا نہ کریگا وہ حکومتِ الٰہی کا انکار کرنیوالا ہوگا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ ۔ فاولئکَ ھُمُ الکافِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

(جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ وہ لوگ انکار کرنیوالوں میں سے ہیں!)

ان قوانین کی تنفیذ انسانوں کے ہاتھ سے ہوگی اور انسانوں کا وہ گروہ جو ان کی تنفیذ کا ذمہ دار ہوگا۔ حزب اللہ۔ یا ملّتِ اسلامیہ کہلائیگا۔ یہی وہ جماعت ہے جو کتاب اللہ کی وارث قرار دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں قوانینِ الٰہیہ چونکہ اصولی اور اساسی شکل میں ہیں، اسلیۓ اِس جماعت کا کام یہ ہوگا کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے احوال وظروف کے مطابق جزئیات و فروعات کو ترتیب دے اور اسکے بعد ان قوانین کو دُنیا میں نافذ کردے۔ اِن مقاصدِ عالیہ کو بروئے کار لانے کے لیۓ ایک نظامِ عمل (نہ کہ نظامِ حکومت۔ بہ اصطلاحِ مروجہ) کی ضرورت ہے۔ یہ نظام جیسا کہ کتابِ سنت و آثار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، نہ تو خالصتہً جمہوریت ہے نہ آمریت بلکہ

ان کو سمویا ہوا سا ہے۔ یعنی ان کی خوبیاں اس نظام میں موجود ہیں۔ اور ان کی بُرائیوں سے یہ منزہ ہے۔ صحیح جمہوریت اور آزادی کے لیے مساوات اور اخوت مقدم ہے۔ اور مساوات اور اخوت اسلام کی روح ہے۔ یہی اس نظام کے رگ و پے میں جلوہ فرما ہے۔ امیر کا انتخاب اس اصول پر ہوگا۔ اور معیار فضیلت فقط "تقویٰ" ہوگا کہ یہ معیار خود ضابطۂ خداوندی کا متعین فرمودہ ہے۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم) اُمّت کے بہترین افراد اس امیر کی مجلس مشاورت کے ارکین منتخب کیے جائینگے۔ اور انکا انتخاب بھی تقویٰ اور مساوات کے معیار پر ہوگا۔ جملہ اُمور میں مشورہ ضروری ہوگا کہ (امرھم شوریٰ بینھم) اُنکے خدا کا حکم ہے۔ لیکن باہمی مشاورت میں قرآن کریم کے اُصول و ضوابط کی روشنی ہر مقام پر اُنکے لیے خضرِ راہ ہوگی۔ نہ امیر اس سے اِدھر اُدھر ہوسکے گا۔ نہ اس کی مجلس شوریٰ۔ معاملات زیرِ نظر کے بہت سے ایسے گوشے جو ایک انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوسکتے ہیں۔ باہمی مشاورت سے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور یوں آخری فیصلہ تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔ بایں ہمہ امیر اکثریت کی رائے پر مجبور نہیں ہوگا۔ پابندی صرف قرآنی اصول کی ہوگی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب مُرتدین کے خلاف چارہ جوئی کا سوال آیا تو جماعت صحابہؓ میں سے ہر شخص کی یہی رائے تھی کہ انکے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے لیکن آپ کی رائے انکے خلاف تھی۔ چنانچہ آپنے اپنی رائے کے مطابق انکے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ اور صحابۂ کبار کو تسلیم کرنا پڑا کہ فی الواقعہ وہی فیصلہ منشائے کتاب اللہ کے مطابق تھا۔ اُسکے برعکس یہ منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ حضرت عمرؓ مہر کی رقوم پر کچھ پابندیاں عائد کرنا چاہتے تھے لیکن مجمع میں سے ایک غریب بڑھیا اُٹھ کر آپ کی توجہ قرآن کریم کی ایک آیت کی طرف منعطف کراتی ہے۔ اور آپ فوراً اپنا خیال ترک کر دیتے ہیں۔ ہم اسوقت اسلامی نظام حکومت کی تفصیلات سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُصولی طور پر یہ نظام جمہوریت سے بالکل مختلف ہے جو یورپ کا وضع کردہ ہے۔ اسلامی نظام جمہوریت میں قوانین کے اُصول و ضوابط پہلے سے متعین ہیں صرف ان کی جزئیات کی ترتیب باقی رہتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان جزئیات میں اگر بہ تقاضائے بشریت

غلطی بھی ہو جائے تو وہ ایسی خطرناک نہیں ہوتی جتنی اُصول کی غلطی۔ لہٰذا اسلام کے نزدیک صرف وہ نظامِ زندگی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جسکا مقصدِ وحید دُنیا میں قوانینِ الٰہیہ کی تنفیذ و ترویج ہو۔ اور بس۔ اور یہ مقصد کبھی اِس جمہوریت سے حاصل نہیں ہو سکتا جس میں فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہوں اور اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ اب آپ کہیئے کہ وہ نظامِ حکومت جسے ہندوستان میں قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور اس کوشش کا نام آزادی کے لیے جہاد قرار دیا جاتا ہے۔ کس طرح مسلمانوں کے لیئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ مسلمان کے لیئے مقدم شئے اُصولِ حکومت Principle of Government ہے۔ ہیئتِ حکومت (Form of Government) کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ جب اُصولِ حکومت وہ نہیں جو قرآن کریم کا متعین فرمودہ ہے، تو ہیئتِ حکومت جمہوریت ہو یا ملوکیت۔ دونوں ناقابلِ قبول ہیں۔ مسلمان کے نزدیک قوانینِ خداوندی۔ قوانینِ فطرت کی طرح اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ اور دُنیا کی کوئی طاقت ان میں ردّ و بدل کرنیکا اختیار نہیں رکھتی۔ خواہ وہ طاقت چنگیز خاں کی ہو یا ہٹلر کی۔ وائٹ ہال کی ہو یا واردھا کی۔ جب تک مُسلمان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتا۔ دُنیا کے پاس چونکہ ایسا ضابطۂ خداوندی نہیں۔ اسلیئے وہ نظامِ حکومت کی مختلف شکلیں اپنے ذہن سے وضع کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک قسم کا نظام قائم کیا۔ پھر اس سے تنگ آگئے تو کوئی دوسری صورت تجویز کر لی۔ وہ ناکام ثابت ہوئی تو کسی اور طرف چل پڑے۔ جب یہ حالت آزاد اقوامِ عالم کی ہو رہی ہے تو غلام قوموں کا تو پوچھیئے ہی نہیں۔ خود ہندوستان میں دیکھیئے کہ یہ غلام آبادی یورپ کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کی طرف کس طرح لپک کر جاتا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے بازاروں میں یورپ اور امریکہ کے اُترن کوٹوں کا استقبال یہاں کے مادّی افلاس کی پردہ دری کرتا ہے۔ اسی طرح وہاں کے اُترن نظریوں کا رواج یہاں کے ذہنی افلاس کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اُنکے پاس قوانینِ الٰہی کا ایسا درخشندہ اور تابناک ضابطہ موجود ہے۔ اور یہ دوسروں سے بھیک کے ٹکڑے مانگتے پھر رہے ہیں۔

پھر کہا جاتا ہے کہ جب ہندوستان کے نظامِ جمہوریت میں اقلیتوں کو اُنکے مذہب کے
کی ضمانت دی جاتی ہے۔ تو پھر مسلمانوں کو اس نظامِ حکومت پر اعتراض کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک
سادہ اور پُرکار حربہ ہے کہ بڑے بڑے دیدہ ور اسکا نشانہ بنکے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر ذرا نگہ دُ
سے دیکھا جائے تو حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دُنیا کے نزدیک مذہب محض چن
اور عبادات کا نام ہے۔ اَنکے علاوہ اور سب کام "دُنیاوی شعبہ" میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے
گاندہی جی نے پھر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ مُسلمان آزادی سے نماز پڑہیں۔ روزے رکھیں۔ ع
منائیں۔ انہیں کوئی نہیں روکے گا۔ یہ اِس سے زیادہ اور کیا تحفظ چاہتے ہیں۔ اور یہ وہ گاندہ
ہیں جنہیں خیر سے یہ دعویٰ ہے کہ ینے قرآن[1] بھی پڑھا ہے اور سیرت کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ا
کون سمجھائے کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا دائرہ عبادات و رسوم سے کہیں وسیع تر ہے۔ اس
دین، ور دُنیا۔ چرچ اینڈ سٹیٹ دو مختلف شعبے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی کپڑے کے تانے بانے ہیں۔ ا
نظامِ زندگی میں مذہب کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی نظامِ جسمانی میں سانس کی۔ کہ بظاہر اسکا
صرف پھیپھڑوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن اعضاء و جوارح میں سے ہر ایک کی زندگی کا دار و مدار ا
ہے۔ اسلام میں زندگی کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جو مذہب کی حدود میں نہ آتا ہو۔ پیدا ہونے
تک ایک مسلمان کی زندگی کا ہر لمحہ۔ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ مذہب سے وابستہ ہے اسلئے ا
کی ضمانت بالکل بے معنے ہے۔ کہ مسلمانوں کو "مذہبی معاملات" میں پوری آزادی حاصل ہوگ
نظامِ جمہوریت صرف "غیر مذہبی معاملات" پر حاوی ہوگا۔ اسلام میں اس قسم کی تقسیم کا تص
باطل ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے نزدیک نظامِ حکومت صرف وہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جس
اُنکے تمام اُمور قوانینِ الٰہیہ کی روشنی میں طے پائیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ
اپنی جماعت ہو۔ اپنا امیر ہو۔ اپنا قانون ہو، اپنی حکومت ہو۔ ہندوستان میں اس کی ایک

---

[1] غالباً مولانا آزاد کی وہ تفسیر پڑھی ہوگی جسکا ہندی ترجمہ کانگرس کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

عملی شکل ہو سکتی ہے کہ مُسلم انڈیا کو باقی حصۂ مُلک سے الگ کر دیا جائے اِسکے علاوہ بحالت موجودہ ہندوستان
میں مُسلمانوں کی آزادی کی کوئی صورت نہیں۔ جب مسلمان کو اس قسم کی آزادی حاصل ہوگی تو یہ
اُسوقت بتا سکے گا کہ کس قسم کا نظامِ حکومت انسانیت کی سرفرازی و سربلندی کا موجب ہو سکتا
ہے، کہا جا سکتا ہے کہ مُسلم انڈیا میں جو غیر مسلم اقلیتیں ہوں گی ان کی مذہبی آزادی کا تحفظ کس طرح
ہو سکے گا۔ لیکن یہ مسئلہ بالکل واضح ہے، جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی لکھا ہے، اسلام کے سوا تمام
ادیانِ عالم میں مذہب کا دائرہ صرف چند عبادات و رسوم تک محدود ہے۔ اسلیئے اِن مذاہب کے
متبعین کے لیئے مذہبی آزادی کی ضمانت کچھ مشکل نہیں۔ غیر مذہب کی عبادتگاہوں کا تحفظ تو ازروئے
قرآن کریم مسلمانوں پر ضروری ہے۔ اسلیئے مُسلم اکثریت کے علاقوں میں غیر مسلم اقلیت کو اپنے مذہب
کی آزادی کے بارے میں کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ مسلمان ہر مذہب والے کو تحفظ کی ضمانت دے
سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی کوئی حکومت، مسلمان کو مذہبی تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ مسلمان کا مذہبی
تحفظ صرف اِسی صورت میں ممکن ہے کہ حکومت ان کی اپنی ہو کہ یہاں مذہب اور حکومت دو مختلف
چیزیں نہیں ہیں۔ دوسرا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقہ میں جو مُسلمان باقی رہ جائینگے
انکا نظامِ زندگی کیا ہوگا۔ سو ظاہر ہے کہ ان کی یہ حالت بالکل اضطراری ہوگی۔ اگر انہیں اسلامی
نظامِ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنا مقصود ہوگا تو انھیں اپنی اضطراری حالت سے جتنی جلدی
ہو گا چھٹکارا حاصل کر کے مُسلم اکثریت کے علاقوں میں آجانا ہوگا، کہ غیر مُسلم حکومت کے ماتحت زندگی
بسر کرنے پر قناعت کر جانا۔ اسلامی زندگی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ اسلامی حکومت کے ایک فرد
کی حیثیت سے وہ دنیا میں کہیں رہے۔ جب تک اسکا رشتہ اپنے مرکز سے جڑا ہوا ہے۔ اس کی پوزیشن
بڑی ممتاز ہوگی۔ یہ ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا مطمح نگاہ اور یہی نصب العین کا حصول ہماری آزادی
ہے۔ البتہ اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لیئے ہمیں مختلف مراحل سے گزرنا ہوگا۔ اور ان مراحل میں جو کچھ ہم
حاصل کرتے جائیں غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ ہم پہلی جست میں اس منتہیٰ تک نہیں پہنچ سکتے البتہ ہمیں اس امر
کا یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ اور یہی راستہ ہے جو آج۔

آئینی جد و جہد میں مسٹر جناح کے پیشِ نظر ہے +
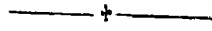
اب آپنے ملاحظہ فرمالیا کہ مسلمانوں کے نزدیک وہ نظامِ جمہوریت جسے ہندو یہاں قایم کرنا چاہتے ہیں کیوں نا قابلِ قبول ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ فقط اتنی بات کہ ہندو اس طرزِ حکومت کی اس قدر حمایت کر رہا ہے اس امر کی کافی دلیل ہے کہ یہ طرز مسلمانوں کی ملّی خودکشی کا باعث ہوگا اسلیئے کہ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے (ودوماعنتم) یہ تو صرف اس چیز کی خواہش کرینگے جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ یہ تمہارے فائدے کی کبھی سوچ ہی نہیں سکتے۔ اسلیئے اگر یہ کبھی یہ بھی کہیں کہ فلاں نظریہ بالکل اسلامی ہے تم اسے اختیار کیوں نہیں کرتے تو بھی مسلمان کو ہزار مرتبہ سوچنا چاہیئے کہ اس میں کیا راز ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شیطان ایک خضر صورت بزرگ کی شکل میں ایک عابد درزا ہد کے پاس گیا اور اسکے سامنے پاپیادہ حج کرنے کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ شخص حج کے لیئے آمادہ ہو گیا۔ ایک دوسرے بزرگ تھے جنہیں معلوم تھا کہ یہ ناصحِ مشفق کون ہیں۔ انہوں نے شیطان سے پوچھا کہ تیرا کام تو ہمیشہ نیکی سے بہکانا ہے، آج خلافِ مسلک اس بزرگ کو حج پر کیوں آمادہ کیا جا رہا تھا۔ اسنے کہا کہ میں نے مسلک تو نہیں چھوڑا۔ جو کچھ میں نے کیا بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسلامی لشکر جہاد کی تیاری کر رہا ہے اور جو لوگ ادھر اُدھر عبادتگاہوں میں معتکف بیٹھے ہیں انہیں دعوتِ جہاد دے رہا ہے۔ اسلیئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایسے لوگوں کو پاپیادہ حج کے لیئے روانہ کر دوں تاکہ یہ جہاد میں شامل نہ ہو سکیں۔ کچھ اسی قسم کے ناصحانہ مشورے ہیں ہمارے ان برادرانِ وطن کے جو قرآن و سیرت کے مطالعہ کا دعوئے کر کے مسلمانوں کو انکا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ جمہوری نظامِ حکومت عین اسلامی نظام ہے، جو مسلمان اس سے انکار کرتا ہے قابل دار ہے لیکن ہمیں ہندوؤں پر افسوس نہیں۔ اسلیئے کہ انکا تو مطمع نگاہ ہی مسلمانوں کی تخریب ہے افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو گاندھی جی کی نفیری بجکر انکے راگ کو محراب و منبر اور ما زنہ؟ و تکبرہ؟ سے اونچے اونچے سُروں میں الاپنا شروع کر دیتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ہم ملّتِ اسلامیہ کو تباہی و بربادی کے کس جہنم کی طرف لیئے جا رہے ہیں۔ اور پھر قیامت یہ ہے کہ اپنے ان ملت کش نظریوں

، کتاب و سُنت کو مسخ کرنے سے بھی نہیں شرماتے کتنی بڑی ہے یہ جرأت اور کتنی زبردست ہیں
، جو انھیں اس جرأت پر آمادہ کر دیتی ہیں۔ (لیشترون بایات اللہ ثمنا قلیلا)۔ حیرت ہو
ت اگر کتاب و سُنت کی طرف سے آنکھیں بند کیئے بیٹھے ہیں تو کیا روزمرہ کے واقعات بھی اُنکے
ں آتے۔ ان سے کہیئے کہ ذرا اپنے کانگرسی آقاؤں سے اتنا تو پوچھیں کہ اگر نظامِ جمہوریت
تان کے لیئے بہترین نظام ہے تو آج جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں یہی
ب کانٹے کی طرح کیوں کھٹکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور و آئین کی رُو سے پنجاب اور
بھی وہی نظامِ حکومت رائج ہے۔ جو یُو۔پی اور بمبئی میں ہے (وزارتی استعفوں سے پیشتر سے
ا اور یہ نظام کم و بیش جمہوری نظام ہی ہے۔ یو۔پی اور بمبئی میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت ہے
ں یہ نظام آسمانی سمجھا جاتا ہے۔ اور جب بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت نظر آتی
ی نظام یہاں مردود بنجاتا ہے۔ اگر جمہوری نظام نعمت ہے تو یہی بنگال میں لعنت کیوں بنجاتی
رہر کانگرسی ایڑی سے چوٹی تک کا زور کیوں لگاتا ہے کہ اس نظام کو اُلٹ کر اکثریت ان کی
اسے جو کانگرسیوں کے ہم خیال ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود کانگرسی حضرات کے نزدیک
جمہوری نظام کوئی قابلقدر شئے نہیں۔ وہی نظامِ جمہوریت قابل قبول ہے جس میں اکثریت
پنی ہو۔ لیکن کانگرس وہی کچھ کہے تو حق و صداقت ہے۔ اور مسلمان وہی کچھ کہیں تو ضد اور تعصب،
ہماری موجودہ سیاست! مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مجوزہ نظامِ جمہوریت اسلیئے
دل نہیں کہ اس میں اکثریت ان کی ہوگی جو ہمارے ہم خیال نہیں۔ ڈاکٹر کچلو (سابق وزیر یوپی)
سے کی دلیل میں کہ جمہوریت عین اسلام کے مطابق ہے فرماتے ہیں:۔

مسلمانوں کا نماز کے لیئے حیرت انگیز اجتماع مسلمانوں کی روحِ جمہوریت کا بہترین مظہر ہے۔
جمہوریت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان جمہوریت کے خلاف
آواز اٹھاتے ہیں" (اسٹیٹس مین ۲۴/۳)

یجیئے۔ جادو کس طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بالکل درست فرمایا۔ یہی ہے وہ نظام جو مسلمانوں کے ۔

نزدیک قابل قبول ہے۔ یعنی خالص اپنی جماعت۔ اپنا امام اور اس امام کی اطاعت۔ ہم ڈاکٹر کچلو سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے کبھی ایسا بھی دیکھا ہے کہ نماز کی جماعت میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو اور یہ اکثریت ایک ہندو کو امام منتخب کرے اور پھر مسلمان اس امام کے پیچھے نماز ادا کر رہے ہوں! بس یہی ہے فرق اسلامی جمہوریت اور کانگرسی جمہوریت میں۔ اسلامی جمہوریت نماز کی اس شکل پر مرتب ہوگی جو چودہ سو سال سے چلی آ رہی ہے۔ اور کانگرسی جمہوریت وہ دوسری شکل ہے جسے آج مسلمانوں کے سامنے اسلامی لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے، حالانکہ وہ خالصۃً غیر اسلامی ہے مسلمانوں کی جماعت خالص اسلامی جماعت ہو گی۔ متحدہ قومیت کی جمہوری جماعت نہیں ہوگی۔ اب آپ خود ہی فیصلہ فرمالیجیے کہ مسٹر جناح ہمیں کس قسم کی نماز کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور جناب نوری اینڈ کو کدھر بلا رہے ہیں۔ ان لوگوں سے ہم سوائے اسکے اور کیا کہیں کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا تھا وہ تو بالکل واضح تھا۔ لیکن

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

ضرورت ہے

طلوع اسلام کے لیے ایک مدیر معاون کی۔ وہ حضرات جو اس مسلک سے متفق ہوں۔ اور اس معیار کے مطابق لکھ سکتے ہوں۔ بہت جلد اپنی درخواستیں ارسال فرمائیں انگریزی اور عربی کی اچھی استعداد ضروری ہے۔ بہتر ہو کہ شرائط معاونت کے ساتھ اپنے کسی مطبوعہ مضمون کی ایک نقل بھی بھیجدی جائے۔ دفتر کے روزمرّہ حساب و کتاب کا تجربہ بھی ہو تو اچھا ہے

لیکن جلدی کیجیے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام بلیماران دہلی

ہندوستان میں ہندوؤں کے منصوبے کیا ہیں؟ یہ چیز اب قیاس و گمان کی حد سے گزر کر یقین و بصیرت کے نقطہ تک آ پہنچی ہے وہ یہاں انگریزوں کی سنگینوں کے سایہ میں خالص مہا سبھائی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے اِس راز کو بھی سمجھ لیا ہے کہ بھارت ورش میں رام راجیہ کے قیام و بقا کے لیے سب سے مقدم یہی امر ہے کہ مسلمان کو من حیث القوم زندہ نہ رہنے دیا جائے مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کا راز اُنکے مذہب میں پنہاں ہے اِس لیے ہندو شاطرانِ بساطِ سیاست نے اپنی پوری توجہات اِسی نقطہ پر مرکوز کر دی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مسلمان کو اس امتیازی نشان سے محروم کر دیا جائے۔ اسکے بعد اِس کے ملی تشخص کا اہلاک کچھ مشکل نہ ہو گا۔ چنانچہ اِسکے لیے ایک منظم سکیم تیار کی گئی۔ اور اُس کی باگ ڈور گاندھی جی جیسے پرکار شکاری کے ہاتھ میں دیدی گئی ایک دیدہ ور شکاری کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ خود جال کے قریب آ کر کھڑا ہو جائے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس قسم کے پرندوں کو پھنسانا مقصود ہو۔ اِنہی میں سے دو چار پرندے سدھائے جائیں۔ اور اُن کی آنکھیں سی کر جال کے قریب چھوڑ دیا جائے۔ ان کی دلکش آواز پر کسی کو گمان تک نہیں ہو سکتا، کہ یہ دامِ تزویر میں گرفتاری کی دعوت ہے۔ اِسلیے اُنکے ہم جنس پرندے اُنکے گرد جوق در جوق جمع ہو جاتے ہیں اُن کو حلقۂ دام کا اُسوقت احساس ہوتا ہے جب پھندا گلوگیر ہو چکتا ہے۔ مسلمانوں کو اُنکے مذہبی تفوق کے جذبہ سے بیگانہ اور ملی تشخص کے احساس سے ناآشنا کرنے کے لیے یہی پرفن حربہ استعمال کیا گیا۔ اور اُس کی پہلی کڑی مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کی شکل میں منصۂ شہود پر آئی۔ اِس تفسیر میں الفاظ قرآنی کے حسین و جمیل پردوں کی آڑ میں غیر محسوس طریقے پر اِس خیال کو قلوب اور اذہان میں راسخ کرنے کی کوشش کی گئی کہ

عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں۔ فرق صرف ظواہر و رسوم میں ہے جنکی کچھ اہمیت نہیں۔ اسلیئے یہ خیال باطل ہے کہ ایک مذہب دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت رکھتا ہے۔ الہلال والبلاغ کے مدیر اعلیٰ مولانا آزاد کا نام۔ اور قرآن کریم کی تفسیر۔ کس کی مجال تھی کہ کسی بدگمانی کو دل میں جگہ دے کر اس صحیفۂ مقدسہ کو چھوئے۔ وار چل گیا۔ تیر ٹھکانے پر لگ گیا۔ اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے نوجوان طبقہ کے رگ و پے میں یہ زہر سرایت کر گیا۔ کہ فی الواقعہ یہ خیال کہ اسلام ہی سچا دین ہے"۔ مذہبی تعصب" اور "تنگ نظری" ہے۔ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ چنانچہ اسکے بعد اکبر کے دینِ الٰہی کی تجدید کی تجاویز سامنے آنے لگیں۔ برہمو سماج کو عام کرنے کے چرچے ہونے لگے۔ بنارس کے ایک ودوان نے مختلف مذاہب کی آسمانی کتابوں کو ملا کر ایک "نئی آسمانی کتاب" تصنیف کرنے کی سکیم پیش کر دی۔ جب گاندھی جی نے دیکھا کہ یوں زمین تیار ہوگئی ہے۔ تو ایک دن نہایت سادگی سے فرمایا کہ جب مولانا آزاد جیسے متبحر عالم کی بصیرتِ قرآنی برملا کہتی ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان تبلیغ کی تحریک کے پیچھے کیوں پڑتے ہیں، مجھے تو یہ ایک خالص سیاسی چال نظر آتی ہے، رفتہ رفتہ اس خیال کو عام کیا گیا۔ اور نوبت بانیجا رسید کہ اب مختلف گوشوں سے اس قسم کی آوازیں بھی آنی شروع ہوگئیں کہ

"ہندوستان میں مسئلۂ اقلیت کا مؤثر حل یہ ہے کہ تبدیلئ مذہب قانوناً روک دی جائے تاکہ اقلیتوں کی آبادی کا تناسب جامد ہو جائے"۔ (ڈاکٹر مونجے ہندوستان ٹائمز ۱۴ جون)

ایک طرف یہ خیال عام کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مقدس ہاتھوں سے واردھا کی تعلیمی اسکیم کا سنگِ بنیاد رکھا دیا گیا ہے، جس میں مذہبی تعلیم کا مرکزی تصور وہی ہے جسکا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ موجودہ نسل کے بعد جب مسلمانوں کی دوسری پشت کی ذہنی تشکیل اس جدید تعلیم کے مطابق ہوگی۔ اسوقت ڈاکٹر مونجے کے اس "خیال" کو "قانون" بنا دینے میں کیا دقت ہوگی۔ اور اگر اُسے قانونی حیثیت نہ بھی دی گئی تو بھی مذہبی نقطۂ نگاہ سے ایک مسلمان اور ہندو میں کوئی فرق نہ ہوگا، اسلیئے کہ یہ عقیدہ مسلمان کا جزوِ ایمان ہو چکا ہوگا

کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں

اِس شکاری کے دامِ تزویر کی دوسری کڑی یہ تھی کہ مذہب۔ انسان اور خدا کے درمیان ایک ذاتی معاملہ کا نام ہے۔ سیاسیات میں اِسے کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اِس نظریہ کی ترویج میں گاندھی جی کو کچھ زیادہ دِقّت نہیں ہوئی۔ اِسلئے کہ مسلمان صدیوں سے اِس نظریہ پر عملاً کاربند چلے آرہے ہیں۔ لیکن اِس باب میں ایک چیز بڑی تحیّر انگیز ہے، قومیت پرست عُلماء کا طبقہ خود تو میدانِ سیاست میں شریک ہوگیا۔ لیکن کانگرس کے اِس اعلان کو ہمیشہ خاموشی سے سُنتا چلا آرہا ہے کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں۔ اِس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ نیشنلسٹ ہوجانے کے بعد مُسلمانوں کو کس طرح اپنے حقیقی خیالات کے اظہار سے محبوُر رکنا پڑتا ہے جو حضرات طلُوعِ اسلام کا مسلسل مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں۔ اُنہیں معلوم ہے کہ کانگرس کے بڑے بڑے ذمّہ دار حضرات نے مسلمانوں کے اِس عقیدے کا کس قدر تمسخر اُڑایا ہے کہ اُنکے ہاں مذہب سیاست سے جُدا نہیں ہے بایں ہمہ ہمارے نیشنلسٹ علما حضرات میں سے کسی ایک نے آج تک احتجاج کا ایک لفظ اپنے مُنہ سے نہیں نکالا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے قومیت پرست حضرات ہندو زعمائے کانگرس کو اپنے گھر میں بلا بلا کر یہہ باتیں اُن سے سنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں ابھی دس روز کی بات ہے کہ عید الفطر کی تقریب پر بمبئی کی مجلس احرار نے بھولا بھائی ڈیسائی کو دعوتِ "وعظ" دی۔ جس میں انہوں نے نہایت بلند آہنگی سے فرمایا کہ

> "چونکہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اسلئے اِسے سیاست سے ملانا نہیں چاہیئے"۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۴)

اور مجمع نے خوب دادِ تحسین دی۔ اگلے دنوں ایک کانگرسی اخبار ہندوستان ٹائمز اپنے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے کہ:۔

> "جمہوریت کا سیاسی نظام مذہبی جماعت بندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور وہ اس امر سے یکسر انکار کرتا ہے کہ کوئی مذہبی (روحانی) عقیدہ کسی سیاسی معاملہ کی بنا قرار دیا جاسکتا ہے"
> (مورخہ ۳)

اسی پر اکتفا نہیں۔ ذرا اور آگے بڑھیے۔ اور۔

درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں!

قرآن کریم کی رو سے مسلمان کی زندگی کا نصب العین اس دنیا میں حکومتِ خداوندی کا قیام ہے
حقیقت ہے کہ جس سے کسی ایسے شخص کو مجالِ انکار نہیں ہوسکتی جسکا قرآن کریم پر ایمان ہے لیکن یہ
کانگرس کا یہی ترجمان اپنے ایک اور مقالہ افتتاحیہ میں کس جرأت سے لکھتا ہے کہ ۔

"حکومتِ الٰہی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور یہ مسلمانوں کا ایک فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان
جیسے ملک میں اسکے احیار کی کوشش کریں۔ جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی
ہیں۔ یا اس امر کا خیال کریں کہ (اس مقصد کے لیے) ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ
علامت بڑی خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے"

(ہندوستان ٹائمز ۱۴/۱۱/۴۳)

ہم اس بر خود غلط کانگرسی آرگن اور اس کی وساطت سے کانگرس کے تمام اربابِ حل و عقد کو
بتا دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی زندگی کا مقصدِ وحید حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ پہلے اپنے گرد و پیش
اسکے بعد ساری دنیا میں ۔ اور اگر وہ چند قومیت پرست مسلمان جنہیں یہ اخبار بزعم خویش "مسلمانوں
کے ذمہ دار رہنما" قرار دے رہا ہے۔ اپنی مصلحت کوشیوں اور ایمان فروشیوں کی بنا پر اس
کے اعلان سے گھبراتے ہیں تو انکے آقایانِ نعمت کو خوش نہ ہونا چاہیے کہ :-

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ

یہ لوگ اللہ کو اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ (اس طرح) یہ خود اپنے
آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن سمجھتے نہیں۔

بہر حال یہ گاندھی جی کے جال کی دوسری کڑی تھی اور اس میں ہمارے قومیت پرست بھی خو
کے تصدق۔ انہیں کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوئی ہے ۔

اب اس دامِ فریب کی تیسری اور سب سے اہم کڑی لیجئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کڑیاں الگ الگ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک سے دوسری خود بخود پیدا ہوتی جاتی ہے تیسری کڑی یہ تھی کہ ہندوستان کی چار دیواری میں بسنے والے تمام لوگ بلا تمیز مذہب ایک قومیت کے افراد ہیں۔ اسکے لیے کچھ عرصہ ہوا دارالعلوم دیو بند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے فتویٰ صادر فرمایا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں۔" اور جب اس کی مخالفت ہوئی تو اس کی تائید میں کتاب و سنت کو مسخ کرنا شروع کر دیا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی فضا میں اِس خیال کو بھی عام کیا گیا کہ مسلمان مذہبی امتیاز و تفوق کی بنا پر ایک جُداگانہ قوم بننے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ قوم کے لیئے تو ہم وطن ہونا ہی شرط ہے۔ نہ کہ ہم مذہب ہونا۔ چنانچہ جب اِس خیال کا چرچا ہوگیا۔ تو پچھلے دنوں گاندھی جی پھر کٹیا سے باہر تشریف لائے اور ہری جن بابت ۹/۱۱ کے مقالہ افتتاحیہ میں مسلمانوں کے اِس دعوے کی نہایت واضح الفاظ میں تردید کی کہ ان کی قومیت کا مدار مذہب ہے نہ کہ اتحادِ رنگ و نسل و وطن، ان کے بعد اُنکے متبعین نے شرح وبسط سے مسلمانوں کے اِس دعوے کی تغلیط کی اور اُسکا مضحکہ اُڑایا۔

چنانچہ ہندوستان ٹائمز اپنی ۹/۱۴ کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے ؟

"ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا تصور کانگرس کے اوّلین بانیان کے دماغ کا رہین منت ہے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر اِس ملک کی مختلف جماعتوں اور فرقوں کو ایک قوم میں تبدیل کرنا ہے تو یہ صرف متحدّہ قومیت کے نظریئے کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں نسل، زبان اور مذہب باہمی تفرقی کا باعث بنتے ہیں۔ سیاست معاشی مفاد اور متحدّہ قومیت کا احساس ان میں باہمی امتزاج پیدا کرتا ہے۔"

حتیٰ کہ مسٹر ڈیسائی نے مذکورہ صدر تقریبِ عید کی تقریر میں تو یہاں تک فرما دیا کہ مسلمان جو مذہبی تحفظات چاہتے ہیں۔ انہیں دے دینے چاہئیں۔

"لیکن اس کے بعد ان کی جُداگانہ ہستی کا کوئی تذکرہ نہیں ہونا چاہیئے" (ہندوستان ٹائمز ۹/۱۴)

سطورِ بالا میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اُسے ایک مرتبہ پھر اِن الفاظ میں دُہرا لیجئے کہ :۔

(۱) تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں۔ اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اسلئے تبلیغ ایک سیاسی حربہ ہے، جسے قانوناً روک دینا چاہیئے۔

(۲) مذہب ایک نج کا معاملہ ہے، جسے سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۳) مذہب کے ظواہر و رسوم (مثلاً نماز۔ روزہ) کے متعلق مسلمانوں کو تحفظات کی ضمانت دیدینی چاہیئے اور اسکے بعد انہیں اپنے جداگانہ ملی وجود کے تذکرہ سے بند کر دینا چاہیئے کہ یہ چیزیں متحدہ قومیت کے راستہ میں روڑا اٹکاتی ہیں +

یہ ہے ماحصل موجودہ "جہادِ آزادی" کا۔

ہم تنگ نظر ہیں۔ آزادی کے دشمن ہیں۔ غلامی کے حامی ہیں، لیکن ہم پوچھتے ہیں اپنے حریت پسند۔ آزادی کے پرستار، اسلام کے سب سے بڑے مجاہدین کی جماعت قومیت پرست سے کہ جو کچھ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کر رہے ہیں۔ کیا وہ کسی صورت میں بھی اسلام کی دوستی کہلا سکتی ہے؟ یہاں آپ اپنے مخالفین کو ٹوڈی اور غلامی کے حامی کہہ کر اپنے آپ کو خوش کر سکتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے۔ کیا وہاں کے لیئے بھی کوئی جواب آپنے سوچ رکھا ہے؟ وہاں تو ان طعنوں سے کام نہیں چلے گا۔

قریب ہے یار روزِ محشر۔ چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا!

اچھوت نمبر ۲

گاندھی جی لکھتے ہیں:۔

"کانگریس کے حامی مسلمان تو (مسلمانوں کے نزدیک) اچھوت خیال کیئے جاتے ہیں"۔ (ہریجن ۴ مئی)

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے　　یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

• ایسا کیوں ہے؟ اسکا جواب بھی گاندھی جی نے خود ہی دیدیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

گرسی لوگوں کے نزدیک قومیت پرستی (Nationalism) اُنکے مذہب کا جزو ہے
اسکے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ عیسائی ہوں یا کوئی اور" (ایضاً)

ہے۔ مسلمانوں کی برادری میں تو وہی رہ سکتا ہے۔ جسکا مذہب وہ ہو جو رسولِ کافۃ للناس
سالت سے انھیں ملا۔ اور جس میں رنگ۔ نسل۔ وطن کی بنا پر قومیت کی تشکیل حرام ہے
ض جو ہندی قومیت کو جزوِ مذہب بناتا ہو کس طرح مسلمانوں کی برادری میں شامل رہ سکتا ہو

———٭———

طمح نگاہ

ے نیشنلسٹ مسلمان ہمیشہ یہ کہہ اپنے آپ کو خوش کر لیتے ہیں کہ لیگ کا تو نصب العین ہی
امندی ہے۔ اسکے ساتھ ہم کیوں شامل ہوں۔ لیکن سُنیئے کہ زعمائے کانگرس اس باب میں
ں مسٹر جناح سے ملاقات کے بعد الہ آباد کی ایک تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں
اری باتیں بالکل کھلی کھلی ہوئیں۔ اور اگرچہ زاویۂ نگاہ میں فرق ہے۔ لیکن جہاں تک مطمحِ نظر
علق ہے۔ لیگ اور کانگریس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں کا نصب العین آزادی ہے"

(اسٹیٹسمین ۶/۱۱/۳۹)

ستان ٹائمز اپنی ۳ر نومبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں رقمطراز ہے۔
یگ کا نصب العین۔ کانگرس کی طرح آزادی ہے"

یشنلسٹ مسلمان بھائیوں سے پوچھتے ہیں کہ جب ایک خالص اسلامی جماعت کا نصب العین
ہے جو کانگریس کا ہے تو اُنہیں ہندوؤں کی بجائے مسلمانوں کے ساتھ اشتراکِ عمل سے
نع ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ لیگ کے ذرائع آمدنی اتنے وسیع نہیں۔ لیکن اسلام کی کشش

ی چیز ہے۔

———٭———

ی وتدبر | وائسرائے صاحب نے کانگرسی لیڈروں کو دعوت دی۔ گاندھی جی اور صدر کانگرس .

بابو راجندر پرشاد جانی پر تیار رہو ئے ۔ مجلس شوریٰ بلائی گئی ۔ معاملات زیرِ نظر پر کافی غور و خوض ہوا ۔ بڑی بڑی تیاریوں کے بعد ملک کی کشتی کے یہ ناخدا وائسرائے کے حضور میں پہنچے ۔ لیکن وہ جو غالب نے کہا ہے کہ

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ !
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

حضور وائسرائے کی ایک ہی نگاہِ جبروت سے سب کچھ بھول گئے ۔ اور جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے ۔ گھر آکر کچھ سکون ہوا ۔ رفقائے کار نے پوچھا کہ وہ جو بنیادی مسئلہ تھا کہ "حکومت برطانیہ کے جنگ کے مقاصد کیا ہیں" ؟ اسکا کیا جواب ملا ۔ تو دونوں نمائندے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ۔ بالآخر وائسرائے صاحب کو چھٹی لکھی گئی کہ سرکار ! وہ جو چوٹی کی بات تھی اسکا تو وہاں ذکر ہی نہیں آیا ۔ یہ ہیں ہمارے لیڈر ۔ ایک صدر جمہوریتِ مملکت ہند یہ اور دوسرے وہ جنہیں تری پوری کانگرس میں "منزہ عن الخطا" ہونے کا تمغہ ملا تھا ۔ ان سے پوچھیے کہ اگر اس اصولی بات کا ذکر وائسرائے صاحب نے نہیں چھیڑا تو آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے ۔ آپنے خود اس بات کو کیوں نہ چھیڑ دیا ؟

❊

(۵) پھر بولے !

شیخ سعدیؒ نے ایک مستبد بادشاہ کے متعلق لکھا تھا کہ :-

ظالمے را خفتہ دیدم نیمروز ۔۔۔ گفتم ایں فتنہ است خوابش بُردہ بہ

واں کہ خوابش بہتر از بیداریست ۔۔۔ آنچناں بدزندگانی مردہ بہ

یعنی جس کا سونا اسکے جاگنے سے بہتر ہے اس کی موت اس کی زندگی سے اچھی ہے ۔ اسی طرح اس دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی خاموشی انکے بولنے سے اچھی ہوتی ہے ۔ انہی میں سے ایک صاحب حکومتِ پنجاب کے وزیر تعلیم ہیں ۔ جنکا تذکرہ گزشتہ اپریل کے طلوعِ اسلام کے صفحات میں آچکا ہے اسکے بعد وہ پھر بولے ہیں ۔ ۲ نومبر کے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں اردو کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"ہندوستان کو ایک قوم بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم ایک زبان کے ذریعہ دی جائے۔" (اسٹیٹسمین ۲۶/۱۱)

یعنی یہ بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تشکیل چاہتے ہیں

دُرست ہے۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں !

جس حکومت کے وزیراعظم جناب سر سکندر حیات خاں جیسے ہوں۔ اسکے اعیان وارکان کی یہی حالت ہونی چاہیئے۔ جناب وزیر اعظم صاحب نے بھی تو گزشتہ مارچ میں حزب مخالف کو فرقہ وارانہ جذبات کو دُور کرکے یک جہتی کی فضا پیدا کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ۔

"اگر اس قسم کی فضا پیدا ہوگئی تو پھر مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا جیسی فرقہ وارانہ جماعتیں خود بخود معدوم ہو جائیں گی" (ہندوستان ٹائمز ۱۷/۳/۴۰)

دہلی سے ایک اسلامی ماہنامہ شائع ہوتا ہے جسکے اغراض ومقاصد کی اولیں شق ہے۔

"وقت کی جدید ضرورتوں کے مطابق قرآن وسُنت کی مکمل شرح وتفسیر مروجہ زبانوں میں خصوصیت سے اُردو۔ انگریزی زبان میں کرنا۔"

اِس پرچہ کی نومبر کی اشاعت میں ایک نظم بعنوان "نفیر وطن" شائع ہوئی ہے۔ جسکا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہے:۔

کوثر و سلسبیل کے گیت بہت مدھر سہی شام وسحر یہ نغمۂ گنگ وجمن کچھ اور ہے

یہ ہے "قرآن وسُنت کی مکمل شرح وتفسیر" کا نمونہ !

حقیقتِ حج

از علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری

دین اسلام کا ہر ہر رکن ایک ایک خاص خاص غرض کے لیے ہے۔ ان میں سے ملت کی اجتماعی اصلاح حج سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ رکن اگر صحیح طور پر ادا ہونے لگے تو بلا کسی کوشش اور بغیر کسی جد و کد کے اس انتشار و تشتت کو جس نے ملت کو پارہ پارہ اور امت کو پرزے پرزے کر رکھا ہے دور کر کے اجتماعی زندگی پیدا کر سکتا ہے۔

اس مضمون میں میں نے کوشش کی ہے کہ حج کی حقیقت اور اس کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کے فوائد اور اس کو صحیح طور پر ادا کرنے کی صورت بھی بیان کروں۔ اسلم

فریضۂ حج اسلام کے ارکان خمسہ میں سے حج وہ رکن ہے جو اسلام کی حقیقی بنیاد یعنی توحید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جیسی موحدانہ عبودیت، مخلصانہ خشیتِ الٰہی اور والہانہ شیفتگی اس میں پیدا ہوتی ہے اور کسی دوسری عبادت میں نہیں پیدا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مرکز توحید کو جہاں حج کے مناسک ادا کیے جاتے ہیں اللہ نے کچھ ایسی خصوصیت بخشی ہے کہ وہاں مومن کے قلب پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا گمان اور اندازہ بھی دوسری جگہ نہیں کیا جا سکتا۔

حج ۹ھ میں فرض کیا گیا۔ ہر مسلمان پر جو سفر کی طاقت اور اس قدر مال رکھتا ہو کہ اس کے مکہ آنے جانے اور واپسی تک اس کے اہل و عیال کے خرچ کے لیے کافی ہو زندگی بھر میں ایک بار حج کرنا لازم ہے اور باوجود استطاعت کے حج نہ کرنا گناہ بلکہ کفر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے:-

"اور لوگوں پر بیت اللہ کا حج خالص اللہ کے لیے فرض ہے (یعنی) ان پر جو وہاں تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو کوئی کافر بن جائے تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔"

تاریخ حج عہد الست کا حامل انسان ابتدائی زمانہ میں باوجود نبیوں اور رسولوں کی تعلیموں کے توحید کی طرف

کم مائل ہوا اور اپنی نادانی سے زیادہ تر مظاہر پرستی میں مبتلا ہو کر شرک کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ فرمایا جو اپنی مستحکم توحید اور شان حنیفیت کے باعث موحدوں کے پیشوائے اعظم ہو گئے۔ اُنہوں نے اکیلے اللہ کی خاطر اپنے باپ، گھر، خاندان اور وطن سب کو چھوڑنا گوارا کیا اور جس وقت حجاز کے اس بے آب و گیاہ خطہ میں اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو لے کر آئے اس وقت دونوں نے مل کر خلوص قلب اور دلی دعاؤں کے ساتھ اکیلے اللہ کی عبادت کے لیے کعبہ کو تعمیر کیا جو دنیا میں موحدوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اللہ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور اس گھر کو مبارک اور سرچشمہ ہدایت بنایا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

"پہلا (توحید کا) گھر جو بنی نوع انسان کے لیے بنایا گیا ہے وہ جو مکہ میں ہے برکت والا ہے اور دنیا بھر کے لیے ہدایت ہے۔"

تیار ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ حج کے لیے یہاں آیا کریں۔

"اور بنی نوع انسان میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پاپیادہ اور سواریوں پر جو ہر دور و دراز کے رستوں سے آتی ہیں آئیں گے۔"

اس اعلان کے بعد سے حج شروع ہوا۔ اور سلسلے وار ہوتا چلا آیا۔ لیکن قرنوں پر قرن اور صدیوں پر صدیاں گزر جانے کی وجہ سے اس میں تغیرات واقع ہو گئے اور خرابیاں پڑ گئیں۔ کیوں کہ اولاد ابراہیم میں سے بنی اسرائیل جن میں انبیاء پیدا ہوتے تھے اور آسمانی کتابیں اترتی تھیں۔ ان کا قبلہ بیت المقدس قرار پا گیا اور کعبے کا حج بنی اسماعیل کی قیادت میں ہوتا رہا۔ جو علوم شریعت سے بے بہرہ اور توحید کی حقیقت سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اس موحدانہ عبادت کو مشرکانہ رسوم کا مجموعہ بنا لیا تھا اور اس توحید کے گھر میں سینکڑوں بتوں کو نصب کر دیا تھا جن کی پوجا ہوتی تھی۔

حج اکبر جب بنی اسماعیل میں دعائے ابراہیمی کا ظہور ہوا اور نبوت کبریٰ کے وارث رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اُنہوں نے بحکم الٰہی پھر اس توحید کے رکن یعنے حج کو شرکیات سے پاک کر کر اپنی اصلی شکل میں قائم کیا۔ سنہ ۹ھ پہلا سال ہے جس میں عہد ابراہیمی و اسماعیلی کے بعد دوبارہ صحیح اُصول پر فریضہ ادا کیا گیا۔ یہ حج تاریخ اسلام میں حج اکبر کے نام سے مشہور ہے۔ کیوں کہ قرآن کریم میں اس کا یہی نام

رکھا گیا ہے اس حج کے امیر سیدنا صدیق اکبرؓ اور نقیب سیدنا علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہم۔

موسم حج یہ رکن چوں کہ بنیاد اسلام یعنے توحید نیز ملّت کے ہر طرح کے منافع کا کفیل ہے ۔ اس لیے سال کا ایک چوتھائی حصّہ یعنے شوال ، ذی قعدہ اور ذی الحجہ تین مہینے اس کے لیے مخصوص کیے گئے حج کی نیت کرنیوالے خالص توحید اور اکیلے اللہ کی رضامندی کی طلب کے لیے جائیں ۔ نہ لڑیں نہ جھگڑیں نہ عورتوں سے ملاعبت کریں اور زادراہ ساتھ رکھیں ۔ تجارتی سامان بھی فروخت کے لیے لے جانا ممنوع نہیں ہے ۔ ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں حج ہوتا ہے ۔

فوائد حج حج میں اللہ نے دین اور دنیا دونوں کے بہت فائدے رکھے ہیں ۔

(۱) اس توحید کے مرکز میں فریضۂ حج ادا کرنے سے مسلمان عہد ابراہیمی کو تازہ کر کے حنفا کی جماعت میں داخل ہوکر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرتا ہے جو سب سے بڑی نعمت ہے ۔

(۲) کعبہ میں جہاں دنیا کے ہر خطہ کے موحدّوں کے گروہ آکر جمع ہوئے ہیں مسلمان آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اسکا دین کسی خاص قوم یا ملک مذہب نہیں ہے ۔ بلکہ وہ دین الٰہی ہے جو تمام عالم انسانیت میں اخوت قائم کرنے کیلئے ہے

(۳) حج میں کعبے کا طواف اور وہاں کی عبادت نصیب ہوتی ہے جو دنیا کی سب سے پہلی مسجد ہے اور ام المساجد کہی جاتی ہے اور جو مبارک ہے اور ہدایت کا سرچشمہ ۔

(۴) حج میں مساوات اور اخوت ہے اور وہاں آقا اور غلام اور شاہ و گدا کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور سب ایک ہی قسم کے فقیرانہ لباس میں ننگے سر حقیقی معبود کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں ۔

(۵) حج میں دنیا کے ہر ملک کے مسلمان آکر جمع ہوتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے ہر قسم کے دینی دنیاوی علمی اور عقلی فائدے حاصل کرسکتے ہیں ۔

(۶) حج جیسی مقدّس انجمن سوائے مسلمانوں کے اور کسی قوم یا ملت کے پاس نہیں ہے اس کے ذریعے سے ساری دنیا کے مسلمان ایک ہوسکتے ہیں ۔ اور سب کا متحدہ لائحہ عمل یہاں سے تیار ہوسکتا ہے ۔

(۷) حج میں سیر و سیاحت کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لوگوں سے مل کر طرح طرح کے تجربے حاصل ہوتے ہیں ۔

(۸) حج ایک مجاہدانہ روح اور فوجی نظام پیدا کرتا ہے ۔ کیوں کہ تمام حجاج ایک لباس پہنتے ہیں ۔ اور ناشائستہ

کلام، باہمی لڑائی جھگڑا فحش اور بے حیائی کی باتیں سب ان کے لیے ممنوع ہیں۔ وہ ایک ساتھ مل کر طواف کرتے ہیں اور ایک ساتھ میدان عرفات میں جا کر حاضری دیتے ہیں۔

(۹) حج میں آدمی چاہے تو سامانِ تجارت لے جا کر بہت نفع کما سکتا ہے۔ کیوں کہ حج میں تجارت اور خرید و فروخت کی بھی اجازت ہو۔ قرآن میں حج کے بیان میں ہے ۔" تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ (حج میں) تم اپنے رب کا فضل (سامان معیشت) کماؤ۔"

الغرض اس رکن میں شخصی اور قومی اور ملکی و ملّی ہر طرح کے بے شمار فوائد ہیں۔ اللہ نے قرآن میں ایک مختصر فقرے میں ان سب کو ادا کر دیا ہے۔ " تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لیے حاضر ہوں۔" لیشھدوا منافع لھم۔

یہ فائدے نہ دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں نہ دین کے ساتھ۔ بلکہ ہر طرح کے علمی، عقلی، مالی اور سیاسی فوائد اس میں داخل ہیں۔

احرام کعبہ ابھی سینکڑوں میل ہے لیکن حجاج معینہ میقاتوں سے نہا دھو کر اور دو رکعت نماز پڑھ کر اس مقدس مسجد کا زائرانہ لباس پہن لیتے ہیں جس کو جامۂ احرام کہتے ہیں۔ ایک لنگی اوپر ایک لنگی نیچے۔ زیب و زینت کچھ نہیں، خوشبو اور آرائش ممنوع۔ آقا اور غلام برابر ہو گئے، شاہ و گدا کا امتیاز اُٹھ گیا۔ اخوت ہی اور مساوات سب کے سب ایک رب العزّت کے آستانہ کے فقیر اسی کی توحید کا دم بھرنے والے۔ اللّٰھمّ لبیک۔ لاشریک لک لبیک۔ ہر ایک کے ورد زبان۔ سارے جھگڑے ٹنٹے ختم، شکار اور کھیل حرام اور لہو و لعب بند۔ قافلہ رواں اور دواں ہے۔ وفور شوق سے دل بے تاب ہو رہے ہیں کہ کب اس منزل پر پہنچیں جہاں برکتیں اُترتی اور رحمتیں برستی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی۔ لبیک کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ زائرین بے قرارانہ شہر میں داخل ہوئے اور پاک و صاف ہو کر اس گھر میں پہنچے جو دنیا کے تمام معبدوں سے زیادہ محترم ہے۔

حجر اسود عہدِ ابراہیمی میں پیمان عام لینے کا یہ دستور تھا کہ ایک پتھر رکھ دیا جاتا جس پر لوگ آکر ہاتھ مارتے۔ اس کے معنے یہ تھے کہ جس عہد کے لیے وہ پتھر رکھا گیا ہے اس کو انہوں نے تسلیم کر لیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب کعبہ تعمیر کیا تو اس کے ایک کونے پر عہد کے لیے ایک کالا پتھر جس کو حجر اسود کہتے

ہیں نصب کر دیا کہ اس گھر میں جس کی بنیاد کیلئے معبودٌ کی پرستش پر ہے جو کوئی داخل ہو پہلے اس پر ہاتھ رکھ کر توحید کا عہد باندھے پھر طواف کرے یعنے اس گھر کے ارد گرد سات چکر لگائے۔ گویا وہ اپنے آپ کو اس کی توحید پر جس کی عبادت کے لیے یہ گھر ہے نثار کرتا ہے۔ اگر جان بھی دینی پڑے گی تو اس سے منحرف نہ ہوگا۔

اس پتھر میں نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت۔ نہ یہ جنت کی چٹان ہے نہ عرش معلے کا فرش۔ صرف تجدید عہد ابراہیمی اور پیمان حنیفیت کے لیے ایک نشان ہے اور بس۔ اس کو چھونے یا ہجوم کی صورت میں دور ہی سے اس کی جانب ہاتھ اُٹھا دینے کو استلام کہتے ہیں۔ چوں کہ یہ توحید کا مقدس پیمان ہے اس لیے ہاتھ یا پتھر کو چوم بھی لیتے ہیں۔ مسجد حرم میں پہونچ کر سب سے پہلا کام یہی استلام ہے جس سے طواف شروع ہوتا ہے۔

نادان ہیں وہ لوگ جو عہد توحید باندھنے والوں پر سنگ پرستی کی تہمت لگاتے ہیں۔ حج کے جتنے اعمال ہیں وہ تو سارے کے سارے شرک کے مذبح ہیں۔ حجاج کی امتیازی صفت قرآن میں یہ ہے "حنفاء للّٰہ غیر مشرکین بہٖ" یعنے وہ اللہ کی طرف ایک رُخ ہونے والے ہیں۔ کسی کو اس کا شریک بنانے والے نہیں۔

طواف یہ نظارہ کس قدر روح پرور ہے۔ سینکڑوں ہیں جو حجر اسود کی طرف ہاتھ اُٹھا کے طواف شروع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ہیں جو پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ اور اللہ کے نام اس کی توحید اور اس کے آستانہ پر نثار ہو رہے ہیں دل سینوں میں اُچھل رہے ہیں۔ آنسو آنکھوں سے اُبل رہے ہیں اور منہ سے دعائے طواف کے کلمات نکل رہے ہیں۔

کچھ کعبہ کی چوکھٹ تھامے خشوع اور خضوع کے ساتھ استغفار میں محو ہیں۔ بیسیوں غلاف کعبہ سے لپٹے ہوئے گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ بہت سے دیواروں سے لگے ہوئے سجدے میں پڑے ہیں اور رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ایک وارفتگی کا عالم ہے جو سارے مجمع پر چھایا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحت قرب کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور جلال کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔

یوں تو اللہ تعالےٰ کہاں اور کب نہیں ہے مگر بعض بعض مکان و زمان کو اس نے خاص خاص خصوصیتیں دے رکھی ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں۔

مقام ابراہیمؑ طواف کے بعد اس تجلی گاہ میں آتے ہیں جو مطاف کے حاشیہ پر ہے یہ معمار کعبہ حضرت

ابراہیمؑ کا مقام ہے جہاں سنگِ مرمر کا ایک حجرہ اور سائبان بنا ہوا ہے۔ یہ خاص قبولیت کا مصلےٰ ہے۔ یہاں شکر کا دوگانہ ادا کرتے ہیں۔ اور دل کا خون آنکھوں سے بہاتے ہیں۔

سعی صفا اور مروہ میں دو فرلانگ سے زیادہ فصل نہیں جس میں نیچے ابن سعود کی بنائی ہوئی پختہ سڑک ہے اور اوپر ترکوں کا ڈالا ہوا سائبان۔ مسجد حرم سے مشرق کی جانب پہلا قدم جو باہر رکھا جائے گا وہ اسی سڑک پر پڑیگا جس میں دو رویہ بازار ہے اور مکے کا بڑا بازار۔

طواف کر کے حجاج سعی کے لیے نکلتے ہیں کہ یہ بھی شعائرِ الٰہی میں سے ہے کہا جاتا ہے کہ ایک متبرک ہستی نے پانی کی جستجو میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان بے تابانہ چکر لگائے تھے اور اس کی یہ ادا رب العزت کو بھا گئی تھی۔

سعی میں بھی دلوں میں وہی رقت ہے اور وہی سوز و گداز۔ تیز گامی بھی ہے اور آہستہ خرامی بھی۔ کبھی حمد و ثنا ہے اور کبھی استغفار و دعا۔ سات بار دوڑتے ہیں اور ہر دوڑ میں وہی محویت ہے اور وہی استغراق۔ جھنڈ کے جھنڈ ہیں۔ مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ سڑک کے دونوں جانب دوکانیں کھلی ہوئی ہیں اور خرید و فروخت جاری ہے لیکن یہ گدایان آستانہ کسی اور ہی دھن میں ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ کدھر بازار ہے اور کیسا کاروبار۔ ان کا سودا ہی اور ہے۔

سعی سے فارغ ہو کر تمتع یعنے خالی عمرہ کی نیت کرنے والے جامۂ احرام اتار دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا کام پُورا ہو گیا۔ اب جس دن حج کو روانہ ہوں گے تو پھر اس کو پہنیں گے۔ لیکن قِران یعنے حج و عمرہ دونوں کی ساتھ نیت کرنے والے ابھی اسی فقیرانہ لباس میں رہیں گے تاوقتیکہ جملہ مناسک حج پورے نہ کرلیں۔

عرفات میدان عرفات جہاں حج ہوتا ہے مکے سے ۱۵ میل کے فاصلے پر ہے آٹھویں تاریخ کو روانگی ہوتی ہے۔ راستہ بھرا پڑا ہے اونٹوں کی چار چار قطاریں ایک ایک ساتھ چل رہی ہیں، ہزاروں گدھوں پر سوار ہیں۔ لاکھوں پیدل۔ سب کے سب کسی خاص دھن میں ہیں نہ بات ہے نہ چیت۔ نہ شور ہے نہ ہنگامہ، شام کو منا میں پہنچے۔ رات کو وہیں منزل رہی۔ صبح کو پھر کوچ ہوا۔ دوپہر تک اس میدان میں داخل ہوئے جو حج کی جگہ ہے اور جس کی کشش ان سب کو کھینچ کر لائی ہے۔ کارِرواں پر کارواں پہنچ رہے ہیں اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے ڈیرے ہی ڈیرے لگے ہیں۔ عہدِ ازلی کے متوالے خمخانۂ الست کے سرشار پیمانۂ حنیفیت کے

سرمست، مغرب، مشرق، شمال جنوب دنیا کی چاروں سمتوں سے دور و دراز راہوں سے سمندروں کو عبور اور بیابانوں کو قطع کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں اور اپنے مالک کی حضوری میں حاضر ہوئے ہیں۔ سب توحید کے فرزند۔ آپس میں بھائی بھائی ایک ہی لباس۔ ایک ہی بھیس اور ایک ہی رنگ ہیں۔ ایک ہی آستانہ کے پجاری اور ایک ہی در کے بھکاری جلتے ہوئے پتھروں پر۔ تپتی ہوئی دھوپ میں سر کھولے اور ہاتھ پھیلائے اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور درد بھرے دل کو اس کے آگے انڈیل رہے ہیں۔ دعائیں ہیں اور التجائیں۔ تسبیح ہے اور تہلیل، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ و استغفار۔

یہ موقع زندگی میں کسی خوش قسمت ہی کو نصیب ہوتا ہے جو مانگنا ہو مانگ لو، جو مقصد ہو طلب کر لو۔ دین کے لیے بھی اور دنیا کے لیے بھی۔ اپنے لیے بھی اوروں کے لیے بھی۔ کوئی مدعا رہ نہ جائے۔ کوئی آرزو چھوٹ نہ جائے۔ بڑے کریم کا دربار ہے جو یہاں آنے والوں کو محروم نہیں کرتا۔

لیکن ہائے ہائے اس اجتماع میں یہ انفرادیت؟ بھائیوں سے بھائی خبر تک نہ ہوئے۔ نہ ایک نے دوسرے کو جانا۔ نہ دل کی راہیں کھلیں۔ نہ آپس کے دکھ درد معلوم ہوئے۔ رشتۂ اخوت کہاں گیا؟ شیرازۂ الفت کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟"

خطیب جو رسول پاک کے منبر پر کھڑا ہوا وہ بھی کچھ نہ بولا۔ ایک ڈھلا ہوا مصنوعی خطبہ مقفیٰ و مسجع پڑھ کر اُتر آیا۔ ضروریاتِ ملّت کی خبر نہ شناسائی۔ نہ حالاتِ امت پر نظر نہ رہنمائی۔ خالی رسم کی خانہ پُری تھی۔ صرف قافیہ بندی کی داد طلبی اور محض بے مغزی کا مظاہرہ۔

ضرورت تھی کہ عرفات میں مسلمان اقوام کا تعارف ہوتا۔ باہم میل جول اور راہ و رسم پیدا کرتے جس سے ساری اُمّت ایک رشتے میں منسلک ہو جاتی۔ کیوں کہ حج اُمم اسلامیہ کے لیے سب سے بڑا اجتماعی مظہر ہے جس میں اکناف و اطرافِ عالم سے ہر قوم کے مسلمان آ کر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے مناسب صورت یہ ہے کہ جس جس ملک یا قوم کے لوگ یہاں آئیں وہ پہلے سے اپنا اپنا ایک امیر حج منتخب کر لیں۔ یہ امراء مکّے میں پہنچ کر باہم ملیں۔ تبادلۂ خیالات کریں۔ پھر انہیں میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے مجمع عام میں ایک خطبہ پڑھے جس ملّت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ ہو، ان کی رہبری کی جائے اور کم سے کم ایک سال کا اجتماعی لائحہ

عمل اُن کے سامنے پیش کیا جائے۔

منبر ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لیے نصب فرمایا ہے۔ ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے کیوں کہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہنچتی ہے۔ ان سب کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب بے نور۔ افسردہ منتشر اور متفرق ہیں تنظیم کی صورت صرف نصبِ مرکزیت ہی اور کچھ نہیں۔ کیوں کہ مرکز کی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے جس سے خود بخود ساری قوم منظم ہو جاتی ہے جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ اُمت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں اُن کو ہمیشہ ناکامیابی ہوگی۔ کیوں کہ یہ اُلٹ راستہ ہے۔

مزدلفہ عرفات میں حج سے فراغت کے بعد غروب آفتاب کے وقت وہاں سے واپسی شروع ہوتی ہے اور قافلے مشعرحرام کے پاس آکر ٹھہرتے ہیں۔ بالعموم لوگ یہاں پہنچکر کچھ کھا پی کر سو رہتے ہیں اور بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی یاد کرتے ہیں۔ حالاں کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہاں ذکرالٰہی کا حکم دیا ہے یہ ذکر انفرادی نہیں ہونا چاہیے کہ اکیلے بیٹھ کر تسبیح و تہلیل کرلی بلکہ اجتماعی ہونا چاہیے۔ کیوں کہ حج کے کل کام اجتماعی ہیں۔ یہاں عظیم الشان محفلِ ذکر ترتیب دینے کی ضرورت ہے کہ جس میں سب لوگ شریک ہوں اور کم سے کم رات کا ایک حصہ حمد و ثنا تذکیر و موعظہ وغیرہ میں صرف ہو اور شکریہ کی نظمیں پڑھی جائیں۔

قربان گاہِ خلیل صبح کو مزدلفہ سے اُٹھ کر نماز فجر کے بعد لوگ منا میں آجاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں توحید کے پیشوائے اعظم اور حنفا کے سرگروہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کرنے کے لیے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا تھا اور چھری نکال چکے تھے کہ آسمانی رحمت نے ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ بس تم اپنی طرف سے سب کچھ کر چکے اور اس کڑے امتحان میں پورے اُتر گئے۔ اسی کا فدیہ یہ ذبح عظیم ہے کہ ہر سال دینِ حنیف کے شیدائی اور ملتِ ابراہیمی کے فدائی لاکھوں ذبیحے یہاں اللہ کے نام پر قربان کر کے سنتِ خلیل اللہ کو تازہ کرتے ہیں۔

قربانی یہ مجمع جو اقصائے عالم سے آکر جمع ہوا ہے۔ بیت اللہ کا زائر اور اپنے رب کریم کا مہمان ہے اس لیے

وقصنی

اس نے اپنے بندوں پرحن کو استطاعت دے رکھی ہے یہ فرض عائد کیا ہے کہ ان ضیوف کی میزبانی کریں جس کے بدلے میں ان کو اجر اور ثواب ملے گا۔ دور دور کے ذی مقدرت بھی جو خود نہ حاضر ہو سکیں جانوروں کو قربانی کے لیے بھیج کر اس میں حصہ لے سکتے ہیں یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے یعنی اس کی غرض حجاج کی ضیافت ہے نہ کہ محض خونریزی۔ اللہ کا حکم یہی ہے۔

"قربانی کو خود بھی کھاؤ اور قناعت پیشہ اور مصیبت زدہ لوگوں کو بھی کھلاؤ"۔ قربانی کے بعد حج کی تکمیل اور اس فریضہ سے سبکدوشی ہو جاتی ہے۔ اب کھانے اور کھلانا اور فرق مراتب کا لحاظ۔ اس وجہ سے مساوات کے لباس جامہ احرام کی ضرورت نہیں رہتی حجاج سر منڈاتے، بال ترشواتے اور ناخن کٹاتے ہیں اور صاف ستھرے ہو کر اپنے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ تین دن تک مجمع رہتا ہے اور تینوں دن قربانیاں ہوتی ہیں۔ یہی ایام تشریق ہیں۔

صدیوں سے اس قربانی کی جو حالت ہو رہی ہے اس کا بیان تکلیف دہ ہے۔ لاکھوں جانور ذبح کر کے ڈال دیئے جاتے ہیں جنکو کھانے کے لیے گدھ اور گیدڑ بھی نہیں ہوتے آخراں کو دفن کر دیا پڑتا ہے۔

یہاں بھی تنظیم کی ضرورت ہے ہر ہر قوم کے ڈیرے جدا گانہ قطعات میں لگیں۔ کل رقم قربانی کی اس قوم کے امیر کے پاس جمع کی جائے اور وہ اپنی جماعت کے اندازہ اور ضرورت کے مطابق قربانیاں کرے۔ ایک جگہ پکوائے اور ایک ساتھ سب مل کر کھائیں اقوام مسلمین کا دماغی تعارف امراء کے ذریعے سے مکے اور عرفات میں ہو چکا ہے یہاں ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کر کے باہم ملیں جلیں۔ جسمانی تعارف پیدا کریں اور باہمی اُلفت و موانست۔

ان ایام تشریق میں ہر جماعت کے امیر کو اپنے ہمراہیوں کو عرفات کا خطبہ اپنی زبان میں سمجھا دینا چاہیئے تا کہ جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے وہ عرفات کے منبر کا پیغام ساتھ لائے اس سے تمام عالم اسلامی میں ایک اجتماعی روح پیدا ہو جائے گی۔

رمی جمرات منا میں تین جگہ تین نشانات بنے ہوئے ہیں جو شیطان سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ ان پر حجاج تینوں دن کنکریاں مارتے ہیں۔ گویا اس رجم سے اس عداوت دین پر جو انسان کو فریب دے کر تعمیل فرمان

اور توحید الٰہی سے روکتا ہے لعنت کرتے ہیں۔ یہ دستور اسلام سے پیشتر سے چلا آتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو قائم رکھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ رمی جمار کی تاریخ عہدِ ابراہیمی سے نہیں بلکہ اصحاب فیل کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو کعبہ کو ڈھانے آئے تھے۔ اہل مکّہ نے جو اس طاقت ور لشکر کے ساتھ رو در رو مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تھے ان تینوں جگھوں پر پہاڑ سے ان پر پتھراؤ کیے تھے۔ جیسا کہ "ترمیهم بحجارة مّن سِجّیلٍ" سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ "ترمی" کا فاعل بھی وہی مخاطب ہے جو پہلی آیت میں "الم تر" کا فاعل ہے نہ کہ "طیر" جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں یہ لشکر جب عذاب الٰہی سے ہلاک ہو گیا تو اسکی یاد تازہ رکھنے کے لیے حج سے واپسی کے وقت ہر سال اِن تینوں مقامات پر رجم کا دستور مقرر ہو گیا۔ چنانچہ ابرہہ کے راہبر ابو رغال ثقفی کی قبر پر بھی جو مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس میں ہے ہر عرب جو گزرتا ہے رجم کرتا ہے دو دن جیسا کہ قرآن میں ہے منا میں رہ کر کے میں آجاتے ہیں اور طواف وداع یا تین دن وداع کر کے وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک اجتماع عام کی ضرورت ہے جس میں سب مل کر حمد و شکر کے ترانے گائیں۔ عربی بھی اور عجمی بھی۔ ایرانی بھی اور تورانی بھی اور پھر وہاں سے باہم گلے مل ملا کر رخصت ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صحیح اصول پر حج ہونے لگے تو اُمّتِ اسلامیہ کے لیے دنیا جنّت بن جائے۔